

بہنوں کا اپنا گمانہ

نومبر 2013

شعاع



نومبر کا شمار لے حاضر ہیں۔

نومبر میں نئے اسلامی سال کا آغاز بھی ہو رہا ہے۔

محرم الحرام - اسلامی سال کا پہلا مہینہ جو حق گوئی، بہادری، شجاعت، صبر و استقامت کے ایک عظیم واقعہ کی یاد دلاتا ہے۔ ایک ایسی جنگ جس کا مقصد حق و صداقت کا بول بالا کرنا تھا۔ جس کا واحد پیغام تھا، اللہ کی سر زمین پر اللہ تعالیٰ کا نظام - اللہ کی سر زمین سے ظلم و جور کا خاتمہ اور عدل و انصاف کا قیام۔ امام عالی مقام حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ، رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے جیتے فوٹے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی دستِ عظیمِ فاطمیہ زہرا اور پیکر شجاعت حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے صاحبزادے تھے۔ ایک طرف امام عالی مقام اور آپ کے بہتر رفقاء تھے۔ دوسری طرف لاکھوں کاشفہ - آپ جیتے فوٹے تو باطل قوتوں سے مفاہمت کر کے اپنی زندگی بچا لیتے لیکن آپ نے بادشاہت اور آمریت کو تسلیم نہیں کیا۔ اعلیٰ انسانی اقدار کی بقا کے لیے اپنی، اپنے اہل خاندان اور رفقاء کی قربانی دے کر وہ مثال قائم کی جس کی عظمت کو پوری دنیا نے تسلیم کیا ہے۔

امام عالی مقام کی شہادت نے وہ عظیم تاریخ رقم کی ہے جو تاقیامت راہِ حق پر چلنے والوں کے لیے رہنما اور مشعل راہِ نبی رہے گی۔

سائرہ رضا کا مکمل ناول - جب ہم ملے،

نوال کا کردار آپ کو یاد ہوگا۔ قرین - خود اعتماد، حساس - ایک مثالی بیٹی۔

پچھلے سال نومبر کے شمارے میں سائرہ رضا کا مکمل ناول "پہلی بار جب ہم ملے" شائع ہوا تھا، نوال اس ناول کا مرکزی کردار تھی۔ اس شمارے میں شائع ہونے والا سائرہ رضا کا ناول "جب ہم ملے" اسی کہانی کا تسلسل ہے۔ ناول کا اختتام ایک سوالیہ نشان پر ہوا تھا۔ سائرہ رضا نے اس میں اس محنت کو سلجھایا ہے۔

زندہ لوگوں کی جائز خواہشات، روایات سے زیادہ اہم ہوتی ہیں۔ وقت کے ساتھ آگے بڑھنے والے، وقت کا ساتھ دینے والے ہی زندگی کو بیٹے ہیں۔

نوال اس حقیقت کو مناسکی یا ناکام بٹھری - قارئین اس ناول کو پڑھ کر جان سکیں گی - پڑھ کر اپنی رائے ضرور لکھیے گا۔ اس شمارے میں،

، عفت سحر طار کا مکمل ناول - آترن،

، سیر احمد کا مکمل ناول - محبت من محرم،

، قاتلہ البعد، مصباح علی، مستقل عزیز شہزاد اور سیما بنت عاصم کے افسانے،

، رضوانہ نگار عذرا اور فیصلہ عزیز کے ناول،

، بندھن - فی وی فکرہ صافیہ اور فیصلہ سلیم، معروف شخصیات سے گفتگو کا سلسلہ - دستک،

، پیارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی پیاری باتیں - الحدیث کا سلسلہ،

، خط آپ کے، شاعری سچ بولتی ہے، شعاع کے ساتھ ساتھ اور دیگر مستقل سلسلے شامل ہیں۔

شعاع کا یہ شمار آپ کو کیا لگا، ہمیں اپنی رائے آگاہ کیجیے گا۔

اندھیرے چیر کر ان میں اُجالا تو ہی کرتا ہے

ہر ایسا کام لے اللہ تعالیٰ تو ہی کرتا ہے

شکستِ فاش دیتا ہے ہمیشہ تو ہی باطل کو

ہر اک موقع پہ حق کا بول بالا تو ہی کرتا ہے

جہاں میں وقتِ پیدائش سے لے کر آخری دم تک

ہر انسان اور ہر حیوان کو بالا تو ہی کرتا ہے

بسا اوقات ہم مایوس ہو جاتے ہیں گھبر کر

ہر ایسے وقت میں مشکل کو ٹالا تو ہی کرتا ہے

زمین پر رگزل شگفتہ، آسمان پر نجمِ رخشندہ

ہے یہ کام تیرے کرنے والا تو ہی کرتا ہے

یہ نرمی اور اس جیسے کروڑوں ہی بشر ہوں گے

بچا کو جن کو گرنے سے سنبھالا تو ہی کرتا ہے

خالد بنجمی

دل میں اترے حرف سے مجھ کو ملا پتا تیرا

معجزہ حُسنِ صوت کا، زمزمہ صدائِ تیرا

ہے میرا وِجَنِ ترے حسنِ کلام کا غلام

بات تھی جاں فزا تیری، لہجہ تھا دلِ بارتیرا

جاں تیری سر بہ سر جمالِ دل تیرا آئینہ مثال

تجھ کو ترے عدو نے بھی دیکھا تو ہو گیا تیرا

اے میرے شاہِ شرق و غرب، ناں جوئی غلّی غلّی

اے میرے بولیا نشیں، سارا جہاں گدا تیرا

میرا تو کائنات میں تیرے سو کوئی نہیں

ارضِ تیری سہا تیرا بندے تیرے خدا تیرا

احمد ندیم قاسمی

بیگم کی بیگم

نکاح سے متعلق احکام و مسائل

نکاح کی فضیلت

حضرت علقمہ بن قیس رحمۃ اللہ علیہ سے روایت ہے انہوں نے کہا۔ ”میں منیٰ میں حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے ساتھ تھا کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ انہیں الگ لے گئے میں پاس بیٹھا تھا۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے ان سے فرمایا۔

”کیا آپ پسند فرماتے ہیں کہ میں ایک کنواری لڑکی سے آپ کی شادی کروا دوں جس سے آپ کو گزرے وقت کی کچھ باتیں یاد آجائیں؟“

جب حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کو محسوس ہوا کہ حضرت عثمان بن رضی اللہ عنہ کو اس کے سوا اور کوئی کام نہیں (بس کے لیے وہ انہیں الگ لے گئے تھے) تو مجھے ہاتھ سے اشارہ کیا۔ میں حاضر ہوا تو وہ فرما رہے تھے۔

”اگر آپ نے یہ بات کہی ہے تو اچھی بات ہی کی ہے کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

”اے جوانوں کی جماعت! تم میں سے جو شخص نکاح کی طاقت رکھتا ہے اسے چاہیے کہ شادی کر لے اس کی وجہ سے نظر سچی رہتی ہے اور جسم (بدکاری سے) محفوظ رہتا ہے اور جسے (نکاح کی) طاقت نہ ہو تو اسے چاہیے کہ روزہ رکھے کیونکہ روزہ خواہش کو کچل دیتا ہے۔“

فوائد و مسائل : 1- گزرے وقتوں کی یاد سے مراد یہ ہے کہ جس طرح آپ پہلے ازواج کی زندگی گزار رہے تھے اور اطمینان و مسرت کا وقت گزار رہا تھا اب پھر آپ کو شادی کی ضرورت ہے تاکہ آپ کو دوبارہ وہی خوشی اور وہی اطمینان و سکون حاصل ہو جس کا حصول شادی کے بغیر ممکن نہیں۔

2- شادی شدہ زندگی میں میاں بیوی کی عمر میں تفاوت کو بہت زیادہ اہمیت حاصل نہیں۔ اگر وہ بی بی ہم آہنگی موجود ہو اور مرد اس قابل ہو کہ اپنی بیوی کی فطری ضروریات خوش اسلوبی سے پوری کر سکے تو اوچتر عمر مرد کم عمر عورت سے نکاح کر سکتا ہے۔

3- تین افراد میں سے دو افراد کو تیسرے کو الگ کر کے بات چیت کرنا منع ہے لیکن اگر تیسرے آدمی کی دل شکنی کا اندیشہ نہ ہو تو بعض حالات میں اس کی گنجائش ہے ویسے بھی مذکورہ بالا واقعہ میں دونوں کے الگ ہو جانے کے باوجود حضرت علقمہ رحمۃ اللہ اتنے دور نہیں تھے کہ ان کی بات چیت نہ سن سکیں۔

4- حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کو اس وقت نکاح کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی اس لیے انہوں نے یہ نہیں فرمایا کہ لڑکی والوں سے رابطہ قائم کیا جائے، البتہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی خیر خواہی کا شکریہ ادا کرنے کے لیے فرمایا کہ نکاح واقعی ایک اہم اور مفید چیز ہے۔

5- نکاح کی طاقت رکھنے کا مطلب جسمانی طور پر نکاح کے قابل ہونا اور مالی طور پر بیوی کے لازمی

(ضرور) نکاح کرے اور جسے (رشتہ) نہ ملے وہ روزے رکھا کرے کیونکہ روزہ خواہش کو کچل دیتا ہے۔“

فوائد و مسائل :

1- نکاح میرا طریقہ ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اہل و عیال والی زندگی گزارنا اسلام کا ایک اہم اصول ہے۔ یہود و نصاریٰ اور ہندوؤں وغیرہ کا طریقہ یہ ہے کہ ان کے ہاں غیر شادی شدہ زندگی گزارنا اور بزرگم خویش عبادت و ریاضت میں مشغول رہنا افضل اور قابل تعریف سمجھا جاتا ہے۔

2- نکاح کا ایک روحانی فائدہ یہ بھی ہے کہ اولاد کی صحیح تربیت کر کے انہیں اسلامی معاشرے کے مفید ارکان بنانا بھی ایک اہم دینی خدمت ہے اور دوسروں کو اچھے کاموں کی ترغیب دلانے سے خود سیدھی راہ پر گامزن رہنا آسان ہو جاتا ہے۔

3- مسلمانوں کے لیے اولاد کی کثرت شرعاً مطلوب ہے، لہذا اس کے لیے کوشش کرنا یعنی نکاح کرنا اور ازدواجی تعلقات قائم رکھنا بھی شرعاً مسخّن ہے۔

4- نکاح روحانی ترقی میں رکاوٹ نہیں۔

محبت رکھنے والوں کے لیے

حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

”اے میں محبت رکھنے والوں کے لیے نکاح جیسی کوئی چیز نہیں دیکھی گئی۔“

فوائد و مسائل :

1- دو خاندانوں میں دوستانہ تعلقات ہوں تو انہیں قائم رکھنے اور مضبوط کرنے کے لیے ایک دوسرے سے رشتہ لینا بچا ہے۔

2- کسی مرد اور عورت کا ایک دوسرے کی طرف میلان ہو جائے تو ناجائز تعلقات قائم کرنے کے بجائے نکاح کا جائز تعلق قائم کر لینا بہتر ہے تاہم اس میں نکاح کی دیگر شرائط یعنی عورت کے سرپرست کی اجازت، حق مهر، ایجاب و قبول اور گواہوں کی موجودگی

اخراجات پورے کرنے کے قابل ہونا ہے۔ موجودہ معاشرے میں رائج رسم و رواج پر کیے جانے والے بے جا اخراجات کی طاقت مراد نہیں۔ معاشرے سے ان فضول رسموں کو ختم کرنے کی کوشش کی جانی چاہیے۔

6- نکاح کا سب سے بڑا فائدہ گناہ کی زندگی سے حفاظت اور جنسی خواہشات کی جائز ذریعے سے تسکین ہے۔ نکاح کرتے وقت یہ مقصد پیش نظر رکھنا چاہیے دوسرے فوائد خود ہی حاصل ہو جائیں گے۔

7- فحاشی سے بچاؤ اسلامی معاشرے کی ایک اہم خوبی ہے اس کے حصول کے لیے ہر جائز ذریعہ اختیار کرنا چاہیے اور فحاشی کا ہر راستہ بند کرنا چاہیے۔

8- اسلامی شریعت کی یہ خوبی ہے کہ یہ انسان کی فطرت کے مطالبات کی نفی نہیں کرتی بلکہ ان کے حصول کے جائز ذرائع مہیا کرتی ہے۔

9- روزہ رکھ کر انسان نامناسب خیالات اور جذبات کو کنٹرول کر سکتا ہے اس وجہ سے فطری خواہش بھی بے لگام نہیں ہوتی اس لیے اگر کسی نوجوان لڑکے یا لڑکی کی شادی میں کسی وجہ سے تاخیر ہو جائے تو اسے چاہیے کہ کئی روزے کثرت سے رکھے اور جذبات میں بیجاں پیدا کرنے والے ماحول اس قسم کے لڑپچر کے مطالعے جذبات انگیز نغمات سننے اور فلمیں وغیرہ دیکھنے سے پرہیز کرے تاکہ جوانی کا جوش گناہ میں ملوث نہ کر سکے۔

نکاح سنت ہے

ام المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

”نکاح میرا طریقہ ہے اور جو شخص میرے طریقے پر عمل نہیں کرنا اس کا مجھ سے تعلق نہیں۔ شادیاں گہا کرو کیونکہ میں تمہاری کثرت کی بنا پر دوسری امتوں پر فخر کروں گا“ (جو (مالی طور پر) استطاعت رکھتا ہو وہ

وغیر وکلیا جانا ضروری ہے۔

بے نکاح رہنا منع ہے

حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ سے روایت ہے انہوں نے فرمایا۔
”رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عثمان بن مظعون رضی اللہ عنہ کو بے نکاح رہنے کی اجازت نہیں دی۔ اگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم انہیں اجازت دے دیتے تو ہم لوگ خسی ہو جاتے۔“ بخاری
فوائد و مسائل :

1- حضرت عثمان بن مظعون رضی اللہ عنہ عبادت کا بہت شوق رکھتے تھے۔ انہوں نے سوچا کہ نکاح کر کے پوری بچوں کے معاملات میں مشغول ہونے سے نقلی عبادات، یعنی نقلی نماز روزے کے مواقع کم ہو جاتے ہیں اس لیے بہتر ہے نکاح نہ کیا جائے لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں بے نکاح رہنے کی اجازت نہ دی۔
2- صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے بوجھے بغیر کوئی کام نہیں کرتے تھے کیونکہ ممکن ہے ایک کام بظاہر نیک کا ہو اور بہت اچھا معلوم

ہو تاہو لیکن شریعت کی رو سے وہ صحیح نہ ہو۔
3- بدعت بھی بظاہر نیک ہوتی ہے لیکن اس کے ظاہری نیک ہونے سے دھوکا نہیں کھانا چاہیے۔ خلاف سنت کام کتنا ہی اچھا معلوم ہو تاہو اس سے پرہیز کرنا ضروری ہے۔
4- اللہ کا قرب حاصل کرنے کا طریقہ یہ نہیں کہ ہندو جوگیوں یا عیسائی راہبوں کی طرح حلال چیزوں سے بھی پرہیز کیا جائے بلکہ کھانے، پینے اور دیگر معاملات میں شرعی ہدایات پر عمل کرنے سے اللہ کا قرب حاصل ہوتا ہے۔

حضرت سمرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بے نکاح رہنے سے منع فرمایا۔

فوائد و مسائل :

1- بے نکاح رہنے کو نیکی سمجھنا غلط ہے خواہ یہ تصوف کے نام پر ہو یا قلندر کی نام پر یا کسی اور نام سے۔
2- نکاح تمام انبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت ہے۔
3- انبیائے کرام نوری مخلوق نہیں بلکہ اشرف المخلوقات انسان ہیں اس لیے وہ نکاح بھی کرتے تھے اور ان کی اولاد بھی ہوتی تھی۔

خاوند پر بیوی کے حقوق

حضرت حکیم بن معاویہ اپنے والد حضرت معاویہ (ابن حیدر رضی اللہ عنہ) سے روایت کرتے ہیں انہوں نے فرمایا ایک آدمی نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا۔
”خاوند پر عورت کا کیا حق ہے؟“

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ”جب کھانا کھائے تو اسے بھی کھائے“ جب کپڑا پہنتے تو اسے بھی پہنائے“ چہرے پر نہ مارے اسے برا بھلا نہ کہے اور گھر ہی میں (اس سے) علیحدگی اختیار کیے رکھے۔“

فوائد و مسائل :

1- اسلام نے معاشرے کو صحیح بنیادوں پر قائم کرنے کے لیے ہر فرد کے حقوق و فرائض کا تعین کر دیا ہے۔ ان کو پیش نظر رکھ کر معاشرے میں امن قائم کیا جاسکتا ہے۔
2- جس طرح مردوں کے حقوق ہیں اسی طرح عورتوں کے بھی حقوق ہیں اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔ ولہن مثل الذی علیہن بالمعروف (البقرة ۲۲۸)
ترجمہ: اور دستور کے مطابق عورتوں کے لیے مردوں پر ویسے ہی حقوق ہیں جیسے مردوں کے لیے عورتوں پر ہیں۔“
3- گھر میں امن و سکون قائم رکھنے کے لیے ضروری ہے کہ دونوں ایک دوسرے کے حقوق کا خیال

رہیں۔

عورت کی بنیادی ضروریات یعنی خوراک، لباس اور رہائش وغیرہ مہیا کرنا مرد کا فرض ہے۔

4- مرد کو حق حاصل ہے کہ عورت کو غلطی پر مناسب تنبیہ کرے۔

5- اگر معمولی تنبیہ کا اثر نہ ہو تو معمولی سی جسمانی سزا بھی دی جاسکتی ہے لیکن چہرے پر مارنا منع ہے۔

لا فقیح کا ایک مفہوم یہ ہے کہ ڈانٹنے وقت نامناسب الفاظ استعمال نہ کرے، جیسے عرواں میں رواج تھا کہ وہ کہتے۔ فح اللہ و جھک اللہ تیرے چہرے کو فحج کر دے۔ یا فحک اللہ اللہ تجھے بد صورت کر دے۔“ اس طرح کی گلی اور بد دعا سے اجتناب کرنا

چاہیے۔ دوسرا مفہوم یہ ہے کہ چہرے پر نہ مارے، فوراً مارنے سے چہرے پر نشان پڑ جائے گا اور چہرہ بد صورت ہو جائے گا اس لیے فرمایا کہ اسے بد صورت نہ بنا دے۔

6- تنبیہ کے لیے ناراضی کا اظہار کرتے ہوئے وقتی طور پر بول چال بند کرنا جائز ہے لیکن بیوی کو گھر سے نکال دینا خود گھر سے کئی دن کے لیے باہر چلے جانا مناسب نہیں۔ گھر میں دونوں کی موجودگی سے ناراضی جلد دور ہو جانے کی امید ہوتی ہے۔

عورتوں کے حقوق

حضرت عمرو بن احوص رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ وہ جنتہ الوداع میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ موجود تھے۔ (اس دوران میں) نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ کی حمد و ثناء کی اور وعظ و نصیحت فرمائی (اس میں آپ نے کئی باتیں ارشاد فرمائیں) پھر فرمایا۔

”عورتوں کے بارے میں خیر کی وصیت قبول کرو کیونکہ وہ تمہارے پاس قیدی ہیں۔ تمہیں ان پر اس کے سوا کوئی اختیار نہیں۔ الا یہ کہ وہ واضح بے شری کا کوئی کام کریں۔ اگر وہ ایسی حرکت کریں تو ان سے بستروں میں الگ ہو جاؤ اور انہیں مارو لیکن سخت چٹائی

نہ ہو۔ (اس تنبیہ کے نتیجے میں) اگر وہ تمہاری اطاعت کرنے لگ جائیں تو ان پر (سختی کرنے کی) راہ تلاش نہ کرو یقیناً تمہاری عورتوں پر تمہارا حق ہے اور تمہاری عورتوں کا تم پر حق ہے۔

تمہاری عورتوں پر تمہارا حق تو یہ ہے کہ وہ تمہارے بستروں پر اسے نہ بیٹھائیں جس (کے گھر میں آنے) کو تم ناپسند کرتے ہو اور تمہارے گھر میں اس فرد کو آنے کی اجازت نہ دیں جسے تم ناپسند کرتے ہو۔ سنو! تم پر عورتوں کا یہ حق ہے کہ ان کے لباس اور خوراک کے بارے میں ان سے اچھا سلوک کرو۔“

فوائد و مسائل :

1- وصیت نامیدی نصیحت کو کہتے ہیں جس پر عمل کرنا بہت ضروری سمجھا جاتا ہے۔ ”وصیت قبول کرو“ کا مطلب یہ ہے کہ میں تمہیں وصیت کرتا ہوں۔ بہت سے صحابہ کرام جو جنتہ الوداع میں حاضر تھے ان کے لیے ممکن ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ان کی وہ آخری ملاقات ہو کیونکہ اس سے تین ماہ بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس دار فانی سے کوچ فرما گئے۔ ان کے لیے یہ خطبہ واقعی آخری نصیحت (وصیت) بن گیا۔

2- خطاب اگرچہ جنتہ الوداع میں حاضر ہونے والے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے فرمایا گیا تھا تاہم یہ حکم قیامت تک آنے والے تمام مومنوں کے لیے ہے۔

3- مرد کو چاہیے کہ بیوی کے اخلاق و کردار کی نگرانی کرے، تاہم بلاوجہ شکوک و شبہات میں مبتلا رہنا درست نہیں جب تک کوئی واضح مشکوک صورت سامنے نہ آئے۔

4- واضح بے حیائی سے مراد ایسی حرکت ہیں جن پر روک ٹوک نہ کرنے سے بدکاری تک نوبت پہنچ سکتی ہے۔ زنا کا ارتکاب ہو جانے کی صورت میں دوسرے احکام ہیں جو قرآن و حدیث میں اپنے مقام پر مذکور ہیں۔

5- جب محسوس ہو کہ عورت اپنی غلطی پر پشیمان ہے اور اصلاح پر آمادہ ہے تو اس سے معمول کے

میں اظہار ممکن نہیں ”دیکھ زہد محبت“ تو واقعی قلبی قلبی سا ہے۔ محبت من محرم بہت اچھی اسٹوری ہے۔

حیا بخاری کا خط پڑھ کر ہمیں بھی حیرانی ہوئی، بھئی شاہ غلطی کیوں نہیں کر سکتے؟ انسان تو ہے ہی خطا کا پتلا۔ کثیر نبوی بی سے عشق پر رقم جذبوں کو جھلسا دینے والی تحریر لکھو! میں (کزارش) نوال افضل کھن کے نام سے بہت مانوسیت ہو گئی ہے۔ ان کے انتخاب وغیرہ کو بار بار دہتی ہوں راجہ بھری کا تعارف اچھا لگا، خاص طور پر پسندیدہ کتابوں اور پسندیدہ مصنفین کا پڑھ کر خوشی ہوئی۔ ”کابے کو بیانی بدیس“ بہت شاندار تھی۔ کیا انیسہ سلیم کا ”ترک رسوم“ کتابی شکل میں ہے؟ انیسہ بی پلیز زیدو عظمیٰ سارہ سے ملاقات کروائیں۔

ج۔ چاری نیلم اشعار سے آپ کی وابستگی کے بارے میں جان کر بہت خوشی ہوئی آپ اشعار اتنی توجہ سے دہتی ہیں اور ناول افسانے ہی نہیں سلسلوں پر بھی آپ کی گہری نظر ہے۔ کثیر نبوی ناول لکھ رہی ہیں۔ جلد ہی آپ ان کی تحریر پڑھیں گی۔ انیسہ سلیم کا سلسلہ کتابی شکل میں نہیں آیا۔

کابے کو بیانی بدیس صوفیہ سرور کی اثر انگیز تحریر تھی۔ یہ نئی مصنفہ ہیں اور ہمیں ان سے بہت توقعات ہیں۔

اپنی فرزندہ آبی کا ہماری طرف سے شکریہ ادا کر دیجئے گا۔

سارہ عرم طوبی کرن اور اشعل نے سبجور سے شرکت کی ہے۔ لکھتی ہیں۔

اپنا خط نہ پا کر اتنا غصہ آیا کہ جی چاہا سب کے خط پھاڑ ڈالوں۔ صائمہ جی بہت اچھے طریقے سے کہانی آگے بڑھا رہی ہیں۔ ہمارے اندازے کے مطابق شاید کہ کاموں کا بیٹا رامس ہے۔ ماہم اور شمن کا کردار ذرا بھی اچھا نہیں لگتا۔ سارا دان فنی سنورتی رہتی ہیں۔ ”بے رقص نکل“ بہت اچھی جاری ہے۔ یہ تو پہلی قسط میں ہی پتا چل گیا تھا کہ ماورا کا ہیرو ہیرو ہے۔ ویسے نیلم آپ کی ہر کہانی کا ہیرو ایک جیسا ہی کیوں ہوتا ہے؟ ”ایک تھی مثال“ میں بشری کو طلاق نہیں ہونی چاہیے تھا۔ اتنا برا جھگڑا تو نہیں تھا کہ نوبت طلاق تک پہنچ گئی۔ دو بے نام کردار ان میں ایک تو مثال ہے دوسرا واقع ہو گا۔ عاصمہ کا اس بار ذکر ہی نہیں



خط بھجوانے کے لیے پتا
ماہنامہ شعاع - 37 - اردو بازار، کراچی۔
Email: info@khawateendigest.com
shuaamonthly@yahoo.com

آپ کے خط اور ان کے جوابات لیے حاضر ہیں۔
اللہ تعالیٰ سے آپ کی سلامتی عافیت اور خوشیوں کے لیے دعا میں۔

اللہ تعالیٰ آپ کو ہم سب کو ہمارے پیارے وطن کو اپنے حفظ و امان میں رکھے۔ آمین۔

پہلا خط کوٹ مومن سے نیلم شہزادی کا ہے۔ لکھتی ہیں۔

پیارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی پیاری باتیں ہمیشہ کی طرح بہت پیاری تھیں۔ ”ایک تھی مثال“ میں بشری کے ساتھ اچھا نہیں ہوا، مگر اسی کا نام زندگی ہے۔ رخصانہ جی آپ کے ناول میں در بدر بھٹکی وہ پیاری سی لڑکی ہی درحقیقت ”مثال“ ہوگی (آہم) ذاتی خیال ہے۔ ”محبت جیت کی صورت“ پسند نہیں آئی (معدرت)۔ نیلم عزیز جی آپ کی سلسلہ وار آمد سے کس قدر خوشی ہوئی؟ لفظوں

پابندی لگائے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے اپنے رضاعی بچا کو گھر میں آنے کی اجازت نہیں دی تھی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ”وہ تمہارا چچا ہے اسے آنے کی اجازت دو۔“

لباس اور خوراک کے بارے میں اچھا سلوک یہ ہے کہ اپنی حیثیت کے مطابق اچھا لباس اور مناسب خوراک مہیا کرے لیکن ایسے لباس سے منع کرنا چاہیے جو شریعت کی تعلیمات کے مطابق نہ ہو۔

شوہر کی خوشنودی

ام المومنین حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا، آپ فرما رہے تھے۔

”جو عورت اس حال میں فوت ہوئی کہ اس کا خاوند اس سے خوش تھا تو وہ جنت میں جائے گی۔“

بہترین عورت

حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

”دنیا (عارضی) فائدے کی چیز ہے اور دنیا کے سازو سامان میں نیک عورت سے بہتر کوئی چیز نہیں۔“

فوائد و مسائل :

1۔ دنیا کی چیزوں سے حلال طریقے سے فائدہ حاصل کرنا جائز ہے۔ ترک دنیا جائز نہیں۔

2۔ دنیا کی چیزیں اس انداز سے استعمال کرنی چاہئیں کہ آخرت میں فائدہ حاصل ہو۔

3۔ نیک عورت ایک بڑی نعمت ہے کیونکہ وہ دنیا کے معاملات میں بھی اچھی مشیر ثابت ہوتی ہے، اچھی شریک حیات ہوتی ہے اور آخرت کے معاملات میں بھی خاوند سے تعاون کرتی ہے۔ اس طرح دونوں کو بلند درجات حاصل ہو جاتے ہیں۔

4۔ نیک مرد بھی عورت کے لیے ایک ایسی ہی نعمت ہے۔

بھلا

تعلقات قائم کر لینے چاہئیں اور بار بار گزشتہ غلطیوں کا طعنہ نہیں دینا چاہیے۔

6۔ بعض اوقات صورت حال اس قدر خراب ہو جاتی ہے کہ جسمانی سزا ناگزیر ہو جاتی ہے لیکن یہ اصلاح کی کوشش کا آخری درجہ ہے جہاں تک ممکن ہو معاملات کو اس مرحلے پر نہیں پہنچنے دینا چاہیے۔

7۔ اگر جسمانی سزا ضروری محسوس ہو تو اس میں بھی نرمی کا پہلو نظر ہونا چاہیے، یعنی صرف اس حد تک سختی کی جائے یا سزا دی جائے جو تنبیہ کے لیے ضروری ہو اس سے زیادہ نہیں کیونکہ مقصد اصلاح ہے غصہ نکالنا یا بدلہ لینا نہیں۔

8۔ مہمانوں کی تکمیم ضروری ہے لیکن اگر کوئی ایسا شخص آتا ہے جسے خاوند اچھا نہیں سمجھتا تو عورت کو چاہیے کہ خاوند کے جذبات کا خیال رکھتے ہوئے اسے اجازت دینے سے معذرت کر لے یا کہہ دے کہ مرد گھر میں نہیں پھر آجائے گا۔

9۔ ناپسندیدہ شخص کو بہتر نہ بٹھانے کا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ غیر مردوں سے ناجائز تعلقات استوار کرنے کی راہ ہموار نہ کی جائے۔ ان سے نرم لہجے میں ہنس ہنس کر بات کرنے کے بجائے سنجیدگی سے مختصر بات کر کے فارغ کر دیا جائے۔ امام خطابی فرماتے ہیں۔ ”اس کا مطلب یہ ہے کہ اجنبی مردوں کو گپ شپ کے لیے اپنے پاس گھر میں آنے کی اجازت نہ دیں، جیسے عرب میں یہ رواج تھا اور اسے عیب نہیں سمجھا جاتا تھا۔ پردے کا حکم نازل ہونے کے بعد اس سے منع کر دیا گیا۔“ (حاشیہ سنن ابن ماجہ از محمد فواد عبدالباقی) ہمارے ہاں دیہات میں جہاں پردے کا اہتمام نہیں کیا جاتا اب بھی یہ صورت حال موجود ہے جو شرعی طور پر ممنوع ہے۔

10۔ بعض علماء نے فرمایا ہے کہ عورت اپنے محرم رشتہ داروں کو بھی خاوند کی اجازت کے بغیر گھر میں نہ آنے دے لیکن زیادہ صحیح یہ معلوم ہوتا ہے کہ خاوند کو ایسا نہیں ہونا چاہیے کہ عورت کے محرم مردوں پر

تھا۔ پلیز کمائی کو تیزی سے آگے بڑھائیں۔ سمیرا حمید کی کمائی بہت اچھی جارہی ہے۔ ناولٹ اچھا تھا ایک جگہ رائٹر کا نام رخسانہ لکھا ہوا تھا تو ایک جگہ موش افخار۔ انسانوں میں ”کاپے کو بیانی بدیس“ اچھا لگا۔ بانی اسٹریو اور مستقل سلسلے اچھے تھے۔

ج۔ سارہ، مریم، طوبی، کرن اور اشاع خط شائع نہیں ہوا تو اتنا غصہ؟ غصہ؟ سلطان سے ہے اچھی بات نہیں۔ بشری کو طلاق اسی غصہ کی وجہ سے ہوئی۔ اور دونوں کا گھر بزرگیا ناولٹ موش افخار کا تھا۔ سوا ”رخسانہ نگار کا نام لگ گیا۔

فوزیہ ثمرت اور طیبہ عمران نے ہجرات سے شرکت کی ہے۔ لکھتی ہیں۔

اجی ابھی مجھے میرن جانی جیجی بانی عمران کا میسج اس کی ماں کی طرف سے ملا ”پیاری! پیچھو جانو کیا کردی ہو؟“ اس ظالم نے میری بانی کو یہ نہیں بتایا کہ آج اس کی پیچھو کی سالگرہ ہے بندہوش ہی کر دیتا ہے پر بانی سب سے پہلے سائرہ اکرم کا ”دیمک زہہ جمت“ پڑھا۔ واہ صائمہ جی کیا جوڑیاں سیٹ کی ہیں آپ نے اور کمائی کے ایک بد صورت کردار ماہم کو جب یہ سب بتا چلے گا تو کیا حالت ہوگی اس کی۔ سیکنہ کا قبرستان کا ذکر آپریشن کے بعد سیکنہ کے ساتھ کیا ہونے والا ہے۔ پلیز اس کردار کو زندہ رہنا چاہیے۔

سمیرا حمید، محبت من محرم زبردست تحریر تھی۔ مجھے لگتا ہے افق کی ماں کا تعلق ہو گا عدنان کے باپ کے ساتھ۔ یہ تو اب آگے جا کر ہی کھلے گا کہ غلام علی غلام افق کا نایا، چچا ہے۔

ج۔ پیاری فوزیہ! آپ اس دن ہوں ہم آپ کو سالگرہ پر وش کر رہے ہیں۔ آئندہ آنے والا ہر دن آپ کے لیے خوشی لے کر آئے!

سمیرا حمید کے ناول میں تو آپ کے اندازے بالکل غلط ہیں۔ رخسانہ نگار کے ناول میں دیکھتے ہیں ”آگے کیا ہوتا ہے۔ سیکنہ میں“ ایک خالی ہے وہ محبت کرنا تو جانتی ہے، مگر محبت کی قدر کرنا نہیں جانتی۔ ڈاکٹر خاور جیسے عمل لوگ اس سے ہمدردی تو کر سکتے ہیں، مگر محبت نہیں اور جو اس

سے محبت کرتا ہے، وہ اس کو دھکار دیتی ہے تو آپ خود سوچیں اس کا انجام اچھا کیسے ہو سکتا ہے۔ زندگی کے خواب اپنی جگہ لیکن حقیقتوں کا سامنا بھی کرنا چاہیے اور انہیں تسلیم بھی کرنا چاہیے سرباب کے پیچھے دوڑنے والے بالا خراک دن تھک کر گر جاتے ہیں۔

شمینہ اکرم نے لیاری کی کراچی سے لکھا ہے۔

”پیارے نبی کی پیاری باتیں“ کو اس مرتبہ میں نے کئی بار پڑھا۔ بندہ میں لیاز احمد کنول ایاز سے ملاقات اچھی رہی۔ اس کے بعد ”آپ کے خط“ کی طرف پیش قدمی کی سب سے پہلا خط ہماری پیاری رائٹر خاں غاری کا تھا۔ ایک بار نہیں باپ پڑھا۔ ایک قلم کار نے ایک قاری کی کمی کو محسوس کیا۔ ”بوند بوند تماش“ پر تبصرہ پڑھ کر ہر انداز قاری کی طرح مجھے بھی بے حد دکھ ہوا۔ کمائیوں میں سب سے پہلے ”محبت من محرم“ پڑھا۔

افق کا کردار پڑھ کر مجھے آئیہ رزاقی کے ناول کی ہیروئن یاد آگئیں۔ ایسی باہمت، حوصلہ مند اور مخفی لڑکی جو ہر طرح کے مصائب و مشکلات سے نہرو آزا ہو کر اپنی زندگی کی جنگ لڑتی ہے۔ خالدہ ثار کا ”محبت جیت کی صورت“ ناول پڑھا۔ ”انا اور ضد ساتھ لے کر جینے والے بیشہ تنہا جاتے ہیں۔“ افسانہ ”بارہ رنگوں کا سوٹ“ بہت اچھا لگا۔ موش افخار کا ناولٹ ”میرے ہم سفر“ کچھ نیا نہیں لگا۔ وہی بد کمائی، شکوک و شبہات اور آخر میں سب کچھ کلیئر۔

ثریا انجم کی تحریر ”در اور دیوار“ سے ایک اچھا میسج ملا۔ اللہ تعالیٰ نے اسی لیے محرم اور ناصر م کا فرق رکھا ہے۔ ”ایک مٹی مثال“ اس بار کمائی دل کو دکھی کر گئی۔

11 نومبر 2012ء کی رات میرے شہزادے بیٹے کا جان لیوا ایکسیڈنٹ ہوا۔ جس کی یاد سے میرے دل کا ہر کونا مہلکا ہے۔

ج۔ پیاری شمینہ! یہ حقیقت ہے کہ شعاع کی قارئین اور مصنفین کے درمیان ایک ان دیکھا رشتہ ہے اور وہ ایک دوسرے کی تکلیف کو اسی طرح محسوس کرتی ہیں جیسے کسی اپنے کی تکلیف کو محسوس کیا جاتا ہے۔

عدیل کا کردار اچھا ہوا نہیں ہے۔ جب دو عزیز ترین رشتوں کے درمیان کشمکش ہو تو انسان اسی طرح بے بس

ہوتا ہے۔ کبھی ماں کی طرف اور کبھی بیوی کی طرف۔ بس دکھی تھی۔ ماں کے آنسو دل پر اثر کر رہے تھے۔ اپنی بات کے جواب میں ایسے میں بشری کا مٹھائی لے کر اتنا اسے اشتعال دلایا اور وہ ایسا فیصلہ کر بیٹھا جس سے عرش کے کنکرے ہل جاتے ہیں۔ اگر بشری تھوڑا سمجھ داری سے کام لیتی اور ٹھنڈے دل سے اسے سمجھا دیتی تو شاید حالات اس نچ پر نہ آتے۔

راولپنڈی سے مسرت ناز نے شرکت کی ہے، لکھتی ہیں۔

اکتوبر کے اس شمارے میں مکمل ناول ”محبت جیت کی صورت“ بہت بہتر ناول تھا۔ بعض اوقات ماں باپ اولاد کے معاملے میں ایسا ہی کرتے ہیں۔ یہ نہیں سوچتے کہ اولاد کا مستقبل کیا ہوگا۔ روحینہ کا فیصلہ اس کمائی میں

ایسا لگا جیسے میری آواز تھی۔ ”محبت کی بدعا سے ڈر لگتا ہے۔“ یہ الفاظ پڑھ کر آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ میں نے اس سال فروری میں ایک تحریر جیجی تھی۔ اس کا نام ”اوشخاں والے“ تھا۔ میں جانتا چاہتی ہوں کہ کیا ”اوشخاں والے“ قابل اشاعت ہے یا نہیں۔

ج۔ پیاری مسرت! شعاع میں کوئی تحریر ناولٹ، افسانہ، ناول یا کسی سلسلے کے لیے انتخاب سمجھوانے کے لیے پوچھنے کی قطعاً ضرورت نہیں۔ شعاع آپ کا چاہے۔ آپ کی کمائی ”اوشخاں والے“ اچھی ہے۔ ان شاء اللہ جلد شائع ہو جائے گی آپ میں لکھنے کی صلاحیت ہے۔ آپ کچھ اور بھی لکھیں۔

کوثر خالد بڑا نوالہ سے شریک محفل ہیں۔

”ایک تھی مثال“ دکھ دے گئی۔ پہلے سے یہ بات معلوم تھی۔ محبت من محرم اس بار ہزاروں جملے ایسے کہ ہر اک پہ جاب نکلتے۔ ان شاء اللہ افق کا اینڈ جیجی ہی ہوگا۔

”محبت جیت کی صورت“ نہایت سبق آموز، خدا کرے تاثر لائے۔ ”دیمک زہہ جمت“ اچھا موڈ آ گیا ہے۔ ہم جیلہ مائی کی باتیں ہر پل سننے کے لیے پیٹاب ملیں گے۔ ”میرے ہم سفر“ عبرت انگیز۔ ”بارہ رنگوں کا سوٹ“ الحمد للہ اللہ نے ہمیں جوانی میں ایسی خواہشوں سے دور رکھا۔ ہمیں صرف پیار کی تلاش رہی۔ ”رات کا رنگ“ اگر ہم رات کے رنگوں کے لیے ہر مل تیار رہیں تو روشنی ہی مقدر بنتی ہے۔ ”کاپے کو بیانی بدیس“ صوفیہ تم نے رلا دیا۔ ”اک لمحہ“ اینڈ پڑھا اور یہ لمحہ تمام رسالے پر بھاری رہا۔ ”تارن کے جھروگے“ مائی فورٹ بہت بہت مزا آتا ہے۔ اس بار ڈاکٹر عبدالقدیر کا پڑھ کر خاص مزہ آیا وہ سلسلے ہی میرے موش فورٹ ہیں۔ اب تو شعاع میں ان کا تازہ انٹرویو ہماری خواہش ہے۔

ج۔ پیاری کوثر! تفصیلی تبصرہ بہت اچھا لگا۔ آپ نے ہر سلسلے پر بڑی باریک بینی سے تبصرہ کیا۔ شعاع کی پسندیدگی کے لیے تہ دل سے شکریہ۔ ڈاکٹر قدیر خان کا انٹرویو تو ہماری بھی دلی خواہش ہے۔ کبھی موقع ملا تو ضرور کریں گے۔

آئیہ پچر اور مشعل پچر لکھتی ہیں۔

جون، جولائی، اگست کے شماروں پر تبصرہ لے کر ہم بڑی مشکل سے آپ کی محفل میں تشریف لائے ہیں۔ جون کے اجالوں کے سفر نے جو کد مل میں پیدا کی، جولائی کی ”برف کی تیلیوں“ نے ختم کر دی۔ یعنی حق دار (پچا زاد) کو اس کا حق دے دیا۔ ”بوند بوند تماش اور امتحان شیشہ کا“ بہت حوا کی بے بسی ظاہر کرتے غصہ دلا گئے۔ حیرت مجھے سعدیہ ملک پر ہے۔ مزے سے راحت جنیں کی تحریر میں کمزور پہلوؤں کی نشاندہی کی۔ اور اس نے بھی زیادہ حیرت سارہ، مریم، جو سچ پور سے بولیں ان پر ظاہر قول میں آپ کے دکھ میں برابر کی شریک ہوں! اگر ایک ہفتہ کچھ پڑھنے کو نہ ملے تو میرا دم کھٹنے لگتا ہے کاپور ماہ۔ میری

اعتذار

پچھلے ماہ اکتوبر کے شمارے میں موش افخار کا ناولٹ ”میرے ہم سفر“ شائع ہوا تھا۔ کمائی پر موش افخار کا نام تھا لیکن فہرست میں رخسانہ نگار عدنان کا نام لگ گیا۔ اس سہو کے لیے ہم دونوں مصنفین اور قارئین سے معذرت خواہ ہیں۔

ناقص رائے کے مطابق آپ کو ہر حال میں ڈائجسٹ پڑھنا چاہئیں۔ یہ آپ کا حق بھی ہے اور خوشی بھی۔

اقصی بتول نے بالکل غلط کھلم کھلا محبت تو اب دنیا کے ساتھ ساتھ شعاع میں بھی خال خال ہی ملتی ہے۔ وہ بھی سچائی، حقائق، روایات کے نزولوں کے ساتھ ”دہر معیار“ عید اور عیدیاں، ایک ہی تصور کے دو رخ۔ ویسے یہ ساس ”ندوں والی باتیں“ مجھے نہیں بھائیں۔ عید کے شمارے میں ان کے بجائے کچھ چننا ہونا چاہیے تھا۔

ج۔ آئندہ آپ نے بہت تفصیلی اور دلچسپ تبصرہ کیا اور یقین کیجئے کہ ہمیں بہت پسند بھی آیا ہے۔ ہم بار بار اعتراف کر چکے ہیں کہ شعاع کی قارئین بہت ذہین ہیں۔ کماؤں کے بارے میں اتنے درست اندازے لگانا اور ان کی اصل روح کو سمجھنا ان کی ذہانت کو ظاہر کرتا ہے۔ صفحات کی مجبوری نہ ہوتی تو ہم آپ کے خط کا ایک لفظ بھی نہ کاتے، شعاع کی پسندیدگی کے لیے دل سے شکریہ۔

افشال حاجی جعفر کراچی لیاری دریا آباد سے شریک محفل ہیں، لکھا ہے۔

اکتوبر کا ٹائٹل بہت اچھا تھا۔ پیارے نبی کی پیاری باتیں بھی بہت اچھی تھیں۔ اس بار ضامنہ اکرم کا ”ذیک زہ محبت“ تو بہت بہت اچھا تھا۔ مکمل ناول میں خالدہ ثار کا ”محبت جیت کی صورت میں“ اچھا تھا۔ پورا شعاع قابل تعریف تھا۔

ج۔ افشال! اللہ تعالیٰ آپ کے والد صاحب کی مغفرت کرے۔ (آمین)

شعاع کی پسندیدگی کے لیے شکریہ قبول کریں۔ آپ کے بھائی لکھنے پڑھنے کے شوق میں تعاون کرتے ہیں۔ یہ جان کر بہت خوشی ہوئی۔ اللہ تعالیٰ سب کے بھائیوں کو یہ توفیق دے آمید ہے کہ آئندہ بھی خط لکھ کر اپنی رائے کا اظہار کرتی رہیں گی۔

راجہ تحسین نے ممتاز آباد ملتان سے شرکت کی ہے، لکھتی ہیں۔

میں نے آپ کے رسالے سے بہت کچھ سیکھا ہے۔ جو قدم قدم پر میرے کام آیا۔ یقین کیجئے اگر آپ میرے سامنے ہوں تو میں آپ کو سیلوٹ ضرور کروں گی۔

”محبت جیت کی صورت“ عجیب لگا۔ سب کچھ تھا۔ لیکن بے ساختگی نہیں تھی۔ خاص کر روحینہ کے کردار میں۔ ”اک لمحہ“ صبیحہ اقبال شہباز ”ایک تھی مثال“ اچھا جا رہا ہے۔ پلیر لہانہ کرنا۔ ”محبت“ ”من“ ”محرم“ اچھا ہے۔ زبردست ہے۔ مجھے یہ ناول ڈینی ڈنر احمد کے ناولوں کی طرح پھسپھسا سا لگا۔ کیونکہ پلاٹ طے شدہ لگ رہا ہے۔ لیکن ایک چیز کی خوشی ہے کہ گوہر خاتون کو محنت کا صلہ مل رہا ہے۔ کیونکہ میں خود گھر میں اجرت پر سلائی کرتی ہوں۔ لیکن بچوں کے جوڑے کے کوئی بھی پچاس یا ساٹھ روپے سے زیادہ نہیں معاوضہ دیتا۔ بلکہ لوگ اسے بھی زیادہ سمجھتے ہیں۔ مجبوری سے پر چلاوتے پیروں میں سڑی تو آتی ہے۔ مجھے سب سے اچھی کمائی میرے ہم سفر لگی۔ کتنے اچھے پیارے، ہیرو ہیروئن تھے۔ ”در اور دیوار“ کے بارے میں میرا کہنا ہے کہ اس کمائی کو ضرور پڑھیں، بلکہ بار بار پڑھیں۔

ج۔ پیاری راجہ! شعاع کی محفل میں خوش آمدید۔ ہمیں افسوس ہے کہ آپ کی فراکش پوری نہیں کی جاسکتی۔ میڈم نور جمال اور خالدہ ریاست کا کوئی اثر پوہمارے ہاں شائع نہیں ہوا۔ البتہ خالدہ ریاست پر ایک مضمون ضرور شائع ہوا تھا۔

بہت اچھی بات ہے کہ آپ کام کرتی ہیں۔ معاوضہ کم ضرور ہے، لیکن اللہ تعالیٰ کسی کی محنت کو رائیگاں نہیں کرتا۔ ان شاء اللہ کبھی نہ بھی آپ کو اپنی محنت کا پورا اجر ضرور ملے گا۔ آئندہ خط لکھ کر نہ پھاڑیے گا۔ ”نورا“ پوسٹ کر دیجئے گا۔

سائزہ ارم لکھتی ہیں۔

پنجاب کے ایک چھوٹے سے گاؤں میں رہتی ہوں اور لی اے کر رہی ہوں۔ شعاع اور خواتین کو کب پڑھنا شروع کیا، کچھ یاد نہیں۔ حمد و نعت کے بعد سب سے پہلے سمیرا حمید کو پڑھا۔ سمیرا جی ویری گڈ، مگر پلیر بھی کبھاڑ چھہ ہا کھلکا بھی، کیونکہ آپ کی تحریریں پڑھ کے میں سب سے پہلے یہ سوچتی ہوں کہ سمیرا جی کے ارد گرد کیا سب اتنے سنجیدہ لوگ بستے ہیں کہ یہ لڑکی بھی دل کھول کے نہ ہنسی۔ نبیلہ عزیز کی تو بات ہی نہ کریں۔ ہمارا نبیلہ جی کی وجہ سے جھگڑا ہو جاتا ہے کہ اب ڈائجسٹ پہلے کون پڑھے۔ افسانے ابھی سارے پڑھے نہیں۔

چک 108 شمالی سرگودھا سے ہاشیراز تشریف لائی ہیں
لکھا ہے -

”اک لمحہ“ میرے خیال سے 7 اچھے لوگوں کو یہ پڑھ کے عقل آجانی چاہیے۔

پیارے ہمارے! ہمیں بے حد افسوس ہے کہ آپ کے خط
آخر سے ملنے کے باعث شامل نہ ہو سکے اور آپ کو مایوسی
ہوئی۔ آپ کی کہانی ابھی پڑھی نہیں گئی۔

اقصیٰ بتول نے نیا لاہور سے لکھا ہے

واہ بھی اس بار تو ناٹل بے حد خوب صورت تھا۔
سب سے پہلے مثال صاحب کی طرف نیچے۔ اف رخسانہ جی
کیا غضب کر دیا آپ نے۔ مائیں ایسا کیوں کرتی ہیں۔ پہلے
تو خود ہار کر لائی ہیں، پھر خود ہی برباد کر دیتی ہیں۔ دوسرا
پراسرار کرکٹر موفیعد مثال کا ہے۔ رقص مثل نارمل چاربا
ہے۔ شکر ہے ”ویک زوہ محبت“ میں بھی کوئی بل جل
ہوئی۔ بارہ رنگوں کا سوٹ بہت سبق آموز لگا۔ اک رات کا
رنگ، مہربان علی نے خوب لکھا ناظمہ عذرا کی نوک
جھونک نے مزید۔ محبت جیت کی صورت کچھ خاص نہیں
لگا۔ رانا موضوع تھا۔ ایسی کمائیوں میں کبھی ٹیشن زدہ
شخص کو شراب نوشی یا کچھ اور غلط کام پر بہت نارمل انداز
میں دکھایا جاتا ہے۔ جبکہ لفظ کچھ ایسے ہونے چاہئیں کہ
سننے والے، پڑھنے والے کو اس کام سے نفرت محسوس ہو۔
سیدھے اقبال نے اچھا لکھا۔ سادہ لفظوں میں گہری صیحت
کر سکیں۔ موش افتخار آپ نے بھی بہت پیارا لکھا۔
صوفیہ سرور آپ نے تو رادیا۔

میرے پاس شاید لفظ نہیں کہ اس درد کو بیان

کہوں جو میں نے دل و روح کی گہرائی سے محسوس کیا۔ در
اور دیوارِ شیاؤں نے بھی بہت اچھا لکھا شبِ بے خود و خود اللہ
نے مقرر کی ہیں۔ ان سے تجاوز کا نتیجہ غلطی نکلتا ہے اور
بے باری ہے۔ سیرا امید کی۔ سیرا جی بے حد بے حد
خوب صورت لکھ رہی ہیں آپ۔ خدا کرے زورِ قلم اور
ایادہ اور سائبرضا آپ کو کھرہ ہیں؟

یہ پیری اہلیاں افسوس ہے کہ کچھلی بار صفحات کی مجبوری کی وجہ سے آپ کا خط شامل نہ کر سکے۔ شراب شہی حرام ہے اور اسلام میں کسی بھی نشہ کی کوئی گنجائش

قسمت کا احوال بتانے کا کوئی بھی سلسلہ ہم شروع نہیں کر سکتے۔ ہمیں اس پر یقین نہیں ہے۔ قسمت کا حال نہ کوئی جان سکتا ہے نہ پاسکتا ہے۔ اور نہ کوئی ہوئی کو ٹال سکتا ہے یہ صرف اللہ کو معلوم ہے۔ اندر کا گاندھی نے سولہ جموں ملازم رکھے ہوئے تھے جو روزانہ اسے ستاروں کی چال بتاتے تھے، لیکن ان سولہ نجومیوں میں سے ایک بھی یہ نہ پاسکا کہ اس کے باؤں گاؤں کے دست میں ایک آدمی اس کے لیے غلط ارادے رکھتا ہے اور ایک دن وہ اس کے ہاتھوں قتل ہوگی۔ اس کا بیٹا بچے کا گاندھی ایک تقریب میں بم بلاسٹ ہونے سے مارا گیا۔ تو آپ خود موجود ہیں اس علم کی کیا حقیقت ہے۔

سدرہ بتول ملتان سے شریک محفل ہیں، لکھا ہے

سب سے پہلے ”ایک نئی مثال“ پر تبصرہ کروں گی اتنا
 بداد فیصلہ کر لیا عدل نے جس میں بہت دھڑکا ہوا۔ کیا عدل کو
 اپنی ماں اور بہن کا بالکل بے ایمان ہونا ”چڑیا بنی ہو گیا۔
 بیلہ عزیز کا رقص مکمل بھی تھا رہا ہے اور محبت من
 حرم میں تو ہمیں یوں لگا جیسے کسی گارمنٹ فیکٹری میں
 آگئے اور پھر فrazم کی شادی سچ میں اچھی قطعہ تھی اس
 فعد۔ محبت جیت کی صورت ایک ٹیکسیک اسٹوری تھی
 اہمال ہیرو، ہیروئن شروع میں ایک دوسرے کی شکل دیکھنا
 بھی گوارا نہیں کرتے اور بعد میں ایک دوسرے کے علاوہ
 کوئی نظریہ نہیں آتا، لیکن جلیں کوئی نہیں۔ ناٹ بیڈ۔

”دیکھ زہ محبت“ بھی اچھی جا رہی ہے، لیکن بہت سلو بھی۔ سیکنڈ اور ڈاکٹر خاور کے درمیان آنکھ مچولی کب

مک پی پی۔ اساتذہ کو ہر دفعہ ایک سے بڑھ کر ایک ہونا
سے بارہ رنگوں کا سوٹ بہت اچھا تھا۔ اس کے علاوہ مصباح

ملی کا فائدہ بھی بہت مزے کا تھا۔ ”کلمہ کو بیانی“ آپ کو
 ایک بات بتاتی ہوں میری ایک فریڈ نے اپنے گھر والوں
 سے کہا کہ چیز ایک لغت ہے اس لیے آپ کو مجھے چیز
 میں دینا چاہیے اور نہ یہ لغت میں اپنے ساتھ لے کر
 جاؤں گی تو اس غمے والدین نے کہا کہ یہ لغت نہیں لے کر
 جاؤ گی تو سرال میں زیادہ لغت ملامت ملے گی۔ ”دراور

یو ار "ایک لمحہ" جی بہت اچھے تھے۔ اس دفعہ انٹرویو کی
کا بھی اچھا نہیں تھا۔ (بہت معذرت کے ساتھ)۔

ج۔ سدرہ! ہر سلسلے کے لیے بھجوانے کے لیے صفحے پر
سلسلے کا نام لکھ دیں تو اچھا ہے ورنہ ضروری نہیں ہے

ج۔ سارہ! آپ نے خط لکھا، بہت خوش ہوئی اور اس سے زیادہ خوشی یہ جان کر ہوئی کہ آپ گاؤں میں رہ کر بی اے کر رہی ہیں اگر کسی وجہ سے خط یا دوسری کوئی تحریر شائع نہ ہو تو اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ مایوس ہو جائیں۔ خط شائع نہ ہونے کی کوئی بھی وجہ ہو سکتی ہے۔ شعلہ کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔

نوشابہ اکبر نے مٹھیال انکس سے شرکت کی ہے
ملکتی ہیں۔

ہمارے گاؤں میں ایک ہی دکان ہے جہاں سے شعاں بڑی مشکل سے ملتا ہے۔ خالدہ ثار کا نابل ”صحبتِ بیت کی صورت“ بہت اچھا تھا۔ سروق پر ماڈل بہت اچھی لگ رہی تھی۔ پیارے نبی کی پیاری باتیں پڑھنے سے ایمان تازہ ہو گیا، تیری ایک چھوٹی سی ریکولٹ بھی ہے ایف ایم 101 کے آر جے حسین رضا کا انٹرویو بھی شامل کریں۔ مہوش افتخار کا ”میرے ہم سفر“ دل کو بھرا گیا، افسانے تو سب اچھے تھے لیکن ”مصباح علی“ کا افسانہ ”رات کا رنگ“ اور ”صوفیہ سرور“ کے افسانے بہت اچھے لگے۔ رابعہ بھری! آپ نے تو میری ہی اسٹوری لکھ دی۔ آپ کے بارے میں بڑھ کر بہت خوشی ہوئی۔

ج۔ نوشاہی! شعلہ کی بزم میں خوش آمدید۔ ہمیں اندازہ ہے۔ شعلہ حاصل کرنے کے لیے آپ کو کئی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا ہوگا۔ شعلہ کی کامیابی کا راز آپ لوگوں کی محبتیں ہی تو ہیں۔ آئندہ بھی خط لکھ کر اپنی رائے سے آگاہ کرنی رہے گا۔

اقراء نے لیہ سے شرکت کی ہے، لکھتی ہیں۔

رقص بکل بہت اچھا ناول ہے محبت من محرم کچھ خاص نہیں لگا اور میرا پسندیدہ ناول دیکم زدہ محبت ہے افسانوں میں کا ہے کوہیابی صوفیہ سرور نے تو مجھے رلا ہی ڈالا۔ ایک اور سلسلہ شروع کرویں ستاروں سے قیمت کا حال جس میں ہم سوالات بھیج کر اپنے مستقبل کے بارے میں جان سکیں۔

ج۔ پیاری اقراء شعاع کی محفل میں خوش آمدید جو لوگ
کوشش کرتے ہیں، اللہ تعالیٰ انہیں کامیابی دیتا ہے۔ آپ
ذہمت کی، آپ کا خط شامل ہے۔

شعاع کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔ ستاروں کے ذریعے

ملتان سے تواتر، اور انجمن اور اذیت خاں و انجمن کے تحت شائع ہونے والے ہر چوں اہل شائع کرنا میں شائع ہونے والے ہر تحریر کے حقوق طبع و نقل، جو ادارہ محفوظ ہیں۔ کسی بھی فرد یا ادارے کے لیے اس کے کسی بھی حصے کی اشاعت یا کسی بھی وی چینل پر ڈیڑا اور مالی تکفیل اور سلسلہ وار قطعہ کے کسی بھی طرح کے استعمال کے لیے پبلشرس تحریری اجازت لینا ضروری ہے۔ یہ صورت دیگر ادارہ یا قانونی چارہ جوئی کا حق رکھتا ہے۔



”علیشہ! آپ کے بارے میں سنا ہے کہ آپ کم عمری میں ہی اس فیلڈ میں آئی تھیں؟“

”جی بالکل ٹھیک سنا ہے آپ نے۔ میں تقریباً دس یا گیارہ سال کی تھی تو مجھے ایک کمرشل کی آفر آئی تھی۔ گھر والوں نے بڑی مشکل سے اجازت دی کیونکہ ہمارا تعلق پٹھان گھرانے سے ہے اور ابھی کام کی ابتدا ہی ہوئی تھی کہ پشاور میں مل جوتا پڑا۔ ہم تقریباً چار سال پشاور رہے۔“

”شوہر کی دنیا سے تو کٹ آف ہو گئی ہوں گی آپ؟“

”جی بالکل۔۔۔ سمجھئے کہ چار سال کا گپ آگیا۔ پھر جب چار سال کے بعد واپس آئی تو ”گپ“ نی دی پر اپلائی کیا۔ مجھے ”وی جے“ کے لیے منتخب کر لیا گیا اور میں نے ”فائزور کس“ کے نام سے میوزک کا پروگرام کیا۔ اس پروگرام نے بھی مجھے بہت پہچان دی۔ بس تو پھر جب ”وی جے“ سے دل بھر گیا تو اداکاری کی طرف آگئی۔“

”اور جب اداکاری سے دل بھر گیا تو؟“

”تو کچھ بھی نہیں۔۔۔ گھر بیٹھ جاؤں گی۔ ویلے اداکاری سے دل نہیں بھرے گا۔ کیونکہ اداکاری میں ورائٹی بہت ہے۔ جس کام میں یکسانیت ہو دل اسی سے بھرتا ہے۔“

”کچھ اپنے بارے میں بتائیں؟“

”سب کو سب کچھ بتا رہے ہیں۔ میرے بارے میں اور میری بہنوں کے بارے میں۔ چلیں! پھر بھی بتا دیتی ہوں کہ 16 ستمبر 1985ء کو پید ہوئی۔ اصل نام صائمہ تھا۔ مگر میوزک کے بعد نام تبدیل کر لیا۔ بس ایسے ہی۔۔۔ پٹھان قبیلے سے تعلق ہے۔ بھائی کوئی نہیں ہے۔ بس ہم چار بہنیں ہی ہیں اور ہم تین بہنیں اسی فیلڈ میں ہیں۔ میں نے بی ایس سی تک تعلیم حاصل کی ہے۔“

”اور شادی؟“

”جی میری شادی 2009ء میں ”رعیان“

حصار میں ہیں؟“

”ارے نہیں! لیکن وہ میری زندگی کا ایک بہترین رول تھا۔ بیوہ خواتین کے مسائل اور ان کی خواہشات پر مبنی تھی۔ جب میں نے یہ ڈراما کیا تو میری شادی گودو ہی سال ہوئے تھے تو گھر والوں نے اور خاص طور پر میرے شوہر اور میری ساس نے بہت مائنڈ کیا تھا کہ میں نے اس قسم کا رول کیوں کیا اور جب یہ سیریل آن ایر آتا تھا تو نہ گھر والے دیکھتے تھے اور نہ ہی سسرال والے خیر۔“

”آپ کو احساس ہوا کہ آپ نے ایک غلط وقت میں اس رول کا انتخاب کیا؟“

”اللہ تعالیٰ میرے شوہر کی لمبی عمر کرے۔ میں جب بھی یہ رول کرتی۔ گھر والوں کا ریاکشن یہی ہوتا کہ

دستک دستک

شہناز رشید

کیوں کیا۔۔۔ لیکن میں سمجھتی ہوں کہ آرٹسٹ کو ہر طرح کے رول کرنے چاہئیں۔ آرٹسٹ خود تو ویسا نہیں ہوتا۔ وہ تو رول کے اندر ہوتا ہے۔“

”اپنے اور کن کرداروں کو یادگار کیسں گی؟“

”نہیں سمجھتی ہوں کہ میں نے اب تک جتنا بھی کام کیا ہے۔ وہ سب یادگار ہی ہے۔ کیونکہ اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ میرے تمام سیریلز ہٹ گئے ہیں۔ خواہ وہ ”اک نظر میری طرف“ ہو۔ ”میں عبدالقادر ہوں چاند پر دستک“ آذر کی آئے گی بارات“ ہو یا ”میرے چارہ گر“۔ ”یعنی کی آئے گی بارات“ ہو ”تہائیاں“ ”وہی کزیاں“ اور ”میرے درد کو جو زیاں ملے“۔ سب ہی بہت ہٹ گئے اور سب میں ہی میرے کردار کو پسند کیا گیا۔“



علیشہ

”کیا حال ہیں جی۔۔۔ اور کہاں عتاب

ہیں؟“

”بالکل ٹھیک۔۔۔ اور کچھ گھریلو ذمہ داریوں کی وجہ سے غائب ہوں۔ لیکن ایسا نہیں ہے کہ میں نے فیلڈ سے کنارہ کشی اختیار کر لی ہے۔ بلکہ بہت جلد آپ کو اسکرین پر نظر آؤں گی۔“

”سنائی تھا کہ آپ نے فیلڈ چھوڑ دی ہے؟“

”نہیں! نہیں! ایسا ہرگز نہیں ہے۔ میں نے بتایا نا کہ کچھ گھریلو ذمہ داریاں تھیں اور پھر ایسا کوئی رول ملا بھی نہیں کہ فوراً قبول کر لیتی۔“

”اک نظر میری طرف“ کے بعد آپ کا کوئی قابل ذکر سیریل نظر نہیں آیا۔ کیا ابھی تک اسی رول کے

درانی“ سے ہوئی۔ میری پسند کو گھر والوں نے بھی پسند کیا اور دونوں گھرانوں کی رضامندی سے ہماری شادی ہوئی۔“

”میاں صاحب آپ کے کام کو پسند کرتے ہیں؟“

”جی بہت۔۔۔ میں ان کی اجازت سے اس فیلڈ میں مسلسل کام کر رہی ہوں۔ لیکن ساتھ ساتھ مجھے اپنی گھریلو ذمہ داریوں کا بھی احساس ہے اور میری پہلی ترجیح میرا گھر ہے۔ کھانا میں زیادہ تر خود ہی پکاتی ہوں کیونکہ مجھے کوئنگ کاشوق ہے۔“

”ہوں گئے اب جب آپ کا نیا سیریل آئے گا تو تفصیلی بات کروں گی۔“

”جی ضرور۔۔۔“

صنم بلوچ

”کیسی ہو صنم۔۔۔ اور آج کل تمہارا مارننگ شو تو اچھا جا رہا ہے۔ لیکن اگر ڈراموں کی بات کریں تو ”کنگر“ بہت اچھا جا رہا ہے۔ کیا ریسپانس مل رہا ہے؟“

”بہت اچھا۔ بہت پسند کیا جا رہا ہے۔ بلکہ میں

جہاں جاتی ہوں۔ اسی پہ بات ہو رہی ہوتی ہے۔“

”اچھا کٹھن۔ کیا رائے ہے لوگوں کی؟“

”مختلف لوگوں کی مختلف رائے ہے۔ کوئی کرن (ڈرائے کا کردار) کو برا کہہ رہا ہے تو کوئی سکندر کو برا کہہ رہا ہے۔ ملی جلی رائے ہے ویسے زیادہ تر لوگ تو ”تم کیا کہتی ہو؟“

”دیکھیں! جہاں لڑکی اسٹرائگ ہوتی ہے۔ بڑھی لکھی ہوا اور یہ سمجھتی ہے کہ میں اپنا بوجھ خود اٹھا سکتی ہوں تو وہاں لڑکی کی یہ اکثر ٹھیک ہے۔ مگر جہاں لڑکی کمزور ہوتی ہے۔ وہاں وہ ہر بات کو برداشت کرنے پر مجبور ہو جاتی ہے اور پھر یہی مجبوری مرد کو مزید خراب کرتی ہے۔“

”گویا اسٹرائگ لڑکی کو طلاق لے کر گھر بیٹھ جانا چاہیے؟“

”طلاق کا فعل برا ہے۔ صلح کی جستجاش رکھنی چاہیے اور دونوں کو بیٹھ کر یہ فیصلہ کرنا چاہیے کہ ہمیں اپنی آئندہ زندگی میں کیا کرنا ہے اور کن اصولوں کے تحت زندگی گزارنی چاہیے۔“

”خیر بولتے ہیں کہ اس سیریل کا کیا اختتام ہوگا؟“

”ہاں! ضرور دیکھیے گا۔ عمیرہ احمد بہت بڑی رائٹر ہیں۔ کوئی نہ کوئی پیغام ضرور ہوتا ہے ان کی تحریروں میں۔ وہ میری پسندیدہ رائٹر ہیں۔“

”اور آج کل کیا کیا پروجیکٹس زیرِ تکمیل ہیں اور کیا کیا تکمیل کے مراحل طے کر چکے ہیں؟“

”بس جی! کچھ زیرِ تکمیل بھی ہیں۔ کچھ مکمل بھی ہو گئے ہیں۔ کام اتنا ہی کرتی ہوں۔ جتنا آسانی سے کر سکوں۔ کیونکہ مارٹنک شو بھی کرنا ہوتا ہے تو پھر اتنا ٹائم نہیں دے پاتی۔“

”تم نے ایک بار کہا تھا کہ مارٹنک شو کی وجہ سے میں ڈراموں کو وقت نہیں دے پاتی۔ اس لیے تم نے مارٹنک شو کو خیر یاد کہہ دیا تھا۔ پھر دوبارہ جوائن کرنے کی وجہ؟“

”اس لیے کہ ایک تو مجھے مزہ لگ گیا تھا مارٹنک شو کا اور دوسری بات یہ کہ میں ڈراموں میں کم کام کرتی ہوں۔ مگر بہت سوچ بچار کے بعد۔ ایک کے بعد ایک ڈراموں میں آکر لوگوں کو پور نہیں کرنا چاہتی۔ میری خواہش ہوتی ہے کہ لوگ میرا نام بڑھتے ہی یہ سوچنے پر مجبور ہو جائیں کہ اس سیریل میں مصمم ہے تو سیریل یقیناً ”اچھا ہی ہوگا۔“

”مطلب کیسے اندازہ ہوتا ہے کہ تمہارا کردار ہٹ جائے گا؟ رائٹر کا نام پڑھ کر یہ صرف اپنا کردار پڑھ کر؟“

”نہ رائٹر کا نام پڑھ کر نہ اپنا کردار پڑھ کر۔ بلکہ میں پوری کہانی پڑھتی ہوں۔ اس میں اپنا کردار دیکھتی ہوں اور پھر مطمئن ہو کر کام کرنے کی ہائی بھرتی ہوں۔“

”رائٹر تمہارے کام سے مطمئن ہوتی ہیں؟ کبھی کسی نے خود سے کہا کہ آپ اچھا کام کر رہی ہیں؟“

”جی! عمیرہ احمد خود سے فون کر کے مجھے کہتی ہیں کہ تم اچھا کام کر رہی ہو۔ تب دل بہت خوش ہوتا ہے اور مزید اچھا کام کرنے کو بھی دل چاہتا ہے۔ پھر مزین جبار کی بھی عادت ہے کہ وہ میری بہت حوصلہ افزائی کرتی ہیں۔“

”صمیم! تمہیں بولڈ کرداروں میں نہیں دیکھا۔ آفرز نہیں آئیں یا تمہیں پسند نہیں ہیں؟“

”آفرز تو بہت ہوتی ہیں۔ لیکن میری طبیعت کا حصہ نہیں ہے بولڈ ٹس۔ مطلب میں ویسے بہت بولڈ ہوں۔ مگر لباس کے معاملے میں نہیں۔ مجھے تو بغیر آستین کے کپڑے پہننے بھی پسند نہیں ہیں۔ بہت مشرقی ٹائپ کی لڑکی ہوں۔“

”اچھا! تو پھر کیا شادی کے بعد شو بزنس چھوڑ دیں گی؟“

”نہیں نہیں۔ شو بزنس تو میں اب بھی کم ہی آتی ہوں اور بہت ڈسٹنٹ رول میں۔ لیکن اگر میرا شریک سفر کے گاہک کام نہیں کرو تو نہیں کروں گی۔ کیونکہ مجھے گھر میں رہنا اور گھر واری کرنا بھی بہت اچھا لگتا ہے۔ گھر میں ہوتی ہوں تو بہت ساوگی کے ساتھ

خون کی
خون
نظام
دوران
طالب

بغیر میک اپ کے رہتی ہوں۔
”پوارڈلے تمہیں؟“

”جی ڈراما سیریل ”دستان“ میں بہترین اداکارہ کا
نکس ایوارڈ پاکستان میڈیا کا ایوارڈ 2011ء میں
اور پی بی ای ایوارڈ بھی مل چکا ہے۔“
”شہرت مسئلہ بنتی ہے؟“

”نہیں! کیونکہ سرسوار نہیں کیا۔ کبھی مسئلہ بنی تو
شوہر کو خود حافظ کہہ دوں گی۔“

مایا علی

”کیسی ہیں جناب؟“
”اللہ کا شکر ہے۔“

”اک نئی سنڈریلا“ کے بعد ایک بار پھر آپ
اسکرین پہ چھائی ہوئی ہیں۔ بہت اچھا پر فارم کر رہی
ہیں ”کھویا کھویا چاند“ میں۔“

”شکریہ۔ لوگ بھی تعریف کر رہے ہیں تو اچھا لگ
رہا ہے۔ محنت وصول ہو جاتی ہے۔“
”اک نئی سنڈریلا“ کے بعد آپ غائب کہاں ہو گئی
تھیں؟“



”اچھا ہے ٹائپ دینا۔ لوگ یاد تو کریں کہ ”مایا
علی“ اتنی تھی کسی ڈرامے میں۔ اب نظر نہیں آتی۔۔۔
اب گپ کے بعد آئی ہوں تو لوگوں نے بہت پسند کیا
ہے اور مجھے خود بھی اچھا لگ رہا ہے۔“

”گپ کی وجہ کیا تھی؟“
”کوئی خاص نہیں۔ ریکارڈنگز چل رہی تھیں۔
بس اسی لیے گپ آگیا۔ اچھے کردار ملتے رہیں گے تو
ان شاء اللہ آپ سب کو نظر آتی رہوں گی۔“

”اچھے کردار کا کیا پیمانہ ہے آپ کی نظر میں؟“
”وہ کردار جس پر کہانی میں (Base) کرنی ہو۔ پھر
میری ایک بہت ہی اچھی سماجی فنکارہ صنم بلوچ نے
ایک بے کی بات مجھے بتائی ہے کہ کردار کو قبول کرنے
سے پہلے اسکرپٹ کا مطالعہ ضرور کر لیا کرو۔ کیونکہ اسی
سے اندازہ ہوتا ہے کہ جو کردار آپ کو آفر ہوا ہے
اس میں کتنی جان ہے۔ بس میں نے یہ بات گہ سے
باندھ لی ہے۔“

”آپ نے ایک انٹرویو میں بتایا تھا کہ جب آپ
اس فیلڈ میں آئیں تو والدین راضی نہیں تھے۔
کیوں؟“

”والدین نہیں صرف والد۔ امی تو ہمیشہ سے
چاہتی تھیں کہ میں اس فیلڈ میں آؤں اور انہی کی
سپورٹ کی وجہ سے ہی تو میں اس فیلڈ میں آئی ہوں۔
مجھے یاد ہے کہ ”ماس کیونیکشن“ کی طالبہ ہونے کی
وجہ سے ایک نیوز چینل میں انٹرن شپ کی تو اسی چینل
سے ایک پروگرام کی میزبانی کی آفر آئی اور میں نے
اس پیشکش کو قبول کر کے چند پروگرام کیے تو والد
صاحب نہ صرف خالص ناراض ہوئے۔ بلکہ انہوں
نے کئی دن تک مجھ سے بات بھی نہیں کی۔“

”اچھا۔ مگر اب تو والدین چاہتے ہیں کہ ہمارے
بچے اس فیلڈ میں آئیں۔ کیونکہ اب تو یہ فیلڈ بھی

باقاعدہ ایک ”پروفیشنل“ فیلڈ ہے؟“
”جی جی بالکل۔ مگر یہ نہیں۔ کیونکہ والد صاحب

کو کچھ اعتراض تھا۔ خیر! پھر سب کے کہنے پر اور اس
بات پر کہ آپ کو کبھی شکایت کا موقع نہیں دوں گی۔
والد صاحب مان ہی گئے اور اب وہ خالص خوش ہیں
میرے اس فیلڈ میں آنے پر۔“

”کیا آپ اپنے خاندان کی پہلی لڑکی ہیں جو اس
فیلڈ میں آئی ہیں اور آپ کو مشکلات کا سامنا کرنا پڑا؟“
”جی۔۔۔ میں پہلی لڑکی ہوں، جو اس فیلڈ میں آئی
ہوں۔ اسی لیے مجھے مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ اب اگر
کوئی اور اس فیلڈ میں آتا چاہے گا تو میرا نہیں خیال کہ
اسے کسی بھی قسم کی مشکل ہوگی۔ کیونکہ میری مثال
سامنے ہوگی سب کے۔“

”کھویا کھویا چاند اور اس سے پہلے ”اک نئی
سنڈریلا“ ملک کے پہاڑی مقامات پر عکس بند کیا گیا۔
کیا محسوس کیا اپنے ملک کے بارے میں؟“

”بھئی کہ اپنا ملک بہت خوب صورت ہے، ہم
دوسرے ملکوں کی خوب صورتی کی تعریف کرتے ہیں
جبکہ ہمارا ملک خوب صورتی سے بھرپور ہے۔“ ”اک
نئی سنڈریلا“ میں جتنے خوب صورت مناظر میں نے
اپنے ملک کے دیکھے۔ اپنی لائف میں کبھی نہیں دیکھے
تھے اور ان مناظر کو دیکھ کر ہی مجھے اندازہ ہوا کہ ہمارا
ملک کتنا خوب صورت ہے۔“

”کن مقامات پر یہ شوٹ ہوا تھا؟“

”مری کی اور راولا کوٹ کی خوب صورت وادیوں
میں۔ سچ بہت موزا تھا۔ پہلا سیریل اور اتنی حسین
اور دلکش جگہیں۔ کبھی نہیں بھول پاؤں گی اس سیریل
کو اور ان حسین مناظر کو جن میں ہم نے شوٹ کیا۔“

”محنت سے سب کچھ حاصل ہوا ہے یا قسمت
سے؟“

”میرا خیال ہے کہ محنت سے ہی سب کچھ حاصل
ہوتا ہے۔“

کرن

ماہنامہ

نومبر 2013 کا شمارہ شائع ہو گیا

✽ ”فیضان خواجہ“ سے شامین رشید کی ملاقات،

✽ ”میری بھی سننیے“ میں شبیو شریف کی باتیں،

✽ ”آواز کی دنیا“ سے عظمیٰ بلوچ کی گفتگو،

✽ ”مقابلہ آئینہ“ میں سونیا ربانی،

✽ نبیلہ عزیز اور فوزیہ یاسمین کے ڈانز کی اقسام،

✽ شفیق الحق رفرخ بخاری، فاطمہ گل، فرحین انظر اور فرحت عمران کے

کمل ناول،

✽ سدید عزیز آفریدی، رحیمانہ بخاری، سدرۃ المنتہی مصباح نوشین

اور لکھی طاہر کے ناول،

✽ سیدہ خواجہ، بشری احمد، نورین، صابرہ نصیر احمد کے افسانے

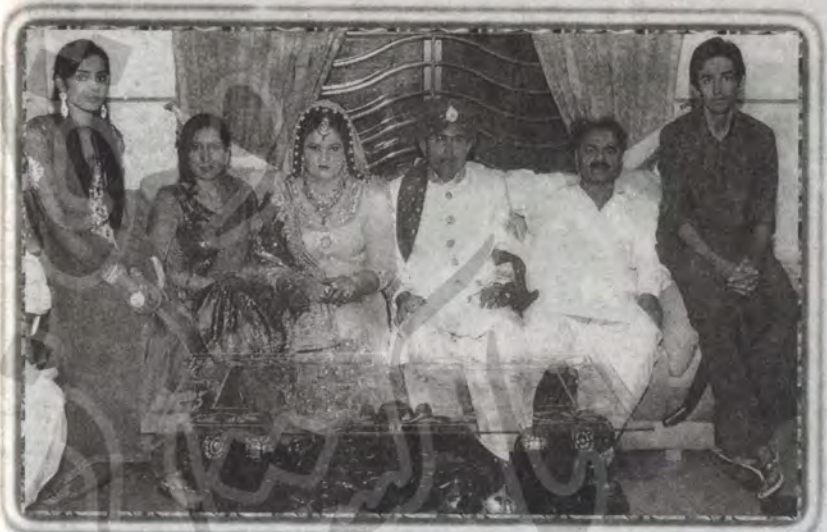
اور مستقل سلسلے،

اس شمارے کے ساتھ کرن کتاب

کرن کتاب

”طلب نبوی ﷺ سے علاج“

کرن کے ہر شمارے کے ساتھ کرن کتاب حصہ سے مفت قریش خدمت ہے۔



شادی مبارک ہو

عذبین ہرگز عدلی گوندل
ترجینہ ہرگز عدلی صر عباس

بُشری گوندل

طرحِ عنبرین کیا انجوائے کرے گی عصر کی شادی کو۔۔۔ مگر ہماری تجویز کو نامعقول قرار دے دیا گیا اور شادی کی ڈیٹ فکس ہو گئی۔ پھر سب کی دوڑیں لگ گئیں۔ انہی بازیہ (عنبرین کی ساس) جب بھی آتیں مجھ سے پوچھتی۔ ”تم نے اپنے جوڑے بننے کے لیے دے دیے ہیں؟“ اور میں ہنس دیتی۔ ”کمال۔۔۔ ابھی بری اور جینز کی خریداری تو مکمل ہو جائے پھر دیکھیں گے۔“ ”میرا تو مشورہ ہے کہ پہلے ہم لڑکیاں لڑکیاں جا کے اپنے ڈرمسز کے آرڈر دے آئیں۔“

خوشیاں بعض اوقات بے پاؤں اور بہت آہستہ آہستہ دل کی دہلیز کو چھونے لگتی ہیں اور گھر کے دیواروں پر بھی ان خوشیوں بھرے لمحات کو بڑی دیر تک محسوس کرتے رہتے ہیں اور جب شادی کے شادیانے بجتے ہیں پھر تو خوشیوں کا انداز ہی نرالا ہوتا ہے، رنگ ہی جدا ہوتے ہیں، بہت دیر تک رہنے والے سچے اور کپے رنگ۔!

قارئین کرام۔۔۔ آج میں نے آپ سے شیئر کرنی ہے میری مند اور میرے دیور کی ایک ہی دن بھگتائی جانے والی شادی کی گہما گہما۔۔۔ حالانکہ ہم نے بہت رولا ڈالا کہ کچھ دنوں کا درمیان میں وقفہ رکھ لیں۔ اس

”ماما! آپ لڑکی ہیں کیا۔۔۔؟“ شہرینہ حیران ہو کر پوچھتی۔
”تو اور کیا! میں کہیں سے ساس لگتی ہوں؟“ اور میں جلدی سے نفی میں سر ہلاتی کہ وہ اتنی بیک اسمارٹ اور ایکٹو ہیں کہ جوان بچوں کی ماں نہیں لگتیں اور پھر۔۔۔ دل انجو کینڈا، ڈینٹ اور بہت نفیس طبیعت کے حامل عدیل بھائی اور بھی ساری خوبیوں کے مالک ہیں۔

میں تو بر ملا عنبرین سے کہتی ہوں کہ ”وہ تمہاری کسی نیکی کا صلہ ہیں، قدر کرنا ان کی۔“
”آپ نے بشری باجی ہماری شادی کی مبارک باد کوئی نہیں دی۔“ عدیل بھائی جب بھی آتے ہیں ہشکوا کرتے ہیں۔ میں اگرچہ ان کے اصرار کو بہ خوبی سمجھ رہی تھی کہ وہ ڈائجسٹ کے ذریعے مبارک بادی وصول کرنا چاہتے ہیں لیکن میں کنفیوژ تھی کہ دو شادیوں میں دو نمائندگیوں سے کس طرح احاطہ و تحریر میں آؤں۔ کون سی بات رہنے دوں، کون سی بتاؤں، کس کا ذکر گول کروں کس کو ہائی لائٹ۔

علیحدہ باجی کی دن رات کی بھاگ دوڑ۔۔۔ میرے میاں خوشنود صاحب کے چھوٹے سینے۔۔۔ عمران بھائی کی مقطع سے واپسی۔

عنبرین کی فرینڈز یعنی اور صبا دوپہر کو اس وقت آگئیں جب عنبرین پارلر جا چکی تھی۔ میں نے بھی ڈھولک ان کے سامنے رکھ دی کہ۔ ”لو رات کے لیے ہر سہل کرو۔ لوگ کہتے ہیں دور کے ڈھول سہانے لیکن قریب بجتے بھی اتنے ہی سہانے لگتے ہیں۔“ مجھے زبردست تاکید کی گئی تھی کہ تمہیں مہمانوں سے پہلے ہال میں موجود ہونا چاہیے، کیونکہ میں گھر کی بڑی بوسہ مختصر اور عنبرین کی اگلاؤنی بھابھی ہوں۔ جبکہ محسن اور زاہد کی شادی پر تو تہینہ بھی ساتھ ہو گیا ان شاء اللہ اور میں جلدی کرتے کرتے بھی جب ہال میں پہنچی تو کافی مہمان آچکے تھے۔ کمرے کی آنکھ روشن ہوئی تو میں تیار ہوئی کہ دو چار فوٹو ہالوں۔ یادگار کے طور پر،

کہ علیحدہ باجی (کزن) نے مجھے کھینچ لیا۔
”شرم کرو، تمہیں تصویریں بنوانے کی بڑی ہے اور مہمان ہال میں انٹرو ہو کر خود اپنے لیے نشستیں ڈھونڈ رہے ہیں۔“
”کیوں، نشستیں گھونگی ہیں کیا؟“ میں بدحواس ہو کر پلٹی کیونکہ میری ساری توجہ اب بھی کمرے کی گہری و شوخ آنکھ پر تھی جو کسی اور جانب متوجہ ہو چکی تھی۔

”لا حول ولا یقہ کوئی قوی اسمبلی کی نشستیں تھوڑی ہیں کہ ایک بار اگر کھو گئیں تو پھر پانچ سال کے بعد پلٹیں گی۔“ میں ہیرا لئی اور کچھ دیر کے لیے کمرے کو بھول بھال کر مہمانوں کی طرف بڑھ گئی۔
”واہ بھئی، بڑی پیاری لگ رہی ہو۔“

لوگوں نے میری تعریف کی۔
میں نے دل میں شکر ادا کیا کہ فیشن وغیرہ کا رزلٹ یقیناً ”اچھا ہی آیا ہے چلو شکر ہے“ میرے پورے ہو گئے لیکن ایک ویٹر نے آکر میری کنگ کا فیشن اور میک اپ کا سٹائپس کرتے ہوئے میرے جوان جہان ارمانوں پر ہل ڈال دیا۔

”آئی جی! مبارک ہو۔“ وہ کوک لے کر آیا اور سب کی ہنسی کے فوارے چھوٹ گئے۔ اقرا، روبینہ، مریم، صائمہ، ربیعہ، سمیرا، کلثوم۔۔۔ سب دانت نکال رہی تھیں اور میں ہانکا کھڑی تھی۔
”آئی جی! پانچ سو کا نوٹ نکالیں، وہ بے چارہ کب سے کھڑا ہے۔“ وہ باقاعدہ مذاق اڑانے لگیں۔
”تم لوگ اپنے حسن کا صدقہ دے دو منھنی کا کیاں!“ میں جل گئی مگر وہ بھی ڈھیٹ تھا، پانچ سو کا نوٹ لے کر ہی ملا۔

عصر بھائی اور عنبرین کو مہندی کی رسم کے لیے پھولوں اور لونوں کی برسات میں اسٹیج پر بٹھایا گیا۔ دونوں ہی پیارے لگ رہے تھے۔ عصر بھائی نے اسی سال فریضہ حج ادا کیا تھا چنانچہ ان کے چہرے کا نور سب کو متاثر کر رہا تھا۔ دونوں بہن بھائی ساتھ ساتھ بیٹھے

بہت شاندار لگ رہے تھے اور او اس بھی۔ سب کی آنکھیں جھپک جھپک کر خوشی کے اس اہم موقع پر اسی ابو نہیں ہیں۔ ماں باپ کی کی تو پوری زندگی ہی محسوس ہوتی ہے اور اس گلی کو کوئی بھی رشتہ پورا نہیں کر سکتا۔

سرال کی طرف سے آئے پہلے جوڑے اور پھولوں کے خوشنما گنوں میں غمگین بہت معصوم اور پیاری لگ رہی تھی۔ نظر لگ جانے کی حد تک۔ اور نظر تو لگ ہی جاتی ہے جیسے مجھے لگ گئی تھی (خدا جانے کس کی) مجھے اچانک گرمی کا شدید احساس ہوا تھا۔ میں فوراً ”مندی کا تھال رکھ کے پلٹی مگر یہ کیا۔ اف میرا پیسہ ہی براؤن خوبصورت نیا کور سوٹ۔ جسے آگ پکڑ چکی تھی۔ صدمے سے میرا برا حال تھا۔ ربیعہ کو روتے دیکھا تو پتا چلا کہ تھال میں جلتی موم بتیوں سے اس کے بالوں کو آگ لگ گئی تھی۔ میں اسے چپ کرانے لگی۔

”پھپھو! شکر ہے ہمارے بالوں کو آگ نہیں لگی۔“ نور فاطمہ اور نوال معصومیت سے بولیں تو میں ہنس دی۔ ایسے موقعوں پر ہر کسی کو اپنی اپنی بڑی ہوتی ہے۔

”تقریباً“ گیارہ بجے مندی کی خوبصورت تقریب اختتام پذیر ہو گئی۔

اگلے دن چونکہ دیوار تھیں۔ اس لیے بھاگ دوڑ اور افراتفری بھی زیادہ تھی کیونکہ غمگین کی رخصتی کے بعد عصر کی بارات لے کر بھلوال جانا تھا اور انہوں نے پابندی وقت کی خاص تاکید کی تھی۔

”یا اللہ! ہر کام خوش اسلوبی سے ہو۔“

دل میں دعا میں مانگتے ہوئے ہم لوگ قاف تیار ہو کر ہال میں پہنچے مہمان آنا شروع ہو چکے تھے۔ بارات آنے سے پہلے بری دکھائی تھی اور گھڑی کی رسم کرنی تھی۔ قارئین گھڑی ہمارے ہال کی ایک خوبصورت رسم ہے۔ پھولوں کی لڑیوں سے سجاکھڑا چچی مائی یا بھابھی اٹھاتی ہے اور گھر کے سربراہ سے پیے

وصول کرتی ہے۔ موی اور کیموں کی تیز چکا چوند روشنیوں اور کرنز، بہنوں کے جھرمٹ میں میرے سر پر گھڑی رکھی گئی اور چچی کوثر نے دھمال ڈال کر پورے ہال کو حقے لگانے پر مجبور کر دیا۔

تقریب گھڑی کو سب لوگ سراہ رہے تھے اور میرا خیال ہے اس میں زیادہ کمال چچی کوثر کا ہی تھا۔ ابھی یہ رسم ختم ہی ہوئی تھی کہ بارات آگئی بینڈ باجے کے ساتھ۔ ہر لونگ بچ گئی تھی اور ہمارے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ پھولوں کا ٹوکرا نہیں مل رہا تھا۔ ہم لوگ حیران پریشان اور حیران اور باریکی خواتین ہال میں داخل ہو کر ”جھم جھم“ ڈال رہی تھیں اور ساتھ ساتھ شکوے بھی جاری تھے کہ پھولوں سے استقبال ہونا چاہیے تھا ہمارا۔ علیحدہ مائی کے دلغے ہی کام کیا بولیں۔

”وہ پھول ہم نے اس لیے نہیں کھینچے کہ پاؤں کے نیچے آکر مسلے جاتے ہیں اور آپ لوگوں کے سلب ہوئے کا خطرہ الگ۔“

”چلو خیر ہے۔“ میں نے آٹنی نازیہ کو گلے لگایا۔ ”آپ اتنی پیاری لگ رہی ہیں کہ پھولوں کی کیا اوقات۔“

”ہیں واقعی؟“ وہ پورے دل سے خوش ہوئیں۔ ”اور میں کوئی لگ رہی ہوں دوسرے کی امال۔؟“

”نہیں بالکل بھی نہیں۔“ میں نے پرزور نفی کی کہ وہ واقعی بہت پیاری لگ رہی تھیں اور شہینہ بھی گرین سوٹ میں بہت خوبصورت لگ رہی تھی۔ انجینئرنگ یونیورسٹی میں پڑھنے والی شہینہ اسکول کی طالبہ ہی لگتی ہے۔ حماد بھی بڑا پیارا لگ رہا تھا۔ آٹنی کے بیٹوں بچے بہت بہت سیکھے ہوئے باخلاق ہیں یقیناً والدین کی اچھی تربیت کا نتیجہ ہے۔

شہزادوں سی آن بان رکھنے والے عدیل بھائی دوسرے راجہ کے روپ میں بہت شاندار لگ رہے تھے اور ان کے پہلو میں چٹھی ہوئی غمگین۔ پرفیکٹ اور بیونی فل کپل۔ اور جب وہ جھلی فوٹو شوٹ کر رہے تھے تو

لڑکیوں کو دیکھ کر۔“

اس کی ٹھنڈی آہ میں ہنس پڑی۔ ”شرم کرو تم!“
 ”اے دودھ تو آپ کو لوگوں نے پلایا ہی نہیں۔“
 حماد کو اچانک دودھ کی طلب ہوئی۔ میں نے فوراً اپنے
 بیگ سے نکل کے سعد حسن کا فیڈر پیش کیا تو سب
 کے قہقہے نکل گئے۔

”رکھ لے یا را! اگلے سال کام آئے گا۔“ یہ کاشف
 کی سرگوشی تھی جو ہم سب نے سن لی۔
 پھر رخصتی ہوئی اور یہ پارٹی بھی عصر بھائی کی
 باراٹ کے ساتھ اپنے بیٹا باجے سمیت شامل ہو گئے۔
 وہاں جاکے زائد کے دوستوں نے زبردست ہنگامہ ڈالا
 اور نوٹوں کی بارش کر دی۔ ہمارا شاندار طریقے سے
 استقبال کیا گیا۔ میرا دو سال کا بیٹا سعد حسن چاچو کاشہ
 بالا بنا ہوا تھا لیکن وہاں جاکے میری گود سے نہ اترتا۔
 وہاں سے شام ڈھلے ہی دہن لے کر گھر کو لوٹے۔
 تہینہ بہت خوبصورت لگ رہی تھی۔ ہر کوئی سراہ رہا
 تھا۔

گھر آتے ہی کسی گاڑی کی ڈکی سے بھولوں کا وہ
 گشدرہ ٹوکر امل گیا تو سب نے جی بھر کے دہن پر پھول
 پھینکے۔ فوٹوشوٹ ہو رہا تھا اور میں نے ہائی ہیل پاؤں
 سے اتار کر ہاتھوں میں پکڑ رکھی تھی کیونکہ پاؤں سوج
 چکے تھے۔ سعد حسن کو تہینہ کی گود میں بٹھایا تھا۔ یہ
 ہمارے ہاں کی رسم ہے۔ چھوٹا بچہ دہن کی گود میں بٹھا
 کے اس سے پیسے وصول کیے جاتے ہیں۔

خوبصورت رسموں ڈھیلوں رونقوں کے ساتھ یہ
 دونوں شادیوں اختتام پذیر ہوئیں۔

اللہ رب العزت تہینہ اور عصر عباس کو، عزیزین اور
 عدیل گوندل کو ہمیشہ شاد آباد اور ہنسنا بستا رکھے۔ ثم
 آمین۔

میں نے آگے بڑھ کر اکل ظفر اور آئی نازیہ کو مبارک
 باد دی کہ اللہ ان کی فیملی کو نظرد سے محفوظ رکھے۔
 عدیل بھائی آپ نروس تو نہیں ہو رہے؟ ”عدیل
 بھائی کو اسٹیج پر سالیوں کے جھرمٹ میں تیسری مرتبہ
 ماتھے سے پسینہ صاف کرتے دیکھ کر میں نے پوچھا۔
 ”نہیں نہیں، کوئی نہیں۔“ وہ اس روز نوکیلوں والی
 ساری تیزی اور چرب زبانی بھولے ہوئے تھے۔

”اپنے حق میں بولیں۔ اس طرح تو لگ ہی نہیں رہا
 کہ آپ لاء جیسے شے سے وابستہ ہیں۔ جبکہ سنا ہے
 وہاں تو گونگے بھی بول پڑتے ہیں۔“
 پھر مجھے بتا چلا گیا کہ درحقیقت وہ شرما نہیں رہے
 تھے بلکہ ان کی ساری کی ساری توجہ اپنے جوتے کی
 طرف تھی کہ ان کی ذرا سی چوک سے پاؤں پکڑ کے
 بیٹھی سالیوں فائدہ نہ اٹھالیں۔

”یہ مٹھائی صرف دو لاکھ کے کھانے کے لیے ہے؟“
 اکل عظمت نے پوچھا جو ایک صوفے پر اپنی دونوں
 بیویوں کے درمیان بیٹھے چمک رہے تھے۔
 ”جی ہاں۔“ میں نے کہا۔ ”کیونکہ آپ دو دفعہ کھا
 چکے ہیں۔“

”دودھ کے پیسے نکالیں، عدلی کریں۔“ اقرار نے
 اصرار کیا۔
 ”آپ ڈیمانڈ کریں۔“ اکل عظمت نے نوٹوں کی
 گلدی لرائی۔

میں نے کہا۔ ”زیادہ نہیں، کیونکہ گھر کی بات ہے“
 اس لیے صرف پانچ لاکھ۔“

”وے! ایک جوتے کی اتنی قیمت؟“ لمبی ناک والا
 کاشی شالابن کے کچھ زیادہ ہی شوخ ہو رہا تھا۔
 ”بھی زندگی میں اتنی رقم دیکھی ہے؟“ یہ

سوال حماد نے کیا۔
 ”نہیں دیکھ لیں گے۔“ قرآن آرام سے کہا۔

”تم نے تاج قتل ہو جانا ہے کاشی کے بچے! میں
 نے اس کے ہاتھوں پہ بیگسار۔“

”نہیں، تو ہو چکا ہوں، اتنی خوبصورت تیار شیر

Face Fresh
CLEANSER CREAM
50gms

Unilever
LORD





ماورا مرتضیٰ عافیہ بیگم کی اکلوتی بیٹی ہے۔ فارہ کے ساتھ یونیورسٹی میں پڑھتی ہے۔ عافیہ بیگم اس کا اپنی سہیلیوں سے زیادہ ملنا جلتا پسند نہیں کرتیں۔ اس کے علاوہ بھی اس پر بہت ساری پابندیاں لگاتی ہیں جبکہ ماورا خود اعتماد اور اچھی لڑکی ہے۔ عافیہ بیگم اکثر اس سے ناراض رہتی ہیں۔ البتہ بی بی گل اس کی حمایتی ہیں۔

فارہ اپنی خیمہ خالہ کے بیٹے آفاق یزدانی سے منسوب ہے۔ دو سال پہلے یہ نسبت آفاق کی پسند سے ٹھہرائی گئی تھی مگر اب وہ فارہ سے قطعی لا تعلق ہے۔ فارہ کی والدہ منظرہ رحیم اپنی بہن خیمہ یزدانی سے ملنے کراچی جاتی ہیں۔ آفاق انہیں ایر پورٹ لینے نہیں جاتا۔ مجبوراً ساشا کو جانا پڑتا ہے۔ وہ آفاق کی بدتمیزی پر خفا ہو کر واپس چلی جاتی ہیں۔

منظرہ خیمہ اور نیو کے بھائی رضا حیدر کے دوست بچے ہیں۔ بیور حیدر اور عزت حیدر۔ بیور حیدر بڑے مین ہے اور بے حد شان دار رہنمائی کا مالک ہے۔ ولید رحمن اس کا بیسٹ فرینڈ ہے۔ اس سے حیثیت میں کم ہے مگر دونوں کے درمیان اسٹیشن حائل نہیں ہے۔ نیو کے بیٹے فارہ کی بہن حسہ بھائی ہوئی ہے۔

عزت اپنی آنکھوں سے یونیورسٹی میں بم دھماکا ہوتے دیکھ کر اپنے خواص کھودیتی ہے۔ ولید اسے دیکھ کر اس کی جانب لپکتا ہے اور اسے سنبھال کر بیور کو فون کرتا ہے۔ بیور اسے اسپتال لے جاتا ہے۔ عزت کے ساتھ یہ حادثاتی ملاقات ولید کو ایک خوشگوار حصار میں باندھ لیتی ہے۔ عزت بھی ولید کے بارے میں سوچنے لگتی ہے اور ڈھکے چھپے لفظوں میں ولید سے اپنی کیفیت کا اظہار بھی کر دیتی ہے مگر ولید انجان بن جاتا ہے۔



— ۵ —
پانچویں قسط

عمیں سوچنے لگتی ہے۔ عافیہ بیگم ماورا کو موبائل خریدنے کی اجازت دے دیتی ہیں۔ بیور ایک میٹنگ کے سلسلے میں فیصل آباد جاتا ہے۔ واپسی میں ٹریفک جام میں اس کی نظر بس میں بیٹھی ماورا پر پڑ جاتی ہے۔ وہ اسے دیکھتا رہتا ہے۔

آفاق فون کر کے فارہ سے شادی کرنے سے انکار کر دیتا ہے۔ فارہ بہت روتی ہے۔ خیمہ اور اشتیاق یزدانی کو علم ہوتا ہے تو انہیں سخت صدمہ ہوتا ہے۔ خیمہ کی طبیعت بگڑنے لگتی ہے۔



اس کے قدم پھرا گئے تھے اور چہرے پر اک طمانچہ سا پڑا تھا۔
آخر اس کے ماں باپ نے اس کے ہاتھ کے لمس کو اور اس کے بازو کے سہارے کو دھکا دیا۔ اس کے لیے
اس سے بڑی ذلت اور اس سے بڑی اذیت اور کیا ہو سکتی تھی بھلا؟ اس کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا سا چھا گیا
اور کانوں میں سائیں سائیں ہی ہونے لگی۔
”ٹھو ٹھنہ! اندر چلو۔“ انہوں نے خود آگے بڑھ کے ٹیمپہ یزدانی کو سہارا دے کر اٹھایا اور اپنے ساتھ اندر
لے گئے۔ اتفاق وہیں کا وہیں کھڑا رہ گیا۔

اشتیاق یزدانی خاصی گہری نیند سو رہے تھے۔ جب کسی کے کراہنے کی آواز یہ ان کی نیند کا تسلسل ٹوٹ گیا۔
انہوں نے آنکھیں کھول کر دیکھا۔ کمرے میں لٹکا ہوا اندھیرا تھا اور کراہنے کی آواز ہاتھ روم کی طرف سے آرہی
تھی۔ وہ ایک دم اٹھ کر بیٹھ گئے اور فوراً ہاتھ پر دھاکے سائیز ٹیبل پر رکھا لیٹ جلا دیا۔
”ٹیمپہ!“ انہوں نے بیڈ کی طرف دیکھا۔ بیڈ خالی تھا۔ اشتیاق یزدانی کے چھلکے چھوٹ گئے تھے۔ وہ ایک دم
اٹھ کر ہاتھ روم کی طرف بھاگے۔

”ٹیمپہ! ٹیمپہ!“ وہ ہاتھ روم کے پاس ہی قالین پر اونڈھے منہ گری ہوئی تھیں۔ انہوں نے ان کے
قریب دو زانو بیٹھتے ہوئے بمشکل انہیں سیدھا کیا۔ لیکن ان کے پکارنے کے باوجود ٹیمپہ یزدانی کے منہ سے کراہنے
کی آواز کے سوا اور کوئی آواز ہی نہیں نکل رہی تھی۔

”ٹیمپہ! کیا ہوا ہے تمہیں؟“ آنکھیں کھولو۔ ٹیمپہ۔“ اشتیاق یزدانی حد سے زیادہ پریشان ہو گئے۔ ٹیمپہ
یزدانی کی اس تشویشناک حالت پر ان کے ہاتھ پیر پھول گئے اور چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگیں۔
”ٹیمپہ!“ انہیں بار بار پکارنے کے بعد جب کچھ نہ سوچا تو وہ انہیں وہیں چھوڑ کر بکھلائے ہوئے باہر کی
طرف لپکے اور ملازموں کو زور زور سے آوازیں دیتے ہوئے سیڑھیاں اتر آئے۔

”ساجدہ! ساجدہ! راجو! راجو! آہا! ہوتو لوگ۔“ انہوں نے باہر لان میں نکلتے ہی ملازموں کو اور
بھی زور سے پکارا تھا اور جیسے جیسے ان کی آواز کانوں میں پڑتی گئی تھی۔ سب کے سب ملازم گہری نیند سے اٹھنے کے
باوجود بھی بھاگے آئے تھے۔

”غفوس!“ اتم جلدی سے گاڑی نکالو۔ بیگم صاحبہ کو لے کر اسپتال جانا ہے۔“ وہ ڈرائیور کو گاڑی نکالنے کا کہہ کر
دوبارہ اپنے بیڈ روم کی طرف بھاگے اور پھر بڑی مشکل سے ملازموں کی مدد سے ٹیمپہ یزدانی کو اٹھا کر گاڑی تک لے
آئے اور ابھی انہیں گاڑی میں ڈال ہی رہے تھے کہ باہر شور کی آواز سن کر گہری نیند سویا اتفاق بھی اٹھ کر باہر نکل
آیا۔

”ساجدہ! کیا ہوا ہے؟ یہ شور کیا ہے؟“ اتفاق نے باہر سے سنائی دینے والی ملازموں کی اور اشتیاق
یزدانی کی آوازوں کے متعلق پوچھا۔

”ارے صاحب جی۔! آپ کو نہیں پتا۔؟ بیگم صاحبہ کی طبیعت خراب ہو گئی ہے۔ کچھ ہوش نہیں ہے۔
اسی لیے بوے صاحب جی ان کو لے کر اسپتال جا رہے ہیں۔“ ساجدہ نے غلت میں بتایا اور ٹیمپہ یزدانی کا دوپٹا لے
کر باہر چلی گئی۔

اتفاق دم بخود سا رہ گیا۔ اس کے قدموں تلے سے زمین سرک گئی۔ اس کی ماں بیمار تھی بے ہوش تھی اور اسے
کسی نے خبر ہی نہیں دی۔ وہ مطمئن بے خبر سوتا رہا۔ ماں کی طبیعت کا احساس ہوتے ہی وہ ایک دم سرپٹ بھاگا۔

لیکن تب تک اشتیاق یزدانی گاڑی میں سوار ہو چکے تھے۔
”پاپا! پاپا! پاپا! کیا ہوا ہے؟ آپ۔؟ آپ۔؟ مجھے بتایا بھی نہیں؟“
وہ گیٹ کی طرف سرکتی گاڑی کی کھڑکی میں جھپٹتے ہوئے خاصے روپائے لہجے میں بولا۔
”ہمارا تم سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ ہم تمہارے لیے مر چکے ہیں۔“ انہوں نے انتہائی سخت اور تلخ انداز میں
کہتے ہوئے ڈرائیور کو اشارہ کیا اور ڈرائیور ان کے اشارے پر رفتار بدھاتے ہوئے گاڑی نکال لے گیا۔
اتفاق اپنے باپ کی اتنی بے گانگی اور لائقیت پر شدید رونا ہوا گیا۔ انہوں نے کتنی آسانی سے اسے پرایا اور خود
سے الگ کر دیا تھا۔ کچھ بتائے بغیر ہی چلے گئے تھے۔

”بھائی! بھائی! اٹھیں پلینز۔“ مجھے اسکول ڈراپ کر دیں۔ میں لیٹ ہو رہی ہوں۔“ کککو نے انتہائی گہری
نیند سوئے ولید کو کندھے سے پکڑ کے سمجھوڑ دیا اور وہ جو تقریباً ”جی چار بجے“ اگر بستر پر گرتے ہی نیند سے بے سدھ
ہو گیا تھا اس اچانک حملے پر ہڑبکا دیا۔

”کیا بات ہے کککو! کیوں جگا رہی ہو؟“ ولید نے کافی بوکھلائے ہوئے انداز میں پوچھا۔
”مجھے اسکول جانا ہے۔ میں لیٹ ہو رہی ہوں۔ پلینز! مجھے ڈراپ کر دیں۔“ کککو نے ایک بار پھر جیسے التجا کی۔
”میں ڈراپ کر دوں؟ تو وحید کہاں ہے؟“ اس نے چھوٹے بھائی کا پوچھا۔
”پیارے بھائی! بخار ہے اسے۔“ کککو جھنجھلائی۔

”اوہ! تو یہ مسئلہ ہے۔“ وہ سنتے ہی اٹھ کے بیڈ گیا اور اپنے سوئے ہوئے اعصاب کو ٹھکانے پہ لانے کی کوشش
کی۔

”جی! اٹھیک ہے۔ تم تیار ہو جاؤ۔ میں تمہیں چھوڑ آتا ہوں۔“ وہ اپنے اوپر سے چادر پرے ہٹا کر بستر سے اٹھ
کھڑا ہوا۔

”بھائی! میں آل ریڈی تیار ہوں۔ بس آپ کے تیار ہونے کا انتظار ہے۔“ کککو اس کی غائب دماغی پر غکلی
سے بولی۔

”اوہ! سوری سویت ہارٹ۔“ مجھے بھی بس تیاری سمجھو۔ تم چلو۔ میں آیا۔“ اس نے کککو کے غکلی بھرے
انداز پر مسکراتے ہوئے اس کا گال تھپکا۔ وہ سر ہلا کر باہر نکل گئی۔ اس کے پیچھے دو منٹ بعد اپنا تالیہ کندھے پہ
ڈالے وہ بھی اپنے کمرے سے باہر آیا اور انتہائی ڈھیلے ڈھالے اور ست سے انداز میں قدم اٹھاتے ہوئے ہاتھ روم
کی طرف بڑھ گیا۔

”ارے! اس نے تمہیں جگا دیا؟“ زبیدہ بیگم دوسرے کمرے سے وحید اور کککو کے کپڑے دھونے کے
لیے لے کر ابھی باہر ہی نکل رہی تھیں کہ ولید کو دیکھ کر ٹھٹک گئیں۔ کیونکہ انہیں پتا تھا کہ ولید رات بھر کام کرنے
کے بعد صبح منہ اندھیرے تھکا ہوا آیا تھا۔

”ظاہر ہے جگانا تو تھا ہی۔ وہ بے چاری اور کیا کرتی؟“ ولید نے کندھے اچکا۔
”لیکن میں نے اسے کہا بھی تھا کہ اسے میں چھوڑ آتی ہوں۔ پھر بھی وہ باز نہیں آئی۔“ زبیدہ بیگم کو بیٹی پر غصہ
آیا۔

”تو اچھا کیا ناس نے کہ مجھے جگا دیا۔“ آپ اتنی دور کیسے جاتیں اور کیسے آئیں۔ اس نے تو آپ کا بھلا ہی سوچا
ہے نا؟“ ولید نے نرمی سے سر جھٹک کر دوبارہ ہاتھ روم کی طرف قدم بڑھا دیے۔

”میرے بھلے کو چھوڑو۔ مجھے تو تمہاری فکر ہو رہی ہے۔ تمہاری نیند بھی پوری نہیں ہو سکی۔“ وہ متفکر ہونے لگیں۔

”ارے ڈونٹ وری امی! نیند پوری نہ ہونا تو اب روٹین کا حصہ ہے اور روٹین کے ساتھ انسان خود بخود ایڈجسٹ ہو جاتا ہے۔ اس میں اتنا پریشان ہونے کی کیا بات ہے بھلا؟“

وہ لا پرواہی سے کہنا نہ مانے کے لیے ہاتھ روم میں گھس گیا۔ زبیدہ بیگم افسوس سے سر ہلاتی ہوئی اپنے کام میں مصروف ہو گئیں۔ وہ ان تینوں بہن بھائیوں کے بغیر چلنے پھرنے کے لیے الگ الگ کمرے رکھے گئیں۔ کیونکہ وہ پہلے ولید اور وحید کے کپڑے دھو کر رکھتی تھیں اور بعد میں کککو کی اور اپنی باری آتی تھی۔ اس وقت بھی وہ ایسا ہی کر رہی تھیں کہ اتنے میں ولید نما کر ہاتھ روم سے نکل بھی آیا اور بالوں میں تولیہ رگڑتے ہوئے کمرے کی طرف بڑھ ہی رہا تھا کہ اچانک چارپائی پر رکھے کپڑوں کے ڈھیر پر نظر پڑے ہی وہ ایک دم ٹھٹک گیا اور بے ساختہ پکار اٹھا۔

”امی!“ اس نے اتنے دل دہلا دینے والے انداز میں پکارا کہ زبیدہ بیگم کے ہاتھ سے صرف کا پیکٹ چھوٹ کر پورے زور و شور سے گھومتی واشنگ مشین میں جا کر ا۔

”ہائے میرے اللہ۔ کیا ہو گیا؟“ وہ دل پہ ہاتھ رکھتے ہوئے اس کی طرف پلٹیں۔

”میری بلیو شرٹ!“ وہ تیر کی تیزی سے لپک کے کپڑوں کے ڈھیر کے پاس آیا اور اس میں سے اپنی بلیو اور بلیک لائننگ والی شرٹ کھینچ کے نکال لی۔

”ارے! کیا ہو گیا ہے تمہاری بلیو شرٹ کو؟“ زبیدہ بیگم کا دل ابھی تک ٹھکانے پر نہیں آیا تھا۔

”ہوا نہیں ہے۔ مگر ہونے ہی والا تھا کہ میری نظر پڑ گئی اور یہ شرٹ بال بال بچ گئی۔“ وہ ٹو پھلا ہو کککو کا جس نے آج مجھے زبردستی جگایا۔ ورنہ آپ نے تو میرے کف افسوس خیز کا پورا پورا انتظام کر رکھا تھا۔ مگر وہ کیا کہتے ہیں کہ اللہ کی رحمت تو بس ہمانہ تلاش کرتی ہے۔“ ولید اس شرٹ کو بڑی چاہ سے جھاڑ پونچھ کے پلٹ گیا۔

”مگر یہ شرٹ تو ابھی دھلی کہاں۔ اتنے دنوں سے کھوئی سے لٹکی ہوئی تھی۔“ وہ حیران ہوئیں۔

”یہ شرٹ دھل چکی ہے امی۔ اور اتنے دنوں سے کھوئی سے نہیں میرے دل سے لٹکی ہوئی تھی۔“ وہ آہستگی سے زرب کہتا ہوا ذرا سا مسکرایا۔

”کیا؟ کیا کیا تم نے؟“ وہ اس کی بات سن نہیں سکی تھیں۔

”کچھ نہیں! میں بس یہ کہہ رہا ہوں کہ اس شرٹ کو دھونے کی ضرورت نہیں ہے۔ اس لیے میں اب اسے الماری میں رکھ رہا ہوں۔“ وہ ذرا سا رکنے کے بعد پھر کمرے کی طرف بڑھا۔

”کیوں؟“ اسی کی کیا بات ہے اس شرٹ میں کہ اسے دھونے کی بھی ضرورت نہیں ہے؟“ وہ مسلسل حیرانی کی زد میں تھیں کیونکہ ولید کا ہر کچھ اور ہی ہو رہا تھا۔

”امی! ابوں سمجھ لیں کہ ساری بات ہی اسی ایک شرٹ میں ہے۔“ وہ جاتے جاتے پھر ٹھہرا۔

”چھا۔“ تو یہ بات ہے۔“ وہ جیسے کچھ کچھ سمجھ گئی تھیں۔

”ہوں۔“ یہی بات ہے۔“ اس نے مبہم سا اقرار کیا۔

”کون ہے وہ؟“ زبیدہ بیگم کا انداز دوستانہ ہو گیا۔

”میرے نزدیک۔“ خوشبو کا پیکر۔“ اس نے ایسے مسحور لہجے میں بتایا جیسے اس کے لہجے میں اس کی خوشبو بس

گئی ہو۔

”بھائی!“ کککو اسے ابھی تک کندھے پہ تولیہ ڈالے کھڑے دیکھ کر ایک دم چیخ اٹھی۔ ولید اس کی چیخ پہ

گڑبڑا کہ اس خوشبو کے حصار سے باہر آیا۔

”وہ نو!“ اس نے سر پہ ہاتھ مارتے ہوئے برآمدے میں لگے وال کلاک کی سمت دیکھا۔

”بس یا برس۔“ امیں دو منٹ میں آیا۔“ وہ کککو سے کتاب اپنے کمرے کی طرف بھاگا اور اپنی شرٹ الماری میں

رکنے کے بعد دوسری شرٹ پہن کر بن کر تانا ہوا باہر نکل آیا۔

”چلو!“ آجاذاب۔“ وہ کککو کو اشارہ کرتے ہوئے بایک نکلنے لگا۔

”اوکے امی۔! خدا حافظ۔“ اور پھر وہ بہن بھائی آگے پیچھے خدا حافظ کہتے گھر سے باہر نکل گئے۔



صبح کا وقت تھا اور کراچی کی سڑکیں تھیں۔ جن پہ اس وقت ٹریفک کا اتنا ہجوم تھا کہ مل دھرنے کو بھی جگہ نہیں تھی۔ جب روٹ پہ کوئی سگنل سرخ ہوتا تو آگے پیچھے ایک دوسرے کے تعاقب میں بھاگتی دوڑتی گاڑیاں ایک ہی جگہ پہ چابی والے کھلونے کی طرح اسٹاپ ہو جاتیں اور ان رکی ہوئی گاڑیوں میں بیٹھے لوگ بے چینی کے مارے حرکت میں آجاتے۔

اور ولید رحمان گاڑیوں میں بیٹھے لوگوں کی بے چینی سے لطف اندوز ہوتا اپنی بایک پہ بیٹھا گنگناٹے ہوئے ادھر

ادھر دیکھ رہا تھا۔ جب اس نے ذرا فاصلے پہ کھڑی گاڑی میں بیٹھی ایک خوب صورت لڑکی کو دیکھ کر مسکراہٹ

اچھائی۔“ جواباً وہ لڑکی بھی مسکرائی۔ جس پہ ولید نے دوبارہ اپنے بالوں میں ہاتھ پھیرا۔

”بھائی!“ کککو نے اسے پیچھے سے کافی آہستگی سے پکارا۔

”ہوں۔“ اس نے فوراً گردن موڑ کر کککو کو دیکھنے کی کوشش کی۔

”لیفٹ سائیڈ پہ بھی ایک گاڑی ہے۔ وہ لڑکی بھی آپ کو ہی دیکھ رہی ہے۔ اس کی طرف بھی دیکھیں نا۔ کتنی

پیاری ہے وہ۔“ کککو نے اسے کسی اور طرف متوجہ کرنا چاہا۔

”کککو!“ ولید نے اسے سر زلش کرتے ہوئے گردن موڑ کر اسے دیکھنا چاہا۔ مگر کککو کو دیکھنے کی کوشش

میں اس کی نظریاں طرف کھڑی اس گاڑی پہ جا پڑی۔ جس میں بیٹھی لڑکی بقول کککو کے اسے ہی دیکھ رہی تھی۔

”عزت!“ ولید کے ہونٹوں پہ اک غیر محسوس سی جنبش ہوئی۔

اور وہ لڑکی اس غیر محسوس سی جنبش سے بھی پہچان گئی تھی کہ اس کے ہونٹوں نے کس کا نام چھو ا ہے۔ وہ بہت

دیر سے اسے ہی تو دیکھ رہی تھی۔ لیکن وہ نچانے کہاں کہاں اور کس کس کو دیکھ رہا تھا۔ مگر عزت حیدر کی طرف

دیکھتے ہی وہ ٹھٹک گیا اور اس کے ہونٹوں کی گنگناہٹ ایک دم ٹھہم سی گئی۔ پھر وہ آہستگی سے نظریں پھیر کر دوبارہ

دوسری طرف دیکھنے لگا۔

بے ساختہ عزت نے اسے پکار کر متوجہ کرنا چاہا۔ لیکن پھر اس کی بایک کے پیچھے بیٹھی یونیفارم میں ملبوس

استثنائی نوعمری لڑکی کو دیکھ کر اسے خود پہ قابو نہ آوا اور وہ اسے پکارتے پکارتے رگ گئی۔ اتنے میں سگنل بھی گرین

ہو گیا۔ لیکن اس سے پہلے کہ وہ گاڑی بڑھا کے اس کی بایک کے آگے لے آتی وہ ایک دم اپنی بایک اڑا لے گیا

اور دوبارہ پلٹ کر دیکھنے کی زحمت بھی گوارا نہیں کی عزت لب پہنچتے ہوئے اسٹیشنرنگ پہ مکار سید کر کے رہ گئی۔



اتنے سارے لوگوں میں اتفاق یزدانی مجرم نہ تھا تھا۔

کیونکہ تین یزدانی کو ہارٹ انٹیک ہوا تھا اور تقریباً سب ہی اس ہارٹ انٹیک کا ذمہ دار اتفاق یزدانی کو ہی سمجھ

رہے تھے۔ آخر رات کو ہی تو تین یزدانی کو پتا چلا تھا کہ اتفاق نے فارہ کو فون کال کی تھی اور اس فون کال میں اس

نے فارہ سے جو کچھ کہا تھا اسے جان کر وہ دل پہ صدمہ نہیں سہا رہی تھیں اور رات کے تین بجے انہیں دل کا دورہ

ٹھا تھا۔ حالانکہ وہ اپنے بستر سے ٹھیک ٹھاک اٹھی تھیں اور وادش روم سے واپس آتے ہوئے اچانک سینے میں اٹھنے والے درد سے دوہری ہو کر نیچے فرش پہ جاگری تھیں۔ تب سے اب تک بے ہوش پڑی تھیں۔ وہ سب ان کے ہوش میں آنے کے منتظر بیٹھے ان کی زندگی کے لیے دعا کر رہے تھے۔

جبکہ وہ دونوں باپ بیٹا اپنی جگہ پہ چپ خاموش اور گم غم سے بیٹھے تھے۔ کیونکہ چار سال پہلے بھی ان کا ایک ناقابل تلافی نقصان ہو چکا تھا اور اس نقصان کے بعد وہ دوبارہ کسی ایسے نقصان کا حوصلہ اور ہمت نہیں رکھتے تھے جو انہیں ایک بار پھر خالی کر کے رکھ دیتا۔ اسی نقصان کو سوچتے ہوئے وہ اندر سے خوف زدہ سے بیٹھے تھے۔ لیکن زبان سے اظہار نہیں کیا رہے تھے۔

البتہ وہاں موجود سب جانتے تھے کہ وہ دونوں باپ بیٹا کیوں چپ ہیں۔ اور کس خوف نے ان کی قوت گویائی سلب کر رکھی ہے۔

اسی لیے رضا حیدر نے اپنے برابر بیٹھے اشتیاق یزدانی کے کندھے پہ ہاتھ رکھتے ہوئے انہیں تسلی دینے کی کوشش کی، مگر وہ کہاں جانتے تھے کہ وہ کس کیفیت کی زد میں ہیں۔

”دیکھو! تم لوگ بریشان نہ ہو ان شاء اللہ! آئینہ جلدی ٹھیک ہو جائے گی۔ اللہ سے ہمیشہ بتری کی امید رکھنی چاہیے۔ ابھی تو اسے اپنے بیٹے کی شادی کرنی ہے۔ اس کی خوشیاں دیکھتی ہیں۔ اپنے ارمان پورے کرنے ہیں۔“ رضا حیدر نے ان کا کندھا تھپکا۔

”ہونہ۔! ایسی شادی؟ کیسی خوشیاں؟ اور کیسے ارمان حیدر بھائی؟ ہمارا کوئی بیٹا نہیں ہے جس کی شادی جس کی خوشیاں اور جس کے ارمان ہم پورے کریں گے۔ ہمارا صرف ایک ہی بیٹا تھا اور وہ چار سال پہلے مر چکا ہے۔“ اشتیاق یزدانی کے ایسے سفاک الفاظ پر راجہ بیگم، منورہ رحیم اور نیر احمد کے دل مٹھی میں آگئے۔ اتفاق نے بھی اپنے باپ کی ایسی سفاک اور دل چیر دینے والی بات یہ گردن موڑ کر ان کے چہرے کی سمت دیکھا۔ ان کے چہرے کے تاثرات بہت پتھر لیے سے محسوس ہو رہے تھے۔ اتفاق ان کے ایسے رویے پہ لب پہنچنے کے وہ گیا۔ وہ اندر ہی اندر دوہری اذیت کا شکار تھا۔ لیکن اپنی اس اذیت کو بیان نہیں کیا رہا تھا اور کوئی اسے یا اس کی اذیت کو سمجھ نہیں سکتا تھا۔

اس کے کئے مال باپ بھی نہیں۔ بلکہ وہ بھی نہیں جو اس کے بہت قریب اس کے سینے کے اندر اس کے دل میں رہتی تھی اور دل میں رہ کر بھی دل کی حرکات و سکنات سے انجان اور بے خبری تھی۔

اتفاق ایک دم وہاں سے اٹھ کر باہر نکل آیا اور طویل راہداری عبور کر کے باہر بیڑھیوں پر آکھڑا ہوا تھا اس نے اپنے دونوں ہاتھ سر پر رکھ لیے۔ اس کے پاس اپنی اور اپنے مال باپ کی اذیت کا کوئی حل نہیں تھا۔ اور جو حل تھا۔ اسے اسے اسے نہیں سکتا تھا۔

مگر اب اس کے ارد گرد بے بسی کا گھیرا رنگ ہوتا جا رہا تھا اور اسے لگ رہا تھا کہ وہ کسی بھی وقت ہتھیار ڈال دے گا اور اس بے بسی کے ہاتھوں بنجور ہو جائے گا۔ آخر کب تک وہ اکیلا اس بے بسی کی جنگ کو لڑ سکتا تھا؟

”اتفاق!“ اس کے بالکل برابر سے تیمور حیدر کی آواز سنائی دی اس نے چونک کر اپنے ہاتھ نیچے گرا لیے۔ ”کیا پرالم ہے؟“ تیمور اس کے برابر کھڑا سامنے مین گیٹ سے لوگوں کی آمد و رفت دیکھ رہا تھا۔ البتہ مخاطب وہ اسی سے تھا۔

”نتھنگ!“ اتفاق نے آہستگی سے نفی میں سر ہلایا اور گہری سانس کھینچتے ہوئے دونوں ہاتھ پینٹ کی جیبوں میں پھنسا کر وہ بھی سامنے مین گیٹ کی طرف ہی دیکھنے لگا۔

”کسی کو پسند کرتے ہو۔؟“ تیمور نے انتہائی سنجیدگی سے استفسار کیا۔

”ہاں!“ اس نے بڑے ٹھہرے ہوئے سے لہجے میں اعتراف کیا۔

”کس کو؟“ تیمور حیدر کا سوال بہت ہی فطری تھا۔

”فادر رحیم کو۔“ اتفاق کا جواب بہت ہی چونکا دینے والا تھا۔

”واٹ فادر کو؟ تو پھر۔ تو پھر تم اس سے شادی سے انکار کیوں کر رہے ہو۔؟“ تیمور کو اچنبھا ہوا۔

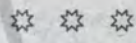
”ہونہ۔! اب کر رہا ہوں یا۔؟“ اس نے نیکی سے کہتے ہوئے سر جھٹکا۔

”کیا مطلب ہے تمہارا۔؟ تم کہہ کیا رہے ہو؟“ تیمور کو الجھن ہوئی۔

”میرا کوئی مطلب نہیں ہے۔ میں صرف یہ کہہ رہا ہوں کہ میں فادر سے شادی سے انکار نہیں کر رہا۔ اگر

میرے مال باپ اس طرح خوش ہوتے ہیں۔ تو ایسے ہی سہی۔ وہ اپنی خوشی اپنے ارمان پورے کر لیں۔ وہ جب کہیں گے میں فادر کو لے آؤں گا۔ میری طرف سے کوئی انکار نہیں ہے۔“ اتفاق بے تاثر سے انداز میں کہہ کر وہاں سے ہٹ گیا۔

اور تیمور اس کے ایسے اقرار پر مزید الجھن کا شکار ہو گیا (یعنی وہ یہ سب مال باپ کے لیے کر رہا تھا۔ اپنے لیے نہیں؟)



”بال دیکھے ہیں اپنے۔ کتنے خشک اور بے رونق ہو رہے ہیں؟“ بی بی گل نے اپنے قدموں کے قریب نیچے فرش پہ بیٹھی ماوراء کے بالوں کو الٹ پلٹ کر دیکھتے ہوئے خفگی کا اظہار کیا۔

”بالکل ہماری زندگی کی طرح۔ خشک اور بے رونق۔“ ماوراء نے لقمہ دیا۔ سلائی مشین پہ جھکی بی گل کا کرتا سلائی کرتی عافیہ بیگم کے ہاتھ تھکے انہوں نے ذرا کی ذرا نظر اٹھا کر ماوراء کو دیکھا، لیکن وہ اپنے ہاتھ میں پکڑے موبائل کی طرف متوجہ تھی۔

”میرا بچہ۔! اپنے بالوں کو بھی خشک اور بے رونق انسان خود بناتا ہے اور اپنی زندگی کو بھی خشک اور بے رونق خود ہی کرتا ہے۔ انسان کے بال اور زندگی انسان سے اس کی توجہ مانگتے ہیں۔ توجہ نہ دو تو بال اور زندگی —

اجاڑ ویران اور بے رنگ ہو جاتے ہیں۔ اچھتے ہیں تو پھر اچھتے ہی چلے جاتے ہیں۔ لاکھ سنوارو۔ پھر نہیں سنورتے بلکہ ان کو سنوارنے میں الٹا تکلیف ہوتی ہے اور جب انسان اس تکلیف سے گزرتا ہے۔ تو پھر سوچتا ہے کہ وہ پہلے ہی توجہ دے لیتا تو اچھا ہوتا۔ کیونکہ بالوں کو اور زندگی کو چمک دار بنانے کے لیے بڑے بڑے طریقے اور بڑے بڑے حربے آزمانے پڑتے ہیں۔“ بی بی گل تیل کی شیشی اٹھا کر ماوراء کے بالوں میں مساج کرنے لگیں۔

”لیکن بی گل۔! میں ان لوگوں میں سے نہیں ہوں جو توجہ نہیں دیتے۔ میں طریقے بھی آزماؤں گی اور حربے بھی اور دیکھیے گا، زندگی کیسے چمک دار ہوتی ہے۔“ ماوراء نے نظر اٹھا کر عافیہ بیگم کو دیکھا۔ لیکن وہ سلائی مشین کے سامنے بیٹھی بی گل کا کرتا سلائی کرنے میں مصروف تھیں۔ ماوراء کی بات پہ انہوں نے کوئی رد عمل ظاہر نہیں کیا۔ یوں جیسے اس کی بات سنی ہی نہ ہو۔

”ان شاء اللہ۔! ایسا ہی ہو گا۔“ بی بی گل نے صدق دل سے کہا۔ عافیہ بیگم اندر ہی اندر ان کی بات پہ کڑھ کے رہ گئیں۔ لیکن کہا پھر بھی کچھ نہیں۔

”آئینہ۔“ ماوراء نے بھی جواباً ”بڑے دل سے آئینہ کہا۔

اور بی گل ابھی اس کے بالوں میں تیل سے مساج کر رہی تھیں کہ اچانک ماوراء کا موبائل بج اٹھا موبائل

”س کا فون ہے۔“ بی بی گل نے ہاتھ روک کر پوچھا۔
 ”فارہ کا۔“ وہ کہتے ہوئے فرش سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ عافیہ بیگم نے چونک کر دیکھا۔ ماورا موبائل لے کر
 بیڑھیاں چڑھ رہی تھی۔

”ہاں ہاں کہہ دیجئے میں سن رہی ہوں۔“ ماورا ایک ہاتھ میں موبائل پکڑے فون سن رہی تھی اور دوسرے ہاتھ سے اپنے نیل لگے بالوں کو سینے کی کوشش کر رہی تھی۔

”وہی جو معذرت خواہ ہو رہا تھا۔“ قارہ کے اندر کی تنگی لہجے میں اُمی۔
 ”اچھا! وہی جو محبت میں غلام نہیں ہوا۔ مگر معذرت خواہ ہو گیا تھا؟“ ماوراکو جیسے یاد آگیا۔

”تو کیا اب وہ غلام ہونے کے لیے تیار ہے؟“ ماورا کے سبھی لکٹ بھی، بھی بہت کمکیاں ہو جاتی تھیں اور وہ اسے چھانے کی کوشش بھی نہیں کرتی تھی۔

”پچھلے سال کے اتنے زرخیز پنچ رس کے وہ شاد، کے لیے تیار ہے۔“ قارہ کے لمحے میں کسی خوشی کی کوئی

”یہ ذہن میں یہ سوال اٹھتا ہے کہ آخر وہ تیار کیسے ہو گیا؟“ ماورائے وجہ جانی چاہی۔

”دو روز پہلے ٹیمنے انہی کو ہارٹ اٹیک ہوا تھا۔“ قار نے آہستگی سے بتایا۔

”ہوں۔ بالکل۔“ قارہ نے اعتراف کیا۔
”صدقے جاؤ! اس بارٹ انٹیک کے۔“ ماوراک کی طرف سے طنز کا ایک اور نشتر چلایا گیا۔ قارہ خاموش ہی رہی۔

”تو بھرا اب آپ جناب کا کیا ارادہ ہے۔“ اور انے آگے کا پوچھا۔
 ”میرا کوئی ارادہ نہیں ہے۔“ قارہ کا جواب انکار میں تھا۔

”ہو نہ۔! کون کتا ہے کہ تم یہ شادی نہیں کرو گی؟“ ماورا کے لہجے میں استغناء اتر ا ہوا تھا۔
 ”کیا مطلب ہے تمہارا۔؟“ قارہ چونکی۔

”لیکن ماوراء...! میں اس کی مجبوری سے شادی نہیں کروں گی۔ وہ میری محبت کو بیاہنے کے لیے تیار نہیں ہوا تو میں اس کی مجبوری کو بیاہنے کے لیے کیسے مان جاؤں؟ کیا اس کی مجبوری بڑی ہے میری محبت سے...؟“ آج کل رہا

”بڑی تو ہے نا۔ آخر ہارٹ ایک ہوا ہے اس کی بدر کو۔“
 ”ان کو ہارٹ ایک ہوا ہے ماورائے! لیکن میرا ہارٹ فیل ہو سکتا تھا۔ جب اس نے معذرت کی تھی۔“ فارہ بیچہ

”تمہارا پارٹ میل ہوتا۔ تو ہو سکتا تھا کہ وہ بھی تمہاری محبت کو بیاہنے کے تیار ہو جاتا۔ مگر تمہارا پارٹ میل نہیں ہوا۔ اس لیے وہ بھی تیار نہیں ہوا۔ لیکن اب اس کی مدد کو پارٹ انیک ہوا ہے تو وہ مجبوری کو بیاہنے کے لیے آمادہ ہے۔ اور تمہارے ساتھ رہتا ہے۔ اور یہ بھی رحمت کو بیاہنے کے لیے آمادہ ہے۔ اور یہ بھی رحمت کو بیاہنے کے لیے آمادہ ہے۔ اور یہ بھی رحمت کو بیاہنے کے لیے آمادہ ہے۔

”جی ہاں۔۔۔ میں کہہ رہی ہوں۔ کیونکہ میں نہیں جانتی کہ دوسرا ہارٹ انیک تمہاری مدد کو آئے اور دو روز

ہے۔ "دارائے اسدی ممکنہ رضامندی کا نقشہ ابھی سے پہنچ دیا۔ فارہ ایک دم چپ ہو گئی۔ کیونکہ ماورا کچھ غلط بھی تو نہیں کہہ رہی تھی۔ آخر اتفاقِ بزدلی کے انکار سے اتنی بڑی مصیبت آسکتی تھی تو پھر اس کے انکار سے بھی

”بہتر ہے کہ تم دونوں ایک ہی پارٹ اٹیک سے مان جاؤ۔ تاکہ دوسرے کی ضرورت ہی پیش نہ آئے۔ دیکھو میں تمہاری دوست ہوں۔ میں کبھی بھی تمہیں غلط مشورہ نہیں دوں گی، لیکن اس مشورے یہ عمل کرنا تمہاری

آگے جا کر کھنڈا۔ "ماورا نے بات ختم کرتے ہوئے فیصلہ قسمت پہ اور فارہ کی مرضی پہ چھوڑ دیا تھا۔ لیکن فارہ اس وقت کچھ بھی کہنے کی حالت میں نہیں رہی تھی۔ اس نے کچھ بھی کہے بغیر آہستگی سے فون بند کر

قدم بیڑھیوں کی طرف بڑھا دے۔ کیونکہ سامنے والے گھر کی چھت پر کھڑا رکاسل اسے ہی دیکھ رہا تھا۔ وہ اس لڑکے کو گھورتی ہوئی نیچے اتر آئی۔

وہ لڑکھینا "کوئی اجنبی تھا۔ کیونکہ اگر اس محلے کا رہنے والا وہاں سے چتا ہوتا کہ وہ کس مزاج کی اور کس ٹائپ کی لڑکی ہے۔ اس لیے اسے ٹاڑنے کی جرات کبھی بھی نہ کرتا۔ جیسے محلے کے باقی لڑکے نہیں کرتے تھے۔

”اے آئی کم ان سر۔“ عزت نے خاصے خوشگوار موٹوں پوچھا۔ تیور ایک دم چونک گیا۔
”اویس ڈارنگ! اہم ان۔ کم ان۔ آخر تمہیں اجازت کی کیا ضرورت؟“ تیور نے اسے دیکھتے ہی بے اختیار اپنے سامنے بیڑے رکھے۔ لیپ ٹاپ کو پیچھے سرکادیا اور اپنی پوری طرح اس کی طرف متوجہ ہوا۔ دروازے کوڑا اور دھکیلتی ہوئی اندر آئی۔

”ہائے! کیا ہو رہا ہے اس وقت؟“ وہ متوازن قدموں سے چلتی اس کے بیڈ کے کنارے آ کے ٹک گئی۔
”بس۔ اویس جو روز ہوتا ہے کام کام اور کام۔“ تیور نے کندھے اچکاتے ہوئے بیڈ پہ بکھرے کاغذات، فائلز اور لیپ ٹاپ کی سمت اشارہ کیا۔

”مگر مجھے تو اس کام کی کچھ سمجھ نہیں آ رہی۔“ عزت نے حیرت سے کہا۔
”وہ کیوں؟“ تیور کو اس کی حیرت پہ حیرت ہوئی۔

”وہ اس لیے کہ ٹی وی بھی چل رہا ہے، لیپ ٹاپ بھی آن ہے اور فائلز بھی کھلی پڑی ہیں۔ اس لیے سمجھ میں نہیں آ رہا کہ آپ کیا اور کس نوعیت کا کام کر رہے ہیں؟“ عزت کی مصنوعی حیرت سنوڑ گئی۔ تیور اس کی حیرت کا مفہوم جان کر بے ساختہ قہقہہ لگا کر ہنسا۔

”بس یا سر۔ امیرا کام کچھ ایسا ہی ہوتا ہے۔ ایک ہی وقت میں کئی کام کرنے پڑتے ہیں اور اس وقت بھی یہی ہو رہا ہے۔ کام بھی کر رہا ہوں اور ساتھ ساتھ نیوز بھی سن رہا ہوں۔ کیونکہ اتنی فرصت تو ملے گی نہیں کہ میں یہ دونوں کام الگ الگ وقت پہ کر سکوں۔ اس لیے مجھ جیسے آدمی کو سب کچھ ساتھ ساتھ کرنا پڑتا ہے اور ابھی تو شکر ہے کہ فنانس بند ہے۔ ورنہ وہ بھی کام کے دوران بھی کان سے لگا ہوتا۔“ تیور بے چارگی سے ہناتے ہوئے مسکرایا اور عزت کو سن کر افسوس ہونے لگا۔

”ہوں! کافی نف روٹین ہے آپ کی بھی۔ اتنا کام کرتے ہیں آپ۔ میں نے خواجوا آپ کو ڈسٹرب کر دیا آکر۔“ عزت معذرت خواہانہ سے لہجے میں بولی۔

”اے نہیں نہیں میری جان! مجھے تو بہت خوشی ہوئی ہے تمہیں یہاں دیکھ کر۔ البتہ یہ اور بات ہے کہ تم یہاں کی کام سے آئی ہو۔“ تیور نے پُر شفقت لہجے میں کہتے ہوئے اس کا ہاتھ پکڑ کر نرمی سے تھپکا عزت ایک دم ٹھنک گئی۔

”کیا مطلب؟“ آپ کو کیسے پتا کہ میں یہاں کسی کام سے آئی ہوں؟“ عزت نے تیور کے ہاتھ میں تھمے اپنے ہاتھ کو بمشکل لرزنے سے روکا۔ کیونکہ تیور کی بات سے اس کے اندر کا چور بدک گیا۔ تیور مسکرا دیا۔

”ناؤ درجود۔“ اس نے وال کلاک کی سمت اشارہ کیا۔ جہاں اس وقت رات کے ایک بجنے میں محض چار منٹ باقی تھے۔

”جی۔۔۔ وہ میں بھی جاگ رہی تھی۔ اس لیے چلی آئی۔“ اس نے وال کلاک سے نظر ہٹا کر چہرہ جھکالیا۔
”جاگ کیوں رہی تھیں۔؟“ تیور نے نرمی سے پوچھا۔

”بس ایسے ہی ایک فریڈ سے ٹیکٹ چھٹ ہو رہی تھی۔ لیکن میجسٹریٹ کرتے کرتے اچانک نیٹ ورک میں کوئی پرابلم آ گیا ہے اور میجسٹریٹ نہیں ہو رہا۔ نہ ہی کال مل رہی ہے۔ اس لیے۔“ اس نے کہتے ہوئے بات ادھوری چھوڑ دی اور تیور اس کا کام سمجھ گیا۔

”اس لیے تمہیں میرا موبائل چاہیے۔ ہے نا۔؟“ تیور نے اس کی ادھوری بات کو مکمل کیا۔
”جی۔۔۔ ایس تھوڑی دیر کے لیے۔“ اس نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے تیزی سے کہا۔
”پاکل! جب ضرورت ہے تو پھر تھوڑی دیر کیا اور زیادہ دیر کیا۔ وہ چار جنگ پہ لگا ہے لے جاؤ۔“ تیور نے

”مجھے۔۔۔ مجھے۔۔۔ ایک بار اس سے پوچھنا تو چاہیے تھا کہ وہ عزت حیدر کے جذبات اور احساسات کو اگر جھٹک کر گیا ہے تو وجہ کیا تھی؟ کیا میں اسے اچھی نہیں لگی؟ یا اسے کوئی اور اچھی لگتی ہے؟ بیوں بغیر کسی وجہ کے اور بغیر کسی دلیل کے تو تم میری ذات کی نفی نہیں کر سکتے ناولیڈر رحمان۔ اور نہ ہی مجھ سے اس طرح منہ موڑ سکتے ہو۔ تمہیں کچھ تو کہنا ہو گا۔ تمہیں کچھ تو بتانا ہو گا۔“

وہ بیڈ کراؤن سے ٹیک لگائے بیٹھی ٹی وی دیکھ رہی تھی۔ جب اس کا دھیان خود بخود ہی ولیدر رحمان کی طرف چلا گیا اور وہ بے چینی سے ٹی وی کے چینل بدلتے لگی۔ اسے ولیدر رحمان سے بات کرنے کا طریقہ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا اور مانع مسلسل حل سوچنے میں لگا ہوا تھا اور مختلف آئیڈیاز اس کے سامنے رکھ رہا تھا۔ جن کی وہ مسلسل نفی کیے جا رہی تھی۔

اس کے گھر کا ایڈریس کیا ہے؟ یہ بھی نہیں معلوم۔

وہ کہاں اور کیا جاب کرتا ہے؟ یہ بھی نہیں معلوم۔

یہاں تک کہ اس کا نمبر کیا ہے؟ یہ بھی نہیں معلوم۔

”نمبر۔۔۔؟“

وہ سوچتے سوچتے نمبر پہ آ کر ٹک گئی۔ کیونکہ اگر اسے نمبر مل جاتا تو وہ آسانی سے اس سے بات کر سکتی تھی۔ مگر سوال یہ تھا کہ نمبر کہاں سے؟ اس کے ذہن نے خود ہی سوال اٹھایا۔

”تیور بھائی۔!“ اور جواب میں ذہن خود ہی تیور کی طرف چل نکلا۔ لیکن دوسرا سوال ذرا مشکل میں ڈالنے والا تھا۔

”مگر میں تیور بھائی سے ان کے دوست کا نمبر کیسے مانگ سکتی ہوں بھلا؟ کیسے کہہ سکتی ہوں کہ تیور بھائی مجھے ولیدر رحمان کا نمبر چاہیے۔ میں اس سے بات کرنا چاہتی ہوں۔ مجھے اس سے کچھ پوچھنا ہے۔“

تیور کی طرف چلتے چلتے اس کے سوچ کے قدم ٹھنک گئے۔ وہ راستے سے پلٹ آئی۔

بے شک ان دونوں شخص بھائی کے درمیان بہت زیادہ انڈر اسٹینڈنگ تھی۔ لیکن ایسے معاملے آکر تو ہر بھائی کی طرح اس کی غیرت بھی اس کی راہ میں رکاوٹ بن کر کھڑی ہو سکتی تھی۔ وہ اس کی غیرت کو آزمانے اور چھیڑنے کا رسک نہیں لے سکتی تھی۔

مگر مسئلہ یہ بھی تھا کہ تیور کے سوا ولیدر رحمان کا نمبر ایڈریس بھی تو کہیں اور سے نہیں مل سکتا تھا۔ ولیدر کا نمبر تیور کے موبائل میں محفوظ تھا اور موبائل تیور کے پاس تھا۔

”موبائل۔۔۔؟“ پہلے نمبر اور اب موبائل پہ اس کی سوئی انگ گئی تھی۔ اچانک وہ کچھ سوچتے سوچتے ٹی وی کا رییموٹ بیڈ پہ اچھال کر بیڈ سے اٹھ کھڑی ہوئی اور اپنے چہرے کے تمام تاثرات پر قابو پاتے ہوئے سلیپر پہن کر باہر نکل آئی۔ اس کا رخ تیور کے بیڈ روم کی طرف تھا۔

لیکن بیڈ روم کے دروازے کے قریب پہنچ کر اس کے قدم رک گئے۔ چند لمحوں دروازے کے باہر ٹھہر کر اسے اپنی ساری ہمتیں جمع کرنی پڑیں اور اس کے بعد کہیں اس نے تیور کے بیڈ روم کے دروازے پہ دستک دینے کی جرات کی تھی۔

”ہوں! کون۔۔۔؟“ اندر سے اس کی مصروف سی آواز سنائی دی۔ عزت نے دروازہ ذرا سادھکیل کر اندر جھانکا۔

اس کے سر پہ چپٹ لگاتے ہوئے کہا اور بیڈ کی دوسری سائیڈ ٹیبل کی طرف اشارہ کیا۔
 ”تھینک یو بھائی! تھینک یو سوچ۔“ وہ تیزی سے اٹھی اور اس کا موبائل چار جگہ سے ہٹا کر باہر نکل آئی
 اپنے بیڈ روم کی طرف واپس آتے ہوئے اپنے ہاتھ میں تھے تیور کے موبائل کو دیکھ کر اس کے من کی کلی کھل
 اٹھی تھی۔

پھر اپنے بیڈ روم میں اگر دروازہ مقفل کیا اور پھر اپنے بیڈ پر اطمینان سے بیٹھنے کے بعد اس نے تیور کے
 موبائل میں محفوظ تمام کانٹیکٹ نمبرز سے ڈیٹا تلاش کیا۔ ولید کا نمبر ٹاپ پر آگیا۔ جس کو بڑی احتیاط سے اپنے
 موبائل میں محفوظ کرتے ہوئے وہ کچھ دیر کے لیے مطمئن ہو گئی۔ کیونکہ اب اسے ولید رحمان سے بات کرنے کے
 لیے لائحہ عمل تیار کرنا تھا۔

ولید اپنی کسی رپورٹ کی تیاری کے سلسلے میں نیوز چینل کے آفس میں مسلسل بھاگ دوڑ کر رہا تھا۔ جب
 اچانک اس کا موبائل بجنے لگا۔ پہلے تو وہ نظر انداز کیے اپنے کام میں لگا رہا۔ لیکن جب موبائل کی گھنٹی متواتر بجتی
 رہی تو مجبوراً اسے موبائل نکال کر دیکھنا ہی پڑا۔ اسے موبائل کی اسکرین پر ایک انجان نمبر نظر آیا جس کے
 باعث اس نے فوراً فون ریپو کیا۔

”ہیلو!“ غلت کے باوجود اس نے اپنے لہجے میں سکون اور ٹھہراؤ رکھا۔
 ”ولید رحمان؟“ دوسری طرف نسوانی آواز بھی اور آواز بھی وہ جس کو سن کر ولید اپنے اندر تک ٹھٹک گیا۔
 حالانکہ یہ آواز فون پر وہ پہلی بار سن رہا تھا۔ لیکن پہچانی ایسے تھی۔ جیسے صدیوں سے سنتا آ رہا ہو۔
 ”آپ کی خاموشی بتا رہی ہے کہ آپ ولید رحمان ہی ہیں؟“ اس کے لہجے کا سکون ولید کے سکون سے بھی
 زیادہ دہن تھا۔

”جی۔ میں ولید رحمان ہی ہوں اور آپ۔“ اس نے اجنبی ہو جانا چاہا۔
 ”آپ کی خاموشی یہ بھی بتا رہی ہے کہ آپ مجھے پہچان کر ہی خاموش ہوئے ہیں۔“ اس کا جواب استہزائیہ سا
 تھا۔

”آپ نے فون کیوں کیا؟“ ولید نے دو ٹوک انداز اپنایا۔
 ”آپ کو خاموش کرنے کے لیے۔“ اس کا لہجہ پل بھر میں بدلا۔
 ”کیا مطلب؟“ وہ الجھا۔

”ولید صاحب! مطلب پوچھنا آسان ہوتا ہے۔ لیکن مطلب سمجھنا بہت مشکل ہوتا ہے۔ آپ اگر
 مطلب سمجھنے کا وعدہ کریں تو مطلب بتاتی ہوں۔ ورنہ رہنے دیں۔“ وہ بھی اپنی طرزی کی ایک سی لڑکی تھی۔
 ”میں بہت مصروف ہوں۔ مجھے اس وقت کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا۔“ اس نے ٹالنا چاہا۔

”مصروف تھے تو مطلب کیوں پوچھا؟ اور اگر پوچھ ہی لیا ہے تو ذرا سا حوصلہ پیدا کریں خود میں۔ ساری بات
 کہہ دوں گی۔ بس آپ کی مصروفیت سے چند لمحوں درکار ہیں۔ پھر آپ کو میرے فون کا مطلب بھی سمجھ میں آجائے
 گا اور اپنی خاموشی کی وجہ بھی پتا چل جائے گی۔“ اس کا لہجہ میسم سا انداز لیے ہوئے تھا۔

ولید تذبذب کا شکار ہو گیا۔ اسے واقعی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کہے اور دوسری طرف وہ خفگی سے
 جھنجھلائے لگی۔
 ”ولید رحمان! آپ کو بات نہیں کرنی تو فون ہند کر دیں یوں چپ ہو جانے کا کیا مطلب۔“ اس کی خفگی اور

جھنجھلاہٹ اس کے لہجے سے ہی نمایاں ہو رہی تھی۔
 ”میں۔۔۔ ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ میں واقعی بہت مصروف ہوں۔“ ولید نے اپنے لہجے اور انداز کی اجنبیت
 پر قابو پانے کی کوشش کی۔

”آپ فارغ رہے ہوں گے؟“ وقت بتا دیں۔ میں کال کر لوں گی۔“ اس نے اس کی مصروفیت کا حل نکالا۔
 ”میری فراغت کا نام مقرر نہیں ہے۔ ایم سوری۔“ ولید نے معذرت کی۔
 ”اوکے! این یوش۔“ آپ کے پاس وقت نہیں ہے۔ میں کال نہیں کر دوں گی۔ مگر اس وقت آخری بات یہ
 بتا دیں کہ آپ تیور حیدر کی بہن کو انٹرویو کر رہے ہیں؟“ آپ وہ دو ٹوک ہوئی تھی۔

”کیونکہ وہ تیور حیدر کی بہن ہے۔“ ولید کا جواب برہنہ آیا۔
 ”اور اگر وہ تیور حیدر کی بہن نہ ہوتی تو۔۔۔“ اس کی برجستگی بھی کمال کی تھی۔
 ”تو پوچھ لیں کچھ اور ہوتی۔“ وہ بھی بے ساختہ کہہ گیا۔
 ”پوچھ لیں کچھ اور ہوتی۔“ مطلب۔۔۔“ وہ الجھی۔

”مطلب یہ کہ شاید پھر میں اپنی مصروفیت سے ٹائم نکال ہی لیتا۔“ اس نے اپنی مجبوری بتائی۔
 ”وہ! تو پھر یوں نہیں تاکہ آپ صرف تیور حیدر کی بہن کے لیے مصروف ہیں۔ ورنہ آپ کے پاس سب
 کے لیے فراغت ہے۔ سب کے لیے ٹائم ہے۔“ دوسری طرف اس کا لہجہ بجھ گیا اور ولید کو ایک بار پھر بھٹلانا
 پڑا۔

”نہیں! میں نے یہ تو نہیں کہا۔“ اس نے اس کی بات کی نفی کی۔
 ”آپ نے جو کہا میں نے سن لیا۔ کوشش کر لوں گی کہ آئندہ آپ کی مصروفیت میں خلل نہ ڈالوں۔ البتہ اس
 کوشش میں میں کہاں تک کامیاب ہوں۔ اس کا کوئی اندازہ نہیں۔ مگر پھر بھی کوشش ضرور کر لوں گی۔ اللہ
 حافظ۔“ گلے ہی پل اس نے بات ختم کر کے فون بند کر دیا۔ اپنی ٹیبل کے قریب کھڑا ولید اپنے موبائل کو دیکھتا رہا
 گیا۔

”عزت حیدر! وہ زرب بزدل آیا اور پھر بے ساختہ لب بھینچ لیے۔
 ”تم نہیں جانتیں۔۔۔ تم کچھ بھی نہیں جانتیں عزت حیدر۔ زندگی میں سب کچھ بتانے کے لیے نہیں ہوتا۔
 کچھ خاموش ہو جانے کے لیے بھی ہوتا ہے۔ محسوس ہو جانے کے لیے بھی ہوتا ہے اور بھول جانے کے لیے بھی
 ہوتا ہے۔“ وہ دل ہی دل میں بولا اور پلٹ گیا۔

میرے جسم سے اس کی خوشبو آج بھی آتی ہے
 میں نے فرصت میں بھی خود سے لگایا تھا اسے

بہنہ یزدانی کے اسپتال سے فارغ ہو کر گھر آتے ہی شادی کے ہنگامے جاگ اٹھے۔ اشتیاق یزدانی اور شہینہ
 یزدانی اتنے خوش تھے آج کل کہ کوئی بھی ان کی خوشی کی انتہا کا اندازہ نہیں لگا سکتا تھا۔ اتفاق ان کی اس قدر خوشی
 دیکھ کر اندر سے اور بھی افسردہ ہو گیا۔ اس کی آنکھیں بھر آئیں۔

اس کے ماں باپ کب سے اس مسرت کے انتظار میں بی رہے تھے اور وہ انہیں یہ خوشی دے ہی نہیں پار رہا تھا
 لیکن اب جب انہیں اس خوشی کا پروانہ دے دیا تھا تو اسے اپنا دل بھی کچھ ہلکا سا محسوس ہو رہا تھا۔ دل کے
 بوجھ میں ذرا کمی محسوس ہوئی دل کی دھڑکن بھی بڑی سبک رفتاری سے دھڑکنے کا کام کرنے لگی۔ وہ شادی کے تمام

ہنگاموں اور تیاریوں کو کافی دلچسپی سے انجوائے کر رہا تھا۔
ہر پریشانی اور پرہیزگاری کو بھول کر وہ سال پہلے والا اتفاق یاد دلائی بن چکا تھا۔ جس کے خواب و خیال کی دنیا سے
لے کر حقیقت کی دنیا تک صرف اور صرف فارہ رحیم کا راج تھا۔ اور اس دنیا میں وہ اس کے تابع رہتا تھا۔ اس کا
غلام بن کے۔

جہاں وہ اس کی پلکوں کی جنبش پہ حرکت کرتا تھا اور اس کی آنکھ کے اشاروں پہ سر جھکا تھا اور اگر وہ ابڑا چکا کر
دیکھ لیتا تو جان پہن آتی تھی۔
اور ایسا ہی اس کے ساتھ آج کل بھی ہو رہا تھا۔ دل غلامی پہ آمادہ اور دل غلیوں پہ بضد تھا۔
لیکن کامیابی آج کل دل کو ہی حاصل تھی۔ کیونکہ دل نے داغ کی طرف سے کان بند کر لیے تھے۔ وہ کچھ بھی
سننے کے لیے تیار نہیں تھا۔ بس اپنی ہی موج میں رواں تھا اور زندگی کو انتہائی قریب سے محسوس کر رہا تھا۔

”اسلام علیکم بابا۔“ اکیسے ہیں آپ۔؟“ تیمور تیار ہو کر آفس کے لیے نکل رہا تھا۔ جب اسے رضا حیدر کے
بلاوے۔ ان کے بیڈروم میں آنا پڑا تھا۔
”وعلیکم السلام! جیتے رہو خوش رہو۔ میں ٹھیک ہوں۔ تم سناؤ کیسے ہو۔؟“ وہ بیڈ پہ لیٹے ہوئے تھے۔ اسے
دیکھ کر تکیے کا سارا الیٹے ہوئے اٹھ بیٹھے اور بیڈ کراؤن سے ٹیکہ لگالی۔
”اللہ کا شکر ہے۔ میں بھی ٹھیک ہوں۔ بس آفس کے لیے نکل ہی رہا تھا کہ آپ کا پیغام پہنچ گیا۔“ تیمور نے
کندھے اچکائے۔

”ہاں! وہ اصل تمہیں یہ بتانا تھا کہ تمہیں فیصل آباد جانا ہے۔ ٹینہ اور اشتیاق کے ساتھ۔“ رضا حیدر
نے اپنے چہرے پہ ہاتھ پھیرتے ہوئے اپنی طبیعت کو ذرا فریض کرنا چاہا۔
”فیصل آباد۔“ ٹینہ آنٹی اور اشتیاق انکل کے ساتھ۔ مگر کیوں۔؟“ اس نے حیرانی سے سوال کیا۔

”وہ لوگ اتفاق اور فارہ کی شادی کی ڈیٹ فکس کرنے کے لیے جا رہے ہیں۔ انہوں نے مجھے بھی ساتھ چلنے کو
کہا تھا، مگر تم جانتے ہو کہ میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ آج شام چھ بجے ڈاکٹر کے ساتھ اپائنٹمنٹ بھی ہے
اس لیے میں نے ٹینہ سے کہہ دیا تھا کہ تم لوگوں کے ساتھ میرے بجائے تیمور چلا جائے گا اور تمہارے جانے کا
سن کر وہ بہت خوش بھی ہے کیونکہ اسے پتا ہے کہ تم مجھ سے بھی زیادہ اچھے طریقے سے سارے معاملات طے
کر لو گے۔“ انہوں نے اسے آمادہ کرنا چاہا۔

”معاملات! اکیسے معاملات بابا جان!؟ آپ کو پتا بھی ہے کہ میں صرف بزنس کے معاملات ہی طے کر سکتا
ہوں اس کے علاوہ مجھے کسی اور چیز کی کوئی خبر نہیں ہے اور یہ شادی بیاہ کی تو بالکل بھی نہیں۔“ تیمور بدک گیا۔
”خبر رکھو گے تو خبر ہو گی نا۔؟ اور ویسے بھی یہ کون سا مشکل کام ہے۔ صرف ایک دوسرے سے مشورے کے
ساتھ ڈیٹ فکس کرنی ہے اور مندی، ناپوں، بارات اور رخصتی کی ٹائمنگ طے کرنی ہے۔ باقی کوئی چھوٹا موٹا
مسئلہ ہوا تو وہ بھی ڈسکس کر لیتا۔ بس اتنا سا تو کام ہے۔“ انہوں نے بڑی سہولت سے اس سارے کام کو اتنا سا کام
کہہ کر بات ہی ختم کر ڈالی تھی۔

”مگر بابا! مجھے یہاں کام ہے۔ میں آفس چھوڑ کے کیسے جا سکتا ہوں بھلا۔؟“ وہ جھنجھلا نے لگا۔
”جیسے اپنے کسی کام سے جاتے ہو۔؟“ رضا حیدر سکون میں تھے۔
”مگر میں فیصل آباد۔“ تیمور کچھ کہتے کہتے رک گیا۔ اسے فیصل آباد کی سڑکوں پہ دھلنے والی ایک ہنگامہ خیز شام

یاد آئی اور فیصل آباد کے لیے پاپسندیدگی کے الفاظ منہ میں ہی رہ گئے۔
”جانتا ہوں، تمہیں فیصل آباد پسند نہیں ہے۔ مگر پھر بھی دعا ہے کہ تمہیں فیصل آباد پسند آجائے اور ایسا پسند
آئے کہ تم بار بار وہیں جاؤ اور بھاگ بھاگ کر جاؤ۔“ وہ کہتے ہوئے مسکرائے۔
”نہیں۔! ایسی بات نہیں ہے، فیصل آباد اتنا برا بھی نہیں ہے۔ بس کسی شہر کسی جگہ پہ دل لگنے کی بات ہوتی
ہے دل لگ جائے تو سب کچھ پسند آ جاتا ہے۔“ وہ بہت آہستہ سے بولا۔
”اوہ! یعنی اس کا مطلب یہ ہوا کہ ہمیں یہ دعا کرنی چاہیے کہ اللہ کرے تمہارا فیصل آباد میں دل لگ
جائے۔؟“ وہ معنی خیزی سے گویا ہوئے۔

”دعا تو بہت اچھی ہے مگر سب کے تو اور اچھی ہو جائے گی۔ فیصل آباد میں آنا جانا آسان ہو جائے گا میرا۔“
تیمور اپنے خیال کی تصحیح پہ کسی کا پیکر بھاگے مسکرایا۔
”ہاں۔؟ یہ تم کہہ رہے ہو۔؟“ نہیں حیرت کا جھکا لگا۔

”جی۔! اب میں ہی کہہ رہا ہوں۔ آپ بس دعا کیجئے میں فیصل آباد میں دل لگانے کے لیے تیار ہوں۔ میرا
مطلب ہے کہ فیصل آباد جانے کے لیے تیار ہوں۔ آپ ٹینہ آنٹی کو بتا دیجئے۔“ وہ کہہ کر باہر نکل گیا۔
اور رضا حیدر حیران پریشان رہ گئے کہ تیمور کے منہ سے ایسی بات۔؟ حیرت ہی تو تھی۔

”فارہ! میں نہیں آسکتی۔ تمہیں پتا تو ہے کہ میرا تمہارے گھر آنا کتنا مشکل ہے؟ امی اجازت نہیں دیں
گی۔“ اور انے سے ٹاننا چاہا۔

”مگر اور!۔! اتم پہلے بھی تو ایک دو بار میرے گھر آ چکی ہوتا۔ وہ بھی آنٹی کی اجازت کے بغیر۔ تو پھر اب کیوں
نہیں۔؟“ فارہ اتفاق کی وجہ سے پہلے ہی ایک عجیب سی نگاہ کا شکار تھی، اب ماورا کے انکار پہ مزید رہا کسی سی
ہوئے لگی۔

”فارہ! فارہ! پلیز پہلے کے آنے میں اور اب کے آنے میں بہت فرق ہے یا۔ پہلے میں دن کے وقت
آئی تھی۔ وہ بھی صرف دس پندرہ منٹ کے لیے اور اب تم رات کے وقت آنے کا کہہ رہی ہو۔ وہ بھی دو تین
گھنٹوں کے لیے۔ تو پھر تم خود سوچو کہ ایسے ٹائم میں، میں امی کی اجازت کے بغیر گھر سے کیسے باہر نکل سکتی ہوں
۔۔۔؟“ ماورائے الناس سے سوال کیا۔

”مگر میں اور کیا کروں۔؟ کس سے کہوں کہ میں اکیلی ہوں۔ اور مجھے کسی کی اہلی کی ضرورت ہے۔ یہاں
میری کوئی کزن نہیں ہے اور نہ ہی تمہارے سوا اور کوئی دوست ہے۔“ فارہ تو جیسے رو دینے کو تھی۔

اور ماورا چند خانے کے لیے خاموش ہو گئی۔ اسے فارہ کے بارے میں سوچ کر اس پہ ترس آیا۔
”ماورا۔! پتا تو دار کس سے کہوں۔؟“ کس سے التجا کروں کہ میری شادی ہے اور مجھے کسی دوست کے
سارے اور اپنائیت کی ضرورت ہے؟ میں اتنی خوشی کے باوجود اندر سے بہت پریشان ہوں اور مجھے اس پریشانی میں
کوئی تسلی دینے والا چاہیے۔ کوئی ایسا جو مجھے۔ میری تکلیف اور میری اذیت سمیٹ سمجھ سکے۔“

فارہ کہتے کہتے روزی اور پٹی بار ایسا ہوا تھا کہ ماورا کے پاس کہنے کے لیے کچھ بھی نہیں رہا تھا۔ وہ کوئی طنز اور
کوئی چوٹ نہیں کر سکی اور نہ ہی اس نے کوئی سخت ست الفاظ کہے۔ بلکہ چپ کی چپ رہ گئی۔ فارہ نے آہستہ
سے فون بند کر دیا۔

”ارے۔! چپ کیوں ہو گئی ہو پچھ۔؟ سہیلی ناراض ہو گئی کیا؟“ بی گل کے سوال پہ وہ چونک گئی اور پھر

”عافیه!“ لی گل کی آواز یہ وہ کسی گھرے خیال اور کسی گہری دلیل سے چونک گئیں اور پھر ایک گہری سانس کھینچتے ہوئے ان دونوں کی سمت دیکھا۔
 ”ٹھیک ہے۔“ اتم جاسکتی ہو۔ مگر اتنا یاد رکھنا کہ تم میری زندگی بھر کی جمع پونجی ہو۔ اگر اس جمع پونجی کو ذرا سا بھی نقصان پہنچا تو زندہ میں بھی نہیں رہوں گی۔ کیونکہ میں پہلے بھی یہ نقصان اٹھا چکی ہوں۔ اب اور حوصلہ نہیں ہے مجھ میں۔“ عافیه بیگم ہیکلے لہجے میں کہہ کر وہاں رکی نہیں تھیں۔ وہ فوراً ہی اٹھ کر اپنے کمرے میں چلی گئی تھیں اور وہ دونوں دیکھتی رہ گئیں۔

”لی گل!“ اور انے خاصی بے بسی سے ان کے چہرے کی سمت دیکھا۔
 ”بس۔ بس۔“ تم جانے کی تیاری کرو۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ فکر کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ انہوں نے ماورا کو پریشان ہونے سے روکا۔
 اور پھر وہ لی گل کے کہنے پہ دل پہ افسردگی اور بد مزگی کا بوجھ لیے اٹھ گئی تھیں۔ لیکن پندرہ بیس منٹ کے بعد وہ تیار ہو کر باہر نکلی تو تب بھی اس کا یہی حال تھا۔
 ”لی گل!“ میرا کہیں بھی جانے کو دل نہیں چاہ رہا۔ میں کیا کروں؟ کیا کروں آخر؟ ماورا خاصی بد دل ہو رہی تھی۔ لیکن لی گل نے اس کا حوصلہ کرنے نہیں دیا۔

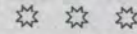
”دیکھو بیٹا! اتم اس وقت کچھ مت سوچو۔ صرف یہ سوچو کہ تمہاری سہیلی تم سے ناراض ہے اور تمہیں اسے کسی بھی طریقے پر مٹانا ہے۔ اس کی ناراضی کا مان رکھنا ہے۔ اگر نہ رکھا تو وہ تم سے کھوجائے گی اور تم کو ہمیشہ پشیمانی رہے گی۔ جبکہ عافیه تمہاری ماں ہے۔ ہمیشہ تمہارے پاس رہے گی۔ تم اپنی ماں کو مٹا سکتی ہو۔ جب چاہے اسے راضی کرو۔ ماں کو راضی کرنا اور رب کو راضی کرنا زیادہ مشکل نہیں ہوتا۔ سچے دل سے ایک بار بھی توبہ کر لو تو فوراً مان جاتے ہیں۔ مجھے پتا ہے کہ تم اس وقت تکش کا شکار ہو۔ مگر بیٹا! میری دعائیں تمہارے ساتھ ہیں۔ تم خوشی خوشی جاؤ۔ تمہاری نیت اچھی ہے۔ اللہ رحم کرے گا۔ شاباش۔ جاؤ جلدی جاؤ۔“ لی گل نے اسے بھرپور تسلی سے نوازا۔ ماورا کو بالآخر دل مضبوط کر کے قدم اٹھانا ہی پڑا۔ سوہان کو خدا حافظ کہہ کر گھر سے باہر نکل آئی۔
 آخر ایک دن تو ایسا ہونا ہی تھا کہ اسے اپنی ماں کی مخالفت کے باوجود بھی کوئی قدم اٹھانا تھا۔ سو اس نے آج ہی اٹھالیا تھا۔

(باقی آئندہ شمارے میں ملاحظہ فرمائیں)

پڑھیں سب سے اٹھ کر صحن میں پتھی ان کی چارپائی پہ آ بیٹھی۔
 ”سہیلی ناراض ہو جائے تو کیا کرنا چاہیے؟“ اس نے حد درجہ سنجیدگی سے استفسار کیا۔
 ”تو سہیلی کو سہیلی بن کر مٹانا چاہیے۔“ لی گل کا جواب پر سکون سا تھا۔
 ”مگر مٹانا مشکل ہو تو؟“

”تو پھر سہیلی آسانی سے کھوجاتی ہے۔ اور جو آسانی سے کھوجاتے ہیں وہ بڑی مشکل سے ملتے ہیں۔“ لی گل نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر نرمی سے تھپکا۔
 ”دیکھ لی گل میں اسے کھونا نہیں چاہتی۔“ ماورا نے بے حد آہستگی سے نفی میں گردن ہلائی۔
 ”تو پھر مٹا لو۔“ ان کا وہی مشورہ تھا۔
 ”ہوں۔ اب یہی سوچ رہی ہوں کہ مٹانا تو پڑے گا ہی۔ مگر اس کو مٹانے سے پہلے امی کو مٹانا زیادہ ضروری ہے۔“ ماورا کا انداز کافی پر سوچ سا تھا۔
 ”تو ٹھیک ہے نا۔ جو زیادہ ضروری ہے پہلے وہ کرلو۔“ وہ تو ہر بات پہ متفق اور پر سکون ہی تھیں۔
 ”لیکن امی آئیں گی تو تب نا؟“ پہلے تو بھی اتنی دیر نہیں لگائی انہوں نے۔ ”ماورا نے موبائل اسکرین پہ ٹائم دیکھتے ہوئے کہا۔

”بیٹا۔ اب بازار میں دیر ہو رہی جاتی ہے۔ ابھی آجائے گی۔ فکر نہ کرو۔“ لی گل اٹھ کر بیٹھ گئیں۔
 اور ماورا عافیه بیگم کا انتظار کرنے لگی۔ کیونکہ اسے فارہ کے پاس پہنچنا تھا اور وہ لیٹ ہو رہی تھی۔



عافیه بیگم کو ماورا کے جانے کا سن کر یوں لگا۔ جیسے کرنٹ چھو گیا ہو۔ وہ بدک گئیں۔ انہوں نے ماورا کو خاصی سخت نظروں سے دیکھا۔
 ”امی پلیز! میری اور کوئی دوست نہیں ہے اور نہ ہی میرا کسی کے گھر آنا جانا ہے۔ بس صرف یہی ایک دوست ہے اور اب وہ بھی چار دن کی مہمان ہے۔ شادی ہو گئی تو کراچی چلی جائے گی۔ بعد میں پھر کب ملاقات ہوگی یہ تو ہمیں بھی نہیں پتا۔ لیکن پلیز جتنا عرصہ وہ یہاں ہے اور جب تک اس کی شادی کا فنکشن ہے۔ تب تک ہمیں ایک دوسرے سے ملنے کی اور فنکشن اٹینڈ کرنے کی اجازت دے دیں۔ صرف اس بات پہ بھروسہ رکھ کے کہ اللہ کے رحم سے اگر پہلے کبھی کچھ نہیں ہوا تو ان شاء اللہ اب بھی کچھ نہیں ہوگا۔ آپ کی بیٹی ماورا مرتضیٰ آپ کو کبھی شکایت کا موقع نہیں دے گی۔“ ماورا نے بڑے مضبوط لہجے میں انہیں یقین دلایا۔ جس پہ انہوں نے لی گل کی سمت دیکھا۔ وہ توازن سے اسی کی طرف دار تھیں اور اسی کی حمایت میں بولتی تھیں۔ اس وقت بھی انہوں نے اسی کی حمایت میں سر ہلایا۔

”جانے دو عافیه! اللہ یہ بھروسہ رکھو۔ اپنے خوف کو اپنی بیٹی کی خوشیوں کے آڑے مت آنے دو! اسے زندگی جی لینے دو اپنی۔“ انہوں نے آگے بڑھ کے عافیه بیگم کے سر پہ ہاتھ رکھ کے ان کی ہمت بندھائی اور انہیں تسلی دینے کی کوشش کی۔

”امی! میں آپ کے جسم کا۔ آپ کی ذات کا حصہ ہوں۔ میں آپ کا اپنا آپ ہوں۔ کیا آپ کو اپنے آپ پہ بھی یقین نہیں ہے؟“ ماورا کا لہجہ اور سوال دونوں ہی بہت عجیب سے ہو رہے تھے۔
 اور وقتی طور پر عافیه بیگم کے پاس کہنے کے لیے کچھ بھی نہیں رہا تھا۔ وہ اپنی جگہ پہ جوں کی توں چپ چاپ بیٹھی رہ گئیں۔

ادارہ خواتین ڈائجسٹ کی طرف سے بہنوں کے لئے خوبصورت ناول

- ☆ تتلیاں، پھول اور خوشبو راحت جبین قیمت: 250 روپے
- ☆ بھول بھلیاں تیری گلیاں فائزہ افتخار قیمت: 600 روپے
- ☆ محبت یہاں نہیں لہنی جدون قیمت: 250 روپے

مکتبہ کا پتہ: مکتبہ عمران ڈائجسٹ، 37- اردو بازار، کراچی۔ فون: 32216361

عیدِ شیل

”اوہ ہلے لوکے! کسی زمانے میں دال بڑا مال ہوتا ہو گا۔ اب تو دال سب سے مہنگا مال۔۔۔ تو شکر کر، شکر سو بنا رہ کھانے کو دال تو دیتا ہی ہے اور دال کون سا پانی میں پکتی ہے۔ ساتھ میں نمک، مرچ، ہلدی اور تسن، اور کپ، پیاز، زیرے کا بھار، ہر اوجھنا، قصوری میتھی۔۔۔ چلو بھر بھی یا تیل ہو تو دال پک کر سامنے آئے کی دباڑی بھری کمانی تو دال ہی نکل لیتی ہے۔۔۔ مرغ مسلم اور برائی کہاں سے لاؤں؟“

مشاق احمد نے روٹی کا قلمہ منہ میں ڈال کر چباتے چباتے بات مکمل کی۔

”اور کیا میں نہیں جانتا کہ تیرے سیکے میں کون سا زردے پلاؤ کی ویکس چڑھتی تھیں۔۔۔ جیسے ہم ویسے تم۔ خدا کی قسم میں طعنہ نہیں دے رہا۔“ اس نے نئی نویلی بیوی کے ماتھے پر ان گنت بل دیکھ کر جلدی سے وضاحت کی۔

”ہاں! لیکن اماں سکول سے آتے ہوئے کینٹین کے چھوٹے چاول وغیرہ لے آتی تھی تو منہ کا ذائقہ بدل لیتی تھی۔ یہاں تو دو اڑھائی ماہ میں دال، آلو، اور دال کے علاوہ تیری چیز ہی نظر نہیں آتی۔ میں تنگ آ گئی ہوں کھا کھا کر!“

مشاق نے نظر اٹھا کے بیوی کو دیکھا۔ اس کا قلمہ والا ہاتھ معلق ہو گیا تھا۔ اس کی بیوی صفری کے سامنے چنگیر میں روٹی اور دال کی پلیٹ ویسے ہی دھری ہوئی تھی۔

”دیکھو سیانی۔۔۔ بشری سیانی!“ ان دو اڑھائی ماہ میں

مشاق کے لاڈ پیار کا آتماز اسی جیلے سے ہوتا تھا۔

”تم تو جانتی ہو باب میرا فاج کا مریض ہے ماں کے گوڑے جواب دے گئے ہیں۔ پھر مجھ سے چھوٹے بہن بھائی بھی خرچے کے لیے میرا منہ دیکھتے ہیں۔۔۔ اب تم خود ہی بتاؤ یہ دال چاول کی ریڑھی سے میں روزانہ کچا کچا پیاز ہزار فوج کہاں سے لاؤں؟ بڑی مشکل سے ڈیڑھ دو سو روپے کی بچت ہوتی ہے۔ جس میں گھر بھی چلانا ہوتا ہے اور ابا کی روٹی کا خرچہ بھی نکالنا ہوتا ہے۔“

صفری نے آنسو پونچھے اور کہا ”یہ سب تو مجھے ہی بتا ہے۔ میں دل کو سمجھاتی بھی بہت ہوں۔ پر کیا کروں۔ مجھے چٹھنی چیزوں کا بہت شوق ہے۔ میں اتنے صبر والی نہیں ہوں“ آپ کی ماں بہنوں کی طرح کہ اگر آپ کی ریڑھی سے دال بچ کر نہ آئے تو میں پانی میں نمک، مرچ گھول کر روٹی کھا لوں۔“

”تم حوصلہ کرو۔ ان شاء اللہ اچھے دن ضرور آئیں گے۔ تم کیوں پریشان ہوتی ہو؟“ مشاق خود اسے رونا دیکھ کر ہاتھ پاؤں چھوڑ بیٹھا تھا۔

”میں بھی کوشش کروں گا کہ دال چاول کی ریڑھی کے ساتھ کچھ اور کام دھندا شروع کروں۔ پر کیا کروں یا۔۔۔“ اس نے بات ادھوری چھوڑی اور چہرے پر حد درجہ افسردگی طاری کر کے صفری کو دیکھنے لگا۔

”میں کچھ اور کام کر نہیں سکتا۔“

”وہ کیوں؟“ صفری نے بے ساختہ سوال کیا۔

”اس لیے کہ روزی روٹی کے پیچھے چوبیس میں سے

میں گھٹنے لگا اور نئی نویلی اکلوتی بیوی سے غفلت برتا بھی تو تم سے برداشت نہیں ہو کا ناں۔۔۔ پر کتنی ہو تو کسی دوسری جگہ کام شروع کر دیتا ہوں۔“ اس نے شرارت سے بیوی کو دیکھا۔

”کہو! منظور ہے۔۔۔؟“

صفری گم صم کی ہو گئی۔ ہاں کہتی ہے تو بچتی ہے۔ میاں کی شکل دیکھنے سے بھی جائے کی سنہ کہتی ہے تو پتا نہیں کب تک وال کاہی منہ دیکھنے کو ملے گا۔ تنگ آ کر اس نے کہا۔

”آپ مجھے امی کی طرف چھوڑ آئیں۔“

بہنوں بعد میکے جانے کا اتفاق ہوا۔۔۔ چھوٹے بہن بھائی تو اس کی شکل دیکھ کر ہی حق دق رہ گئے۔ وہ شادی کے بعد بھڑکیلے کپڑے لال لگال ہوتے چہرے، چمن چمن کرتی چوڑیوں والی صفری کہاں مرمر آگئی؟ ماں کے سینے سے لگ کے اس نے اگلی پچھلی تمام کمرس پوری کر دیں۔

”ماں! لوہاں کی سب سے بڑی عیاشی دال روٹی ہے۔ میرے حلق میں دال بھرا نوالہ جھنسن جاتا ہے۔“ وہ آنکھوں کا پانی انگلی کی پور سے صاف کرتے ہوئے بولی۔

”یہ کیا کہتا ہے؟“ ماں کلپارہ اوپر چڑھا۔

”تم ہاتھ پاؤں چھوڑ کے بیٹھ گئی ہو؟ دس جماعتیں میں نے اس لیے دھووائی تھیں؟ بجائے شوہر کی دل جوئی کے یہ سلوک کرتی ہو اس کے ساتھ؟ وہ بے چارہ ایک ریڑھی لگا کے سو دو سو روپے کمائے تو تمہارے زبان کے چیکے پر خرچ کر دے؟ پیار پاپ کے علاج اور گھر کے بلانی الفز اور خرچ نہ کرے؟“

اماں کا جلال ہی جلال تھا۔ صفری نے آنکھ اٹھا کر ماں کی طرف نہ دیکھا۔ روتے روتے وہ بے دم ہو گئی تھی۔ پھر ممتا کا جوش کام میں آیا۔۔۔ اسے سینے سے لگا کے وہ خود بھی رو پڑیں۔

”اچھے برے دن ہر ایک پر آتے ہیں۔ لیکن اس



میں ایسے بھول سے سبق سیکھتے ہیں۔۔۔ ہمارا باپ حق حلال کی مکائی کھاتا تھا۔ لیکن ساتھ ہی نصیحتوں کی بنیادیں کھول دیتا تھا۔ شادی سے پہلے ان کا ایک لفظ سمجھ میں آیا۔ نہ سمجھنے کی کوشش کی۔ جب تمہارا باپ حادثے میں اچانک دنیا سے رخصت ہوا۔ مسائل کی کڑی دھوپ میں سلگنا پڑا تو ایک ایک لفظ کالوں سے نکل کر دماغ میں پچھنا شروع ہوا تو دل کو سکون سا ہوا۔ کسی کے آگے ہاتھ پھیلائے نہ دل تنگ کیا۔ ہاتھ نہ ہاتھ رکھ کے بیٹھنے کی میرے مذہب میں قطعی منع تھا۔ نہیں۔۔۔ ہمارے باپ نے اٹھتے بیٹھتے ایک ہی بات سمجھائی کہ انسان کی شان کپڑوں اور گھریا سے



امت الغریبہ شہزاد

ماکی کسپاری

ہے۔ ”ان کی معلومات متنت تھیں۔

”بس! رہنے دو یہ ڈرامے“ انہوں نے سر جھٹکا۔ ”اس میں تو نامعلوم کیا کیا کچھ دکھاتے اور بتاتے رہتے ہیں۔ ڈیڑھ دو کوڑے کم کے گھر نہیں ہیں یہاں۔“ گاڑی ذرا سا آگے ٹھکی۔

”بس! بس! کچھ نہیں جانتی۔ آپ جلدی سے گلشن والے پلاٹ کی تعمیر شروع کروائیں۔ کم از کم اس سے تو بہتر ہے وہ علاقہ۔“ وہ اصرار کرنے لگیں۔

”مفتے کا دن تھا۔ سو ٹیفک کارش معمول سے کچھ زیادہ ہی تھا۔ موسم کئی روز سے ابر آلود تو تھا۔ مگر اتنا سہانا نہیں کہ کسی پکنک یا آؤٹنگ کا موڈ بن سکے۔ آج موسم بھی گویا اپنے شباب پر تھا۔ تب ہی اہلیان کراچی کی بڑی تعداد سڑکوں پر تھی۔

”افو! کیا مصیبت ہے بھی۔ پچھلے پچیس منٹ سے یہیں پھنسے ہوئے ہیں۔ آپ ہارن تو بجائیں نا۔ تاکہ آگے والے ٹیکسیں تو سہی۔“ اسماہ نخت آمیز بے زاری سے گویا ہوئیں۔ اچھا موسم، ویک اینڈ اور شوہر تاندار کا خوشگوار موڈ۔

سارے ہی پس پوانٹمنٹس یکجا تھے۔ تب ہی تو اسماہ بڑے دھڑلے سے ”شاپنگ پس لاگ ڈرامو“ کی فرمائش کر گئیں۔ جو فیصل نے بنا رو قدر کیے پوری کرنے کی باہمی بھی بھری۔

تین تین شاخ رنگوں والے لان کے نئے برانڈڈ سوٹ میں سچی سنوری سی اسماہ اور سفید کاٹن کے آرام دہ شلوار سوٹ میں فیصل اپنی سفید بیش قیمت گاڑی میں سڑک پر رواں تھے۔

”ہارن بجائے سے کیا ہو گا۔ سڑک آگے تک بلاک ہے۔“ ان کی نظریں وینڈاسکرین پر تھیں۔

”ایک تو آپ میری سنتے بھی تو نہیں کرب سے کہہ رہی ہوں پچھو ڈوس اس علاقے کا پچھا۔ یہ علاقہ بھلا اب متول لوگوں کے رہنے کے قابل بھی کہاں رہا ہے۔ ذرا سڑکوں کا حال دیکھیں۔ لوگوں میں تیز نام کی کوئی چیز نہیں۔ اوپر سے مارا ماری الگ اور اگر بھی کافٹن یا ڈیفنس جانا پڑ جائے تو ایک گھنٹہ تو راستے ہی میں لگ جاتا ہے۔“ وہ سخت ناراض تھیں۔

”کیوں اس علاقے میں انسان نہیں رہتے۔ اور تم سے کسی نے کہا کہ یہ متول لوگوں کے رہنے کی جگہ نہیں؟“ وہ بھی گرم ہوئے۔ حالانکہ گاڑی کا اسے پوری طرح کام کر رہا تھا۔

”لو۔“ انہوں نے سیدھا ہاتھ نکھلیا۔ ”کے گا کون۔“ ڈراموں میں جب کسی کا غریب رشتے دار دکھایا جاتا ہے تو وہ عموماً ”اسی علاقے سے تعلق رکھتا

ماہ نے اسے چھٹی دی۔

”انھو! مشتاق کے آنے کا وقت ہو گیا ہے۔ اپنا حلیہ درست کر۔“ رو رو کر آنکھیں سجا رہی ہیں۔

اس نے ابھی غسل خانے میں قدم رکھا ہی تھا کہ اماں کے فون پر بیل ہوئی۔ اپنا نام سن کر وہ کھٹکی۔

فون بند کر کے اماں اس کی طرف آئیں تو ان کے چہرے پر مسکراہٹ جگمگا رہی تھی۔

”مشتاق کا فون تھا کہ آج صغریٰ ہمیں رہے میرے وال چاول ایک ہوٹل والوں کو اتنے پسند آئے

ہیں کہ انہوں نے اسے ہوٹل میں ملازمت دے دی ہے۔ دونوں وقت کا کھانا اور موٹر سائیکل بھی ہوٹل والوں کی طرف سے ہو گا۔ مستقل ملازمتوں کے لیے

اور بھی بہت سی سہولتیں ہیں۔“

صغریٰ بس ایک سی بات سوچ رہی تھی۔ اس کی ایک خواہش منہ سے نکلی۔ رپ نے پورا کر دی۔ وہ اب ہوٹل کے نئے پکوان بھی کھا سکتی ہے لیکن۔

لیکن۔ کتنی معمولی سی خواہش کے لیے وہ ہلکا ہوئی؟ بندے بندے کی بات ہوتی ہے۔ خواہش تو بلا ہاجرہ نے بھی کی تھی۔

کتنی بڑی خواہش کہ تاقیامت ان کی کوشش اور خواہش کو زندہ رکھا جائے گا۔

اپنی اور ان کی خواہشوں کے تقابلی جائزے سے نہ رامت اسے ملی وہ اس لذت سے کہیں زیادہ تھی۔ اچھا کھانا کھانے کے بعد اسے ملا کرتی تھی۔

اور شاید آئندہ ساری زندگی ملے بھی ناں! بس ایک چیز مل گئی واقف۔

اللہ پرمان توکل پیار۔

اللہ پرمان توکل پیار۔

اللہ پرمان توکل پیار۔

اللہ پرمان توکل پیار۔

اللہ پرمان توکل پیار۔

نہیں! اس کے کردار سے ہے۔ سو الحمد للہ! پورے محلے میں کوئی میلی آنکھ سے نہیں دیکھ سکتا۔ کدھ سکھ میں پورا محلہ شریک ہوتا ہے۔ کیا یہ اس کا احسان نہیں؟ میرے پاس تو دنیا کی کوئی تعلیم نہیں۔ پھر بھی کبھی حوصلہ نہیں ہارا تھا۔ تم تو ایک نہ دو پورے دس سال سرکار کے اسکول میں بڑھتی رہی ہو۔ کیا تمہیں وہاں سے کوئی ہنر نہ ملا زندگی گزارنے کا؟“

”ابی! کیا کروں میں۔ مجھے تو کچھ بھی نہیں آتا۔“ وہ روہانی ہو کر بولی۔

”تم اپنے علم کو کام میں لاؤ۔ اماں ہاجرہ سے سبق لیکھو۔ جب پینے کا پانی اور بھجوروں کا ذخیرہ ختم ہو چکا تھا۔

جب روئے زمین پر کوئی اپنا یا پر اپنا ان کے پاس نہ تھا۔ اڈوس پڑوس مسرال، میکے کا نام و نشان نہ تھا۔

اس لبق و وقیح صحرا میں جب بھوک اور پیاس نے ناں اور بیٹے دونوں کو شکمے میں قابو کر لیا تھا۔ اس تن تنہا عورت نے موت کا مقابلہ کیا۔ اس نے رہتی دنیا تک ثابت کر دیا کہ حالات کا رونا نہیں روتے۔ بلکہ کر

گزرتے ہیں۔ وسائل اسباب پاس نہ بھی ہوں۔ بس کوشش کرنے کے لیے پاؤں کی ایڑی زمین پر سے اٹھا دیتے ہیں۔ پھر اللہ بھی پیانے بدل لیتا ہے۔

وہ کوشش اور کارگزاری کو پسند کرتا ہے۔ اس مایوسی کی دلدل میں اترنے کے بجائے توکل اور تدبیر کرنے والوں کے صدمے میں قیامت تک کے لیے زم زم کے چشمے جاری کر دیتا ہے۔ کہاں لحد بھر کو سانس لینے

رکیں۔ پھر اپنی بات جاری رکھی۔

”تم تو جوان جہان ہو۔ میاں کا سایہ اللہ نے سر پر سلامت رکھا ہے۔ تم بھی کچھ کرو۔ کڑھائی سلائی کا خنر جانتی ہو۔ اسے کام میں لاؤ۔ کدھیں بیٹھ کر تعلیم جاری رکھو۔ مندوں کو اپنے ہنر میں ساتھ ملاؤ۔ تم نہ بھوگی

برکتوں اور رحمتوں کا ختم نہ ہونے والا سلسلہ شروع ہو جائے گا۔“

اللہ پرمان توکل پیار۔

اللہ پرمان توکل پیار۔

اللہ پرمان توکل پیار۔

”کوشش تو کر رہا ہوں۔ دعا کرو انبالہ والوں کا ٹھیکہ مجھے مل جائے۔ پورے پانچ ہولڈر بنانے والے ہیں وہ۔ اگر یہ ٹھیکہ مل گیا تو وارے نیارے سمجھو۔“ اندرونی جذبات سے ان کا چہرہ ختمائے لگا۔

”ہائے اللہ! شرط انبساط سے بارہ کی جج ہی نکل گئی۔“ آپ نے ہلکے کیوں نہیں بتایا؟ بس کل ہی سے مدرسے کے بچے بلوا کر ختم کروانا شروع کرتی ہوں۔ ضرور ہی ہمارا بیڑا بار ہوگا۔“ وہ مار۔ رنخندیت کے آنکھیں بند کر کے مٹنے لگیں۔

”ہاں! ہاں! ضرور کروانا بی الحال تو وہ دعا یاد کرو جو اماں نے ٹریفک میں پھنس جانے کی صورت میں پڑھنے کو بتائی تھی۔“ پینتیس منٹ بعد بالآخر ان کا صبر جواب دے گیا تھا۔

”آپ کی اماں تو دعاؤں کا چلتا پھرتا اشتہار تھیں۔ سوئے وقت یہ دعا پڑھو کھاتے وقت وہ دعا پڑھو۔ اور تو اور بارش کے برینے اور بادل کے گرجنے تک کی دعاؤں انہیں ازبر تھیں۔ اب اتنی تو اتار سے وہ دعاؤں پتائیں گی تو انسان کو خاک پا رہے گا کہ کون سی دعا کب مانگنی ہے۔“ وہ استہزائیہ لہجے میں بولیں۔

”ہاں! یہ تو ہے۔ اماں کو ہر موقع کی مسنون دعاؤں یاد تھیں۔ مجھے راشد اور فاطمہ (پھوٹے بہن بھائی) کو انہوں نے ساری دعاؤں یاد کروائی تھیں۔ میں تو اب ان کے سکھائے سارے سبق بھول بھال گیا۔ ان دونوں کو شاید یاد ہوں۔“ وہ کھوئے کھوئے سے لہجے میں بولے۔

”چھوڑیں دعاؤں کو۔۔۔ آپ ہارن بجائیں۔“ وہ پہلو بدل کر بولیں۔

”ایک تو یہ شوہر نای مخلوق۔ لاکھ اس کے لیے اپنا پتاپانی کرو۔ گرنے اپنی اماں کے ہی گائے گا۔“ وہ منہ دوسری طرف کر کے خاموشی سے باہر دیکھنے لگیں۔

دل میں البتہ بڑبڑا ہٹ جاری تھی۔

”یاں لیاد آیا۔۔۔ تیرا کلمہ۔۔۔ تیرا کلمہ پڑھنے کو کہتی تھیں اماں۔ جب کبھی ٹریفک میں پھنس جاؤ۔ تیرے کلمے کا ورد شروع کرو۔ دیکھنا، کتنی آسانی سے

رش سے باہر نکل آؤ گے۔“ فیصل کے دماغ میں اماں کی آواز گونجی۔ اس نے زیر لب ورد شروع کر دیا۔ دس منٹ بمشکل گزرے ہوں گے کہ ٹریفک رواں ہو گیا۔

”صد شکر۔“ انہوں نے گہری سانس لی۔

”دیکھا، یہ جو آپ کے ساتھ کھڑے اتنے لوگ ہارن بجارہے تھے۔ اسی وجہ سے آگے والوں کو کھٹکنے کا خیال آیا۔“ وہ یوں غریہ بولیں۔ جیسے اس میں ان کا کمال ہو۔

”جی نہیں! میں دعا پڑھ رہا تھا۔ اس وجہ سے ٹریفک رواں ہوا ہے۔“ وہ اب سراب گوٹھ کے پل سے اتر رہے تھے۔

”ہونہ۔۔۔“ انہوں نے نخوت سے سر جھٹکا، پھر بولیں۔ ”یہ آپ کے گھر لائے کی لاجک میری سمجھ سے باہر ہے۔ زندگی میں کوئی بھی مسئلہ درپیش ہو۔ لگ جائیں گے دعاؤں مانگنے، وظیفہ کرنے، خیر! یہ بھی نہ کریں تو کیا کریں۔ بیٹھے بیٹھے تو یہی کچھ ہو سکتا ہے نا۔۔۔ مسائل کا پریکٹیکل حل نکالنے کے لیے ہاتھ پاؤں ہلانے پڑتے ہیں۔ جو انہیں گوارا نہیں۔“ وہ طنزیہ بولیں۔

”اب ایسی بھی کوئی بات نہیں۔“ وہ بے پروائی سے بولے گاڑی اب گلشن چورنگی عبور کر چکی تھی۔

”ایسی ہی بات ہے فیصل شیخ صاحب!“ وہ چبا چبا کر بولیں۔ ”آپ کے گھر والے عمل کرنے کے بالکل بھی شوقین نہیں۔ اماں کی ہر وقت کی آؤٹ آف ڈیوٹڈ نصیحتوں نے انہیں کیس کا نہ چھوڑا۔ صبر، قناعت، شکر، زاری سے آخر انہیں حاصل ہی کیا ہوا؟ ابامیاں تو آپ کے بچپن ہی میں فوت ہو گئے تھے۔ آپ انٹر میں تھے۔ آپ نے بڑھ کر انہیں سارا دیا۔ یہی تو وہ پوائنٹ ہے جو راشد کے بگاڑ کا باعث بنا۔ آپ تو کما ہی رہے تھے۔ ذرا جو اس بندے نے ہاتھ پیر ہلانے کا سوچا ہو۔ الٹا آپ پر بوجھ بن رہا۔ آنکھوں میں تھلاہٹ اس وقت۔ ایسا کوئی چھوٹا بچہ بھی نہیں تھا۔ کچھ نہ کچھ محنت تو کر ہی سکتا تھا۔ عمر نہ جی۔۔۔“ انہوں نے زور زور سے نفی میں سر ہلایا ”جب بیٹھے بیٹھے مل رہا ہو

تو کون بے کار میں بیٹھ رہا ہے روپیٹ کی کام کیا اور لگ گئے سرکاری نوکری سے۔ گریڈ چوہے کے نوکر لگے تھے اور آج شاید پندرہ سولہ کے ہو گئے ہوں۔ یہ ہے ان کی ترقی کی رفتار۔ میں آپ کی زندگی میں نہ آئی تو آپ کا بھی یہی حال ہونا تھا۔“ انہوں نے وقت سے کہا۔

”ہاں یار! یہ تو تم واقعی ٹھیک کہہ رہی ہو۔ تمہاری یہ کوالٹی تو میں واقعی تسلیم کرتا ہوں۔ اماں تو ہمیشہ قناعت پسندی، حلال محرام ہی کے اسباق پڑھاتی رہتی تھیں۔ اب بھلا ان سب کے سارے بھی زندگی گزرتی ہے۔“ گاڑی اب شاہراہ فیصل پر اسی کی رفتار سے دوڑ رہی تھی۔

”بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں آپ۔“ فیصل کے اعتراف پر وہ مزید زور دے شور سے بولیں۔ ”آج کل جس کے پاس پیسہ ہے۔ بس اسے ہی جینے کا حق ہے۔ معاشرے میں عزت نام، مقام، سب کچھ پیسے ہی کا ریزہ منت ہے۔ میرے بہن بھائی سب ہی ماشاء اللہ بہت پیسے والے ہیں۔ ایسے میں آپ خود سوچ سکتے ہیں ان کے سامنے میری کتنی سبکی ہوتی تھی۔ بھابھیاں میرے معمولی سے لان کے سونوں، بچوں، بچوں کے کھلنے کے اسکول میں پڑھنے اور پرانے وقتوں کے بچے آپ کے مکان کا کتنا فراق اڑاتی تھیں۔ کوئی مجھ سے پوچھے۔“ ان کی آواز گلو گلو ہو گئی۔

”خیر! راج کر۔۔۔ کیوں اپنا خون جلا نہ ہی ہو، گزرنے وقت کی تکلیف وہ باتوں کو یاد کر کے میں تو گمنا ہوں۔“

”ہیلو! پند زفری لگا ہوا تھا۔ انہوں نے فون ریسیو کیا۔ اسارہ بھی ٹائیڈہ آنسو پونچھ کر آنے والی کال کی جانب متوجہ ہو گئیں۔

”کس گھر سے نہ ہو۔ ایک تو سارا زاراجی بھر کے فکمی ہیں۔ رشیدہ (ملازمہ) نہ ہو تو نا معلوم گھر کا کیا حشر کریں۔“

وہ اپنی سوچوں میں غلط تھیں۔ تب ہی چونک پڑیں۔

”اجھا! راشد بیمار ہے۔ کیا ہوا ہے اسے؟“ وہ سنبھل کر پوچھنے لگے مبادا کچھ مانگنے ہی کے لیے فون نہ کیا ہو۔ یہی خیال بیک وقت ان کی نصف بہتر کے دل میں بھی آیا تھا۔

”گڈنی پر اہلم کوئی ایسی پر اہلم تو نہیں کہ جس کے لیے اسپتال ایڈمٹ ہونا پڑے۔“ وہ جرح کرنے لگے۔

”اجھا۔۔۔ اچھا معمول سے زیادہ ہو گیا تھا۔ خیر! اب کیا مسئلہ ہے۔ رٹمنٹ ملے گی تو ٹھیک ہو جائے گا۔“ وہ لا پرواہی سے بولے۔

”دیکھو بھئی فاطمہ! میں جانتا ہوں اسے بڑے بھائی کے دلا سے یا سلی کی کوئی ضرورت نہیں۔ یاد نہیں اس نے مجھے بھرے مجمعے میں کیسا بے عزت کیا تھا؟“ اسارہ کے ہلکے سے کرخت چہرے پر کچھ اور سختی چھا گئی۔

”میں نے اسی روز اس سے مرنے جینے کا تعلق ختم کر لیا تھا۔ اب تم مجھے کیوں مجبور کر رہی ہو؟ کیا چاہتی ہو تم کیا تم سے یہ ٹیلی فونک رابطہ بھی ختم کر لوں؟“ وہ کرختی سے بولے۔ اسارہ بڑی بے چین بیٹھی بیچ و تاب کھا رہی تھیں۔

”تم تو وہاں دینی میں بیٹھی ہو۔ تمہیں یہاں کے حالات کا علم نہیں۔ میں آج کل بہت پریشان ہوں۔ بچوں کے اسکول کی فیس بھی نہیں دے سکا ابھی تک۔ خود میں اتنے دن بیمار رہا ہوں۔ میں نے تو اس کی طرح جیسے ہوئے کے لیے اپنی بیماری کا ڈھول نہیں بپا۔ تم میں بیچیں ہزار کی بات کر رہی ہو۔“ وہ ایک لمحے کے لیے خاموش ہوئے۔ تب ہی سرعت سے اسارہ نے ان کا بازو دبا کر گویا کچھ اشارہ دیا۔

”بھئی پانچ دس ہزار بھی مشکل ہیں۔ تم مجھ سے کہہ رہی ہو۔ تم کیوں نہیں دے رہیں؟“ اپنی دانست میں انہوں نے چال چلی۔

اسارہ کی شکل پہ ”یہ ہوئی نابات“ والے تاثرات جگ گئے۔

”اجھا۔۔۔ اچھا دے چکی ہو تو پھر کیا مسئلہ ہے؟ یہ چھوٹے چھوٹے بچوں کی تم نے خوب کئی فاطمہ۔

بچے تو میرے کچھ چھوٹے ہی ہیں۔ مگر بات یہ ہے کہ کسی کو میرا احساس نہیں۔ اسارہ ٹھیک ہی لگتی ہے۔۔۔ اچھا! خدا حافظ ہو نہ۔۔۔ آخر میں حقارت سے سر جھٹکا ملیکینٹ کا علاقہ شروع ہو گیا تھا وہ بڑی احتیاط سے ڈرائیو کر رہے تھے۔

”سارا موڈ تباہ کر دیا۔ بتاؤ ذرا۔ وہ راشد جس نے مجھے اماں کی جھینرو تعقیبن یہ کہہ کر نہیں کرنے دی کہ میرا بیسہ حرام کا ہے۔ میں اس کی عیادت کو جاؤں گا۔“ وہ خود کلامی کے انداز میں بولے۔

”اور دیکھا آپ نے اپنی بہن کو؟ کیسے میزا کر سکتے ہی فون بند کر دیا اور اس کی نیسی وکالت کر رہی تھی۔ میں نے تو آپ کو پہلے ہی کہا تھا۔ آپ ہی بے وقوف ہیں عجمان کے لیے مرتے رہتے ہیں۔ ورنہ انہیں تو ہمیں فون تک کرنا گوارا نہیں۔ کریں گے بھی تو اپنے ہی مطلب کی بات کریں گے۔ آپ بھول گئے، کتنی درستی سے اس روز اس نے آپ سے بات کی تھی؟ اماں کو کوئی ہم نے تو پیار نہیں کر ڈالا تھا۔ جتنے روز وہ اسپتال میں ایڈمٹ رہیں۔ آپ تو دینی گئے ہوئے تھے مجھے انہوں نے فون تک کرنا گوارا نہیں کیا اور بعد میں عیادت نہ کرنے آنے کا الزام لگا دیا۔“ انہوں نے دھیمے سے سوز سے لہجے میں کہہ کر گویا جلتی پر تیل ڈالا۔

”ٹھیک کہتی ہو تم۔ یہ راشد شروع ہی سے میری ترقی سے جلتا رہا ہے۔ خود کو جو ایسا مروج نہیں ملا۔ اماں کے انتقال والے روز یاد ہے اس نے کیا کہا تھا؟“ ان کے ہاتھ اسٹیرنگ پر گڑ گئے۔ جڑے مچھ گئے اور بھنویں تن لگیں۔

”ہاں! ہاں۔۔۔ کیسے بھول سکتی ہوں میں۔“ وہ چمک کر بولیں۔

”بھابھی بیگم آپ کو جنم کی طرف گھسیٹ لے جا رہی ہیں اور آپ بنا مزاحمت کے گھسیٹے جا رہے ہیں۔ اپنے آخری ایام میں اماں آپ کی آواز سننے کو ترستی رہیں۔ مگر بھابھی بیگم نے آپ کا نمبر نہیں دیا۔ نہ ہی ان کی عیادت کو آئیں۔ ہاں مجھے! اجڑا ہوا کیڑے ہیں بھابھی بیگم میں۔۔۔ میں نے تو اسی روز تہیہ کر لیا تھا آج

کے بعد سے اس سے مرنے جینے ہر طرح کا تعلق ختم نہ میرے مرنے پر کوئی آئے۔ نہ کسی کے مرنے پر میں جاؤں گی۔“ وہ بے لچک لہجے میں بولیں۔

”ہاں۔۔۔ اور کہہ رہا تھا کہ اماں نے خاص طور پر تلقین کی تھی کہ میرا بیسہ ان کی نئی منزل میں کام نہ آئے۔۔۔ بڑا آیا نیک پارسا کہیں گا۔ یقین کرو اسارہ! اس دن سے وہ میرے دل سے مکمل طور پر اتر گیا تھا۔ میں نے بھی قسم کھالی تھی کہ اس کی میت میں بھی نہ جاؤں گا۔“ وہ سخت طیش کے عالم میں بولے گاڑی اب کورنگی ہے ڈی۔ ایچ۔ اے کی طرف مڑ رہی تھی۔

شام ڈھل رہی تھی۔ موسم بدستور سمانا تھا۔ ”چھوڑیں جی۔۔۔ کیوں اس کی بکواس یاد کر کے اپنا موڈ غارت کر رہے ہیں۔ پہلے زمزمہ چلیں گے؟“ فیصل کا ”موڈی ریموٹ کنٹرول“ اسارہ کے پاس تھا۔ جدھر چاہیں ٹھون کر دیتیں۔

”ہاں! پہلے شاپنگ کر لو۔ پھر دودیا کی طرف جاتے ہیں۔“ وہ بھی اپنے آپ کو سنبھال کے خوشگوار لہجے میں بولے۔

”کتنے سوٹ لوں؟“ وہ شرارت سے پوچھنے لگیں۔ ”جتنے جی چاہے۔“ انہوں نے فراخ دلی سے کہہ کر احتیاط سے موڑ کاٹا۔ مگر موڑ کے دوسری طرف سے آتا ہوا بجزی کارٹرک بہت جلدی میں تھا۔

ڈیفنس کی پر اسراریت بھری خاموش فضا میں ایک ہولناک دھماکا سا گونجا۔

تیز رفتار ٹرک سفید پیش قیامت گاڑی کو ملے میں تبدیل کر کے فرار ہو گیا۔ کار میں موجود زندگی سے بھرپور وہ دونوں نفوس موقع ہی پر زندگی کی بازی ہار گئے۔

زندگی۔۔۔ جو اتنی ہی ناپائیدار ہے۔ جتنا کہ ریت پر بنا گھر وندہ۔ دوسرے دن ان کے جنازے میں راشد اپنی بیماری کے باوجود بھی شریک تھا۔

عفت سگر طاہر



ہلکی پھلکی نفیس سی کڑھائی سے سجایا اور آف
وائٹ کریم کلر کاسوٹ اس کے تناسب سے سر اپنے پر
عجب ہی ہمارے رہا تھا۔ کمر تک آتے بالوں کی چوٹی کو
آخری بل دے کر ریوینڈ چڑھاتے ہوئے اس نے
چوٹی کو جھٹکے سے کمر پر پھینکا تو اس کے لبوں پر خوشگوار
سی مسکراہٹ تھی۔
آج اپنا آپ اسے خود ہی بہت اچھا لگ رہا تھا۔ اس
نے پلٹ کر کائن کا دوشیا اٹھایا۔ سیاہ دوشیا جس پر کہیں
کہیں چھوٹے چھوٹے سے آف وائٹ پھول لڑھے
تھے۔ دوشے کے چاروں طرف آف وائٹ گلر کی انچ
بھر کی بیٹی تھی جس پر چھوٹے چھوٹے سیاہ رنگ کے

پھول کڑھے ہوئے تھے۔ اس نے بڑے شوق سے
دونوں شانوں پر دوشے کو پھیلایا۔ تھمتاتی رنگت اور
آنکھوں میں اتری پر شوق کی چمک نے اسے بہت کھلا
ہوا روپ دے دیا تھا۔
وہ بڑے اچھے موڈ میں عافیہ کے کمرے سے باہر نکلی
تو اندر آتے عاقب سے ٹکرائی۔
”وہ مار دیا۔“ وہ مصنوعی آہوں کا کرنے لگا۔
”آف۔ دیکھ کے نہیں چل سکتے۔“ زمینپ کو
حقیقت میں ناک پہ چوٹ لگی تھی۔ سرخ ہوتی ناک کو
ہاتھ سے دباتی وہ جھنجھلا کر بولی۔
”دیکھ کے ہی تو چل رہا تھا پھر ہوش ہی کہاں

مکمل ناول



سلامت رہے۔ لائیں مار رہی ہو آج تو۔“ عاقب کے لب و لہجے کی شوخی نے اسے جھینٹے پر مجبور کر دیا۔
”کیا اس مت کرو۔“
”لو۔ تمہاری تعریف کیواس ہے تو میں اپنے الفاظ واپس لیتا ہوں۔“

اس کی نگاہ ابھی بھی زینب کے اچھوتے روپ پر تھی۔ متمنا چہو جس کا حسن بدھارہا تھا۔

”سچی کہہ رہے ہو؟“
”دھر آؤ۔ پھر بتاتا ہوں۔“

وہ فوراً ”لو فرہوا تو زینب کو وہاں سے بھاگنا پڑا۔ مگر دل ایک الگ ہی لمے میں دھڑک رہا تھا۔

عاقب کی ذرا دیر کی توجہ بھی اس کے جذبات کو بڑھا دیتی تھی۔ اسے یقین تھا کہ تائی اماں عاقب کے ساتھ

اسی کو سوچے ہوئے ہیں۔ تب ہی تو وہ بلا خوف و خطر اس کے سنگ خوابوں کے سفر پر نکل جایا کرتی تھی۔

فیصل نے گاڑی اس عالی شان بیچلے سے ذرا فاصلے پر روکی۔ پوش ایریا میں بناوہ ایک شان دار نگہ تھا۔ جس کے کمینوں کی امارت پر کوئی شبہ نہیں تھا۔

عاقب پر بیچان طاری ہونے لگا۔ اس بیچلے کی خوب صورتی بھی یا اس کے کمینوں کی امارت کا عیب۔

اسے لگا وہ بھی بول نہیں پائے گی اور آنکھیں کھیں کہ اس خواب فکر کا نظارہ گر کر کے نہیں ٹھک رہی تھیں۔

”کیا بات ہے۔ گھر پسند نہیں آیا میری جان کو؟“

فیصل اس کے قریب ہو کر محبت سے پوچھ رہا تھا۔ عاقب کسی خواب کی گرفت سے آزاد ہوئی۔

”یہ۔ تم یہاں رہتے ہو؟“ عاقب کی آواز لرز رہی تھی۔

”ہاں۔ تو۔“ فیصل کے انداز میں بے نیازی تھی۔

”مائی گا۔ تم نہیں جانتے فیصل! یہ تو میرے خوابوں کا گھر ہے۔ میں تو سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ یہ

کبھی حقیقت میں میرا ہو سکتا ہے۔“

وہ بچوں کی طرح خوش ہو رہی تھی۔ گندی رنگت جذبات کی شدت سے تینے لگی۔ گھور سیاہ آنکھوں کی چمک قاتل دید تھی۔ فیصل کو اس پر بے اختیار پیار آیا۔

”تم لڑکیاں بھی نا۔ کتنی چھوٹی چھوٹی باتوں پہ خوش ہو جاتی ہو۔“ عاقب نے جذباتی ہو کر اس کا ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں میں دبوچ لیا۔

”یہ چھوٹی بات نہیں ہے فیصل! اب میرے گھر والوں کے پاس تمہیں رجسٹرکٹ کرنے کا کوئی جواز نہیں۔“

”جواز تو ابھی بھی ہے عانی! میرے ابو کبھی بھی اس شادی پر راضی نہیں ہوں گے۔ چچا کی بیٹی کو مانگ رہا ہے انہوں نے میرے لیے اور مجھ اکیلے کے ساتھ تمہارے ابا تمہیں رخصت نہیں کریں گے کبھی اور جائیداد بھی تب ہی مجھے ملے گی جب میں شبانہ سے شادی کروں گا۔“ وہ پریشان تھا۔

”اس کی تم فکر مت کرو۔ تم ابا سے ملو گے تو وہ نہ سے بہت متاثر ہوں گے اور تمہارے والدین بھی آہستہ آہستہ مان ہی جائیں گے۔“ عاقب نے اس کے ہاتھ پر اپنے ہاتھوں کا پیار بھرا دیا وہ بڑھاتے ہوئے اسے یقین دلایا۔

”اور اگر ابو نے مجھے عاق کر دیا تم سے شادی کرنے کی صورت میں تو۔“ وہ عاقب کا چہرہ کھوجتے جیسے اس کا امتحان لے رہا تھا۔

”کیسی باتیں کر رہے ہو فیصل۔ اتنا انتہائی قدم نہیں اٹھا سکتے وہ۔ اگوتے بیٹے ہو تم ان کے اور کس کے نام کریں گے اپنا سب کچھ؟“ عاقب نے اپنے چہرے کی بدلتی رنگت کو بڑی مہارت سے چھپایا تھا۔

”خیر۔ گھر سے تو نکل ہی سکتے ہیں۔ بڑی مشکل میں پڑ جاؤ گی تم بھی۔“

”میری فکر مت کرو تم۔ میں تمہارے ساتھ ہر قسم کے حالات کا سامنا کر سکتی ہوں۔“ عاقب کے لب و لہجے میں پختہ عزم تھا۔

”تم ہی ناؤں سی تو ہو میری جان۔ میں اپنی وجہ سے تمہیں کسی مشکل میں نہیں ڈالنا چاہتا۔“ فیصل کی محبت پر وہ مسکرا دی پھر قاف خیر سے بولی۔

”ڈونٹ وری جناب۔ ایسے بھی کوئی مشکل حالات نہیں آنے والے ہیں ہزار کی جا ب ہے میری اور ترقی کے چاند لگ۔“

”ہاں۔“ فیصل گہری سانس بھرتا سیدھا ہو بیٹھا اور گاڑی اشارت کرنے لگا۔ پھر ایک نظر عاقب کے سونے چہرے کو دیکھ کر طمانیت بھری مسکراہٹ سے بولا۔

”سی بات کی تو تسلی ہے مجھے۔“ گاڑی آگے بڑھ گئی۔ عاقب سائید مرمر میں سے بیچلے کا عکس دیکھ رہی تھی۔ اس نے فیصل کے لفظوں پر دھیان نہیں دیا تھا۔

”کمال رہ گئی تھیں۔ آج پھر اتنی دیر کر دی آنے میں۔“ اماں عاقب کی شکل دیکھتے ہی شروع ہوئی تھیں۔ وہ برآمدے میں رکھے صوفے پر بیٹھ کر کھلے انداز میں سینڈ لڑا رہی تھی۔

”میں کیا پوچھ رہی ہوں؟ نو سے پانچ والی نوکری میں سات کا ہے تو بجتے لگے اب؟“ اماں کا انداز ٹیکھا تھا اور عاقب کی برواشت بس یہیں تک تھی۔ ترخ کر بولی۔

”اگر میں بیس ہزار کمانے والا بیٹا ہوں تو یہ سوال کبھی مجھ سے نہ کیا جاتا۔“

”خدا کی ماس۔“ اماں کو غصہ آیا۔ ”لو کے اور لڑکی کی آزادی کی الگ حدود ہوتی ہیں بیٹا رانی۔“ غصے میں وہ اسے پونہ کی مخاطب کرتی تھیں۔

”جھالال۔ اب آتے ہی سرے سوار نہ ہو جائیں۔ چائے پانی اس گھر میں کوئی پوچھتا نہیں“ آنے جانے کا پوچھنے سب کھڑے ہو جاتے ہیں۔ ”وہ بے زاری سے بولی۔ تو اماں کو اپنا لب و لہجہ ذرا دبا کر لیا۔

”ارے تو میں کون سا اپنے فائدے کے لیے کہتی ہوں۔ تمہارا ہی بھلا ہے اس میں۔ کل کو سسرال کے

جوتے کھانے سے بچ جاؤ گی۔“ عاقب کے لبوں پر فیصل کی یاد سے مسکراہٹ پھیل گئی۔

”لو۔ وہاں اپنے ٹھٹ ہوں گے۔ یہ چند ہزار کی نوکری تو ڈیڑی کروں گی میں۔“

”چند ہزار۔ ارے کم بخت پورے بیس ہزار کماتی ہے۔ شکر خدا کا بڑھائی میں اچھی تھی تو نوکری بھی شیخ صاحب کی سفارش سے اونچی جگہ لگ گئی۔“ اماں نے گھر کا۔

”یہ تو گھر کے حالات کی وجہ سے کر رہی ہوں اماں۔ سسرال جا کے میں شوہر نہیں پاؤں گی۔“

وہ جھنجھکی ہوئی۔ اماں کچھ کہنے لگی تھیں کہ اسی وقت زینب ٹھنڈے ٹھار شربت کا جگ اور گلاس ٹرے میں رکھے چلی آئی۔ عاقب کی بات منہ میں ہی رہ گئی۔

وہ یقیناً ”اس وقت چولہے کے آگے کھڑی تھی۔ عاقب کی آواز سن کر شربت بنالائی تھی۔ تمنا پانی رنگت ہمار کا سا جو بن سیاہ لباس میں وہ دکھ رہی تھی۔ عاقب کو لگا برآمدے میں یک نخت روشنی ہی ہو گئی ہو۔

”یہ لیں۔“ ٹھنڈا ٹھار شربت۔

تپانی پر ٹرے رکھتے ہوئے اس نے جلدی سے شربت کا گلاس بھر کے عاقب کو پیش کیا۔ سرخ مرطوب لبوں سے جھلکتے ہموار وچک دار دانٹوں کی لکیر۔ اس کی مسکراہٹ بہت خوب صورت تھی۔

عاقب کو خواجوا غصہ آنے لگا۔

”یہ۔ نیا سوٹ پہن کے تم یکن میں کام کر رہی تھیں؟“ اس کی تیوری کے بل زینب کو گڑوا گئے۔

”نہیں۔ وہ نہا کے آن پہنا تو پھر۔“

”اری آنکھیں کھول کے دیکھ۔ نیا کمال۔ تمہارا ہی دو سال پرانا سوٹ ہے۔ جو تم نے اسے دے دیا تھا۔“

اماں بے زار ہوئیں۔

عاقب گلاس قہار کر شربت کے گھونٹ بھرنے لگی، مگر اس کی عجیب سی نگاہیں یکن کی طرف جانی زینب کی کمر تک آئی تھیں ہالوں کی چھایا سے ابھرتی تھیں۔

”اما شادی پر زور دے رہی ہیں۔ ان کی طبیعت کچھ

”ٹھیک نہیں رہتی۔“ اماں نے وہ بات شروع کی جس کے لیے وہ ”چٹکی“ ڈال کے بیٹھی تھیں۔
 ”کس کی شادی کے لیے۔؟“ وہ سرسری انداز میں پوچھ کر شربت کے گھونٹ بھرے لگی۔ اماں نے اسے قدرے گھور کر کہا۔
 ”ظاہر ہے اپنے بیٹے کی شادی کے لیے۔“
 ”تو کہیں۔“

خالی گلاس تپائی پر رکھتی اطمینان بلکہ بڑی بے اعتنائی سے کہتی وہ اٹھ گئی تو اماں مسکرا دیں۔ اشتیاق سے بولیں۔

”تو بتا پھر۔ کون سا مہینہ رکھوں شادی کا؟“ وہ اندر جاتے جاتے رک گئی پھر ان کی طرف پلٹی۔

”آپ کیوں رکھیں گی۔ جن کا پٹا ہے وہ رکھتے پھر بس تاریخیں۔“ وہ اس کی سادگی پر مسکرا دیں۔

”میری بے وقوف۔ تاریخ تو لڑکی والے ہی دیتے ہیں نا۔ تمہارے ابا تو اگلا مہینہ ہی کہہ رہے ہیں۔ یہ تو

پتیلی پر سرسوں جمائے والی بات ہو گئی۔ پر جب سے عمر کی زبانی آیا حال سنا ہے دل پریشان سا ہے۔ اس لیے میں بھی راضی ہو گئی۔“ وہ افسوس سے گویا تھیں۔

عافیہ کی پیشانی کے بل گمرے ہوئے۔
 ”ایکسکیوز می اماں۔“ وہ قدرے زور سے بولی تو

اماں ٹھٹک کر اسے دیکھنے لگیں۔
 ”یہ کون سی منصوبہ بندیاں کر رہی ہیں آپ؟ کون سی شادی کس کی شادی۔؟ میں تو ابھی سوچ بھی نہیں

سکتی شادی کلا اپنا کیرئیر بنانا ہے میں نے۔“ اس نے صفات انداز میں کہا تو وہ ہل گئیں۔

”وہاں تو ٹھیک ہے تیرا۔ سالوں پرانی منہ زبانی کی بات ہے ہم دونوں بہنوں میں اور پھر مجھے کون سا نہیں

پتا تھا۔ دو سال پہلے ہجرت گئی تو عمر کو بند کیا تھا تو نے۔ راضی تھی شادی پر۔“ وہ تیز لہجے میں بولیں۔

”بچہ پتا تھا میرا۔ اور اماں! میں کراچی جیسے جگہ خیر شہر سے اٹھ کے ہجرت جا کے نہیں بس سکتی۔“ اس نے تلخی سے جواب دیا۔

”نہ۔ تو یہ اب یاد آیا ہے تجھے؟ آتے ہی کیوں نہیں کہہ دیا کہ وہاں شادی نہیں کرے گی۔ تیری طرف سے ہاں کہہ دی تھی میں نے آپا کو۔“ اماں کو غصہ آنے لگا۔
 ”غلطی کی نا۔ مجھ سے اجازت لے کے بات کرتیں۔“ وہ اطمینان سے کہتی ان کا پارہ چڑھانے لگی۔
 ”بے غیرت۔ تو نے ہی تو آکے عمر کی تعریفوں کے بل باندھے تھے۔“

”نزی شکل و صورت ہی ہے۔ نوکری تک تو ملی نہ تھی جناب کو۔“ وہ حقارت سے بولی۔

”چھوٹی موٹی نوکری تو کر ہی رہا ہے۔ ساتھ ہی کوئی بڑا امتحان بھی دے رکھا ہے اس نے۔ اعلا نوکری کے لیے۔“ اماں نے اسے تسلی دلانا چاہی۔

”مجھے تو معاف ہی رکھیں اور ایسے بھی صاف کہہ دیں۔ میں بیاہ کے اتنی دور پنجاب کے چھوٹے سے شہر میں نہیں بسنے والی۔ شادی میں کراچی ہی میں کیوں

گی۔“ وہ صفا جٹ بلکہ بے پرواہی سے انداز میں کہتی واپس پلٹی تو زینب غالباً جگ اور گلاس اٹھانے آئی تھی۔

عافیہ نے رک کر اسے گھورا۔
 ”اور تم۔ یہ سوٹ تبدیل کرو اور دھوکے اچھی طرح چریس کر کے میری الماری میں لٹکا دو۔“ حکم صادر

کرئی وہ اندر چلی گئی تو منہ کھولے کھڑی زینب کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔

”ہاا۔ ندیدی۔“ کھڑکی۔ اماں کو بیٹی کی عادت سے کراہیت آئی۔

وہ اکثر اپنی استعمال شدہ چیزیں زینب کو دے دیتی تھیں مگر وہی چیزیں جب زینب پر جیتیں یا اسے جگہ دیتیں تو اکثر وہ دوبارہ اپنی چیز مانگ لیتی تھیں۔ زینب آنسو

چٹی خاموشی سے برتن اٹھانے لگی۔
 ”تو فکر نہ کر زینبی! اس سے اچھا جوڑا لے کے دل

گی تجھے۔ اس کی تو عادت ہے ندیدوں والی۔“

اماں نے اس کا دل رکھنا چاہا۔ زینب اسی خاموشی سے کچن کی طرف بڑھ گئی۔
 ”ایک دفعہ شادی ہو جائے عافی کے ساتھ میری۔“ سب سے پہلے اسی کہنی کو سیدھا کر دیں گی۔ جگ گلاس سنگ میں رکھ کر اس نے ہتھیلیوں سے آنکھیں رگڑتے ہوئے اشتیاقاً خود کھائی کی تھی۔ پھر اپنے دو بے کوبہاں پر پھیلا کر حسرت سے دیکھا اور آہ بھر رہے تھے۔

رات کھانے کے بعد اماں اور لایا کی میزنگ ہوئی۔ جلدی ہی لایا کے حضور عافیہ کی طلحی ہو گئی۔

عافیہ کو اسی بات کی امید تھی۔ اس کا ہوم ورک بھی مکمل تھا وہ بہت اعتماد کے ساتھ ان کے سامنے گئی۔

”ہاں بیٹا جی! یہ تمہاری اماں کیا کہہ رہی ہے۔ تمہیں اب عمر سے شادی پر اعتراض ہے؟“

لایا بات گھمانے پھرانے کی عادت نہیں تھی۔ ایک بات کہہ دینا اور پھر اس کو حرف آخر مان کر اسی پر

جم جانا ان کی عادت عظیم تھی۔ اس لیے ان کی زبان سے کوئی فرمان جاری ہونے سے پہلے عافیہ ان پر اپنا مطیع نظر واضح کر دینا چاہتی تھی۔

”جی! اب اسب سے پہلی بات تو یہ کہ میں آپ لوگوں سے اتنی دور جانا نہیں چاہتی۔“

”دوسرا صوبہ ہی ہے، کوئی دوسرا ملک تو نہیں جو ویزا لے کر آنا جانا پڑے۔“ اماں ترخیں۔ لایا نے انہیں گھور کے دیکھا۔ اپنی بحث میں کسی اور کے ڈانڈ لاگ

انہیں پسند نہیں تھے۔
 ”تم کمر لوات۔“

”چھ! اچھا۔ آپ کرس۔“ اماں گڑبڑا دیں۔
 ”دوسرے یہ کہ عمر کے پاس ڈھنگ کی نوکری تو ہے

نہیں سارا خرچ عثمان بھائی چلا رہے تھے اور وہاں جا کے اگر میں نے ہی نوکری کر کے شوہر کو پالنا ہے تو

اس سے بہتر ہے کہ میں شادی ہی نہ کروں۔“ وہ

شجیدگی سے بولی۔
 ”وہ نوکری کر رہا ہے۔ آج کم تنخواہ والی ہے، کل زیادہ والی بھی کرے گا۔ بہت مختصی پچہ ہے۔ سی ایس ایس کا امتحان دے رکھا ہے اس نے۔“

لایا کو بھی عمر پسند تھا۔ حالانکہ وہ ایک باری کراچی آیا تھا مگر فون پر ان کا عمر سے رابطہ رتا تھا۔ سو وہ اس کے خیالات و افکار سے اچھی طرح واقف تھے اور مستقبل کے عراغے سے بھی۔

”آہم سو ری! اب! مجھے پھر بھی عمر سے شادی نہیں کرنی۔ مجھے کوئی ویل اسٹیشن بندہ چاہیے۔ میں بیٹھ کے اچھے فیوچر کا انتظار نہیں کر سکتی۔“ لایا نے اتنے صاف گوانڈاز پر بغور بیٹی کا چہرہ دیکھا۔

”اور وہ کون ہے؟“ عافیہ کے چہرے کا رنگ بدلا مگر ارادہ نہیں۔

”جی! اب! فیصل ہے۔ اپنا پروپوزل بھیجنا چاہتا ہے

ادارہ خواتین ڈائجسٹ کی طرف سے بہنوں کے لیے خوبصورت ناول

نظم حسی لیسٹی میں



فاخرہ حبیب

قیمت - 400/- روپے

منگوانے کا پتہ:

فون نمبر: 32735021
 مکتبہ عمران ڈائجسٹ
 37، اردو بازار، کراچی

میرے لیے۔ ”سر جھکا کے آہٹکی سے بولی۔
 ”تم نے اسے بتایا نہیں کہ تمہاری سالوں پہلے سے بات طے ہے۔“ بابا لالچہ تیز تھا۔
 ”وہ بچپن کی بات تھی اب! اور پھر جب میرے پاس ایک بہترین آپشن موجود ہے فیصل کی صورت میں تو میں عمر کے ساتھ ٹھنک بھری زندگی کیوں گزاروں۔“
 وہ بھی ان ہی کی اولاد تھی۔ اپنی کہہ کے ”کر کر زرنے والی۔“ صفا چٹ انداز میں بولی۔
 ”اچھا۔ تو وہ کہاں کلاٹ صاحب ہے؟ نام پتا تو بتاؤ اس کے اجداد کا؟“ بابا نے تنگی سے کہا تو عافیہ کے لبوں پر پرتقا خرسے مسکرا ہٹ کھل گئی۔
 ”مشہور انڈسٹریسٹ ہیں مرزا فرمان علی۔ ان کا اکلوتا بیٹا ہے۔“

”وہ تو مرزے ہم ملک ذات برادری سے ہی باہر ہیں وہ تو۔“ اماں نے ہاتھ جھاڑے۔ گویا بات ہی ختم۔
 ”ذات سے باہر ہیں انسانیت سے نہیں اماں! ہماری طرح کے انسان ہیں وہ بھی۔“ عافیہ کو برا لگا۔
 ”کل کہو اس لوٹے سے۔ اپنے باپ کو لائے ہمارے گھر۔ پھر پتا چلے گا انسانیت کے کس درجے پر ہے وہ۔“

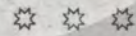
بابا نے قطعی مگر طنزیہ لہجے میں کہا تو عافیہ کا دل دھڑکا۔ مگر اس وقت ہمت کی ضرورت تھی سو وہ بھی ہمت کر کے کہہ ہی گئی۔
 ”وہ اکیلا آئے گا کافی اٹال۔ آپ پہلے اس سے مل لیں پھر اس کے باپ سے بھی مل لیجئے گا۔“
 بابا نے تیوری چڑھا کر گہری نگاہ اس پر ڈالی۔
 ”اچھا۔ تو پہلے وہ جائزہ لینے آئے گا ہمارا؟“

”اس نے کون سا گھر داماد رہتا ہے اب! آپ اس کا عائشان بن گئے دیکھیں گے تو ونگ رہ جائیں گے۔ محل لگتا ہے پورا۔“ عافیہ کی آنکھیں چمکیں۔
 بابا نے طنز سے پھٹکارا بھرا۔ پھر قطعیت سے بولے۔
 ”تم بلاؤ تو سہی کل اسے۔ مگر ایک بات سن لو۔ اگر میں اس پہلی ملاقات میں اس سے مطمئن نہ ہوا تو تم

چپ چاپ بیٹھا کر عمر کے ساتھ پنجاب چلی جاؤ گی۔“
 ”مجھے یقین ہے کہ ایسا کبھی نہیں ہو گا۔ فیصل سے ملاقات آپ کو اپنا فیصلہ بدلنے پر مجبور کر دے گی۔“
 عافیہ نے ازحد یقین سے کہا۔
 عافیہ کے جاتے ہی اماں نے آنکھوں پر دوئے کا پلہ رکھا اور چمکوں پہمکوں رونے لگیں۔ بابا نے ناگواری سے انہیں دیکھا۔
 ”ہائے عاقب کے اب۔ یہی دن دیکھنا باقی رہ گیا تھا۔ لڑکی اپنے منہ سے اپنا رشتہ بتاتی پھر رہی ہے۔ ناہیں کوں آپ سے اتنا نہ ہوا ایک پھٹری مار دیتے اس کے منہ پر۔“

”جاہلوں والی باتیں مت کرو۔ جو پہلے ہی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے بے غیرتی سے اپنی پسند کی شادی کا اعلان کر رہی ہے اسے اور باغی کر دیتا۔“
 ”نہ ملک صاحب! میں اپنی آپا کو کیا منہ دکھاؤں گی۔ وہ بے چاری بیمار۔ ہو کے ہاتھوں تنگ۔ اس بے چاری نے تو یہی سوچا کہ دوسرے بیٹے کے لیے بھانجی لے جائے گی تو سارے دلدرور ہو جائیں گے۔ وہ بھی چار دن سکون کی زندگی گزارے گی مگر کہاں تو کالیا ہی پلٹ دی اس گھمبوی عافی نے۔“ اماں کے بین جاری ہو چکے تھے۔

”اری نیک بخت! کل آنے تو دے اس لوٹے کو۔ پتا چل جائے گا کتنے بیس کا سو ہوتا ہے۔ ہم بھی تو دیکھیں ایسا کون سا کروڑ پتی پسند کر لیا اس نے۔“
 بابا نے بات لپٹی۔ مگر اماں کی سوں سوں ان کی تسلی پا کر بھی دیر تک جاری رہی۔



”السلام علیکم! اس کے انداز میں موجود تھ کاٹھ نے ماں کے سامنے خوش دلی کا لبادہ اوڑھ لیا۔
 ”وعلیکم السلام! جیتا رہ میرا بچہ۔“ ثقاہت ان کی آواز پر غالب تھی، مگر ان کی آنکھوں اور چہرے کی رونق عمر کو دیکھتے ہی لوٹ آئی تھی۔
 ”کیسی طبیعت ہے آپ کی؟“ وہ ان کا ہاتھ تھام کر

حرارت چیک کرتے ہوئے پوچھنے لگا۔ رات سے انہیں بخار تھا۔
 ”ٹھیک ہوں اب تو۔“ انہوں نے اپنا ہاتھ کھینچنا چاہا۔
 ”ٹھیک کہاں ہیں۔ ابھی بھی بخار ہے آپ کو۔“ وہ تنقیر سے بولا۔
 ”کچھ کھایا بھی ہے آپ نے؟“ اسے دھتکا۔
 دھیان آیا۔ وہ صبح جاتے وقت بطور خاص بھابھی سے ان کے لیے کچھری یا دلہہ بنانے کا کہہ گیا تھا۔
 ان کی نگاہ بے اختیار سائڈ ٹیبل پر پڑے ڈھکے ہوئے برتنوں کی طرف اٹھ گئی۔ پھر وہ جلدی سے بولیں۔

”ہاں۔ تم بتاؤ۔ تم نے بھی لچ کیا یا ابھی تک بھوکے ہی ہو؟“
 انہوں نے صاف بات پلٹی تھی۔ عمر اٹھ کر دستر خوان اٹھا کر کھانا چیک کرنے لگا۔ قیہ مڑ کا سا ان اور ساتھ میں تہدوری روٹی۔ اس نے لب بچھینچے پھر وہ تیزی سے باہر کی جانب بڑھا۔ تو وہ برافروختہ سی ہو گئیں۔
 ”عمر۔ بات تو سنو میری۔“

مگر وہ دندانہا ہوا سیدھا ڈرامہ دیکھتی بھابھی کے سپرے جاگڑا ہوا۔
 ”میں نے آپ سے کہا بھی تھا کہ امی کو بخار ہے انہیں کوئی بلکی پھلتی غذا بنانے کے نتیجے گا۔“ وہ غصہ ضبط کرتے ہوئے بولا تو پھر بھی مارے جذبات کے لہجہ تیزی تھا۔

بھابھی نے مجبوراً اپنے پسندیدہ ڈرامہ سے نظر ہٹا کے اسے ناگواری سے دیکھا۔
 ”دبہ میں تو ٹھیک تھا۔ میں نے چیک کیا تھا اور دیکھے بھی قیہ مڑ بنایا تھا۔ میں نے کوئی وال دلہہ نہیں جو کم یوں تفتیش کرنے آگئے ہو۔“
 ”بیار آوی تو قیہ مڑا نچوئے نہیں کر سکتا بھابھی۔ میں نے جو آپ سے کہا تھا کہ انہیں۔“ وہ کہنے لگا تھا مگر اس کی بات کاٹ کر وہ غصے سے

بولیں۔
 ”تم کون سا کہیں کے فخر لگے ہوئے ہو۔“ میں کہہ گیا تھا۔ اتنا ہی خیال تھا تو خود بنا جاتے ماں کے لیے خاک کھینے۔ میں تین بچوں میں انجھی کس کس کو دیکھوں۔ اوپر سے امی صاحبہ۔ میرا دیا کھانا کھانے کے بجائے خود چائے پنانے کچن میں پہنچ گئیں۔ لا کے بیچ صحن میں میرے جینز کا کپ بھی پھوڑا اور چائے بھی پھیلائی۔ بھئی نہیں اتنی ہمت تو بستر پر ہی رہیں، مگر نہیں۔ میرا آرام تو کسی کو بھاتا ہی نہیں۔“
 بھابھی کے دواوے۔ ان کی بے کاری خود ترسی۔
 عمر نے ہاتھوں پر دانت جمائے۔ ایک دولا سنیں سن کے ہی اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ ماں نے دن کس کسمپرسی کے عالم میں گزارا ہو گا۔ وہ بونہی سلگتا ہوا واپس آ گیا۔
 ”کیوں گئے تم باہر۔ میں نے کہا بھی ہے اس کے منہ مت لگا کرو۔“ امی کی آنکھوں میں نمی چمک رہی تھی۔

”یسی کی تھی ان کی۔ پہلے یہ آپ کا گھر ہے پھر ان کا۔“ جو تے اتارتے ہوئے تنگی سے کہتا وہ سلیپ پاؤں میں از ستاواش روم میں گیا اور ہاتھ منہ دھو کے جلدی ہی باہر نکل آیا۔

”آپ نے ہی انہیں سر پہ چڑھا رکھا ہے امی! لوگوں کو دیکھیں ذرا، کیسے بہووں کو کھینچ کے رکھتے ہیں۔“ تو لیے سے ہاتھ منہ صاف کرنا وہ سنجیدگی سے بولا۔

”اچھا بس اب۔ سن لے گی تو عثمان تک بات پہنچائے گی۔“ امی نے دبے لفظوں کہا۔
 ”کہنے دیں انہیں اور عثمان آپ کا بیٹا ہے جانتا نہیں کہ اس کی ماں کس طبیعت کی ہے۔“ عمر کو غصہ آیا۔

”اب وہ بھی تو اس کے بچوں کی ماں ہے نا بیٹا۔“ وہ بے بسی سے بولیں۔
 ”بچوں کی ماں ہے۔ اس کی تو ماں نہیں ہے نا۔“ عمر نے تیوری چڑھائی۔
 ”اچھا بس اب۔ بات ختم کرو۔ کھانا گرم کر کے

لاؤں تمہارے لیے؟؟؟ انہوں نے بات بدلی۔
 ”آپ بیٹھیں۔ میں خود گرم کر لوں گا۔ بلکہ آپ کے لیے بھی کچھ لاتا ہوں۔“ وہ اٹھ کے چلا گیا۔
 تھوڑی دیر کے بعد وہ ٹرے میں اپنا کھانا اور ان کے لیے چائے بسکٹ لے آیا۔

”بس۔ اب تو ایک ہی حسرت ہے، جلدی سے عافیہ کو بہا کے لے آؤں۔ پھر میرے بھی سکھ کے دن آئیں۔“ امی نے چائے میں بسکٹ ڈبوئے ہوئے ٹھنڈی سانس بھری۔ عمر کے ہونٹوں پر اس ذکر سے مسکراہٹ پھیل گئی۔

”ایک سو بھگت رہی ہیں اس سے دل نہیں بھرا آپ کا۔ ایک اور لانے چلی ہیں۔“

”ارے میری ماں جانی کی اولاد ہے۔ میرا درد محسوس کرے گی۔ سر آٹھو۔ یہ بٹھا کے رکھے گی۔ دیکھا نہیں جب یہاں آئی تھی تو کتنا خوش تھی تمہارے ساتھ اور میری بھی کتنی چاہت کرتی تھی۔“ امی کا چہرہ خوشی سے چمک اٹھا۔

”وہ تو ہے۔ مگر سو من کر لو کیاں بہت بدل جاتی ہیں شاید۔“ عمر نے اپنا خیال پیش کرتے ہوئے نوالہ منہ میں رکھا۔

”ایسا کچھ بھی نہیں ہو گا۔ تمہاری خالہ فاطمہ سے بات کی ہے میں نے۔ جلد ہی کوئی مثبت جواب دے گی۔ وہ بھائی جان تو ویسے ہی تمہیں بہت پسند کرتے ہیں۔“ عمر کو بھی یہ ذکر اچھا لگ رہا تھا۔

عافیہ دو سال پہلے پنجاب آئی تھی اور ان کے ہاں مہینہ بھر کے کئی تھے۔ کھلے ڈالے باجول کی پروردہ عافیہ نے دنوں میں عمر سے بے لطفی قائم کر لی۔ ہنسی مذاق ہلا گیا۔ کچھ بچپن سے ملے شدہ رشتے کا بھی احساس تھا۔ عافیہ کو عمر کی پر سنائی اچھی لگی۔ عافیہ کی طبیعت میں چھاجانے کا عنصر زیادہ تھا۔ اس کے برعکس عمر کی طبیعت دھیمی اور مقابل کا مان رکھنے والی تھی۔ اس وجہ سے وہ عافیہ سے کچھ دتا محسوس ہوتا تھا۔ بہر حال عمر کی یہ کوئی عافیہ کو بہت پسند آئی۔ اور وہ اسے مستقبل کے کھلے اشارے دیتی واپس کراچی گئی

تھی۔

”ہفتہ بھر میں زلزلہ آنے والا ہے امی۔ دعا کیجیے گا۔ بہت اچھی پوزیشن آئے۔ پیر زلزلہ بہت شان دار ہوئے تھے۔“ عمر نے امید سے کہا۔

”کیوں نہیں میرے بچے ان شاء اللہ۔ بہت اچھا زلزلہ آئے گا بالکل تمہارے گمان کے مطابق۔“

امی نے فوراً دعا کی تو وہ مسکرا کر کھانا ختم کرنے لگا۔

آج فیصل کو اباسے ملنے آنا تھا۔ وہ آیا اور اباسے ساتھ ڈرائنگ روم میں بند ہو کے بیٹھ گیا۔ باہر عافیہ کے دل کو گویا ہیسے لگ گئے۔ چائے بھی عاقب کے ہاتھ منگوائی گئی۔ ایک کھٹے کی مینٹنگ کے بعد فیصل کو ڈرائنگ روم کے بیرونی دروازے سے ہی خدا حافظ کہہ دیا گیا۔ اماں تک کو ملاقات نہ کرنے دی گئی۔

ابا باہر آئے تو سنجیدہ تھے۔ چہرے سے کچھ بھی اندازہ لگانا ممکن نہ تھا۔ صحن میں کچھ سیبوں کی طرف آئے تو اماں کے ساتھ ساتھ عافیہ بھی اوھر ہی آ بیٹھی۔ اسے امید تھی۔ جس طرح فیصل نے اسے متاثر کیا تھا۔ ویسے ہی ابا بھی اس سے متاثر ہوئے ہوں گے۔

”کیا بنا ملک صاحب، کیا تھا لڑکا؟“ اماں کے اشارے پر بھی وہ ڈھیٹ بن کے بیٹھی رہی تو انہیں اس کے سامنے ہی پوچھنا پڑا۔

”فیل۔ فیل۔ فیل۔“ سرب بے اعتنا لہجہ عافیہ پر بجلی سی گرا گیا۔

”کیا مطلب ہے ابا اس بات کا؟“ وہ تڑپ ہی تو اٹھی۔

”مہنہ اگاڑی لے کے رعب جانے آگیا۔ اپنے باپ کی دولت کا گھٹو۔“

”صاحب جانید او ہے۔ اتنا عالی شان رنگ۔“ عافیہ احتجاجاً بولی۔ مگر وہ تیز لہجے میں اس کی بات کاٹ گئے۔

”جب کچھ اس کے باپ کا ہے۔ صرف ایک گاڑی لے کے دی ہوئی ہے۔ اس نے بیٹے کو پٹرول پھونکنے کے لیے۔ سب پوچھا ہے میں نے فارغ، نکلا پھرتا ہے۔“

”اسے کام کرنے کی ضرورت ہی کیا ہے ابا۔“
 ”کیوں۔ ساری عمر باپ کے کٹڑوں پر پڑا رہے گا۔“

”سارے بزنس کا اکوٹا وارث ہے۔ وہ باپ کے لاڈ۔ پیار کی وجہ سے دھیان نہیں دیتا کام کاج کی طرف۔“ عافیہ نے فیصل کی حمایت کی۔

”بہر حال میرے تو کسی بھی سوال کا خاطر خواہ جواب نہیں دیا اس نے۔ میں بالکل بھی مطمئن نہیں ہوں اس لڑکے سے۔“

ابا نے صاف گوئی کا مظاہرہ کیا۔ عافیہ مرنے والی ہو گئی۔

”کیا امت کہیں ابا وہ کوئی سڑک چھاپ آوی نہیں ہے فارغ بیٹھ کے بھی کھائے تو دولت ختم نہ ہو ان کی۔“

”بہر حال۔ میں تمہیں وہ فیصلہ سنا رہا ہوں۔ جو اصل ہے اور آخری۔“ ابا نے اونچی آواز میں کہا تو ان کے دنگ بچے نے عافیہ جیسی بد لحاظ لڑکی کا دل بھی دھلا دیا۔

”صرف تمہاری خوشی کی خاطر میں اس لڑکے سے تمہاری شادی کرنے کو تیار ہوں۔“ ابا کے منہ سے گویا پھول جھڑے۔ عافیہ نے جھٹکا کھا کر ان کی طرف دیکھا۔

”میری صرف اور صرف ایک شرط ہے۔“ وہ بے حد سرد سیات لہجے میں بولی۔

”کیا ابا۔“ وہ مثبت ہوئی۔ مگر اندر سے سخت بے قرار۔

”اس سے کوئی مسئلہ نہیں باپ کو لے کے آئے۔ وہ باقاعدہ تمہارا رشتہ دیں۔ جیسے شریفوں کا طور طریقہ ہے۔“ ابا کا انداز قطعی تھا۔ عافیہ گڑبڑائی۔

ایک عین میں یہ تو فیصل کا کیس کنزور پڑا تھا اور ابانے

بھی اسی پوائنٹ پر ہاتھ مارا تھا۔
 ”ابا۔ میں بات کروں گی اس سے۔ لیکن اس کی کچھ گھلو مجبوریوں ہیں۔“ عافیہ نے کہا۔

”بتایا ہے اس نے مجھے۔ چچا کی بیٹی منگیت رہے اس کی۔ ابھی سے اپنے ماں باپ کو لائن پہ لگائے گا تو ہی اس گھر میں تمہاری جگہ بنے گی۔ ورنہ تو تمہیں کوئی پوچھے گا بھی نہیں وہاں اس عالی شان محل میں۔“ ابا نے طنز کیا۔

بات تو ان کی سو فیصد درست تھی۔ مگر فیصل کے والدین تو کبھی مر کے بھی عافیہ کا رشتہ مانگنے نہ آتے۔ یہ بات فیصل نے اسے شروع میں ہی بتادی تھی۔

”میں پھر بات کروں گی اس سے۔ شاید کوئی راستہ نکل ہی آئے۔“ عافیہ بچھ سی گئی۔ ابا نے انگلی اٹھا کر اسے متنبہ کیا۔

”یاد رکھنا عافی! میں نے اپنی غیرت کو سلا کے تمہاری اتنی ضد مانی ہے۔ لیکن اگر وہ لوگ رشتہ مانگتے نہ آئے تو اس سے بڑھ کے کوئی بات نہ کرنا۔ میں تمہیں کسی چور دروازے سے ان کے بنگلے میں داخل ہونے کی اجازت کبھی نہیں دوں گا۔“

ابا کی آنکھوں میں سرخی اتر آئی تھی۔ عافیہ نے نظر جھکا لیا۔

”جی ابا۔“ اس ہنسی سے کہا۔ مگر اندر تو طوفانی آتھل چٹھل مچی تھی۔

وہ آفس سے نکلی تو پروگرام کے مطابق وہ گاڑی لیے موجود تھا۔ عافیہ فرنٹ سیٹ پر آ بیٹھی۔

”کسی پارک میں لے چلو۔ سکون سے بیٹھ کے بات کرتے ہیں۔“ وہ دست سی تھی۔

”خیریت تو ہے نا۔ تمہارے ابا نے مجھے رنجش کاٹ تو نہیں کر دیا ہے۔“ گاڑی اشارت کرتے ہوئے وہ خوش دلی سے پوچھنے لگا۔

”شاید۔“ تمہیں کیسے پتا چلا؟“ عافیہ نے ترجیحی نگاہوں سے اسے دیکھا۔

”جیسے وہ طارق عزیز بن کے سوال پوچھ رہے تھے۔ اسی سے مجھے لگ رہا تھا کہ دل سے وہ اس رشتے پر راضی نہیں ہیں۔“ وہ صاف گوئی سے بولا۔ پھر پارک آنے تک وہ دونوں خاموش ہی رہے۔ پروق پارک میں قدرے سائیز پر وہ دونوں چلتے ہوئے ایک بیچ پہنچے۔

”اب بتاؤ تفصیل سے۔ کیا ارشاد فرمایا تمہارے ابا نے؟“ فیصل کے انداز سے کوئی پریشانی ظاہر نہ تھی۔ ”ابا اس رشتے پر راضی ہیں۔“ عافیہ نے کہتے ہوئے رک کر فیصل کو دیکھا جس کے چہرے پر حیرت پھیلی تھی۔ پھر گہری سانس بھر کے بولی۔ ”مگر رشتہ لے کر تمہارے والدین آئیں تو۔“

”اور یہی ایک کام ہو نہیں سکتا۔“ ”تم میرے ابا کو نہیں جانے فیصل! ان کا اس رشتے کے لیے راضی ہو جانا ہی کسی معرکے سے کم نہیں۔“ ”اور تم میرے باپ کو نہیں جانتیں۔ میرے تمہارے اخیوت کا علم ہوئے ہی وہ اپنی بیٹی سے میرا نکاح دھوا دیں گے۔“

فیصل نے ٹھنڈے غار لہجے میں جواب دیا۔ ”تم ان کے اکلوتے بیٹے ہو فیصل۔ ذرا بلیک میل کرو گے تو انہیں ماننا ہی پڑے گا۔“ عافیہ نے اپنی سی کوشش کی۔

”تمہارا کیا خیال ہے۔ اگر ایسا ہو سکتا ہے تو مجھے کیا شوق ہے۔ خوری کا یا کٹے کٹے کے لوگوں کی باتیں سننے کا۔“ وہ بھڑک اٹھا۔ تو عافیہ دھیمی پڑ گئی۔ پھر وہ بھی خود کو کمپوز کرتے ہوئے قدرے نرمی سے بولا۔

”یہ خاندانی جائیداد اور برنس کے معاملے ہیں جان! تم نہیں سمجھو گی۔ میری اور شانہ کی شادی کی صورت میں شانہ کے حصے کی جائیداد اور برنس شیئرز ہمیں ملیں گے۔ یہ بات تو طے شدہ ہے۔ اب تم سے تو فقط محبت کے مارے شادی کر رہا ہوں۔ ورنہ کیا حاصل ہو رہا ہے مجھے جو تمہارے ابا اتنی شرطیں رکھ رہے ہیں۔“

”وہ تو ٹھیک ہے فیصل! لیکن اب کیا ہو گا۔ ابا نے

”تمہارا رشتہ قبول کرنے کی یہی ایک شرط رکھی ہے۔“ عافیہ بے بسی سے بولی۔ پر آسائش زندگی کا خواب دور جانا محسوس ہوا تھا۔

”شادی میں نے تم سے کہنی ہے جان من۔ تمہارے ابا سے نہیں۔ ان کے راضی ہونے یا نہ ہونے سے مجھے کوئی فرق نہیں پڑتا۔“ وہ بے نیازی سے بولا۔ تو عافیہ نے نا جی کے عالم میں اسے دیکھا۔ وہ مسکرایا۔

”کیا کچھ غلط کہا میں نے؟“ ”مگر ابا کی رضامندی کے بغیر یہ شادی کیسے ہوگی؟“ ”شادی کے لیے ابا کا نہیں بلکہ دولہا اور دلہن کا ہونا ضروری ہوتا ہے۔“

وہ اطمینان سے کہتا اس کے باقی ذہن کو نئی سوچ کی باگ تھما رہا تھا۔ عافیہ گم سم سی تھی۔

☆ ☆ ☆

عافیہ نے ابا کو صاف لفظوں میں بتا دیا کہ فیصل کے گھر والے اس رشتے پر کسی طور پر راضی نہیں۔ اس لیے انہیں فی الحال فیصل ہی پر انگٹا کرنا پڑے گا۔ مگر ابا متاثر تو کیا ہوتے انہوں نے ہاتھ ہی جھاڑ دیے۔

”فاطمہ فون کرو اپنی آپا کو اور شادی کی تاریخ طے کر لو۔“

”ابا۔۔۔“ عافیہ سکتے میں آگئی۔ جبکہ ابا کے تونل کی کلی ہی کھل اٹھی۔ بن سے کیا وعدہ بھالنے کا وقت قریب آ گیا تھا۔

”میں نے کہا ملک صاحب! اچھا سنگن ہے۔ عالی کے ساتھ ساتھ عاقب کو بھی بچھاؤ لیں۔ گھر کی بچی ہے زینب۔ گھر ہی میں کھپ جائے گی۔“ ابا بے حد خوش تھیں۔

”ٹھیک ہے۔ سوچتے ہیں اس کا بھی کچھ۔“ ابا نے پر مٹ جاری کر دیا۔ چن میں کھڑی زینب تو خوشی کے مارے گنگ سی ہو گئی۔

عاقب سے شادی ہو جانے کا مطلب تھا۔ اس گھر میں ایک معتبر حیثیت ملنا اور یہ کلمہ ہی عافیہ بھی بیاہ کے

”دور رخ ہو جائے گی۔ متوقع آزادی کا خیال ہی اس کے روم روم میں خوشی دوڑانے کو کافی تھا۔“

☆ ☆ ☆

عثمان کا فون آیا تو وہ الجھا ہوا تھا۔ ”امی۔ کیا جلدی ہے آپ کو عمر کی شادی کی۔ اسے کوئی ڈھنگ کی نوکری تو کر لیتے دیں۔ ایک اور ذمہ داری ڈال رہی ہیں اس پر۔ جو بھالنے کے انہی وہ قابل بچی نہیں ہوں۔“ اس کے منہ میں یقیناً ”بیوی کی زبان تھی۔“

”تم بے فکر ہو۔ اللہ کے فضل اور عافیہ کے ٹیک نصیب سے امتحان میں بہترین نمبروں سے کامیاب ہوا ہے۔ وہ۔ بڑی اعلا نوکری لگے گی اب اس کی۔“ امی بے حد خوش تھیں۔

کل ہی فاطمہ نے فون کر کے اگلے ماہ شادی کی تاریخ دی تھی۔

”پھر بھی امی۔ ذرا سوچ سمجھ لیں۔ عمر اس کی ذمہ داری اٹھالے گا؟“ وہ دبے لفظوں میں جواب نہیں سمجھتا چاہ رہا تھا۔ وہ ایک دم سے ان کے ذہن میں کلک ہوا۔

”تم بے فکر ہو بیٹا۔ ساری ذمہ داری وہ خود ہی اٹھائے گا اور اپنی شادی کا خرچ بھی ان شاء اللہ۔“ ان کا لہجہ بھیک سا گیا۔ ایک ہی روٹی پہ پلٹنے والے کیسے اپنے رزق جدا کر لیتے ہیں۔

”چلں ٹھیک ہے۔ پھر تو جیسا وہ مناسب سمجھے۔ میرا تو آپ کو بتا ہی ہے۔ ڈھنگ کی نوکری نہیں مل رہی۔ بیکشکل ہی گزارا۔“ وہ اپنا رونا رونے لگا۔

”خدا بہتر کرے گا بیٹا۔“ ماں کے دل نے خیر ہی کی دعا دی۔ وہ خوش تھیں۔

اور عمر مطمئن۔ اس گھر میں آنے والی یقیناً اس کی ماں کو بہت سکھ اور عزت دینے والی تھی۔

☆ ☆ ☆

”خدا کے لیے کسی طریقے سے اپنے ابو کو راضی کرو فیصل۔ بلکہ اپنی امی کو، مائیں تو سدا کی رحم دل ہوتی ہیں۔ وہ یقیناً تمہارا ساتھ دیں گی۔“ عافیہ نے

شادی کی تاریخ طے ہونے والی بات فیصل کو بتاتے ہوئے التجا تک کر ڈالی۔

”کہا فیصل کی بحث ہے یا رانہ حاصل نہ وصول۔ ہمارے گھر میں فقط ابو کا فیصلہ چلتا ہے اور بس۔“ فیصل اکتا کر بولا۔

”تو پھر۔۔۔ بیٹھ کے شادی کا دن آنے کا انتظار کروں؟“ عافیہ کو غصہ آیا۔ سچ ناظم میں وہ اس کے ساتھ چھوٹے سے ریٹورنٹ کے کیمپن میں موجود تھی۔

”ہاں۔ انتظار کرو۔ اپنی اور میری شادی کے دن کا۔“ وہ شوخی سے بولا۔

”تم بس گاڑی کی آڈی دھول دیکھتے رہ جانا اور ابا مجھے عمر کے ساتھ رخصت کروں گے۔“ عافیہ نے جل کر کہا۔

”ایسا کچھ بھی نہیں ہو گا۔ تم لکھ رکھو۔ رخصت تو تم میرے ساتھ ہی ہو گی۔“ وہ حد درجہ مطمئن تھا۔ عافیہ کا دل اس کے یقین بھرے لہجے پر ٹھہرنے لگا۔ شاید تب تک اس کے والدین راضی ہو جائیں۔

”مگر تم حتمی شادی والے دن بھی اپنے گھر والوں کو راضی کر کے لے آئے تو میں تمہارے ساتھ چل پڑوں گی فیصل۔“ وہ جذباتی ہو کر بولی۔

”ڈونٹ وری جان۔ تم شادی کی اچھی سی تیاری کرو بس۔ زیور کپڑے خوب دل لگا کے خریدو۔ تاکہ گھر والے تمہاری طرف سے مطمئن رہیں۔ میری جان لیا د رکھو۔ آخری چال ہماری ہی ہو گی۔“

وہ اس کا ہاتھ تھام کے یقین سے بولا اور اس کا ہاتھ لیوں سے لگایا۔

خوب صورت سی مسکراہٹ عافیہ کے لیوں پر پھیل گئی۔

☆ ☆ ☆

زینب کا موڈ صبح سے خراب تھا۔ جب سے عافیہ نے اس کے پیروں سے اپنی گلابی اور سیاہ دوپٹی چنل اتروائی تھی۔

”کھینچی، ندیدی“ اللہ کرے مر جائے دے کے
چیزیں واپس لینے والی۔
اس نے کتنی ہی دفعہ آنسو پونچھے تھے۔
”ہائے۔ کتنی اچھی لگ رہی تھی۔ میرے
گورے گورے پیروں میں۔“ اس نے حسرت سے
سوچا۔

چپل خاصی مہنگی تھی۔ مگر اس کی پٹی ڈھیلی پڑ گئی تو
عافیہ نے یوں ہی الماری کے خانے میں ڈال دی۔ نئی
جوتیوں نے اسے اس چپل کی یاد بھی بھلا دی۔ دو دن
پہلے اس نے زینب سے الماری صاف کروائی تو وہ چپل
شاید بطور مزدوری عنایت کر دی۔ زینبی تو کسی پر خوش
ہو گئی۔ فوراً ”ہی محلے کے بچے کو بھیج کر جوتی سلائی
کروائی اور پہن لی۔ مگر اس کا شوق دو دن ہی پورا ہوا“
تیسرے دن عافیہ کی نظر اس کے پیروں پر پڑی تو اسے
خیال آیا کہ اچھی خاصی خوب صورت چپل تھی۔
جب زینب کے پیروں پر اتنی اٹھ رہی ہے تو یقیناً ”اس
کے پیروں میں بھی اتنی ہی خوب صورت لگتی ہوگی۔
اس نے فوراً ”ہی حکم صادر کیا کہ یہ چپل انار کے
الماری میں رکھ آؤ۔ زینب کا دل حسب عادت ٹوٹ
پھوٹ گیا۔

”مجھے تو بس ہر کوئی اپنا مطلب نکالنے کے لیے
استعمال کرتا ہے۔ زینبی یہ کرو، زینبی وہ کرو۔ اس کے
بعد کون زینبی گماں کی زینبی۔“
وہ سخت برگشتہ آزرہ تھی۔

عافیہ نے دل اور جیب کھول کر اپنے لیے زیور اور
کپڑے خریدے تھے۔
”اسی سونو نگر کو ہاتھ بھی مت لگانا۔ اکلوتی بیٹی ہو۔
باپ کے پیسے ہر شے بناؤ۔“ فیصل نے مشورہ دیا۔
پھر وضاحت بھی کر دی۔

”کل کو جانے کیسے حالات ہوں۔ کچھ عرصہ اگر
مشکل کاٹنی پڑی تو کچھ میرا بینک بیلنس اور کچھ تمہاری
سیونگر سے کام چل جائے گا۔“

”یہ تو تم نے بالکل ٹھیک کہا اور ویسے بھی میرا خرچہ
نکل کے میری ساری تنخواہ بینک میں ہی جاتی ہے۔ اب
تو میری تنخواہ کا ایک روپیہ تک لینا حرام سمجھتے ہیں۔“ وہ
مسکرائی۔
”وہ ہو۔ یعنی کہ خاصی بھڑکی آسانی ہو۔“ وہ
ہنسنا۔ تو عافیہ اتر آئی۔
”کیسی دلی۔“

فیصل کی لاروائی پر عافیہ پریشان تو بہت تھی۔ مگر وہ
محلے کو اتنا جگے انداز میں لے گیا تھا کہ وہ بھی بسل
جاتی۔ شادی میں محض ایک ہفتہ باقی رہ گیا تھا۔
لڑکے والے مندی سے ایک روز پہلے کراچی آتے
اور دو دن یہاں رہ کر دلہن لے کر جاتے۔ سب
پر گرام ملے تھا۔ جب فیصل نے فون پر بڑے جوش
سے اسے بتایا۔

”مبارک ہو عافی! ابی، ابو کو راضی کر لی لیا میں
نے۔ وہ میرا پوڈل لے کر آئے کو تیار ہیں۔“
”واقعی۔“ وہ خوش ہو گئی۔

”ہاں۔ تم بتاؤ۔ آج۔ ابھی۔ شام کو۔ کس
وقت آؤں انہیں لے کر؟“ وہ محبت سے پوچھ رہا تھا۔
”میں اب کو بتاتی ہوں۔ وہی ملے کر سن گے۔ یہ شرط
بھی تو انہوں نے ہی رکھی تھی۔“ وہ فرط مسرت سے
بولی۔

اس کم عقل کو ذرہ برابر بھی احساس نہ تھا کہ اس کی
شادی طے ہو چکی ہے اور محض ایک ہفتے بعد بارات
آنے والی ہے۔ اس نے جا کر پہلے اپنے تئیں یہ خوش
خبری اماں کو سنائی۔

”ہائیں۔“ وہ کھلے منہ اور چمٹی آنکھوں سے اسے
دیکھتی رہ گئیں۔ ”گیا کہہ رہی ہے کہ بخت۔“
”جی۔ افسوس۔ ابانے ہی تو کہا تھا کہ فیصل کے گھر
والے اگر رشتہ لے آئے تو وہ میری اور فیصل کی شادی
ہو جانے دیں گے۔ مبارک ہو اماں، فیصل کے ماں
باپ ملان گئے۔“ وہ تو جیسے ہواؤں میں اڑ رہی تھی۔

استحبابا“ جا کر اپنے کمرے میں بند ہو گئی۔

لاڈلہ میں پلی اکلوتی بیٹی نوکری کر کے خود سرو خود
بھارت ہو چکی تھی اور خود غرضی تو اس کی فطرت تھی۔ وہ
ان لوگوں میں سے تھی جو سب سے پہلے اپنے بارے
میں سوچتے ہیں۔ اس سے پہلے سب اس کی ناراضی کو
اہمیت دیتے تھے۔ مگر اس بار تو اس کی ضد اور جرم اس
قدر کڑا تھا کہ کسی نے بھی اس کے کمرہ نشین ہونے یا
بھوک ہڑتال کرنے کا ٹولس نہ لیا تھا۔ فقط زینبی ہی تھی
جو اس کے لیے چائے پانی اٹھاتا لے جاتی۔

”دفع ہو جاؤ۔ کیوں بار بار آ جاتی ہو یہ سب لے
کر۔“ عافیہ نے غصے سے ٹرے کو پرے دھکیلا۔ مگر ان
دلوں زینب کا موڈ اس قدر خوش گوار تھا کہ اسے اب
عافیہ بے چاری سی لگنے لگی تھی۔

”گیا کرتی ہیں عافیہ جی۔ شادی ہو رہی ہے آپ کی۔
یوں بھوک ہڑتال کرتی رہیں تو چرے کی رونق ختم
ہو جائے گی۔ روپ نہیں آئے گا۔ گدا بن گئے۔“

وہ مسکرائی۔ ”چمچنی رنگت اور براؤن کینچوں جیسی
شفاف آنکھیں عافیہ جی بھر کے جھلس رہی ہیں۔
”تخنے اچھے تو ہیں عمر بھائی۔ آپ کے کمپیوٹر میں
ڈیروں تصویروں ہیں ان کی۔“ اس کی خاموشی نے
زینبی کی ہمت بندھائی۔

”تو تم لے لو اتنا اچھا ہے تو۔“ وہ غرا کر بولی تو زینبی
سسم سی گئی۔

”تمہارا تو رنگ روپ ماند نہیں پڑا۔ تم کر لو یہ
شادی۔“ عافیہ کی تو زبان گے آگے کھائی تھی۔
”نہ جی۔ تو بس۔ میں ایسا کیسے۔ آپ کی مندی
والے روز میرا اور عاقب کا نکاح ہے۔“ اس نے
گھبرا کر کہا۔ تو بات کے آخر میں رنگت میں سرخی
اترنے لگی۔

”تو جاؤ۔ دفع ہو جاؤ۔ بھنگڑا ڈالو جا کے۔ تمہاری
کون سا زندگی برباد ہو رہی ہے، میری طرح۔“ عافیہ

اماں کو ٹوٹ کر ہوش آیا۔ اسے دو ہنر سید کیے
”میری حرام خور بے غیرت، کیسی کلمہ ہی ہے تو۔
اری لاج نہ آئی تھے شادی سے پانچ دن پہلے دو سرا
رشتہ لاتے بے حیا باپ کو پتا چلا تو لدی سے زبان کھینچ
لے گا تیری۔“ اماں ایسا چپچپ کہ حلق میں خراشیں پڑ
گئیں۔ کھانسی شروع ہو گئی۔ زینب بھاگ کے پانی
لائی اور گلاس ان کے منہ سے لگا دیا۔ ان کی آواز ابابو
ڈرائنگ روم میں سے باہر کھینچ لائی۔
”گیا تمہارا گھر کھا ہے یہاں۔“ وہ غصے میں تھے۔
”چار لوگ آئے بیٹھے ہیں اور تم نے یہاں اپنا ڈیک چلا
دیا۔“

”مجھ سے کیا پوچھتے ہیں عاقب کے اب اس بد ذات
سے پوچھیں۔ جس کے چھن شریفوں والے نہیں
رہے۔“ وہ دھڑکے میں منہ دیے بھہہک کر رو دیں۔
وہ حیرت سے عافیہ کی طرف متوجہ ہوئے۔ جس کے
تاثرات کی خود سری اور ماتھے کی تیوری انہیں صاف
محسوس ہو گئی تھی۔
”کیا ہوا؟“

”اماں کی تو عادت ہے۔ چھوٹی سی بات کو کھینچ کے
چونگم بناتی ہیں۔ میں نے تو صرف اتنا ہی بتایا ہے کہ
فیصل نے امی ابو مان گئے ہیں اور وہ شام کو انہیں میرا
رشتہ مانگنے لارہا ہے۔“

ابا پر بھی لمحہ بھر کو سکتہ سا طاری ہوا۔ اس کے بعد تو
انہوں نے نہ آؤ کھانہ نہ آؤ عافیہ کی چٹپٹا پکڑ لی۔

”خبروا۔ خبروا جو میری عزت کا جنازہ نکالنے والی
بات منہ سے نکلی ہو تو۔“ وہ دھیسے، مگر خوشخوار لہجے میں
غرائے تھے۔ ”زندہ گاڑیوں لگا اگر اب جو تمہارے
منہ سے فیصل کا نام سنا تو۔“ یہاں آیا تو اماں، باپ
سمیت کفن میں واپس جائے گا کہہ دینا اسے۔ ”ایک
جھٹکے سے اسے پرے دھکیل کر وہ تن فتن کرتے واپس
چلے گئے۔“

عافیہ کے لیے ابابا روپیہ کھلی دھوکے بازی تھا۔ وہ

نے غصے سے کہا تو زینبی کا دل برا پڑنے لگا۔ عافیہ کسی کی خوشی میں تب ہی خوش ہوتی۔ جب خود وہ خوش ہوتی تھی۔

”مجھے یہاں آنا ہی نہیں چاہیے تھا۔ چڑیل کے مسکن میں۔“ وہ ٹرے اٹھا کے بدلی سے پلٹ گئی۔

عافیہ کی خاموشی نے اماں، اماں کو اس کی طرف سے خاصا لارو اکر دیا تھا۔ ویسے بھی آج شام عمر کے گھر والے آجائے والے تھے۔ کل مایوں، ہندی، پرسوں، یارات کے بعد وہ دلن لے کے بیٹاب نکل جاتے۔ عاقب نے اسے دھوکا پہ آئی خواتین کے لیے چائے بناتے ہوئے کچن میں جالیا۔

”ابا۔۔۔ میری دلن یہاں چھپی بیٹھی ہے۔“ وہ ایک دم سے بولا تو پھلتی میں چائے چھانتا اس کا ہاتھ لرزا۔ گرم گرم چائے کر کر اس کے پاؤں کو جلا گئی تھی۔

”اللہ۔۔۔ اس کے جملہ کامزہ کیا خاک لیتی۔ پاؤں لال سرخ ہو گیا۔“

”سوری۔۔۔ سوری۔۔۔ مجھے نہیں پتا تھا کہ چائے ڈال رہی ہو۔“ عاقب نے فوراً کان پکڑے۔ وہ خاموشی سے پلٹ کے ٹرے اٹھانے لگی۔

”ارے داد۔۔۔ بڑا غور ہے زینبی محترمہ کو۔ میں بات کرنے کو مرا جا رہا ہوں اور تمہیں پرواہی نہیں۔“ وہ خفا ہوئے لگا۔

زینبی نے مسکراہٹ دیانی۔ دل روئی کے گالے کے طرح ہلکا پھلکا ہو رہا تھا۔ اس دن کے تو وہ خواب بنا کرتی تھی۔

”وہاں چائے کا انتظار ہو رہا ہے۔“ باریک سی گوٹی سے سجائیں ٹکر کا سون اس پر کھل رہا تھا۔ عاقب نے آج سے پہلے اسے بیٹھ گھر کی مرغی سمجھا تھا جو وال موہا کرتی ہے۔ مگر آج اسے احساس ہوا کہ کون سا

ہیر اس کی آغوش میں گرنے والا ہے۔

”کل ہمارا نکاح ہے زینبی۔“

وہ جذباتی ہونے لگا۔ آگے بڑھ کے اس کے دونوں شانوں کو جٹڑا۔ زینبی کے جذبات میں بھی تلاطم چلا۔ اس نے بڑے حوصلے سے نگاہ اٹھا کے عاقب کو دیکھا۔ اونچا لمبا ہندی رنگت اور اچھے نقوش والا عاقر اس کا خواب تھا یا شاید اپنی حیثیت بدلنے کے لیے استعمال کیے جانے والا ذریعہ۔

”زینبی۔۔۔“

عاقب کی نگاہ کے ساتھ ساتھ آواز میں بھی غبار اتر۔ زینبی نے بے سرعت اس کے ہاتھوں کو اپنے شانوں سے پرے کیا۔

”ہوش میں رہو۔“ اس کا تینہ ہی جملہ ابھی منہ میں ہی تھا کہ اس نے عاقب کے پیچھے عافیہ کو دیکھا۔

”یہاں کون سی فلم کی ریکارڈنگ چل رہی ہے؟“ اس کا طنز یہ لہجہ اچانک ہی گونجا۔ عاقب کے جذبات ہرن ہو گئے۔

”دھسے پانی۔۔۔ پینے آیا تھا میں۔“ کھیا کر کتا، بالوں میں ہاتھ پھیرتا وہ باہر چلا گیا۔ زینب مڑ مڑ کر ٹرے اٹھانے لگی۔

”کافی آوارہ ہو تم بھی۔۔۔“ عافیہ کا کڑوا لہجہ اس کے اعصاب پر چلبک کی طرح ہر سا۔

”میں نے کیا کیا ہے۔ وہ خود آیا تھا یہاں۔ میں نے چائے بنا رہی تھی۔“ زینبی روپائی ہونے لگی۔

”اری چل۔۔۔ بکواس تو اس کے سامنے کر جو تجھے جانتا نہ ہو۔ کیسے ابھی سے انگلی۔۔۔ بھاری ہے اسے۔“

اشاروں، اشاروں میں یہاں آئے آئی۔ پہلے بھی ہا نہیں کیا کیا گل جھڑے اڑا چکی ہوگی۔ ہم تو چھٹی اعتبار کے بندے ہیں۔ بھی غوری نہیں کیا۔“

عافیہ کی زہنی گراوٹ کی تو کوئی حد ہی نہ تھی۔ زینب پہلی پڑ گئی۔ ایسے کھٹا الزامات۔

اسی وقت لڑکے والوں کے آنے کا شور مچ گیا تو عافیہ اسے جیکھی نگاہوں سے دیکھتی کچن سے نکل گئی۔

زینب نے دھندلائی آنکھوں کو بے دردی سے ہتھیلیوں سے رگڑا۔
دل یک لخت ہی بو جھل سا ہو کر جیسے دھوئیں سے بھر گیا تھا۔

عمر کی فحلی کے ساتھ خاندان کی چند خواتین اور مرد یارات کے طور پر آئے تھے۔ رات سکون کے ساتھ مگر۔۔۔ اوپر کی منزل پر سب کے ذہنی بستر لگا دیے گئے تھے۔ تین کمروں میں چند لوگ آسانی سے سو گئے۔ البتہ عمر کو عاقب کے ساتھ کو شینر کرنا تھا۔ عمر نے گرم جوشی سے اسے ہونے والے نکاح کی مبارک باد دی۔

صبح ناشتے کے لیے اکیلی زینبی ہی گھن چکر بی ہوئی تھی۔ اماں کو عافیہ کی سستی اور ہڈ خراپی بری طرح کھلی۔
”ارے عالی کو جگاؤ۔ تمہارا ہاتھ بناوے کچھ۔“ انہوں نے زینبی کو بکارا۔

”زینبے دس ناٹی اماں! دس ہے وہ کلم کرتی اچھی لگے گی بھلا۔“ زینبی نے بچھول کے ساتھ مسکرا کر کہا تو وہ تلملا گئیں۔

”تمہاری بھی تو شادی ہو رہی ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ بندہ تخت نشین ہو کر بیٹھ جائے۔“

آپا کے سامنے عافیہ کی ہڈ خراپی انہیں بالکل بھی نہیں بھاری تھی۔ اتنے سارے مہمانوں کو بھلا اکیلی زینب کی کیا سنبھال پائی۔ عمر کی بھابھی صاعقہ کے ہاتھ بھی طر کا مہر بچ گیا۔

”بھئی ہم تو مہمان ہیں یہاں ورنہ خود ہی اٹھ کے سب بچا لیتے۔ اب کون دلتا ہے دیکھتا ہے اور پھر گھر آئے مہمانوں کی خاطر داری۔“ تب اماں کو اٹھنا ہی پڑا۔ کڑے تیور لے کے عافیہ کے کمرے میں گئیں۔

”اس قدر بے حیا اور ڈھیٹ لڑی ہے یہ۔ رات ایک بار شکل دکھا کے دوبارہ بیٹھی نہیں خالہ کی طرف۔ ہونے والی ساس ہے۔ اتنا بھی لحاظ نہیں کیا کینجٹ

نے۔“

وہ دروازہ دھکیلی اندر آئیں تو بستر خالی پا کر دل مطمئن ہوا۔ عافیہ اٹھ گئی تھی۔ وہ بیڈ پہ بیٹھ گئیں۔ وہ یقیناً واش روم میں تھی۔ وہ بیڈ پر تھیں۔

”شکر ہے اسے بھی عقل آئی کچھ۔“ وہ اس کی گوشمالی کرنے کے خیال سے وہیں بیٹھی تھیں۔ تب ہی انہیں دھیان آیا کہ بیڈ کی چادر بے ممکن تھی اور سفید چادر تہہ کی ہوئی پیروں کی طرف پڑی تھی۔ عافیہ اتنی سکھ تو نہ تھی کہ اٹھتے ہی چادر تہہ کر کے بیڈ شیٹ درست کر کے پھر ہاتھ روم جاتی۔

”زینبی نے کیا ہوگا سب کچھ صحیح۔“ انہوں نے ذہن کو دوسری طرف لگایا۔

پھر انہیں خیال آیا کہ زینبی تو مستقل کچن میں سر کھپا رہی ہے۔ ان کا دل گھبرانے لگا۔ واش روم میں بالکل خاموشی تھی۔ پانی گرنے کی آواز تک نہ تھی۔

پھر ان کی نگاہ واش روم کے اوپر کھلے دروازے کی جھری پر پڑی۔ وہ بدقت اٹھ کر واش روم کی طرف بڑھیں۔ واقعی دروازہ کھلا تھا۔ انہوں نے دروازہ دھکیلا تو واش روم خالی۔

”یہ صبح کمال دفع ہو گئی۔“ ان کا دل گھبرا گیا۔ دروازے تک جا کر انہوں نے زینبی کو زور زور سے آواز دیں تو وہ بھاگتی ہوئی آئی۔

”عالی کہاں ہے؟“ انہوں نے متوحش انداز میں پوچھا تو وہ ان کے شانے کے اوپر سے کمرے میں جھانکتے ہوئے بولی۔

”واش روم میں ہوں گی۔ میں تو صبح سے ادھر آئی ہی نہیں۔“

”میرے خدا۔۔۔ وہاں مہمانوں میں دیکھ۔ وہاں نہ ہو۔“

”ادھر تو بالکل بھی نہیں ہیں۔ وہ سب تو دلن دیکھنے کو بے تاب ہیں۔ ابھی ناشتا دے کے آ رہی ہوں سب کو۔“

زینب نے تین سے کہا تو وہ لڑکھڑاسی گئیں۔ بے شکن بیڈ شیٹ تہہ کی ہوئی چادر جیسے رات اس بستر پر

کوئی سویا ہی نہ ہو۔ زینب نے گھبرا کر انہیں قہام لیا اور بیڈ پر لایا تھا۔

”نہیں۔ الماری تو ٹھیک ہے آپ کی؟“
”نہیں۔ الماری چپک کر عافی کی۔“ انہوں نے ڈوبتی آواز میں کہا تو وہ جیسے ان کی ذہنی حالت پہ شک کرتی ان کو دیکھتے ہوئے بولی۔

”الماری میں تھوڑی چھپی ہوں گی وہ۔“
”الماری میں زیور دیکھ کجنت۔ کپڑا لادیکھ اس کرموں جلی کا۔“

وہ دلی آواز میں دھاڑیں تو گھبرا کر زینب نے عافیہ کی الماری کے دونوں پٹ کھولے۔

کل تک بیٹنگ زینب جوڑے لٹک رہے تھے۔ خانوں میں تہہ در تہہ پڑے تھے ان کی نگاہ بے اختیار الماری کی سائیز پر پڑی۔ جہاں عافیہ کے جینز کے کپڑوں کا سوٹ کیس رکھا تھا۔ وہ جگہ اب خالی تھی۔ ڈوبتے دل اور لرزتے قدموں کے ساتھ وہ تیزی سے آگے بڑھیں اور الماری کا لاکر کھولا۔ وہ کسی فقیر کے کاسے کی مانند خالی تھا۔

”ہائے۔“ ان کی آوازیں غم و اندوہ تو تھیں۔ مگر کچھ ایسی کیفیت بھی تھی جس نے زینب کو لرزادیا۔
”راکھ ڈال گئی ہمارے سروں میں۔ عافیہ تیرا بیڑا غرق ہو۔“ وہ رو دیں۔

زینب کی پیشانی پسینے کے قطروں سے چمک اٹھی۔
”اماں دھڑام سے وہیں بیٹھ گئیں۔“
”تائی اماں۔“

”زینب۔“ مر گئے ہم لوگ، جنازہ نکل گیا آج تیرے تایا کی عزت کا بھاگ گئی وہ بے غیرت گھر ہے۔“
تائی اماں منہ پر دوپٹا ڈالے بین کر رہی تھیں۔ زینب کو لگا اس کے قدموں تلے زمین نکل گئی ہو۔

زینب نے چوروی کی طرح سارے گھر میں دیکھ لیا۔ مگر وہ کہیں نہیں تھی۔ مجبوراً ”ابا کو کمرے میں بلانا پڑا۔“

”کیا مصیبت ہے۔ ہزار کام پڑے ہیں وہاں اور یہاں تم۔“ وہ کچھ غصے میں اور کچھ جھنجھلائے ہوئے

اندرو داخل ہوئے مگر اماں کو روتے کر لاتے دیکھ کر گھبرا گئے۔

”کیا ہوا نیک بخت؟“ عاقب سرخ چہرے لیے تیز قدموں کے ساتھ اندر آیا۔

”کہاں گئی ہے وہ؟“
”کون۔ کیا ہوا؟ کچھ بتاؤ تو؟“

”ملک صاحب۔ لٹ گئے ہم۔ عزت کا جنازہ نکال گئی ہماری بیٹی۔“ اماں بلک اٹھیں۔

ابا لڑکھا کر پیچھے ہٹے۔ پچھلی آنکھوں میں بے یقینی تھی۔ عاقب نے جلدی سے بڑھ کے انہیں سنبھالا۔

”عافی کہاں ہے؟“ وہ بے اختیار الماری سے اُٹھ کر عاقب اور روئے چہرے والی زینب کو دیکھ رہے تھے۔

”وہ۔“ وہ تو نہیں ہیں گھر میں۔ الماری بھی خالی ہے۔ کپڑے زیور سب۔“ زینب کو بے لحد قیامت لگ رہا تھا۔

ابا کے منہ سے غراہٹ سی نکلی اور بس۔ وہ وہیں ڈھسے گئے تو جوان جہاں عاقب سے بھی نہیں سنبھالے گئے۔ زینب بے اختیار اس کی مدد کو آگے بڑھی تھی۔

خالہ اور عمر کو یہ سب بتانا ایک اور قیامت تھا۔ مگر اماں نے بڑی بسن کے آگے ہاتھ جوڑ دیے۔

ان کی رنگت فق پر گئی۔ عمر نے سختی سے دانت پیچھے۔ کپڑوں کی ریشیں نمایاں ہو گئیں۔ صاعقہ بھاہی کے ہاتھ ایک نیا شوٹ لگا۔

”اے لوس۔ تو ہمیں کیا یہاں بے عزت کرانے کے لیے بلوایا تھا۔“

”نہ میری بیٹی رات کو تو گھر یہ ہی تھی۔ ملی تھی تم لوگوں سے۔ پتا نہیں کس کے ہکاؤے میں آگے۔“

اماں ہبھک کے رو دیں۔ جھوٹ بوتیں بھی تو کس منہ سے، ٹینشن سی ٹینشن۔ بارات کے ساتھ آئے مہمانوں کا خیال۔

ساری عمر کی جمع پونجی۔ ایک عزت۔ کراچی دہلی لینے آئے تھے۔ اب کیا کہتے سب

سے؟

بارات بنا دہلی کے واپس جاتی؟
عمر کا دلخ خراب ہونے لگا۔ خالہ رونے لگیں تو ان کی طبیعت بگڑ گئی۔

”میں کیا منہ دکھاؤں گی برادری والوں کو۔ سرسالی عزیز ہیں میرے۔“

وہ اپنی جگہ صحیح تھیں۔ ابھی معاملہ فقط گھر کے لوگوں کے درمیان تھا۔ مگر کسی کو بھٹک پڑ جاتی تو۔

ماں کی طبیعت کی خرابی عمر بھاری پڑنے لگی۔
”تمنا شا، بھڑا دیا آپ لوگوں نے ہمارا۔ اگر لڑکی کی مرضی نہیں تھی تو پیسے بتا دیتے۔ ہمارے لڑکے کو کون سا لڑکیوں کی کمی تھی۔“ صاعقہ بھیما بھیما ان کے لئے لے رہی تھیں۔ اماں نے ہاتھ جوڑ دیے۔

مگر فقط ہاتھ جوڑنے سے معاملہ نہیں بننے والا تھا۔ سب کو ابا کے ساتھ سر جوڑ کے بیٹھنا پڑا۔

زینب کا دل گھیرنے لگا۔ سب ڈراٹنگ روم میں بند ہو گئے تھے۔ ابا کا دھیما لہجہ، عمر کی بلند آواز، تائی اماں کے بین صاعقہ کا تیکھا انداز، گفتگو۔

دروازے سے کان لگا کے کھڑی زینب کی کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ عمو جی آواز میں کالی کچھ بول رہا تھا۔ ابا کی آوازیں شکستہ تھیں۔ معافی کی طلب تھی ہمار تھی۔

دروازہ کھلا تو وہ گڑبڑا کر سیدھی ہوئی۔ نگاہ عاقب کی سرخ ہوئی آنکھوں سے ملی۔ اسے دیکھ کر اب بھیچتا وہ تیزی سے باہر نکل گیا۔

سب باری باری چلے گئے تو اماں باہر آئیں اور ہوتی کھڑی زینب کا ہاتھ قہام کرکھینٹتی ہوئی اپنے کمرے میں اماں پلٹ کر دروازہ لاک کیا۔ زینب متحیر کی کھڑی تھی۔ اماں اس کا ہاتھ تھامے اپنے بستر تک لائیں۔ اسے اپنے سامنے بیٹھایا۔

”یہ دیکھ زینب۔“ ہاتھ اس کے سامنے جوڑ دیے۔ وہ ہڑبڑا کر حواس میں آئی۔

”یہ کیا کر رہی ہیں تائی اماں! میں کسی کو نہیں بتاؤں گی یہ بات۔“ ان کے ہاتھ کھولے۔

”نہ میری بچی۔ یہ بات تو جھپٹنے والی نہیں ہے۔ ہاں مگر اپنی آپا کی عزت بچا کے جینے کا ایک راستہ ہے ہمارا پاس۔“

”وہ کیا؟“ زینب کا اندام غمگن ہوا تھا۔
”تیرے تایا نے کہا ہے۔ آج نکاح کر دیتے ہیں عمر کے ساتھ۔ چپ کر کے دہلی بن کے بیٹھ جانا۔ میری آپا کی عزت رہ جائے گی۔ بڑی مشکل سے عمر مانا ہے۔ اب تو اعتراض نہ کرنا۔“

اماں کے ہاتھ پھر اس کے آگے بندھ گئے تھے۔ زینب کے کانوں میں سائیں سائیں ہونے لگی۔ پچھلی آنکھوں میں عاقب کی لال ہوئی نگاہیں در آئیں۔

تو ایک بار پھر اس کے نصیب میں عافیہ کی اتارن آگئی تھی۔ اس کا دل ڈوبنے لگا۔

حالات خراب، اس کا موڈ خراب اور سب سے بڑھ کے یہ کہ اس کی قسمت خراب۔

جہاں آج اس کا اور عاقب کا نکاح ہونا تھا۔ وہاں اب اس کا اور عمر کا نکاح ہو رہا تھا۔ مہمانوں میں سے کسی کو بھی حقیقت کا پتا نہیں چلا۔ لمبے گھونگھٹ والی نکاح کی دہلیں اور اس کے بعد میک اپ سے سنی سنوئی عافیہ کے رانے مگر کلدانی جوڑے میں ملبوس۔

زینب کے جتنم کو وہ جوڑا کٹھا رہا تھا۔ وہ متوحش تھی۔ زندگی نے ایک دم سے کروٹ بدل کر سب کچھ اٹھل پھٹل کر دیا تھا۔

ایسے میں اس کی سراسیمگی کو اس کی واحد محلے دار دوست نے کم کرنے کی کوشش کی۔ جب نکاح کے بعد وہ اسٹور میں کھسی زار و قطار روئے جارہی تھی۔ تائی اماں کے حکم کے بموجب اسے چپ کروانے میں جب وہ ناکام ہو گئی تو تقریباً ”چلا ہی اٹھی۔“

”تمہارا مسئلہ کیا ہے زینب؟“

”اندھی ہو گیا۔ دکھائی نہیں دے رہا، قسمت نے کیا کھیل کھیلایا میرے ساتھ؟“ سرخ آنکھوں سے اسے دیکھ کر وہ غرائی۔ کہ فقط ایک وہی تو تھی جس پر وہ

79 اگست 2013

78 اگست 2013

غصہ کر سکتی ہو سکتی تھی۔
 "اسے کہتے ہیں ٹرننگ پوائنٹ" اطمینان سے
 کہتے ہوئے سامعہ نے اس کا بازو تھاما اور باہر کی طرف
 بڑھی اور دوسرے جماعتیں تو وہ بھی بڑھی ہوئی تھی۔ اس
 سے الجھنے لگی۔ سب سے نظر بچا کر سامعہ اسے کھینچتی
 گھٹی پھٹ پھٹ لے آئی۔
 "چھابھلا میری زندگی میں اب سکھ آرام آنے لگا
 تھا۔ قسمت کھلنے لگی تھی کہ پھر سے قسمت نے دھوکا
 دے دیا۔" ٹیس کی دیوار سے ٹیک لگائے وہ ہبھک
 کر رو پڑی۔
 "کیا پتا تمہارے سکھ اور آرام کا راستہ اب کھلا
 ہو۔" سامعہ آرام سے بولی۔
 "ساری عمر عافیہ کی اتار پاتی ہے میں نے۔ اب
 شوہر بھی اسی کا چھوڑا ہوا۔" زینی سے تو بات ہی مکمل
 نہ ہو پائی۔ سامعہ نے تاسف سے اس کے بہتے
 آنسوؤں کو دیکھا۔
 "تنتے سال برتا ہے اس نے اس چھوڑے ہوئے
 شوہر کو؟" طنز سے پوچھا۔
 "نام تو آگیا نا اس کے ساتھ اور ان دونوں کی دوستی
 بلکہ عشق کے قصے عافیہ سنا چکی ہے مجھے۔ یہ بڑی بڑی
 تصویریں ہیں دونوں کی عافیہ کے کمپیوٹر میں۔" دوپٹے
 سے ناک پونچھتے ہوئے وہ لال گلابی ہو رہی تھی۔ بڑے
 دکھ سے بولی۔
 "ایسا ہی عشق ہوتا تو یوں بھگوٹوں کی طرح اسے
 چھوڑ کر بھاگتی؟ کچھ بھی نہیں تھا ان دونوں کے
 درمیان۔" سامعہ نے قہر کا مظاہرہ کیا۔
 "وہ تو بارات لے آیا نا جو عشق میں سچا ہے۔"
 "یہ تمہاری قسمت کی بارات تھی۔ اسے آٹائی تھا
 زینی۔ اب اڑکے پختاب جانے سے تو رہیں تم۔"
 "چچی بھلی عافی سے شادی ہو رہی تھی۔ کیسے
 ٹھٹھا ہوتے اس گھر میں میرے۔ عافیہ بھی دفعہ دور
 ہو جاتی۔"
 اس کا کوئی ایک غم تھوڑی تھا۔ اب دوسرے کی دم
 پکڑ لے۔

"لو کی۔" سامعہ نے بے اختیار غصہ کنٹول کیا۔
 "کیا ٹھٹھا ہوتے یہاں تمہارے؟ اتنے سوالوں
 سے تمہاری تائی تمہیں اپنی بیٹی کی اتار پتاری ہیں
 کبھی بازار سے دلایا بھی تو مگر۔ یا وہ جوان کی بیٹی نے
 ریجیکٹ کر دیا ہو۔ یہ ٹھٹھا کراتیں تمہیں؟ ہفت کی
 نو کرائی ہو، کتنے فارغ بیٹے سے بیاہ رہی ہیں تمہیں۔"
 سامعہ نے دو آنکھیں مزید اس کے ہاتھ میں تھامیں۔
 مگر جو جان بوجھ کے اندھا اس کا دارو کیا؟
 "تمہیں کچھ نہیں پتا۔" زینی نے پھر مظلوم بنا
 چاہا۔ مگر سامعہ اس پر بھاری تھی۔ تیر لہجے میں بولی۔
 "مجھے سب پتا ہے اور تم سے زیادہ پتا ہے اور اب
 تم یہ مظلومیت کا لبادہ اتار دو زینی! خدا کا شکر ادا کرو کہ
 ایک عزت دار گھر میں میں بیاہ کے جا رہی ہو۔ اس گھر
 کی بیٹی بھاگی ہے جسے وہ بیاہنے آئے تھے۔ مگر وہ لو
 سرمہ پیٹ کے تمہاری تائی اور تایا کی عزت اچھالنے
 کے بجائے نہ صرف اپنی عزت سنبھال رہے ہیں۔ بلکہ
 ان لوگوں کی عزت بھی ڈھک کے جا رہے ہیں تمہیں
 بیاہ کے۔"
 "یہ تو ان لوگوں کا بڑا پن ہے۔" زینی کچھ کچھ متفق
 ہوئی۔
 "تو اب تم لوگ بھی چھوٹے پن سے نکل کے
 انہیں کوئی بڑا پن دکھا دو۔" سامعہ نے طنز کیا۔ پھر اسے
 سمجھانے لگی۔
 "یہ تو سوچو بے وقوف لڑکی کہ اس کی قسمت میں
 تمہیں بیاہ کے لے جانا لکھا تھا۔"
 "اور عمر؟" پتا نہیں ان سب کا وہاں جا کر مجھ سے
 کیا رویہ ہو۔" وہ اندر سے بہت سی باتوں سے خوف
 زدہ تھی۔
 "کچھ نہیں ہو گا۔ عافیہ کی خالہ بڑی اچھی خاتون
 ہیں۔ تمہاری تائی سے زیادہ حوصلے والی اور صبر و
 برداشت والی۔ کوئی اور عورت ہوتی تو بہن کی عزت
 اتار دیتی اور پھر تم سے تو سب راضی ہی ہوں گے
 اتنے نازک وقت میں سب کی عزت بچا رہی ہو تم
 ورنہ تو دونوں گھر کی ناک کٹ چلی تھی۔"

سامعہ نے اس کا ہاتھ تھام کر اسے یک لخت ہی
 روشنی میں لاکھڑا کیا تھا۔ سبک رو ہوا کا جھونکا اس کے
 چہرے سے لکڑیا۔
 "ارے ہاں۔ یہ تو میں نے سوچا ہی نہیں۔" اس
 کی براؤن آنکھیں جگمگا اٹھیں۔
 "اب تو سب کی نظروں میں میری ہی اہمیت
 ہو گی۔"
 "بالکل۔ اور یہی تو تم چاہتی تھیں اور اس کے
 لیے تم عاقب جیسے ویلے کتے سے شادی کرنے کو بھی
 تیار تھیں۔" سامعہ نے اطمینان سے کہا تو وہ کھلکھلا
 دی۔
 "واقعی۔ یہ تو میں نے سوچا ہی نہیں تھا کہ مجھے تو
 اپنی ایک حیثیت چاہیے تھی اور وہ مل گئی۔" سامعہ
 نے سکھ کا سانس لیا۔
 آگے کی زندگی میں چاہے کیسے ہی امتحان کیوں نہ
 ہوتے فی الحال تو مطلع صاف تھا۔
 یہی اطمینان تھا جس کی بدولت اگلے روز ناک
 بھوں چڑھا کر عافیہ کا پرانا مگر خوب صورت سا کاغذ لانی
 جوڑا اس نے پہن ہی لیا۔
 "کچھ سفر کی وجہ سے بری لے کر نہیں آئے وہ
 لوگ۔ وہاں جا کر تو عیش ہی ہوں گے تمہارے۔"
 سامعہ کی لسی نے جوڑے کی جبین کو قدرے کم کیا۔
 ساتھ ہی بے ساختہ گلہ بھی ہوا۔ تائی اماں سے اتنا نہ
 ہوسکا کہ نکاح (چاہے رہ ہی گیا تھا) کے موقع پر چار
 جوڑے اس کے بھی لے لیتیں۔
 سامعہ کو کہہ رہی تھی۔ گھر کی مرغی دال برابر۔
 دنیا داری تھی۔ ورنہ اگلے دن وہ لوگ بنا کچھ کھائے
 بچے وہاں سے نکل پڑتے۔ اسے مووی اور تصویروں
 کے لیے عمر کے ساتھ بیٹنا پڑا۔ اب زینی کا موڈ اچھا تھا
 اور شاید وہ واحد نفس تھی جو اس فتن کشن کو انجوائے
 کر رہی تھی۔ باراتیوں کو تو وہ لہما کا سیاہ سا انداز ہی
 الجھن میں ڈال گیا تھا۔ یہ وہ عمر تو نہ تھا جو پرسوں کے سفر
 میں ان کے ساتھ اپنی دلہن لینے نکلا تھا۔
 ٹرین کا سفر تھا۔ کچھ امی کی طبیعت کی خرابی بہانہ بنی

واپسی جلدی ہو گئی۔ تائی اماں نے بیمار بہن کے پاؤں
 تھام لیے۔
 "تمہارا کیا تصور؟ جس کی قسمت میں جو تھا مل
 گیا۔" بڑے حوصلے سے کہہ کر وہ بہن سے وداعی
 ملیں۔
 زینی نے تائی اماں سے ملتے ہوئے مصنوعی منہ
 بسورا۔ اب تو نئی زندگی کا ایسا جتس ہو چلا تھا کہ سب
 نقصان اور گھٹائے بھول گئے تھے۔ اس کے برعکس
 تائی اماں یوں اسے پیچ پیچھنے کے روئیں جیسے اپنی
 اکلوتی نازوں پی کو بیاہ کر رو رہیں جیسے والی ماں رویا کرتی
 ہے۔
 واپسی کا سفر محض انسانوں کا نہیں۔ مختلف سوچوں
 کا تھا۔
 * * *
 اگلے روز وہ شمالی علاقہ جات کی طرف نکلنے والے
 تھے۔
 عافیہ نے کسل مندی سے انگڑائی لی۔
 "دو دن ہوٹل میں ہی ٹھہرے رہتے۔"
 فیصل نما کے بھی نکل آیا تھا۔ پیٹ بنیان میں
 ملبوس وہ بال سنوار رہا تھا۔
 "میری جان جو خرچا یہاں کرنا ہے۔ وہ ناردرن
 ایریا میں کر لیں گے۔ ہنی مومن کے دوران تو یوں بھی
 پیسہ پر لگا کے اڑتا ہے۔" منہ ہاتھ ہوئے عافیہ کو اٹھنا
 ہی پڑا۔
 "تمہارے پاس کچھ رقم ہے تو وہ دو۔ مل ملا کے
 کافی ہو جائے گا۔" نکتے ہوئے فیصل نے کہا تو سر ہلا کر
 عافیہ نے اپنے پیگ میں سے پرس نکال کر بیس ہزار
 اسے تھما دیا۔ ہوٹل سے باہر نکلے تو فیصل کے پیچھے
 بڑھتی وہ ٹھٹکی۔ فیصل گاڑی کی ڈکی میں سالن رکھ رہا
 تھا۔
 "یہ تو تمہاری گاڑی نہیں ہے۔"
 "جیسے بیٹھو تو۔" بتاتا ہوں۔" فیصل ڈرائیونگ
 سیٹ کی طرف بڑھتے ہوئے بولا۔ تو وہ بھی گاڑی میں

بیٹھ گئی۔

”نی الحال تو گھر والوں کو بھٹک بھی نہیں پڑی ہماری شادی کی۔ بس میں نے یہی کہا ہے کہ نارورن ایریا کی سیر کو جا رہا ہوں دوستوں کے ساتھ۔ اپنی گاڑی لیتا تو کوئی بھی واقف کار فوراً پہچان لیتا۔“ وہ بتا رہا تھا۔

”کچھ کیش تو نکلا لیتے ہیںک سے۔“ عافیہ کو اپنے بیس ہزار یاد تھے۔ ناک چڑھا کر بولی۔

”او کامو پہلے ہی خراب ہے جانم! سیر تو قرن کا سنتے ہی انہوں نے محنت کی عظمت اور کام کام پر لیکچر دینا شروع کر دیا۔ ایسے میں کیش مانگا تو جوئے پڑتے۔“

وہ مسکرا رہا تھا۔ مگر عافیہ تو مسکرا بھی نہیں پائی۔ اس کی شکل دیکھ کر فیصل ہنس دیا۔

”ہم تو عشق کے اور بھی بہت سے امتحانات باقی ہیں۔“ اس کا مطلب پا کر عافیہ کھسکی۔

”وہ تو ٹھیک ہے میں تو اس لیے پریشان ہوں کہ لمبے سفر کے لیے نکل رہے ہیں ہاتھ میں کھلا پیسہ ہوتا چاہیے۔“

”وہ تو کھانا تو سہی کیسا شان دار ہنی مون ہو گا۔ بلکہ یہ تو ٹریل ہے۔ اصل ہنی مون تو تب ہو گا جب میں ہمیں یورپ گھمانے لے جاؤں گا۔“ وہ تقاخر سے کہتا عافیہ کو سرشار کر گیا۔

واقعی۔ اب جلدی کس بات کی تھی۔ فیصل اس کی مٹھی میں تھا تو سب کچھ اس کی دسترس میں تھا۔ جلد یا بدیر وہ اپنے باپ سے سب کچھ حاصل کرنے والا تھا۔ گنگناٹے ہوئے گاڑی ڈرائیو کرتے فیصل کو اس نے بڑے پیار سے دیکھا تھا۔

وہ ٹرن میں پہلی بار سفر کر رہی تھی۔ اس لیے دلہن ہونے کے باوجود شرم و حیا کو بالائے طاق رکھ کر تمام راستے کھڑکی سے لگی باہر کی رونقیں دیکھتی رہی۔ عمر نہ جانے کہاں بیٹھا تھا۔ ایک بار بھی بھولے سے جو اس طرف پھٹکا ہو۔

ای کی طبیعت ناسازی تھی۔ تمام راستے منہ پر دوڑا ڈالے پڑی رہیں۔ زینی کو شک تھا کہ وہ رورہی ہیں۔ مگر اس نے زیادہ غور کرنا مناسب نہیں سمجھا۔

یوں بھی۔ وہ تو نئی زندگی شروع کرنے جا رہی تھی۔ جو پہلے سے اس زندگی کا حصہ تھے وہ اپنے غموں اور خوشیوں کے ساتھ جی رہے تھے مگر زینی نے فی الحال اس زندگی سے کچھ تجربہ نہ حاصل کیا تھا۔ اسی لیے سامعہ کے دیے خواب اس نے اپنی آنکھوں میں سجالیے تھے۔

تمام راستے صاعقہ بھابھی ان کی گھنٹی سی ماں اور ماؤرن چلتی رہی بن سرگوشیاں کرتی اور ٹھٹھے لگاتی رہیں۔ بھابھی کے بالترتیب چار اور چھ سالہ غیب اور مطہب البتہ کتنی ہی دیر ”چچی دلہن“ کے ارد گرد ہی رہے۔ پھر نیند آنے پر ماں اور نانی کی گود میں پڑ کے سو رہے۔

ٹھکانے والے طویل سفر کے بعد ٹرن گجرات کے اسٹیشن پہ رکی۔ سب پر سلمان سمیٹنے اور ٹرن سے اترنے کی فکر سوار ہوئی۔ تب اتنے گھنٹوں کے سفر میں پہلی بار عمران کے ڈبے میں آیا۔ وہ ماں کی فکر میں جتا تھا۔ انہیں سہارا دے کر دروازے کی طرف بڑھا۔ زینی شش و پنج میں جتا کھڑی تھی۔

”یہاں تک خود آئی ہو بنو! آگے بھی خود ہی چلنا پڑے گا۔ بتا کسی سہارے کے۔ عادی کر لو خود کو۔“ صاعقہ بھابھی کی ماں عادیانہ ٹھٹھا لگا کے کہتی۔ اس کے پاس سے گزریں تو وہ بھی خاموشی سے ان کے پیچھے چل دی۔ دوسری رشتہ دار خاتون نے اسے ویسائی پروٹوکول دیتے ہوئے اسٹیشن کے باہر کھڑی ہائی ایس میں بٹھایا۔ جیسا کہ نئی دلہن کو دیا جاتا ہے یہ ہائی ایس عمر کا دوست لے کر آیا تھا۔

اسٹیشن سے محض دس منٹ کے سفر کے بعد وہ گھر پہنچ گئی۔ ای کی طبیعت کی خرابی کی وجہ سے تمام رشتہ دار اور تو اور بھابھی کی ماں اور بن بھی راستے ہی میں اتر گئی تھیں۔ انہیں علم تھا۔ گھر جاکے اور کوئی رسمیں کرنے والی حالت تو کسی کی ہے نہیں۔ سو گھر تک

آئے محض زینی صاعقہ بھابھی اور بچے اُمی اور عمرہی بچے تھے۔ عمر فرٹ سیٹ پر بیٹھا دوست سے محو گفتگو تھا۔

گھر پہنچ کر عمر نے ہی ماں کو سہارا دے کر گاڑی سے اتارا۔ بھابھی اپنے بچوں کو لیے اتریں۔ عمر دروازے کا لاک کھول رہا تھا۔ زینی سر سے پھٹکتے دوپٹے کو صحیح کرتی بیچہ اتر آئی۔

اسے قدرے ماپوسی ہو رہی تھی۔ یہاں تو نئی دلہن والی کوئی صورت حال ہی نہ دکھائی دیتی تھی۔

عمر ماں کو سہارا دیے ان کے کمرے میں لے گیا اور وہ تین روپے۔ برآمدے میں گھرے بڑے سے صحن میں خٹا کھڑی انگلیاں مروٹی رہ گئی۔ صاعقہ بھابھی بچوں کو کمرے میں چھوڑ کے آئیں تو اسے یوں ہی کھڑا دیکھ کر مسکراہٹ دیا تو اس کی طرف آئیں۔

”ہائیں۔ یہ نئی ٹوبی دلہن کو چھوڑ کے عمر کہاں چلا گیا؟“ ان کی اداکاری بڑی فطری تھی۔ زینی سٹپٹا گئی۔

”فہ خالہ جان کی طبیعت خراب ہے۔“ عاقب اور عافیہ کی دو کھادیں بھی وہ بھی انہیں خالہ ہی کہتی تھی۔ ”چٹا۔“ تھیں کمرے میں چھوڑ ڈالیں عمر کو تو شاید ساری رات تمہارے یہاں کھڑے ہوئے کا خیال ہی نہ آئے۔

وہ کہتی آگے بڑھیں۔ زینی خاموشی سے ان کے پیچھے بڑھ گئی۔ ایک کمرے میں داخل ہو کر انہوں نے لائٹ جلائی تو وہ دنگ رہ گئی۔ کمرہ عروسی سجاوٹ سے مہک رہا تھا۔ زینی کا دل لہر لہا گیا۔

”ہائیں۔“ بھابھی نے تاسف سے آہ بھری۔

”انسان کیا سمجھتا ہے اور قدرت ہمارے لیے کچھ اور ہی لکھے ہوئے ہوتی ہے۔ اب دیکھو۔ ایک ایک شے کو عمر نے عافیہ کے استقبال کے لیے سجایا تھا مگر اس کم بخت کی قسمت میں ہی نہ تھا۔“ زینی تجل سی ہونے لگی۔

بھابھی کو اچانک کچھ خیال آیا تو ان کا انداز راز دارانہ ہو گیا۔

”کیسے گئی کہاں وہ؟ تمہیں تو بتا ہی ہو گا۔ کہیں پکا

یارانہ ہو گا اس کا۔ تب ہی تو عین شادی کے روز گھر والوں کے سروں میں خاک ڈالے نکل گئی۔“ وہ منتظر نگاہوں سے زینی کو دیکھ رہی تھیں۔

”فہ! واش روم کہاں ہے؟“ زینی کا سوال غیر متعلق تھا۔ بھابھی کی باتوں کو بریک لگی تو وہ بد مزہ سی ہو کر رہ گئیں۔

”یہ ایجنڈا ہاتھ ہے۔“ انہوں نے دروازے کی طرف اشارہ کیا۔

”میرے کپڑوں کا ایک بیک تھا۔ سیاہ رنگ کا۔“ وہ جھجکی۔

”سامان تو سارا باہر صحن میں پڑا ہے۔ جا کے دیکھ لو بھی۔“ میرا تو ٹھکن سے برا حال ہو رہا ہے۔ ابھی نیٹ پہ جا کے صحن کو ساری کمانی ستانی ہے اور ویسے۔“ وہ صفا جٹ انداز میں کہتی اس کے قریب جھک کر راز داری سے بولیں۔

”ہم تم بھی آرام کرو تو بہتر ہے۔ ہماری ساس کم از کم آج کی رات تو عمر کو ادھر پھٹکنے بھی نہیں دیں گی۔“ خواجہ خواہ اپنی نیند خراب مت کرنا۔“ پھر آہ بھر کے بولیں۔

”قسمت تو خراب کر رہی لی۔“

وہ چل گئیں تو زینی نے سکون بھری سانس لی اور دلچسپی سے کمرے کی آرائش اور پھولوں کی لڑیوں کی سجاوٹ دیکھنے لگی۔

دل میں ایک آہ سی تھی۔ عمر کمرے میں ضرور آئے گا۔ سو واش روم سے فریش ہو کے نکل آئی۔ باہر جا کے اپنا بیک ڈھونڈنے کا اس کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ اپنے پرانے کپڑے تو ساتھ لانے کے قابل نہیں تھے سامعہ نے ہی اس کے بیک میں عافیہ کے گھر میں پہننے والے کئی ایک جوڑے ڈال کے ساتھ کر دیے تھے۔ وہ ٹیکے سے ٹیک لگائے فریش سی بیٹھ گئی۔

وہ منتظر تھی کہ عمر آ کے کن الفاظ میں اس کا شکر گزار ہو جائے۔

”بھئی اتنی بڑی قربانی دی ہے۔ جی حضوری کرنا پھرے گا تمہاری۔“ سامعہ نے کہا تھا۔

زینب کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آن ٹھہری۔ وہ ذرا کھسک کر ٹھیک طریقے سے تکیے پر لیٹی۔

”آہ۔ اسے سرور سا آیا۔“

اینا کمرہ اپنا بستر

ملکیت کے احساس نے بڑے نقاخر سے دل میں جگہ بنائی۔ تیز رفتار چلتے پٹھے کی ٹھنڈی ہوائے کب اسے نیند کی وادی میں پہنچا دیا۔ اسے خبر بھی نہ ہوئی تھی۔

امی کے بار بار کہنے پر عمر کمرے میں داخل ہوا تو زینب کو بے سدھ سوئے پا کر ان ہی قدموں واپس لوٹ گیا۔

”عاقب۔ عاقب۔“

اباں کی متوحش سی آواز۔ انہوں نے عاقب کو بری طرح جھنجھوڑ کر اٹھایا تھا۔

”اٹھ دیکھ تو سہی۔ تیرے ابا کو کیا ہوا۔ طبیعت ٹھیک نہیں ہے ان کی۔“

وہ ساری رات کا جاگا، ابھی آنکھ لگی تھی مگر یوں اچھل کے اٹھا جیسے سویا ہی نہ تھا۔

ابا کی حالت ٹھیک نہ تھی۔ شدید ڈیپریشن اور ٹینشن نے دماغی خلیوں کو سخت متاثر کیا تو نتیجہ فالج کی صورت نکلا۔

بارعب سے ابا۔ جن کے قدموں کی دھمک سے زمین تھر تھراتی اور جن کی آواز سے وہ لوگ دبا جلا کرتے تھے۔ اب بے بس سے بستر پر پڑے تھے۔ ان کا دایاں بازو اور ٹانگہ بے حرکت تھی اور زبان بھی متاثر ہوئی تھی۔

اماں نے جھوپیاں پھیلا پھیلا کر ان کی زندگی اور عافیہ کی بربادی کی دعائیں مانگیں۔

اسپتال کے کورڈروں میں عاقب حوصلہ ہار کر ان کے شانے میں منہ چھپا کر رو دیا۔

بہن غیرت کو لگا کر گئی تھی اور باپ کی بے بسی نے عاقب کے چمن پتے کو جھنجھوڑ کے رکھ دیا۔

اسے ان دیکھے ہوئے بوجھ سے یک لخت ہی اپنے شانے بوجھل ہوئے محسوس ہوئے تھے۔

صبح اگر بھابھی اسے نہ جگاتیں تو وہ جانے کتنی در تک خواب خرگوش کے مزے لیتی رہتی۔ چند لمحوں کے سوئے ذہن کے ساتھ بھابھی کو ویسٹ کرتی رہی۔

”اب اٹھ جاؤ واپس رانی۔ سویرا نکل آیا۔ نکلے والے بھی نکل گئے اور تم یہاں سوئی پڑی ہو۔“

ان کا مخصوص کچھ سمجھنا ہوا۔ مگر سمجھ میں نہ آنے والا انداز۔ زینبی بے اختیار اٹھ بیٹھی۔ ادھر ادھر دیکھا۔ بھابھی خوب بھینیں۔

”کوئی بھی نہیں آیا رات بھر ادھر۔ ہم نے تو پہلے ہی اشارہ دے دیا تھا۔ امی حضور کے توری ہی نہیں لگ رہے تھے عمر کو کمرے میں بھیجنے والے۔“

بھابھی کی جگہ اتنی آسانی سے تو کسی کو نہیں دے سکتیں نا اور عمر بے چارہ چہ چہ۔ ”وہ مزہ لے رہی تھیں۔“

زینبی کے کان کھڑے تھے۔

”ایک ایک شے عافیہ کے لیے سجا کے گیا تھا۔ اب وہیں تمہارے ساتھ رات گزارنا تو اسے قیامت ہی لگتا۔“

دھڑ دھڑوہڑ

زینبی کے اوپر سے کوئی ٹرین گزری۔

برتا ہوا مرد۔ عافیہ کی اترن

”اب یہ تو ماں کو چاہیے کہ تمہاری قربانی کا خیال کرتے ہوئے بیٹے کو سمجھائے مگر نہ جی۔ یہاں تو جو مسکین اور مظلوم ہے اسی کو دبایا جاتا ہے اچھے بدلے نکالیں گے تم سے عافیہ کے۔ اٹھ جاؤ اب ناشتا کرلو۔“

اسے اچھی طرح ”ٹھنسا“ کے اب وہ ناشتے کا مڑا سنا رہی تھیں۔ زینبی کے لیے تمام حقیقت ناقابل قبول اور ڈراؤنی سی مگر یہ بھی ایک حقیقت تھی کہ رات سے ایک کھیل بھی اڑ کر منہ میں نہ لگی تھی اور اب

معدہ دبائیاں دے رہا تھا۔

وہ چپ چاپ منہ دھونے اٹھ گئی۔

ناشتے کے دوران بھابھی نے کھل کر عافیہ اور عمر کے رویوں کی آنکھوں ویسی حقیقت بیان کی تھی جس کے گیارہ زینبی کو جینھن پر مجبور کر گئے۔

”اب خود سوچو۔ اتنی نزدیکیاں اور بے باکیاں کوئی مرد اتنی جلدی بھلا سکتا ہے؟ کیا کیا نہیں سوچا ہو گا اس نے عافیہ کے بارے میں۔“

بھابھی شادی شدہ تھیں۔ روائی سے بولتی جا رہی تھیں، مگر زینبی کس پل صراط سے گزر رہی ہے یہ انہیں خبر نہ تھی۔

اسے رونا آیا۔ ناشتا وہ کر چکی تھی۔ بھابھی نے برتن سینے۔ زینبی کی ہینٹ پلکیں وہ دیکھ چکی تھیں۔

”بے وقوف ہو تم۔ رو کے بڑول دکھاؤ کی تو کھلا کے مار ڈالیں گے ماں بیٹا تمہیں۔ یہاں تو مقابلہ کرنا پڑے گا ان کی چال بازیوں کا تمہیں۔“ بھابھی نے زینبی کے ہاتھ میں ایک ہتھیار تھمایا۔

”میں بھلا۔ کیا کر سکتی ہوں۔ میں نے تو ان لوگوں کی عزت چاہی ہے۔“

وہ بے بسی سے بولی تو آنسو پلکوں کی باز توڑ کر رخساروں پر ٹھک گئے۔ بھابھی چکیں۔

”وہی تو۔ اسی لیے تو کہہ رہی ہوں کہ تمہارا پلٹا بھاری ہے۔ ذرا سی بھی نرمی دکھاؤ کی تو سر پہ چڑھ کے تلچے گا عمر تمہارے۔ اب اگر احسان کیا ہی ہے تو اسے ٹھیک طرح سے جتاؤ بھی۔“ نئے سبق، نئے انداز۔

زینبی کو جلد ہی کوئی فیصلہ کرنا تھا کہ اس کو اس نئی زندگی میں کیا حکمت عملی اپنانی ہے۔

باہر نکلا ہو تو بھابھی نے اٹھا کے پلٹیں۔

”آج کا ناشتا تو میں نے کر دیا۔ مگر آئندہ سے تم جانو اور تمہارا کام۔ میں تو بھی بمشکل اپنا اور بچوں کا کام کرتی ہوں۔ باقی تم جانو اور تمہاری ساس اور میاں جائیں۔“ ایک دم سے اتنے بے اختیار لہجہ اور بے مروت انداز۔ زینبی آنکھیں پھاڑ کے انہیں دیکھ کے رہ گئی۔

بیرونی گیت کھلا، عمر امی کو تھام کے اندر لارہا تھا۔ شاید وہ لوگ ڈاکٹر کے پاس سے ہو کے آرہے تھے۔

کمروں کے آگے برآمدہ تھا اور برآمدے کو لوہے کی مضبوط جالیوں سے کوریڈور میں تبدیل کر دیا گیا تھا اور ان جالیوں پر تیز دھوپ سے بچاؤ کے لیے چھٹی لٹکانی لگی تھیں۔ جس کی وجہ سے برآمدے اور کمروں میں ٹھنڈک کا احساس نمایاں تھا۔

زینبی برآمدے ہی میں فریج کے پاس پرکھی چار کرسیوں والی میز کے گرد کھڑی کر رہی تھی۔ عمر اس کے پاس سے گزرا۔ وہ منہ اٹھائے دیکھے مگر نہ سلام نہ دعا امی خود ہی رکیں۔ وہ تیز صال سی تھیں۔

”اندر آؤ میرے پاس۔“ انہوں نے کہا تو وہ ان دونوں کے پیچھے چل دی۔

عجیب سی شادی، عجیب سی سسرال۔ عمر نے انہیں سہارا دے کر بستر پر بٹھایا اور پھر کھانا اسپڈ پر چلا دیا۔

انہوں نے اشارے سے زینبی کو اپنے پاس بلایا۔ عمر باہر نکلنے لگا تھا۔

”تم کہاں جا رہے ہو۔“ امی نے فہامت زدہ لہجے میں اسے روکا۔

”نیند آ رہی ہے مجھے۔ تھوڑا آرام کروں گا۔“ وہ بیٹا مڑے کہہ کر چلا گیا۔

زینبی دل ہی دل میں اس سے نفرا ہو گئی۔

”اب نیند آ رہی ہے موصوف کو اور ساری رات کیا بل چلاتے رہے ہیں۔“

”ساری رات کا جاگا ہوا ہے۔ میری طبیعت ٹھیک نہیں تھی نا، کبھی سر دبا تا رہا اور کبھی ٹانگیں۔“ امی نے پیار سے عمر کا ذکر کیا۔

زینبی کڑھی (اچھی مصروفیت پر لگا رکھا تھا بیٹے کو) ”تم بتاؤ۔ ٹھیک سے سوئیں؟“ وہ یوں پوچھ رہی تھیں جیسے وہ اس گھر میں سونے کے لیے ہی تولی گئی تھیں۔

”جی۔“ سر جھکا کر دھیرے سے کہا۔

امی نے رک کر جیسے کچھ سوچا۔ جانے الفاظ جمع کر رہی تھیں کہ ہمت پھر بڑے محل سے بولیں۔

”بیچھے جو کچھ ہوا اے بھول جانا زینب! اب ہی آسانی سے زندگی میں آگے بڑھ سکوگی اور اب یہ

تمہارے ہاتھ میں ہے کہ تم عمر کو بھی وہ تلخ یادیں بھلا دو۔ تمہاری دہری ذمہ داری ہے بیٹا۔
لوٹی۔ یعنی یہ تو نہ ہنگ لگانے کے موڈ میں ہیں اور نہ پھٹری اور رنگ بھی چو کھا چاہ رہی ہیں۔
اس نے تپ کے سوچا۔ مگر منہ سے فقط ”جی“ کہہ کر سر جھکا لیا۔

صاعقہ بھابھی صرف اپنا اور اپنے بچوں کا کام کرتیں، اپنا کمرہ اور اس کے آگے کا برآمدہ صاف کر لیتیں اور بس۔
جبکہ اگلے ایک ہفتے میں باقی سارے گھر کی ذمہ داری زینب پر آن پڑی۔
”بھئی تم تو اکیلی جان ہو۔ کچن بھی سنبھال سکتی ہو۔ میرے تو بچے ہیں، بچے کام ختم نہیں ہوتے سالن وغیرہ تو میرے بچے کھاتے نہیں، بس میں ہی ذرا سالن گی۔ بھئی تم لوگ تین جاہل ہو پکنا تو نہیں ہی چاہیے۔“ انہوں نے بڑی ہوشیاری سے اپنی جان چھڑائی۔

اب وہ تھیں اور کیبل کے پروگرامز وہاں سے اٹھتیں تو اس کا پچھلے میاں کے ساتھ گپ شپ شروع ہو جاتی۔ ان کے دونوں بچے منب اور مطیب چچی سے نوڈلز اور چپس بنوا کے کھا لیتے۔
زینب کے دل میں یہی اپنے گھر کی خواہش پوری ہونے لگی۔ الماری کھولی تو بری کے جگمگاتے ڈسٹرز پر لٹکے کپڑوں نے آنکھیں خیرہ کر دیں۔

پھر وہ روز بچاؤ پوچا لگاتی ڈسٹنگ کرتی، مزے کا کھانا بناتی اور پھر شان سے نہانے کے بعد بری کا ایک سوٹ چڑھا کے بیٹھ جاتی۔ کچھ خدانے روپ بھی دیا تھا اور البرہ انداز بھی۔ سو بہت سی باتیں وہ دل پہ نہ بیتی تھیں مگر یہاں یہ ہوا کہ بننے سنورنے کے بعد دل کسی کی توصیفی نگاہ کے لیے محفل لگا۔

اسے اپنے آپ میں مگن بھر پور زندگی گزارتے دیکھ کر عمر کے انداز میں مزید سرد مہری سی اثر آتی تھی۔

جب سے زینب بیاہ کے آئی وہ ایک بار بھی اس سے ہم کلام نہ ہوا تھا۔ سامعہ کو فون کیا تو اس نے جی بھر کر لٹاؤ۔

”وہاں جا کے سب کو بھول ہی گئی ہو۔ تمہارے کیا کو فالج نے ادھ موا کر دیا ہے۔ عافیہ تو سمجھو ان کے لیے مری گئی۔ عاقب اب نایا کی جگہ کام کر کے لکری ذمہ داری سنبھال رہا ہے۔“

وہ بھونچکی رہ گئی۔ خالہ کے سامنے ہی صوفے میں دھنس کر رونے لگی۔

”کیا ہوا۔ خیریت تو ہے؟“ وہ پریشان ہوا اٹھیں۔
زینب نے ساری پچا کہ سنائی۔ جسے انہوں نے صبر سے سنا اور پھر بڑے حوصلے سے بتایا۔

”میں جانتی ہوں۔ آپا کا فون آیا تھا۔ سچ پوچھو تو ان یہ تو آزمائش ہی آگئی ہے۔ مگر انہوں نے ہم میں سے کسی کو بھی وہاں آنے سے منع کر دیا۔ فون یہ ہی میں اور عمر احوال پوچھ لیتے ہیں۔ نہیں اس لیے نہ بتایا کہ تمہارا دل پریشان ہوگا۔“

وہ پتا نہیں واقعی سچ کہہ رہی تھیں یا اپنی سنگدلانہ پردے ڈال رہی تھیں۔

زینب سول سول کرتی امی اور عمر دونوں سے برگشتہ ہو گئی۔

”ہو نہ ہو اور اگر سنبھال رہی ہو۔ کراچی بھیج کے ہاتھ سے تھوڑا کنوا میں گے تمہیں یہ لوگ۔“

صاعقہ بھابھی نے آنکھیں نہچا کے اس کے دکھ کو اور بڑھایا۔ زینب کا دل ہر شے سے اچھٹ ہونے لگا۔

اس نے الماری میں ڈسٹرز پر ترتیب سے لٹکے ان گنت کپڑوں پر ریاست سے ہاتھ پھیرا۔ اب تو کسی رنگ بے دل لچا نا ہی نہ تھا۔

”جس کے نام کی یہ بری ہے۔ وہی میرا نہیں تو یہ سب۔“ اس نے بے دلی سے الماری کے پٹ بند کر دیے تھے۔ کھٹکے پر پلٹ کر دیکھا تو عمر بستر کے کنارے دکا جھک کر شوڑا اتار رہا تھا۔ زینب کو غصہ آیا۔

وہی غصہ جو کبھی کبھار سامعہ سے لڑکے اتارا کرتی تھی۔ وہ عمر کے سر پہ جا کھڑی ہوئی۔

”آپ کو میں نظر نہیں آتی؟“ اس نے عمر کے ہاتھوں کو دست پڑتے دیکھا۔ اس نے نظر اٹھا کے لحو بھر کر زینب کی طرف دیکھا پھر شوڑ بید کے نیچے کھسکائے اپنے سپر پڑنے اور اٹھ کھڑا ہوا۔

اب وہ زینب کے بالقاتل تھا۔ زینب نے اس کے بلوس سے اٹھتی خوشبو کو بہت اچھی طرح محسوس کیا تھا۔

”میں حقیقت سے نظریں چرا نے والوں میں سے نہیں ہوں۔ اور کون ہے یہاں جو نظر آئے گا۔“ عمر کے لمحے میں ایک سلگتی ہوئی کیفیت تھی۔

”مجھے کسی نے تیا ابا کے بارے میں کیوں نہیں بتایا۔ میں وہاں جاتی ان کا حال پوچھنے۔“ زینب نے احتجاج کیا۔

”مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ ان لوگوں نے ہی منع کر دیا ہے وہاں آنے سے۔ فون پہ حال پوچھ لو تم بھی۔“

”مگر مجھے بتاتے تو۔“

”اب بتا دیتا۔“ وہ لکھت سی سرد لہجے میں بولا۔
وہ اس روم کی طرف بڑھا۔

”میں یہاں اپنی مرضی سے نہیں آئی ہوں۔“
زینب نے اسے جتلیا۔ کمال ہے میری قربانی اسے دکھائی ہی نہیں دیتی۔

اب پتا نہیں اس کی بات میں کیا اثر تھا۔ وہ رکابی نہیں بلکہ پلٹ کر اس تک واپس بھی آیا۔

”خانا ہوں۔ بے فکر رہو تم۔ جو تمہاری مرضی ہو وہی کرنا۔ مجھے بار بار جتنا مات۔“

سرد لہجہ سیاٹ انداز۔
وہ واپس روم جا چکا تھا۔ زینب جھرجھری سی لے کر بیدار ہوئی۔ اس نے کھس کر سوچا۔

”ان لوگوں کو تو بس نوکرائی چاہیے گھر کے لیے اور دل لگی۔ عافیہ یہاں آئی تو تھکانہ توڑی۔“

وہ امی اور عمر سے برگشتہ ہونے لگی۔

مری نیو مری، ایوبیہ تک گھوم پھر لیا۔ عافیہ کا دل اس ہنسی مون سے بھر گیا۔ کیونکہ پرس خالی ہونے کو تھا۔

وہ اب واپس جا کے جلد از جلد فیصل کے محل نما بیٹھنے۔ اپنی حق داری جتنا چاہتی تھی۔

آخر وہ اس بیٹھنے کے اکلوتے وارث کی بیوی تھی اب اسے سوچ کر ہی سرشاری ملتی۔

فیصل کی لمبی گاڑی میں ایک بار لفٹ لینے سے اس کے تو بھاگ ہی کھل گئے تھے۔

عافیہ نے زندگی میں کبھی گھائے کا سودا نہیں کیا تھا۔ عمر جیسا جذبات میں کھرا بندہ چھوڑ کے اس نے لاکھوں میں کھینے والے شخص کو چنا تھا۔ اسے اپنے بروقت فیصلے پر ناز ہوتا۔

”فیصل۔ گھر کب چلیں گے؟“

”کیا بات ہے؟“ فیصل نے اس کی کمر کے گرد ہاتھوں کی گرفت باندھی۔ عافیہ نے ناز سے منہ بسورا۔

”بور ہو گئی ہوں میں۔“ فیصل نے ہلکے سے جھٹکے سے اسے اپنے قریب کیا۔

”میرے ساتھ ہوتے ہوئے بھی۔ اب تو اس گستاخی کی خت مڑا لے گی نہیں۔“

اس کا انداز ذوق منی اور لہجہ مسکراتا ہوا تھا۔ مگر عافیہ کا دھیان تو اپنے پرس کی طرف اٹکا تھا۔ بیس ہزار تو شروع سفر میں ہی اس نے فیصل کو پکڑا دیے تھے۔ اوپر کے پچاس ہزار میں سے بھی پانچ سات ہی اس کے پاس بچے تھے۔

اب یہ ستر ہزار فیصل کے لیے تو شاید ستر روپوں کے برابر تھے۔ مگر عافیہ جیسی تنخواہ دار کے لیے تو ایک بڑی رقم تھی۔ مگر فیصل بے فکر تھا۔

”اب مجھے شاپنگ بھی تم ہی کرواؤ گے۔ میرا پرس تو خالی ہو چکا۔“ عافیہ نے اس کے شانے پر سر رکھتے ہوئے کہا تو لہجہ بھر کے توقف کے بعد وہ بولا۔

”میں سوچ رہا تھا کہ تم ٹھیک ہی کہہ رہی ہو۔ ہم

یہاں رہ کر خواجوا اپنی سیونگزاڑا رہے ہیں۔ آگے چل کے بتائیں کیسے حالات ہوں۔ ابھی واپسی پر شاید کرائے کا گھر بھی لیتا رہے۔ عافیہ کو جھٹکا سالگا۔

”کرائے کا گھر؟“

”سیدھا گھر لے جا کے ابو سے جوئے کھاؤں گا کیا؟“ وہ مسکرایا۔

”وہ ہمارا بھی گھر ہے فیصل! اب میں بہو ہوں اس گھر کی۔“ اس نے اپنے لفظوں پر زور دیتے ہوئے کہا۔ فیصل کی گرفت اس کی کمر اور مضبوط ہوئی۔

”میں نے کب انکار کیا ہے جان! مگر راہ راست ابو سے ٹکر لینا دانش مندی نہیں ہے پہلے تو جا کے ابی ابو کو رام کرنا پڑے گا۔ ان کے ذہن میں تمہارے لیے جگہ بنے کی تو گھر میں خود بخود ہی بن جائے گی وہ غصے میں عاق بھی کر سکتے ہیں مجھے۔“

آگے کی مشکلات کا اندازہ کر کے عافیہ گہری سانس بھر کر رہ گئی۔

عمر بہت پر جوش سامٹھائی کا ڈیو لے کر گھر آیا۔ مگر زینی کا موڈ اس قدر خراب تھا کہ اسے کوئی بخشش نہ ہوا وہ سب کام چھوڑ چھاڑ کرے میں آئی۔

تھوڑی دیر بعد ابی کی پکار سنی تو اسے مجبوراً ان کے کمرے میں جانا پڑا۔ دونوں ماں بیٹا جانے کس بات پر کھلے پڑے تھے۔ مٹھائی کا ڈیو بیچ میں کھلا پڑا تھا۔

”تم کہاں رہ گئیں۔“ ابی کو اس نے اتنے دنوں میں پہلی بار خوشی کے اس ناٹھ میں دیکھا تھا۔

”میں نے کہاں ہوتا ہے۔ وہی گھر کے کام کا۔“

کچن کی ڈیوٹی اور واشنگ مشین۔ ”اس کا اندازہ لگا مار تھا۔ عمر نے بے اختیار اس کی طرف دیکھا۔ مگر زینی کا ارادہ اس سے دے نہ کا قطعی نہیں تھا۔ اگر وہ عافیہ کی یادوں میں ڈوب کر زندگی گزار سکتا تھا تو وہ بھی اپنا غصہ نکالنے میں آزاد تھی۔

”اچھا۔ وہ سب تو ہوتا رہے گا۔ آگے مٹھائی تو کھاؤ۔“ ابی نے ماحول کو خوشگوار ہی رکھنا چاہا۔

مگر زینی کا خواجوا کی موت نبھانے کا کوئی مولیٰ تھا۔

”یہاں کون سی کام والیاں بیٹھی ہیں۔ میں غریب کروں گی نا اور میرا جھٹکا کھانے کا موڈ نہیں ہے۔“

کے تاثرات میں سنجیدگی اتر آئی۔ ایک شکایتی نظر اس کو دیکھ کر وہ اٹھ گیا۔

ابی آواز سن رہی رہیں مگر وہ کمرے سے نکل گیا تھا۔ (اچھا ہے نا۔ میرا دل جلائے والوں کا دل بھی جلا چاہیے) زینی مطمئن ہوئی۔ ابی کو تسف ہوا۔

”خواجوا موڈ خراب کر لیا۔ اتنی عالیشان پوسٹ نوکری ملی ہے میرے بچے کو۔ آج تو خوشی کا دن تھا۔“

زینی نے چونک کر انہیں دیکھا۔

”دلغ تو خراب نہیں ہو گیا تمہارا۔ یہ کون سے طریقے اپنا رہی ہو تم۔ بجائے اس کے کہ تم وہاں اپنی ایک اہمیت بتائیں لانا اپنی حیثیت بھی کھو رہی ہو۔“

سامعہ فون پر ہی اس پر چڑھ دوڑی۔ زینی جڑ ہوئی۔

”ابو! سی حیثیت نوکرنا بنا لیا ہے مجھے۔“

”ہیکومت۔ اپنا گھر ہے وہ تمہارا زینی! یہ کیوں نہیں سوچتیں۔“ سامعہ نے زور دے کر کہا۔ ”یہاں بھی ڈیگرا کاٹ رہی تھیں مفت کی۔“ وہ یا سیت سے بولی۔

”اپنوں سے مل کر اپنا گھر بنتا ہے سائی! اب خالی اینٹ پتھروں سے ساری عمر پھوڑی رہوں۔“

”یا اللہ۔ اس لڑکی کو کیسے سمجھاؤں۔ جو قیامت ان لوگوں پر گزری ہے اس سے سنبھل تو لینے۔“

انہیں سب ٹھیک ہوا جائے گا۔

عمر اندر داخل ہوا تھا۔ زینی نے آواز بڑھائی۔ ظاہر یونہی کیا جیسے اس کی آمد سے انجان ہو۔

”ہاں۔ ان ہی سے تو قیامت گزری ہے۔ مجھے تو کوئی دکھ ہوئی غم ہے ہی نہیں جیسے۔ میرا بھی تو نکاح ہونے والا تھا عاقب سے اس روز۔ میری زندگی برباد نہیں ہوئی کیا؟“

عمر نے سب اچھی طرح سنا۔ زینی کی اونچی آواز بسور تاجہ وہ لب سمجھے تیز قدموں سے چلتا ماں کے کمرے میں چلا گیا زینی محل کے مسکرا دی۔

(اب بتا جاؤ گا موصوف کو۔ اتنی گئی گزری نہیں ہوں۔ ان کی مختصر تھی تو میرا بھی ایک عدد مکتبہ تھا)

فیصل نے شاید کسی دوست کے ذریعے پہلے ہی بندوبست کر رکھا تھا۔ واپسی پر وہ اسے سیدھا کرائے کے گھر میں لایا۔

دو کمرے ایک باتھ ایک کچن، مختصر سا صحن اور عافیہ کا دل بیٹھنے لگا۔

”یہاں رہیں گے ہم۔“

”ابھی تو یوم کی مہمانی ہے جو یہ ہلکا پھلکا مسلمان افروختہ میں خرید کے گھر سیٹ کر دیا ہے اس نے۔“

فیصل مطمئن تھا۔

عافیہ نے اس ”عالیشان“ مسلمان کو دیکھا۔ کوئی بیڈیا چارپائی نہ تھی۔ زمین پر ڈبل بیڈ کا لگا اچھا کارپر صاف ستھری بیڈ شیٹ ڈال دی گئی تھی۔ سائیڈ پر رومی دو کرسیاں اور بس۔ یہ ان کا بیڈ روم تھا۔

اس نے ساتھ والے کمرے میں جھانکا۔ وہ خالی بھاٹیں بھائیں کر رہا تھا۔ البتہ کچن میں چولہا سیٹ تھا اور گاؤں پر ہی ضرورت کے برتنوں کا ڈھیر رکھا تھا۔ جو شاید نئے ہی خرید کے لیے گئے تھے۔ عافیہ کالی پی لو ہوئے لگا۔

”تم ان کو اچھا سا فرشتہ تو کروا لیتے فیصل! بالکل کسی غریب کی کنٹیا لگا رہی ہے۔“ وہ صدے کی کیفیت میں تھی۔ عمر بے فکر تھا۔

”کر لیں گے یا ر! پریشان کیوں ہوتی ہو۔ کون سا تم نے یا میں نے نوکری پھوڑ دی ہے۔“ عافیہ نے تنک کر کہا۔

”تم سے شادی کے بعد بھی میں ٹکے ٹکے کی نوکریاں کرتی پھوڑوں؟“

”تم ان یا ر! تم تو آزمائش کی پہلی میڑھی پہ ہی تھک کے بیٹھ گئی ہو۔ کیا میں نے تمہیں پہلے سے یہ سب نہیں بتایا تھا؟“ وہ بھی خفا ہوا تو عافیہ ٹھنڈی پڑ گئی۔

”مگر کب تک فیصل۔ پلیز! اپنے گھر والوں سے بات کرو۔ مجھے ایسے گھر میں رہنے کی عادت نہیں ہے۔“

اب کی بار اس کا انداز التجائیہ تھا۔ فیصل کے لبوں پر مسکراہٹ کھیل گئی۔

”اؤڈر! اپنا زینی بیڈ تو چیک کریں۔“ ہاتھ بڑھایا مگر وہ تیزی سے پیچھے ہٹ گئی۔

”اس سے بہتر ہے کہ میں جا کے کچن کا چولہا چیک کروں اور چائے بناؤں مینشن سے سرور شروع ہو گیا ہے۔“

اس کے جانے کے بعد فیصل گدے پر اطمینان سے نیم دراز ٹانگ پر ٹانگ جمائے ٹنگٹانے لگا۔

اس کے انداز و اطوار میں بلا کا اطمینان تھا۔

عمر کو ابی کی جانب کی وجہ سے بہت خوب صورت گھر بھی ملا اور عثمان دار گاڑی بھی۔

”ہی! یہاں سے کچھ بھی نہیں لے جائیں گے سوائے کپڑوں اور انتہائی پرسل چیزوں کے۔ دل فرشتہ گھڑا ہے۔“ عمر نے مسکرا کر کہا تو وہ خدا کا شکر بجالائیں۔

صاعقہ بھابھی تو تفصیل سن کر ہی برا فروختہ ہو گئیں۔

”جی جی۔ آپ چلی جائیں گی تو میں یہاں اکیلی کیسے رہوں گی؟“ ان کے لہجے کا ادب و احترام بہت اچھی سا تھا۔ ابی نے بڑی آس سے عمر کی طرف دیکھا۔ عمر وہ صاعقہ بھابھی کی رنگ رنگ سے واقف تھا۔

عثمان بیرون ملک گیا تب عمر بڑھ رہا تھا اور ابھی وہ نوکری پر بھی نہیں لگا تھا کہ صاعقہ بھابھی نے خرچوں کے بڑھ جانے کا رونا رونا کر اپنا ہر خرچ الگ کر لیا تھا۔ اور نہ ہی کبھی عثمان کو قوت پڑی تھی کہ وہ بھائی نہ سی

مال ہی کا خرچ الگ سے بھجوا دیتا۔

”آپ اپنی امی کو بلوائیں یا پھر بھائی کے پاس چلی جائیں۔“ عمر نے صفا جھانڈا زبیں کہہ دیا۔

وہ دل موس کے رہ گئیں۔ بڑے سے لان والا شان دار سا گھر ان کی آنکھوں کے آگے ناچ رہا تھا۔

انہوں نے صحن میں پوچھا لگائی زینہ کو حسد اور رشک کی ملی جلی نگاہ سے دیکھا۔

(اس بے وقوف کو پتا ہی نہیں کیسا روشن ستارہ اس کے ہاتھ لگ گیا ہے)

نئے گھر میں آکر زینہ تو گویا قوت گویائی ہی کھو بیٹھی۔

”یہ ہمارا گھر ہے؟“ اس نے بے اختیار ہی پاس کھڑے عمر کا بازو ہلا کر پوچھا تو وہ چونک کر اسے دیکھنے لگا۔ وہ جھل سی ہو گئی۔ ”خوارا“ بات بدلی۔

”مطلب یہ آپ کو ملا ہے؟“

”ہوں۔“ وہ ہنس انداز میں کہہ کر امی کو بازو کے گھیرے میں لے کر اودھر اودھر کھوتے پھرتے گھر دکھانے لگا۔ زینہ اسے پیچھے سے زبان چڑا کر رہ گئی۔

اس نے خود ہی خوش خوشی سارا گھر پاتھوں سے چھو چھو کر دیکھا۔ (کاش عافیہ یہاں ہوئی۔ جل کے مرجانی وہ تو۔)

اسے ہنسی آئی۔ واقعی عافیہ نے غربت کہہ کر ہی تو عمر کو ٹھکرایا تھا اور اب اگر وہ عمر کے ٹھٹھاکے دیکھ لے تو۔

وہ بے اختیار ہنسنے لگی۔

ٹھنڈے ٹھنڈے رول پائی جیسی شفاف ہنسی۔

اندر سے نکلتے عمر نے بے اختیار مڑ کر اس من موچی کو دیکھا تھا۔

ایک ہفتے کے اندر اندر گھر میں کام کرنے والی اور ساتھ ہی کھانا پکانے والی عورت بھی آگئی۔

زینہ کو لگا اب وہ ملکہ بن کے بس بیڑ پہ بیٹھی حکم

چلایا کرے گی۔ مگر چند دنوں میں ہی اسے ہر شے وصول کی تھیں دکھائی دینے لگیں۔ آرام کر کر کر پڑیاں دکھتے لگیں تو وہ کام والی کے سر پہ کھڑی ہو کر کرواتے لگی۔

مگر کھانا پکانے والی کا کیا کرتی؟ اپنے ہاتھ کے کھانا کی ایسی عادت پڑی تھی کہ بلور چن کے ہاتھ کا پکا پڑا ہی نہ آتا۔

ای بے چاری شاید موت میں گزارا کر رہی تھیں۔ مگر زینہ کی اس روز والی منہ ماری کے بعد انہوں نے لب سی لیے تھے جب وہ کام کے بوجھ کی شکایت کر رہی تھی۔

”عمر۔ کہاں ہوتے ہو تم۔ گھر میں بھی ناظم کرو۔“ امی اس پر خفا ہونے لگیں۔

”متنی نئی جاب ہے اور پھر اتنی بڑی پوسٹ۔ میں بالی کام ظاہر نہیں کرنا چاہتا۔“ اس نے ہنسنے لگا کر امی متایا۔

”انگوروں سے بھری پلیٹ گود میں رکھ کر دی ہی نظریں گاڑے بیٹھی زینہ نے کن کن اکیلیوں سے اسے دیکھا۔ اسے عمر کی مسکراہٹ اچھی لگی تھی۔

”بٹا جی! شادی بھی نئی نئی ہوئی ہے آپ کی۔ اور بھی کوئی چھوٹی موٹی پوسٹ نہیں ہے۔ پھر یہاں انڈیا کی کام ظاہر کیوں ہو رہا ہے؟“

ای کا ارادہ شاید اس کے کان کھینچنے کا تھا۔

زینہ کا دل دھک دھک کرتے لگا۔ انگور کا دانہ ٹوٹنے لگی۔ وہ تو امی کو عمر سے ملا ہوا سمجھ رہی تھی (صاف بھابھی کے بقول)

”حکم کریں آپ۔“ خوش حالی نے عمر کے موہ بھی بہت اچھا اثر ڈالا تھا۔

”موسم بدل رہا ہے بیٹا! زینہ کو مارکیٹ لے جاؤ۔“

شاہنگ کروا لاؤ۔ وہ تو اتنی صابر ہے منہ سے کبھی کہ نہیں۔ مگر تمہیں تو اپنے فرائض کا خیال رکھنا چاہیے۔

”اے۔“

زینہ کا دل بلبلوں اچھلا۔ شاہنگ۔ زندگی میں بار۔ مگر عمر شاید کچھ کہہ رہا تھا۔

”میرے پاس اتنا نام نہیں ہے۔ کل ڈرائیور بھیج دوں گا گاڑی کے ساتھ۔“ جتنی جی چاہے شاہنگ کر لے۔

”اب یہ ڈرائیور کے ساتھ جا کے خریداری کرے گی۔“

ای ناراض ہوئیں۔ زینہ کا جی چاہا ان سے کہے، شاہنگ ہی کرنی ہے ناجس کو چاہے بھیج دیں بلکہ چراسی کو بھی بھیج سکتے ہیں۔ مگر پھر دل کو بجھا بجھا سا پاپا کر اس کا یہ جلد اندر ہی رہ گیا۔

(تو کیا یہ دل عمر کا ساتھ مانگ رہا ہے؟)

اسے اس سوچ کے ساتھ ہی خود بے یقینی ہوئی۔

پہلی تنخواہ ملنے ہی گھر کے اخراجات پہ اٹھ گئی۔

پینک سے وہ پہلے ہی اپنی تمام بچت نکالوا کر بنی مومن پر اڑا چکی تھی۔

فیصل اپنے باپ سے جو جیب خرچ لایا وہ عافیہ کی تنخواہ سے بھی کم تھا۔ یہ شکل گھر کا کرایہ اور مل ہی ادا ہو سکے عافیہ تو زب ہی اٹھی۔

”اب ایسے گزارہ کریں گے ہم۔“

”سوٹ پارٹ“ پیار محبت میں تو بھوکا رہ کے بھی گزارہ ہو جاتا ہے۔

اس نے عافیہ کو اپنی طرف کھینچتے ہوئے کہا عمر عافیہ کو اس کا وارنڈہ انداز بالکل نہ بھلایا۔

”تم کر سکتے ہو گے“ عمر میں نہیں۔“ اس نے بے دید وید لحاظ ہونے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

(کس اسے کرائے کے مکان میں رکھ کے وہ بھول ہی نہ جائے) فیصل نے اسے خاصی ناراضی سے دیکھا۔

”بس یہ تھی تمہاری محبت؟“ عافیہ سنبھل۔

”میں نے اس طرح کی زندگی کا خواب نہیں دیکھا تھا فیصل۔“ اس کے بڑھ کے اس سے لپٹ گئی۔

”میں نے باپ کو تو چھوڑ ہی آئی ہوں۔ یہاں بھی تم تہلیل کی مار دے رہے ہو۔ میں نے تو سوچا تھا کہ

تمہارے والدین میرے باپ کی کمی کو پورا کر دیں گے۔“ وہ بڑی ڈرامے باز تھی۔ رقت آمیز لہجے میں بولتی فیصل کو لمحہ بھر کو چپ کروا گئی۔

”تمہیں اچھا لگتا ہے کہ خود غم اٹھوں کی گاڑی میں سفر کرتے ہو اور تمہاری بیوی بسوں میں خوار ہوئی ہے اور پھر سب سے بڑھ کے یہ کہ اتنے امیر شخص کی بہو ہو کر معمولی سی جاب کر رہی ہے۔“

فیصل نے اسے خود سے الگ کیا اور بہت ٹھنڈا سا ہو کر رگدے پر جا بیٹھا۔

”اس گھر کو دیکھو کیا یہ تمہارے رہنے کے قابل ہے؟ جہاں نہ سونے کو بیڈ ہے نہ بیٹھنے کو صوفہ۔“ وہ جذباتی ہو رہی تھی۔ فیصل سنجیدگی سے بولا۔

”اور اگر یہ سب نہیں بھی نہ ملے۔ ابو مجھے عاق کر دیں تو۔“

عافیہ کا دل بچے کی مانند لرزا۔ وہ ایسا سوچنا بھی نہیں چاہتی تھی۔

”تمہیں اپنا حق ہر حال میں لینا ہو گا فیصل۔ مجھے دنیا کے سامنے تماشہ بننا پڑے گا؟“ اس نے بچنے بچنے لہجے میں کہا۔

”کس بات کا تماشہ؟ شادی کا وعدہ کیا تھا میں نے وہ نبھادیا۔“ فیصل مطمئن تھا۔

”مگر میں اس گھر کی بہو بھی بننا چاہتی ہوں فیصل! مجھے اپنے گھر کا مان بھی چاہیے۔“ وہ ضدی ہونے لگی۔ اس کی مال اکٹھا کر لی تھیں۔

”مقرر سے اتنی ہی ضد لگانی چاہیے، جتنی اپنے اختیار میں ہو۔ جہاں معاملہ اختیار سے باہر لگے وہاں اپنی ضد چھوڑ کر خدا کی رضامانی لینے ہی میں عافیت ہے۔“

”مگر عافیہ نے کبھی اس جملے کی گہرائی میں اتر کر کوئی سیپ نہ پایا تھا۔

”تمہارا گھر وہی ہے جہاں میں ہوں عافی۔ اس گھر اور اس کے کمینوں سے تمہارا کیا واسطہ؟“

وہ جیسے عافیہ کو آزار رہا تھا۔ مگر عافیہ اس امتحان میں کسی طور پورا اترنے کو تیار نہ تھی۔

”وہ عیش قدرت نے ہمارے نصیب میں لکھے ہیں
فیصل پھر کیوں نہ ان سے مستفید ہوا جائے۔“
”بہر حال۔۔۔ فی الحال تو کچھ نہیں ہو سکتا۔ جب تک
ابو کو منانہ لوں۔ وہ تو پہلی فرصت میں ہی مجھے شانہ سے
پہا دیں گے۔ مسلسل زور دے رہے ہیں شادی پر۔“
فیصل نے بات ختم کر دی۔
”تم کم از کم اب آؤ تو سنبھال لو فیصل! اب تک
صرف گاڑی کا پیٹرول پھونکتے رہو گے۔“
عافیہ کو اس کی لاپرواہی اب کھٹکنے لگی تھی۔ حالانکہ
اس کا یہ بے نیاز اور لاپرواہا انداز ہی عافیہ کو لوٹ کر
لے گیا تھا۔
لاٹھوں کی گاڑی میں بیٹھا خوش شکل سامرو منوں
میں اس پر لٹو ہو گیا تھا۔ یہ کیا کم مرتعہ والی بات تھی۔
”لوگے۔ دو ایک ماہ انتظار کرو۔ پھر سب ٹھیک
ہو جائے گا۔“ فیصل نے نخل سے کہا تو وہ ٹھنکی۔
”مگر مجھے پیسہ چاہیے۔ جب تک بھی یہاں رہنا
ہے، کم از کم اپنے معیار کے مطابق تو کروں اس گھر
کو۔“ اس بار مجھے وہ زنج آکر بولا۔
”تم اتنا زور کیوں نہیں بچا دیتیں؟“
عافیہ رنگ سی اسے دیکھنے لگی۔

عمر نے ماں کی بدایت ایک کان سے سن کر دو سرے
سے اڑا دی۔ اسے شاپنگ کے لیے لے جانے ڈرا بیور
ہی آیا تھا۔ امی کو سخت غصہ آیا۔ اب جوان جہان لڑکی
کو ڈرا بیور کے ساتھ کیسے بھیجتیں۔ خود ساتھ ہو لیں۔
”بہت برے دل کے ساتھ اس نے شاپنگ کی۔ مگر
گھر آ کے اس کا ایک بھی چیز کھول کے دوبارہ دیکھنے کا
دل نہ چلا۔“
ٹوکیا ساری زندگی وہ یونی بٹانے والا تھا؟ عافیہ جیسی
سنگدل اور بے حیا لڑکی یا داؤد میں کھو کر۔ اسے عافیہ
یاد تھی۔ عافیہ کی بد کرداری وہ بھول گیا تھا کیا؟ زینب کو
اپنی کیفیت کچھ سمجھ میں نہ آ رہی تھی۔ ڈھیروں کپڑے
لٹے جوتے، جیولری۔ مگر پلڑے میں تمام چیزیں رکھ

کے بھی۔ عمرو الا پلاز بھاری تھا۔
ای کمرے میں آئیں تو وہ رو رو کر بے حال ہو رہی
تھی۔ وہ حدود درجہ پریشان ہو گئیں۔
زینی کی ایک سی رشت۔
”کراچی جانا ہے۔ تایا ابا سے ملنا ہے۔ میرا دل
گھبرا رہا ہے۔“
امی نے لپک جھپک کر عمر کو فون کیا۔ منٹوں میں وہ
گھر پہنچا۔
”بھئی چنگی تھی۔ جانے اکیلے میں بیٹھے بیٹھائے کیا
ہو گیا۔“ عمر نے دیکھا رو رو کر اس کی آنکھیں سوج رہی
تھیں۔

پھر امی نے کراچی چلنے کا حکم صادر فرما دیا۔ زینی کے
دل میں ٹھنڈک سی اترنے لگی۔ مگر عید کی گئی۔
”کیسی باتیں کر رہی ہیں امی۔ اس گھر میں۔“
”جو قسمت میں لکھا تھا وہی لے کے آئے تھے
ہم۔ منہ زبانی کہہ دینے سے خون کے رشتے نہیں ٹوٹا
کرتے عمر۔“ امی کا انداز اتنا ہی تھا۔
عمر چپ سا ہو کر انہیں دیکھنے لگا۔ پھر جھنجھلا کر باہر
نکل گیا۔ اگلے روز اس نے امی اور زینی کو ٹرین میں بیٹھا
دیا۔

”میں فارغ نہیں ہوں ابھی۔ جب آنا ہو بتا دیجیے
گا۔ واپسی پہ خود لینے آؤں گا۔“
اس کی نئی نوکری تھی پھر اونچی پوسٹ۔ امی چپ
ہو رہیں۔ زینی نے لاتعلقی سے منہ پھیر لیا۔ عمر لب
چپچپے کھڑکی سے پیچھے ہٹ گیا۔

تائی اماں اس سے لپٹ کے یوں بین کر کے روئیں
جیسے ان کی سگی بیٹی سامنے آگئی ہو اور تایا ابا کو دیکھ کر تو
ان کی بے بسی اور بے چارگی نے زینی کو بھی رلا رلا
ڈالا۔

بارعب اور دینگ سے تایا ابا لاچاری کی علامت
بنے بستر پہ بڑے تھے۔ ملنے چلنے سے معذور۔ زبان کو
بھی فاج مار گیا تھا۔ زینی کو دیکھ کر غول آں کرتے

آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے تو وہ ان کے سینے سے لپٹ
گئی۔ کیسی بد نصیب ہوتی ہیں وہ بیٹیاں جو اتنے شان و
شکوت والے باپوں کے شعلے مٹی میں رول کر ان کو
یوں بستر سے لگا دی ہیں۔
ابا جیسے مضبوط آدمی کو وہ بندے دھکے سے دھکیل
نہ سکتے تھے مگر عافیہ جیسی کمزور بیٹی نے ایک سی ہلے میں
ان کی کمر زمین سے لگا دی تھی۔
شاید اسی لیے مٹی کوئی نہیں مانتا؟
عافیہ بہت بدل گیا تھا۔

وہ عافیہ جس کی آنکھوں میں بے تکلفی آمیز بے
پاکی ہوتی تھی۔ اب جیسے زینی کے سائے سے بھی بچ رہا
تھا۔ بات کرتا بھی تو یوں جیسے کسی انجان اجنبی سے
گفتگو ہو رہی ہو۔ زینی کا دل وہاں سے چاٹ ہونے
لگا۔

زینی نے جی جان سے تایا ابا کی خدمت کی۔ اس گھر
میں کوئی بھی عافیہ کا ذکر نہیں کرتا تھا۔ زینی کو واضح
اہمیت دی جا رہی تھی۔ تائی اماں تو جیسے میکے آئی بیٹی کی
ماں بنی ہوئی تھیں۔ زینی کو شدت سے احساس ہوا کہ
یہ سب عمر کی بیوی بننے کا اعجاز ہے۔

امی نے عمر کو فون کر دیا تھا۔ وہ انہیں لینے آ رہا تھا۔
ساتھ ہی تایا ابا کی خبر گیری بھی ہو جاتی۔

اور پھر جس روز عمر آیا زینی کے چہرے پر انوکھی سی
چمک اتر آئی۔ زینی نے دل لگا کے عمر کی پسند کی بریانی
اور اچار گوشت بنایا۔ ٹائمر بایز اور کھیرے کا کچھ مرسلاد
اوپر ڈھیر سا رالیموں نچوڑتے۔ بیٹھے میں فروٹ کسٹرو۔
گرم کارم روغنی نان عاقب لے آیا۔

مگر عمر نے اس پر ایک نگاہ بھی نہ ڈالی تھی۔ یوں
جیسے وہ کسی اور کی بیوی ہو۔ جبکہ وہ کھانے کے دوران
بڑھ بڑھ کے اسے ڈھیس پیش کر رہی تھی۔

وہ تائی اماں سے باتیں کر رہا تھا۔ امی سے ہنس بول
رہا تھا۔ مگر عاقب نے بھانپ لیا کہ وہ زینی کو مسلسل
نظر انداز کر رہا تھا۔
زینی نے رو رو کر برتن دھوئے۔

تب ہی ایک بے حد عجیب سی بات ہوئی۔ جو پچھلے
ایک ہفتے سے نہ ہوئی تھی۔ وہ برتن دھو کر سلیپ
صاف کر کے پٹنی تو چہرے پر شکست و ریخت کے
نشانات موجود تھے۔ عاقب کو غیر متوقع طور پر سامنے
پاکر زینی نے بو کھلا کر دے پٹنے سے چہرہ کڑا۔

”تم رو رہی ہو؟“ وہ غور سے اسے دیکھ رہا تھا۔
”نہیں۔ نہیں تو۔ میں کیوں روؤں گی۔“ وہ مکر گئی۔
باہر نکلتا تھا۔ مگر اسے عجیب سا لگا۔ عاقب کچن کے
دروازے کے عین درمیان میں پھل کے کھڑا تھا۔
”مجھ سے تو جھوٹ مت بولو زینی! جان گیا ہوں میں۔“

اصلیت دیکھ لی ہے میں نے۔ عمر اور تمہارے
درمیان پچھلی سرد مہر۔ ”وہ جذباتی ہونے لگا۔
زینی کے وجود میں سنناٹہ سی ہوا تھی۔
”وہ میرا شوہر ہے عاقب! اور تم خواستہ کے
اندازے مت لگاؤ۔ بس تھوڑا تھا ہے مجھ سے۔ اتنے
دن زبردستی جو رہی ہیں۔“

اس نے عاقب کی بدلتی نگاہوں کو سرعت سے
محسوس کر لیا تھا جب ہی پر زور انداز میں اس کی نفی
کی۔ مگر وہ جانے کیسے اندر کا بھدرا گیا تھا۔

”جھوٹ اس سے بولو جو تمہیں جانتا نہ ہو زینی!
میں تو تمہاری چال سے تمہاری نگاہوں کے انداز سے
پہچان سکتا ہوں کہ تم ابھی تک وہی زینی ہو۔ منہ بند
فلی۔“

بے باک تو وہ پہلے بھی تھا۔ مگر اتنا کھلا ڈالا انداز۔
زینی کو اپنے کانوں کی او میں چپتی محسوس ہوئیں۔
”میں عمر کی بیوی ہوں عاقب! میرے راستے سے
ہٹو۔“ اس نے لہجے میں درشتی سمو کر بمشکل کہا۔

”پاکلی مت بنو زینی۔“
وہ آگے بڑھ آیا۔ اس کے انداز میں وارفتگی اور
لہجے میں دیباہ سا جوش تھا۔

”پانے نکال والے دن ہی عمر سے کہہ دیا تھا کہ فی
الحال وہ تم سے نکال کر کے اپنی عزت بچائے۔ بعد میں
بے شک تمہیں طلاق دے دے۔ تو راضی ہی نہیں
تھا تم سے شادی پر۔“

”میں نے بائیں مت کرو۔ مجھے جانے دو۔“ زینی کو اس سے خوف محسوس ہوا۔

”یاد کرو زینی! ہم دونوں کتنے خوش تھے اپنے رشتے سے۔ اس روز نکاح طے تھا ہمارا۔“

وہ اسے ہکا بکا تھا۔ وہ اپنی کراہی دکھا رہا تھا۔ مگر زینی ان ہکا بکاؤں سے نکل چکی تھی۔

”میں صرف اس لیے خوش تھی کہ تم سے شادی کے بعد شاید اس گھر میں میری حیثیت کچھ بہتر ہو جائے۔ ابھی تم نے دیکھا۔ کیسے عافیہ اپنی اترن۔ اپنے کپڑے اپنے جوتے مجھے وان کرتی تھی۔ آج تک اس گھر میں میرے لیے کوئی نیا جوتا نہیں بنا۔ میں تو اسی لالچ میں تمہارے سنگ رشتے سے بندھ گئی کہ اس گھر کی بیوی بن کر شاید مجھے اس اترن سے نجات مل جائے اور اترن ابھی وہ ہے کہ جسے میرے بدن پر دیکھ کر عافیہ رہ نہیں سکتی تھی اور لکٹی ہی یاد اس نے اپنے دے ہوئے جوڑے مجھ سے اتروائے ہیں۔ تمہیں تو پتا بھی نہیں عاقب۔ ان حالوں میں گزارہ کرتی رہی ہوں میں یہاں اور تم۔ تم مجھے میرا ماضی یاد کرا رہے ہو؟“ وہ بے حد غصہ اور اذیت پسند ہو رہی تھی۔ آنسو بنا شعوری کو بخش کے بنے جا رہے تھے۔

”بھول جاؤ عاقب۔ جیسے میں نے بھلا دیا اس ماضی کو۔ میں کسی کے نکاح میں گئی ہوں تو دل کی پوری رضا مندی کے ساتھ۔ اب وہ برا کرے یا بھلا، میری قسمت۔“ اس نے ہتھیلیوں سے آنکھیں رگڑیں۔ عاقب کا رنگ بدل گیا تھا۔ اسے امید نہ تھی کہ زینی کیسا آئینہ اس کے سامنے لارکھے گی۔

چکن کا دروازہ کھٹکھٹایا گیا۔ عاقب اور زینی دونوں چونکے۔

دروازے میں عمر کھڑا تھا۔

زینی کا دل غوطہ کھا کھا ابھرا۔ عمر نے عاقب کی ساری بکواس سن لی تھی۔

”چائے بنا دو چار کپ۔“ وہ نارمل انداز میں بولا۔

”جی۔ اچھا۔“ زینی جلدی سے چولہے کی طرف پلٹ گئی۔ عاقب باہر نکل گیا تھا۔

زینی کا دل تیز رفتاری سے دھڑک رہا تھا اس کی طبیعت گھبرانے لگی۔

(جانے اس نے کیا کیا سن لیا ہو؟)

”میری چائے میں چینی ایک ٹی اسپون ڈالنا پس۔ اور پیکنگ جلدی ختم کر کے سو جاؤ۔ صبح واپس جانا ہے۔“

”ہیں۔“ زینی کا تمام خوف اڑن چھو ہوا۔ مسکراہٹ سے چوہا کھل اٹھا۔ پلٹ کر عمر کے اثرات دیکھنے چاہے تو وہ چاچا تھا۔

زینی نے طمانیت بھری سانس لی۔

”تو گویا اس نے کچھ نہیں سنا۔“

فیصل جس قدر اطمینان سے دو کمروں کے اس گھر میں رہ رہا تھا اسے دیکھ کے عافیہ کو لگتا تھا کہ وہ یونہی زندگی گزارنے کی پلاننگ کیے ہوئے ہے۔ صبح ناشتا کر کے گھر سے نکلتا تو رات کے کھانے پر واپس آتا۔ عافیہ کی برواشت کی حد نہیں تک بھی۔ اسے صاف دکھائی دے رہا تھا کہ اگر اس نے یونہی ہتھیار ڈالے رکھے تو فیصل بھی بھی اسے اپنے گھر نہیں لے جائے گا۔ تب ہی اس رات جب وہ گھر پہنچا تو غصے سے بھری عافیہ اس کی منتظر تھی۔

”کھانا لے آؤ جلدی سے۔“

وہ ہاتھ دھو کر توبہ سے خشک کرتے ہوئے بولا اور ریموٹ اٹھا کر بیوی آن کر کے لگا۔

چھپکھپھتے دل پر پھر رکھ کر عافیہ نے زیورات میں سے ایک سیٹ نکال دی اور فرخ نے لے لیا تھا۔

”کہوں۔ گھر سے کھا کے نہیں آئے یا وہاں تمہیں کوئی پوچھتا ہی نہیں؟“

طرز سے بھرپور یہ لہجہ اب فیصل کو اجنبی نہیں لگتا تھا۔ جب سے وہ اس گھر میں آئے تھے عافیہ کے موڈ پر سے خوش دلی کی ساری برتیں اترنے لگی تھیں۔

”میرا گھر یہ ہے عافیہ! جہاں میں تمہارے ساتھ رہتا ہوں۔“ وہ سنجیدگی سے بولا اور مطلوبہ چیمبل دکا کر

کری میں دھنسی گیا۔

عافیہ تڑپ سی تو ابھی۔

”تمہیں یہ ہے ہمارا گھر۔ اور نہ ہی میں اس کا ایک میں مزید رہ سکتی ہوں۔ جو بھی ہو گا دیکھا جائے گا۔ تم مجھے اپنے گھر لے کے چلو۔“ وہ چلائی۔ فیصل نے ناگواری سے اسے دیکھا۔

”تم نے مجھ سے شادی کی تھی یا میرے گھر سے؟“

”دونوں سے۔“ وہ ذرا بھی پشیمان نہ ہوئی تھی۔

”وہ کے کے ساتھ اس کی مضبوط مالی پوزیشن بھی دیکھی جاتی ہے۔“

”میری پوزیشن بلکہ ہر ”پوزیشن“ تمہارے سامنے تھی پھر اب یہ چیخ کیوں؟“ وہ سختی سے بولا۔

”تم نے کہا تھا یہ چند دنوں کی بات ہے۔ مگر حقیقت تو یہ ہے کہ ہم چھپکھپھتے دو ماہ سے اس گھر کا کرایہ بھر رہے ہیں اور اپنی آمدنیوں میں کھینچ جانے کے گزارہ کر رہے ہیں۔ نہ ہو لنگ نہ لانگ ڈرائیو۔ کیا کیا خواب دیکھتے تھے میں نے۔“ وہ بدل ہو رہی تھی۔

فیصل اٹھ کے اس تک آیا اور اسے دونوں شانوں سے تقاب کر پیار سے بولا۔

”کیا تمہیں یہ پسند نہیں کہ ہم دونوں مل کے اپنی دنیا بنائیں۔ مل کے محبت کریں اور خوشیوں بھرا ایک محل تعمیر کریں۔“ کوئی محبت کرنے والی صاف ذہن کی لڑکی ہوتی تو شوہر کے اس محبت بھرے پیغام پر لپیک کتنی کمزور نہ کھٹکھٹا کر پیچھے ہٹی۔

”محبت۔ ہوش میں تو ہو تم؟ تمہارا مطلب یہ ہے کہ ہم اپنی ساری جوانی جوتاں کھاسے دو سروں کی نوکیلاں کرتے اور پہلی کا انتظار کرتے گزار دیں؟“

وہ بے یقین تھی۔ فیصل کو اس کے چہرے پر خوف سا دکھائی دیا۔

”تم کی سمجھ لو کہ تمہارے فیصل کی یہی حقیقت ہے۔ بھول جاؤ اس بنگلے اور اس کے کمینوں کو۔“

وہ دونوں بازو پھیلا کر گھر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا تو وہ بے یقینی سے اسے دیکھنے لگی۔

”تم نے گھر میں بات کی اپنی شادی کی؟“ فیصل

ٹھکے ہوئے انداز میں پلٹ گیا۔

”ظاہر ہے۔ رات گھر نہ جانے کا کوئی جواز تو نہ بنائی تھا۔“

”پھر؟“ وہ بے تابی سے آگے بڑھی۔

”پھر یہ کہ اب ہمیں ہمیں اپنی دنیا بسانی ہے۔“

فیصل کے اس مختصر سے جواب میں ایک قیامت چھپی تھی۔ عافیہ کو سناپ سیڑھی کا کھیل آج سمجھ میں آیا تھا۔ بڑی مہارت سے وہ ہندسوں کے بجائے سیڑھیوں سے چڑھ کر اوپر تک آئی تھی مگر ننانوے پر موجود سناپ اسے ڈسنے کی تیاری میں تھا۔ یہ اسے علم نہیں تھا۔ شارٹ کٹ استعمال کرنے والوں کو اکثر نہیں ہوتا۔

”تم۔ تم خاموشی سے لوٹ آئے۔ کیسے مردہ تو تم فیصل۔ اپنا حق نہیں مانگ سکے۔“

عافیہ کو اپنی زندگی کی گیم ختم ہوتی محسوس ہوئی تھی۔

مل کھا کے بولی۔

”سب کچھ کر کے دیکھ لیا اور اب مہربانی کرو تم بھی۔“

اس ٹاپک کو کہیں دفناؤ۔ میں پہلے ہی تمہارے رویے سے ٹپس ہو رہا ہوں۔ مجھے نہیں پتا تھا تم اس قدر مانت پرست ہو۔ بجائے مجھے حوصلہ دینے کے تم اس بنگلے کو رو رہی ہو۔“

وہ تلخ ہونے لگا۔

مگر عافیہ کو اپنے کسی فعل یا لفظ پر ذرہ برابر بھی شرمندگی نہ تھی۔

اسے تو اپنا نقصان سہ پہر ہاتھ رکھ کے رونے پر مجبور کر رہا تھا۔ اس کی طرف سے پاپس ہو کر فیصل خود ہی کچن میں کچھ کھانے کے لیے دیکھنے چلا گیا۔

وسیع و عریض شان دار بنگلے کو رشک و مسرت سے دیکھتے ہوئے عافیہ نے ذور تیل پر ہاتھ رکھا۔

زادیر کے کعبہ چوکیدار نے چھوٹا ٹیکہ ڈالیا۔

”وہ صاحب سے ملنا ہے میں نے۔“ وہ ذرا سا سٹپا کر بولی۔

”کون سے صاحب سے ملنا ہے بی بی؟“ پھان
چوکیدار نے اپنے مخصوص انداز میں پوچھا۔
عافیہ اس وقت بہترین لباس پہنے ہوئے تھی۔
نازک سی گولڈ جیولری اور ہاتھ میں قیمتی برس۔
وہ اس گھر کے مکینوں پر اپنا پہلا امپریشن بہت اچھا
ڈالنا چاہتی تھی۔
”فیصل صاحب۔ فیصل کے گھر والوں سے۔“
چوکیدار نے چند لمحے ابھی نظروں سے عافیہ کو دیکھا۔
پھر جیسے سمجھ آنے پر سر ہلایا۔
”اچھا۔ فیصل کا مہمان اے۔ وہ تو بڑے
صاحب کو فیکٹری لے کر گیا ہے۔“
”اس کی ای تو ہوں گی گھر پر۔“ عافیہ غصہ دیتے
ہوئے بولی۔ اس چوکیدار کو تو وہ ضرور سبق سکھائے
گی۔
”ہاں۔ وہ اے۔“ چوکیدار نے سر ہلایا تو وہ نرج
آکر بولی۔
”مجھے اندر تو آنے دو۔ ان سے ملنا ہے میں نے۔
رشتہ دار ہوں ان کی۔“
چوکیدار نے مشکوک نظروں سے سرتپا اسے
دیکھا۔ اور پھر دروازے سے پیچھے ہٹ گیا۔
اندر داخل ہوتے ہی عافیہ کی طبیعت بکاش ہو گئی۔
وسیع و عریض لٹ کر گرین لائن۔ پور ٹیو میں کھڑی دو
شاندار گاڑیاں۔ وہ ماربل کی روش پر چلتی مسحوری
تھی۔ اسے لگا جیسے اس کے خواب آج تعبیر پا گئے
ہوں۔
”بی بی۔ کدھر جاتا ہے؟“ چوکیدار کی کرخت آواز
اسے یک سخت ہوش میں لائی۔
”کیا مسئلہ ہے تمہارے ساتھ؟“ وہ غصے سے بولی۔
”اندر کدھر جاتا ہے بی بی؟ تم تو فیصل کی اماں سے
ملنے آیا تھا۔“ وہ تذکیر و تائید کی ایسی کی میسی کرتے
ہوئے بولا۔
”ہاں۔ تو؟“ عافیہ نے اسے پھاڑ کھانے والے
انداز میں دیکھا۔
”وہ اور اندر نہیں اے۔ ان کی رہائش پیچھے

اے۔“ چوکیدار نے ناگوار سے کہا۔ وہ چپ کی
ہو گئی۔ پھر محتاط انداز میں پوچھا۔
”پیچھے کیا ہے؟“
”اور سب ملازموں کے سروٹ کوارٹر ہیں۔“
چوکیدار کے لبوں نے الفاظ نہیں اس کے کانوں میں
تیزاب اندھا تھا۔
”اور فیصل۔ وہ کہاں۔؟“ عافیہ کی دنیا داؤ پر لگی
تھی۔
وہ دنیا جس کے لیے اس نے اپنی آخرت داؤ پر لگا
دی تھی۔
”اس کا کوارٹر بھی اور ای اے۔ ڈرائیور ہے وہ
بڑے صاحب کا۔ گھر کی گاڑی بھی چلاتا ہے اور فیکٹری
والی بھی۔“
”ڈن۔ ڈن۔ ڈن۔ ڈن۔“
تیز رفتار ٹرین عافیہ کے وجود کے پرچے اڑاتی نرری
تھی۔ وہ بے یقینی سے چوکیدار کو دیکھنے لگی۔
”آج کل تو وہ ڈیوٹی کے بعد نہیں چلا جاتا اے۔ اور
نہیں رہتا۔ گھر میں کوئی کھٹ پٹ اے شاید۔“
بے حد بدحواس ہو کر وہ وہاں سے پلٹی تو چوکیدار کو
خوشہ ہوا اونچی تہیل سے وہ ماربل پر پھسل ہی نہ
جائے۔ مگر وہ کہاں جانتا تھا کہ عافیہ کن بلندیوں سے گر
چکی ہے۔ گھر میں عافیہ نہیں ایک طوفان لوٹا تھا۔
فیصل کے آنے تک پہلے تو وہ روتی رہی پھر اس نے
گھر کا سارا سامان بکھیر ڈالا۔ برتن توڑ دیے اور تو اور
وی بھی زنیں پر پھینک دیا۔
اس وقت اگر فیصل اس کے سامنے ہوتا تو یقیناً
اسے وہ قتل ہی کر ڈالتی۔
فیصل اپنے مخصوص وقت پر آیا۔ پاس موجود چال
سے لاک کھول کے اندر داخل ہوا تو کچھ عجیب سا
احساس ہوا۔ پورا گھر اندھیرے میں ڈوبا ہوا تھا اور بالکل
خاموشی طاری تھی۔ سورنہ اس وقت عافیہ بی بی کی لگا کے
بیٹھی ہوئی تھی۔
وہ خوف زدہ سا ہوا۔ آگے بڑھ کر صحن کی لائٹ
جلانی اور تیزی سے کمرے کی طرف بڑھا۔

لائٹ آن کرتے ہی اس کا دل جیسے کسی نے کھینچ
لیا۔ ہر شے الٹ پلٹ تھی۔ بی بی کی ایک
میں کس لیا۔ ہر شے الٹ پلٹ تھی۔ بی بی کی ایک
طرف اونڈھا ہوا تھا غالباً اس کی اسکرین ٹوٹ گئی
تھی۔
فیصل کے ذہن میں پہلا خیال ڈکیتی کی واردات ہی
کا آیا۔ وہ بے تابی سے کدے پر اونڈھی پڑی عافیہ کی
طرف بڑھا۔
”عافیہ۔ کیا ہوا میری جان؟“ اس نے اسے شانوں
سے پکڑ کر سیدھا کیا۔ رویا چہرہ موسمی آنکھیں، بکھرے
بال۔ وہ بی بی کی تھی۔ فیصل کا دل لرز گیا۔
”بولتی کیوں نہیں۔ کیا ہوا؟“ وحشت کے مارے
فیصل نے اسے جھنجھوڑ ڈالا۔
دنیا الٹ گئی ہے میری۔ مر گئی ہوں میں۔ وہ
ہسٹریائی انداز میں چیختی تو وہ دم بخود رہ گیا۔
”پور آئے تھے یہاں۔؟“
”پور۔!۔“ وہ جیسے بخنی سے بولی۔ ”کیا چوری کریں
گے یہاں سے چور۔ ایک معمولی سے ڈرائیور کے گھر
کیا چرائیں گے۔“
فیصل ساکت سا ہوا۔ پھر اس نے طمانیت بھری
سانس لی۔
شکر ہے خدا کا۔ میں تو ڈر ہی گیا تھا کہ خدا ناخواستہ
کوئی قیامت نہ ٹوٹ پڑی ہو۔“
اس نے تشکر کا اظہار کرتے ہوئے عافیہ کو بائیں
میں لیا تو اس نے پوری قوت اور نفرت کے ساتھ فیصل
کو پیچھے دھکیلا۔
”قیامت۔ ابھی کوئی قیامت ٹوٹنی باقی ہے کیا؟“
وہ ہڈی۔
اس کے رد عمل پر فیصل کو کوئی حیرت نہ تھی۔ وہ
پر سکون تھا۔ بالکل پر سکون۔
”پلو انڈھ جاؤ۔ اب منہ ہاتھ دھوؤ اور کھانا لگاؤ۔
دونوں ساتھ کھا لیں گے۔“
”تم دھو کے باز فرمائے۔“ دو ٹکے کے ڈرائیور اور
جھوٹ بولتے رہے میرے ساتھ۔“ عافیہ اس کے
پیچھے لگی اور کالر سے پکڑ کے اسے کھینچا۔ وہ بھوک

شیرینی بنی ہوئی تھی۔
فیصل نے اس کا لال بھہو کا چہرہ اور وحشت سے
بگڑتے خدوخال دیکھے۔ اور نرمی سے اپنا کالر چھڑاتے
ہوئے بولا۔
”میں نے تم سے کوئی جھوٹ نہیں بولا۔ میں نے
ایک بار بھی نہیں کہا کہ وہ بنگلہ میرا ہے۔ میں نے
صرف یہ کہا تھا کہ میں وہاں رہتا ہوں۔“
”تم نے یہ کیوں نہیں کہا کہ تم وہاں ڈرائیور ہو اور
اپنے ماں باپ کے ساتھ سروٹ کوارٹر میں رہتے
ہو۔“ وہ ہڈی۔
”تم نے پوچھا ہی نہیں۔“ وہ آرام سے بولا۔
”تم حرام۔“ غم وغصے اور نفرت سے بے حال
ہو کر وہ اسے گالی دینے لگی تھی کہ اس کا مطلب یا کر
فیصل نے اس کے بالوں کو جڑوں سے مٹھی میں جکڑ
لیا۔
”نکواس بند۔ اب مزید ایک لفظ نہ سنوں میں۔ تم
جیسی ہی لڑکیاں ہوتی ہیں ماں باپ کے گھروں سے
بھاگتی ہیں تو پھر ایک شوہر کے ساتھ بھی گزارہ نہیں
ہوتا۔ عزت راس نہیں آری؟“ وہ ایک بالکل مختلف
فیصل تھا۔
عافیہ لنگ سی اسے دیکھ رہی تھی۔ پھر جیسے حواس
میں آئی تو دیوانی ہو گئی۔ اسے نوجا کھوٹا دھکے دیے
جو چیز ہاتھ میں آئی اسے دے ماری۔ مگر فیصل کے
ایک زوردار ہتھرنے ہی اسے چکر کر کرنے پر مجبور
کر دیا۔ وہ گالیاں بلکا بکچی میں چلا گیا۔
”امی۔!۔“ وہ بلک اٹھی۔
ان تین ماہ میں اس نے پہلی بار ماں کو یاد کیا تھا۔

ای کی نظروں سے کچھ بھی چھپا ہوا نہ تھا۔
”کیا بات ہے زینب۔ کیوں اتنی آزادی دے رکھی
ہے تم نے عمر کو؟“
آج بھی وہ رات کے کھانے پر نہ پہنچا تھا۔ امی نے
زینب کو ٹوکا تو وہ شکایتی نظروں سے انہیں دیکھنے لگی۔

”غلط بات ہے یہ۔ تمہارا شوہر ہے وہ۔ برا بھلا پوچھنے کا حق رکھتی ہو تم۔“

وہ دیکھتی تھیں عمر گس ضرورت کے وقت ہی زینبی سے مخاطب ہوتا تھا۔ اور زینبی تو جیسے اس گھر کے کاموں میں ہی خود کو الجھائے ہوئے تھی۔ اس کے پاس تو عمر کو مخاطب کرنے کا بھی نام نہ تھا شاید۔

”وہ تو شاید عافیہ کو بھول ہی نہیں پائے۔ میں نے ہی غلطی کر دی۔“ زینبی کو زوروں کا رونا آیا۔

”تم سے کوئی بات کی ہے اس نے عافیہ کی؟“ امی پریشان ہوئیں۔

”جھگ سے کیوں کریں گے۔ خیالوں میں کرتے ہوں گے۔“ وہ نرمے پن سے بولی۔ تو اس کی ساواکی اور معصومیت پر وہ بے ساختہ ہنس دیں۔ پھر سچے لہجے میں بولیں۔

”بڑا صاف دل ہے میرا بیٹا! تم دونوں کے درمیان غلط فہمیاں آگئی ہوں گی بس۔ ورنہ عافیہ تو کب کی ہمارے درمیان سے نکل چکی ہے۔“

”ہاں۔ بڑے صاف دل کا ہے۔“ زینبی جل کر بولی۔ ”کاش کہ ان کی نظر بھی اتنی ہی صاف ہوتی تو پتا چل جاتا کہ اللہ نے عافیہ سے زیادہ خوب صورت بیوی دی ہے انہیں۔“ عمر اندر داخل ہوتے ہوئے کھنکھار۔

”السلام علیکم۔“

زینبی یوں اپنی پلیٹ پہ جھکی جیسے کافی دیر سے کھانا ہی کھا رہی ہو۔

”کمال تھے تم۔ کب سے انتظار کر رہی ہے تمہاری بیوی۔ بھوکی بیٹھی ہے تمہارے لیے۔“ امی نے خود ہی اس کی خیر لینے کا سوچا تو اس نے اپنی نگاہ زینبی کی پلیٹ پر ڈالی۔

”اچھا۔ افسوس ہوا۔ کہیں بھوک ہڑتال پہ تو نہیں ہے آپ کی، سو رہی؟“

زینبی کو صاف پتا چل رہا تھا کہ اس کی بھری پلیٹ پر نظر کیا جا رہا ہے۔ وہ جڑبڑہوئی۔ مگر اس سے اتنی بے تکلفی ہی کب تھی کہ کوئی جواب دیتی۔

وہ اب امی کی ڈانٹ کے جواب میں کام کی لڑائی اور مصروفیات کا رونا روتا رہا تھا۔

زینبی کھانا اور حورا چھوڑ کر تیزی سے وہاں سے گئی۔ دونوں ماں بیٹے نے اسے دیکھا۔

”جاؤ۔ لے کے آؤ۔ اسے کھانا بھی دے۔“

نہیں کھایا اس نے۔“

انہوں نے گھر کا گہری سانس بھرتے عمر کے کمرے کی طرف بڑھا۔ جہاں ایک ماہ سے دو اجڑی رہائش پذیر تھے۔

وہ کمرے میں آیا تو وہ بیڈ پر بیٹھی گھنٹوں پر ٹھونڈے ٹکائے بیڈ شیٹ کے پیرائے پر انگلی پھیر رہی تھی۔

”شکر ہے۔ میں تو سوچ رہا تھا۔ جاتے ہی آنسوؤں کے دریا کو بار کرنا پڑے گا۔“ عمر کے لب و لہجے میں موجود بے تکلفی نے زینبی کو چوٹ لگایا۔

”ہاں۔ آپ نے کون سی کسر اٹھا رکھی ہے رلا لے کی۔“ انرا زنی سے بولی۔

”اور تم نے دل جلانے کی۔“ وہ بے ساختہ بولا۔

”میں نے۔ کب۔؟“ زینبی نے احتجاج کیا۔

”آپس روز۔ فون پہ کہہ رہی تھیں شاید اپنی دوست کو۔ عاقب سے نکاح نہ ہونے کا وہ کہہ۔“ وہ یاد دلایا تھا۔ زینبی مجبور ہوئی۔

”وہ تو۔ یونہی۔ آپ کو جلانے کے لیے۔ مجھے تو بس نکاح کا شوق تھا۔ آپ سے ہو گیا تو ٹھیک ہے۔“ عمر کا دل سینے میں لوٹ کر رہ گیا۔

یہ ساواکی اور معصومیت۔ گھر گھر ہستی کے انداز۔ چھپلے تین ماہ سے ہر پلڑے میں بھاری تھی وہ۔

”تو نکاح کے بعد کے بھی کچھ حقوق ہوتے ہیں محترمہ۔“ عمر نے مسکراہٹ دی۔

”آپ نے کون سے اپنے فرائض ادا کر دیے ہیں۔“ وہ بے اختیار بولی پھر عمر کو دیکھ کر زبان دانتوں تلے دبائی مگر اس کا اقبہ جمل کر گیا۔

”آپ تو بس طرے کے تیر چلا سکتے ہیں مجھ پر۔“ وہ ہنس سے اتر کر چیلوں میں پاؤں بھسانے لگی۔

عمر نے اپنی تمام تر ذہنی دلی آمادگی کے ساتھ اس

ہاتھ تھام کر اسے اپنی طرف کھینچا تو وہ پچھلی ڈال کی طرح اس کے ساتھ آگئی۔

”تو تم بھی چلاتیں تیر کچھ اپنی نظروں کے کچھ قاتل اداؤں کے۔“ اس کی وحشت سے پچھلی آنکھوں میں جھانکنا وہ مخمور انداز میں کہہ رہا تھا۔ زینبی کی جان ہوا ہونے لگی۔

”وہ۔ آپ تو عافیہ سے۔“

”میں نے اپنی انگلی زینبی کے نرم و گلابی ہونٹوں پر رکھی۔ اس کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ تھی۔

”اس بل۔ صرف میں اور تم۔“

”تو پھر کھانا۔ کھا آئیں؟ ابی انتظار کر رہی ہوں گی۔“

”وہ خشک ہوتے حلق کے ساتھ منمنائی۔ تو وہ بے ساختہ ہنس دیا۔ زینبی کو لگا اس کی زندگی میں بھی ہمارے پھول کھل گئے ہوں۔“

زینبی خوش تھی۔ بے حد خوش۔

گہری رات اس کے دامن کو خوشیوں سے بھر گئی تھی۔ عمر وہ قاتل نخیر لگنے والا شخص۔ بناس کی کسی کوشش کے یوں اس کا ہوا تھا جیسے صدیوں سے اسی کا ہو۔

مگر کچھ لوگوں کو خوشیاں اتنی آسانی سے نہیں ملا کرتیں۔ یہ شخص ایک ہفتے بعد کی ہی بات تھی۔

اور یہ ایک ہفتہ اس نے عمر کے ساتھ جیسے خوشیوں کے ہنڈولے میں بیٹھ کر گزارا تھا۔ اس کے دل سے عمر اور اس کے خلاف ہر شکوہ ہر کدورت ختم ہو گئی۔

اس کو عمر کے ساتھ اس کے کسی کو لیک کے ہاں بٹھا پر جانا تھا۔ آج اس کا آف ڈے تھا مگر وہ جانے کہاں نکلا ہوا تھا۔

ڈور تیل بجی تو زینبی میگزین بند کرتی سیدھی ہو بیٹھی۔

”پتا نہیں یہ کہاں رہ گئے۔ اور باہر شاید کوئی آیا

بیوٹی بکس کا تیار کردہ

سوہنی ہیرائل

SOHNI HAIR OIL

- گرتے ہوئے بالوں کو روکتا ہے
- بے ہال آگاتا ہے۔
- بالوں کو مضبوط اور چمکدار بناتا ہے۔
- مردوں اور عورتوں دونوں کے لئے
- یکساں مفید۔
- ہر موسم میں استعمال کیا جاسکتا ہے۔



قیمت = 100/ روپے

سوہنی ہیرائل 12 جڑی بوٹیوں کا مرکب ہے اور اس کی تیاری کے مراحل بہت مشکل ہیں ہذا ہی تجویز مقدار میں تیار ہوتا ہے۔ یہ بازار میں یا کسی دوسرے شہر میں دستیاب نہیں، کراچی میں دکنی خرید جاسکتا ہے، ایک بوتل کی قیمت صرف = 100/ روپے ہے، دوسرے شہروں کے لئے ڈار بج کر رجسٹرڈ پارسل سے منگوائیں، رجسٹری سے منگوانے والے مٹی ڈار اس حساب سے بھجوائیں۔

2 بوتلوں کے لئے = 250/ روپے
3 بوتلوں کے لئے = 350/ روپے

نوٹ: اس میں ڈاک خرچ اور پیکنگ چارج شامل ہیں۔

منی آڈر بھیجنے کے لئے ہمارا پتہ:

بیوٹی بکس، 53- اورنگزب مارکیٹ، سیکٹر فور، ایم اے جناح روڈ، کراچی
دستی خریدنے والے حضرات سوہنی ہیرائل ان جگہوں

سے حاصل کریں

بیوٹی بکس، 53- اورنگزب مارکیٹ، سیکٹر فور، ایم اے جناح روڈ، کراچی
مکتبہ عمران ڈائجسٹ، 37- اردو بازار، کراچی۔

فون نمبر: 32735021

ہے۔ ”وہ خود کھائی کرتی بستر سے اتری۔
ایک نظر ڈرینگ نیکل کے آئینہ میں اپنا حلیہ
دیکھا۔

پر پل کلر کا سفید کڑھائی سے مزین لباس بے شکن
تھا۔ کالوں میں سفید گول والے بندے اور ان ہی کے
ساتھ کی خوب صورت سی بالاس کی لمبی گردن کے گرد
خوب صورتی سے لپیٹی ہوئی تھی۔ یہ عمر کاس کے لیے
پہلا تحفہ تھا۔ اور اس کے ساتھ واہنی کلائی میں پینا
وائٹ گولڈ کا انگن جو سفید گول سے مزین تھا۔ اسے
خود پر نہیں۔ عمر کی زین پر پیار آیا تو وہ مسکرا دی۔ باہر
سے اونچی آوازیں آئیں تو وہ خیالوں سے چونکی۔
”جائے کون آیا ہے۔“ وہ تیزی سے باہر نکلی۔ مگر
پھر آنے والے کو دیکھ کر جیسے اس پر بجلی ہی گر پڑی۔

اسی سے لیٹ کر چٹکوں ہسکوں روئی عافیہ۔ زینی
کو لگا اس کے گھر کی چار دیواری کو سیلاب کی تند و تیز
لہروں نے چھو لیا ہو۔ اسی بے حد خاموش تھیں۔
زینی کو دیکھ کر عافیہ لمحہ بھر کو تو سکت سی رہ گئی۔ پھر
ترپ کر اٹھی اور آگے بڑھ کے زینی کے گلے لگ
گئی۔ مگر زینی کے ہاتھ اسے لپٹانے کو اٹھ نہ پائے
تھے۔

”بس کرو عافیہ۔ بند کرو رونا۔“ امی کی ٹھہری آواز
پر وہ زینی کو چھوڑ کر پٹی اور رومال سے آنکھیں صاف
کرتے ہوئے مظلومیت بھرے انداز میں بولی۔
”کچھ اپنے گناہ تو دھو لینے دیں خالہ۔ نہ امت کے
آنسوؤں سے غلطیوں کے نشان میں گے نہیں مگر
شاید ہلکے ہو جائیں۔“

لگ رہا تھا وہ زمانے کی ٹھوک کھاکے آئی ہے۔
”اکثر جو لوگ زمانے کو اپنی ٹھوک میں جھٹتے ہیں زمانہ
ان ہی کو ٹھوکروں پر رکھ لیا کرتا ہے۔“ زینی نے سوچا۔
”زینی۔ پانی لاؤ عافیہ کے لیے۔“

اسی نے اس سے کہا۔ تو وہ جلدی سے کچن کی طرف
بڑھی۔ وہ تو خود وہاں سے ہٹ جانا چاہتی تھی۔ ملازمہ
کے ہاتھ کو لٹو ڈنک بھجوا کر وہ وہیں کاؤنٹر سے ٹیک لگا
کے کھڑی ہو گئی۔

”بہت غلط کیا تھا میں نے خالہ! سب کامان عمر
مٹی میں ملا دی میں نے۔ بہت پچھتاوا ہے میرے
میں خالہ! بہت۔ اپنی زندگی برباد ہوئی تو فلسفہ زندگی
میں آیا۔“

عافیہ کی جذباتیت بھری رندھی ہوئی آواز زینی کو
مٹھی میں کر رہی تھی۔
امی خاموشی سے سن رہی تھیں۔ جبکہ زینی کا جی
رہا تھا۔ وہ عافیہ کی طبیعت صاف کر دیں۔ اسے طے
دیں ڈیل کریں۔ کیسے شادی کے روز وہ دو گھرانوں کی
عزت داؤ پر لگا کے بھاگ گئی تھی۔ مگر وہ شاید بھائی
سامنے پا کر اس کی جذباتیت کا شکار ہو چکی تھیں۔
خاموشی سے اس کے آنسو پونچھتی اور صبر کرنے کی
تلقین کر رہی تھیں۔

زینی اب کب تک کچن میں چھپی رہتی حالات کا
سامنا تو کرنا ہی تھا۔
”یہ میرا گھر ہے عافیہ۔ یہاں ماکن میں
ہوں اور وہ فقط ایک مہمان۔ ان چاہی بن بلائی
مہمان۔“
وہ خود کو یاد دلاتی مضبوطی کا درس دیتی باہر نکلی۔
اس نے اسے دیکھتے ہی یاد دلایا۔
”مجھے تھکاوٹ محسوس ہو رہی ہے زینی! اور وہ ابھی
لپٹی ہے مجھے۔“

وہ ان کا مطلب سمجھ کر ان کا ہاتھ تھام کر انہیں
کمرے میں لے آئی۔ پانی کا گلاس بھر کے انہیں تھما
اور ان کی دوا نکال کے دی۔ دوا کھا کر وہ لیٹ گئیں۔
”تھوڑا آرام کروں گی میں۔“
زینی مضطرب سی پٹی۔
”تم پریشان ہو رہی ہو؟“ امی کی پرسکون آواز نے
زینی کو کھیر میں مبتلا کیا۔
”آپ نے اس سے پوچھا نہیں، وہ یہاں کیوں آئی
ہے؟“

”مہمانوں سے ایسے نہیں پوچھا کرتے۔ وہ تو آئے
ہی جانے کے لیے ہیں زینی۔“ انہوں نے اطمینان
سے کہا تو لمحہ بھر انہیں دیکھتے رہنے کے بعد وہ مسکرا
ہوئی۔

”تم جا کر اسے کھانے کا پوچھو۔ سفر سے آئی ہے۔
دعوت میں جاتے ہوئے اسے میرے کمرے میں
چھوڑ جانا۔“ امی کے کہنے پر وہ سر ہلا کر باہر چلی۔ جہاں
عافیہ اب قدرے پرسکون حالت میں ادھر ادھر مشل کر
اس شان دار گھر کا جائزہ لے رہی تھی۔
زینی کو دیکھ کر رشک و حسد کے ملے جلے انداز میں
بولی۔

”تم نے ہمیشہ ہی میری اترن پر عیش کیا ہے۔“
زینی کی رنگت زرد پڑ گئی۔
وہ کچھ دیر پہلے والی حالات کی ٹھوکروں کی زد میں آئی
عافیہ سے بالکل مختلف لگ رہی تھی۔
بالکل نالی اماں کے گھر والی عافیہ۔ نخوت زدہ انداز
اور کمینگی کی حد تک فقط ”مینا“ سوچنے والی۔
”میں گھر سے چلی گئی تھی اس دنیا سے تو نہیں کہ
تم نے جلدی سے عاقب کو چھوڑ میرے منگیتر سے
نکل پڑھو لیا۔“ وہ پھنکاری۔

زینی نے ہمیشہ سے عافیہ کے رعب میں اس سے
دب کر زندگی گزار لی تھی۔ اس کے پرانے کپڑے
جو تے پسنے والی اس کے سامنے بھلا کیا رہتی؟ ہاں دل
ہی دل میں اس کے خلاف محاذیہ کار جنگ لڑتی رہتی۔
مگر اب تو عافیہ حد ہی کر رہی تھی۔ اس نے ہمت مجتمع
کی۔

”مگر اب وہ تمہارا منگیتر نہیں ہے۔ مت بھولو کہ
اس وقت میں ہی تھی جو دونوں گھروں کی عزت بچا سکتی
تھی۔“

”ٹھٹ اپ۔“ وہ غرائی زینی کے عیش و آرام کی
ہلکی سی جھلک نے ہی اسے پاگل کر ڈالا تھا۔ ”کیا
ہو تمہارا دل واپس آجائی بنا دلہن کے، سوواٹ؟ میں
آج نہ سہمی کل واپس آئی تو بھی عمر میرا انتظار کرتا۔
اب اس وقت گزار چکے ہیں ہم اکٹھے۔“ وہ بے حیائی کی حد
پر تھی۔

زینی کے پردہ ذہن پر صاعقہ بھائی کی کئی باتیں تازہ
ہوئیں۔

”وہ سب ماضی کی باتیں تھیں عافیہ! عمر کا حال میں
ہوں۔ اور ماضی بھول جانے کے لیے ہی ہوا کرتا ہے۔
خاص طور پر سیاہ ماضی۔“ زینی نے خود کو مضبوط بنائے
رکھنے کی کوشش کرتے ہوئے لمحے میں سختی بھری۔
”کیا اس بند کو۔ آنے دو عمر کو۔ پھر دیکھنا کون حال
ہے۔ اور کون ماضی کا قصہ بنتا ہے۔ ایسے ایسے قصے
بتاؤں گی تمہارے اور عاقب کے کہ۔“

وہ شیطانت بھرے انداز سے مسکرا کر جملہ ادھورا
چھوڑ گئی مگر زینی کے وجود میں خوف آمیز سنسناء ڈھوڑ
گئی۔ وہ عافیہ کا مطلب اچھی طرح سے سمجھ گئی تھی۔
”میرا عاقب سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ اس سے
میرے نکاح کی خواہش نالی اماں کی تھی۔“
زینی کو رونا آیا۔ عافیہ کچھ بھی کر سکتی تھی۔ عافیہ
مخروطہ انداز میں مسکرائی۔
”یہ تو میں جانتی ہوں نا عمر تو وہی سنے گا جو میں کہوں
گی۔“

”خدا کے لیے عافیہ! اپنی زندگی تو بسا چکی ہو میرا گھر
کیوں تباہ کرنے آگئی ہو۔ جو پہلے ہی بڑی مشکلوں سے
بسا ہے۔“

زینی کے آنسو رواں ہو گئے وہ بے بسی کی انتہا پر
تھی۔

تین ماہ پہلے ماں باپ کی عزت داؤ پر لگا کر جانے والی
بھلا اس کی عزت سے چھلنے کا ہے کو پچھلنے لگی؟
”یہ میرا گھر ہے زینی۔ تم صرف ایک غائب ہو اور
بس۔ یہ سب وہ ہے جس کے لیے میں فیصل کی طرف
دوڑی تھی۔“ سرشاری سے کہتے وہ ہاتھ دائیں بائیں
پھیلا کر گھومی۔

”مگر وہ ذلیل کو کھلا نکلا۔ مجھے کیا پتا تھا یہ سب مجھے عمر
کی قسمت سے ملنے والا ہے۔“ وہ متاسف ہوئی۔ پھر
اطمینان سے بولی۔ ”خیر۔ ابھی بھی کون سا کچھ بگڑا
ہے۔“

”چلی جاؤ یہاں سے عافیہ۔ میں تمہیں اپنی زندگی
تباہ کرنے کی اجازت نہیں دوں گی۔“ وہ سرسراہٹ آواز
میں بولی۔ عافیہ کے ہونٹوں پر طنزیہ مسکراہٹ پھیل

گئی۔

”ہو نہ۔ تمہیں تو عادی ہو جانا چاہیے تھا اب تک۔ جانتی نہیں ہو میری عادت کو۔ ہمیشہ میری اترن پہنی ہے تم نے۔ مگر جب وہ چیز تم پر چڑی تو میں نے واپس لینے میں ایک منٹ نہیں لگایا۔ اب عمر کو کیسے چھوڑ دوں تمہارے ساتھ۔“

اس کے سفاکانہ انداز پر زینی کی ٹانگیں کانپنے لگیں۔

اسی وقت عمر اندر آگیا۔ وہ اپنے دھیان میں پیشہ کی طرح سلام کرتا آیا تھا۔ زینی نے بے ساختہ عافیہ کو دیکھا جس کے اثرات یکسر بدل گئے تھے۔

”عمر۔“ بے حد جذباتی انداز میں اسے پکارتی وہ آگے بڑھی اور عمر کا ہاتھ تھام لیا۔ ”کیسے ہو تم۔؟“

عمر سادہ سا عافیہ کو دیکھ رہا تھا۔ زینی کا دل کسی نے غمی میں جکڑ لیا۔

سامعہ نے کہا تھا عمر کے دل پر عافیہ کا سایہ ہے۔ تو کیا وہ پھر سے کوئی متر پھونکنے والی تھی؟

”مجھے معاف کرو عمر! دیکھو تمہاری محبت کتنی طاقت ور ہے ایک دن بھی سکون سے نہیں گزار پائی میں تمہارے بغیر۔ بس کسی کے برکادے میں آئی تھی۔ تم سے دور تھی نا اسی لیے۔ کسی نے میرے معصوم جذبات کا رخ اپنی طرف موڑ لیا۔ مگر اس دل سے تمہاری تصویر اتر ہی نہیں پائی۔ ٹھہرا آئی ہوں میں فیصل کی نام نہاد محبت کو۔ تمہاری محبت جیت گئی عمر!“

وہ جرب زبان بھی تھی اور اداکارہ بھی۔ آنکھوں میں آنسو پھرے بڑے دردیے انداز میں

تین ماہ کی ”داستان حیات“ سنارہی تھی۔ عمر نے آہستگی سے اپنا ہاتھ چمڑیا اور نرمی سے بولا۔

”میں زینی سے شادی کر چکا ہوں۔“

”تو کیا ہوا۔ مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ میں بھی تو فیصل کو چھوڑ کے تمہارے پاس آئی ہوں۔ تم بھی اسے چھوڑ دو۔“

یہ زینی کا گھر تھا، اور وہ اس وقت وہاں فقیروں کی طرح کھڑی تھی۔

”اور زینی کا کیا ہو گا؟“ عمر کا سوال سن کر زینی کاچ آنسوؤں سے پھیلنے لگا۔

اب وہ بھلا کسی اور سے محبت کر پائے گی۔ زینی کی معصوم بے ساختہ محبت کو برتنے کے بعد بھی وہ غائب سے یہ سوال کر رہا تھا۔

زینی کھڑے کھڑے مرنے لگی۔ عافیہ نقاخرے مسکرائی۔

”اس کی تم فکر مت کرو۔ وہ میرا مسئلہ ہے۔ عافیہ میری بات بھی نہیں ٹالے گا۔ اور رہی زینی۔ تو اسے سدا سے میری اترن کی عادت رہی ہے۔ حتیٰ کہ شادی بھی میرے چھوڑے ہوئے منگیترے کر لی۔“

عافیہ کو عمر بے وقوفی کی حد تک سدا سا ہوا لگا کر تھا۔ تب ہی اسے یہ زعم تھا کہ عمر اس کی غلطی کو معاف کر کے اسے اپنانے میں دیر نہیں کرے گا۔

”لیکن میرے ساتھ ایک مسئلہ ہے عافیہ!“ وہ متحیر سا بولا۔

”وہ کیا۔؟“ عافیہ طمانیت سے مسکرائی تو عمر اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے اتنی دیر میں پہلی بار مسکرایا۔

زینی نے اذیت محسوس کرتے ہوئے آنکھیں موند لیں۔

”وہ یہ کس۔ مجھے کسی کی اترن کی عادت نہیں ہے۔“

عافیہ کو لگا اس کے آس پاس زور دار دھماکا ہوا ہو۔ عمر کے ایک ہی جھلنے نے اس کی ذات کے پر نچنے اڑا دیے تھے۔

”مانا کہ تم اپنی استعمال شدہ چیزیں زینی کو دیتی رہی ہو۔ مگر تم نے مجھی یہ سوچا کہ وہی چیزیں زینی سے واپس لے کر تم بھی اس کی اترن پہنتی رہی ہو؟“

وہ تحقیر آمیز انداز میں اسے اس کی اوقات دکھا رہا تھا۔

زینی کے آنسو تھم سے گئے۔ عافیہ بے یقینی سے

کو دیکھ رہی تھی۔

”مجھے سوچ بھی کیسے لیا کہ میں تمہاری بد کرداری کو بھول کر تمہاری چند دنوں کی محبت کو یاد رکھوں گا؟“

عمر کے انداز میں اس کے لیے تحارت تھی۔ اس نے آگے بڑھ کے زینی کے شانے پر بازو پھیلاتے ہوئے اسے خود سے قریب کیا تو وہ بے اختیار اس کے شانے سے لگ کے رو دی۔

”یہ وہ لڑکی ہے جس نے تمہاری اڑائی ہوئی بے غیرتی کی دھول کو اپنی فرماں برداری کے پانی سے دھو ڈالا۔ چاہے اسے عاقب سے محبت تھی یا اس کا نکاح اس کے ساتھ طے تھا۔ میں صرف اتنا جانتا ہوں کہ اس نے اس وقت میری عزت کو سنبھالا دیا جب تم نے نہ میری عزت کاپاس رکھا اور نہ اپنے شریف ماں باپ کی۔“

وہ جیسے مگر شعلہ پار لہجے میں پھنکارا تو عافیہ کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔

”اس لیے تو فیصل کو چھوڑنے کا فیصلہ کر لیا ہے میں نے۔ مجھے اپنی غلطی کا احساس ہو گیا ہے عمر!“

”غلطی کا احساس ہو گیا ہے تو جاگے اپنے والدین سے معافی مانگو۔ میری زندگی کی تصویر مکمل ہو چکی ہے۔ یہ سب شان و شوکت زینی کے نصیب سے ہے۔“ وہ بے رحمی سے بولا۔

کافی دیر خاموشی چھائی رہی تو اس کے شانے میں منہ دیے کھڑی زینی نے سر اٹھا کے دیکھا لاؤنج خالی تھا۔ عافیہ کا سر کیس بھی عتاب تھا۔ وہ وہاں سے ناکام و ناسرا جا چکی تھی۔

بے اختیار عمر کو دیکھا تو وہ مسکرا رہا تھا۔ وہ جینپن کر پیچھے ہٹی۔ دینی روٹی آنکھوں کے ساتھ وہ بہت حسین لگ رہی تھی۔

”وہ چلی گئی؟“ بے یقینی سے پوچھا۔ گری سانس بھرتے عمر نے اسے دونوں بازوؤں سے تھام کر اپنے سائے کیا۔ اور مسکرا کر بولا۔

”مے جانا ہی تھا۔ تم نے بالکل ٹھیک کہا تھا۔ جس کا حال“ انا شان دار ہو وہ تاریک ماضی کو یاد رکھ کے

کیا کرے گا۔“ وہ بھولین سے بولا۔ زینی سٹپائی۔

”اور وہ کیا کہہ رہی تھیں تم امی سے۔ کہ اگر اللہ نے دل کی طرح مجھے نظر بھی صاف دی ہوتی تو پتا چلتا کہ عافیہ سے زیادہ حسین بیوی ملی ہے مجھے ذرا پاس آؤ۔ دیکھوں تو سہی۔“

وہ مزید بولتے ہوئے قریب ہوا تو زینی کا بے اختیار تقہر ہواؤں میں بکھر گیا۔ وہ کئی موقعوں پر اس کی گتھگو سن چکا تھا۔ وہ مطمئن تھی۔ اسے پتا چل گیا تھا کہ عمر کے دل کے تمام موسموں پر اب اسی کی حکمرانی ہے۔

اور ادھر بیٹے میں شرابور رکشے کے انتظار میں کھڑی عافیہ اپنی زندگی کی بازی دو سری بار بار کے روٹی ہوئی واپس جاری تھی۔

اسی زندگی کی طرف جس کے راستے اس نے خود تلاشے تھے۔ کہ خدا ابھی بھلے ہوؤں کو تب تک راستہ نہیں دکھاتا۔ جب تک کہ خود ان کے دل میں صحیح منزل تک پہنچنے کی لگن نہ جاگے۔



ادارہ خواتین ڈائجسٹ کی طرف سے بہنوں کے لیے خوبصورت ناول

ایک مہینہ کی قسط

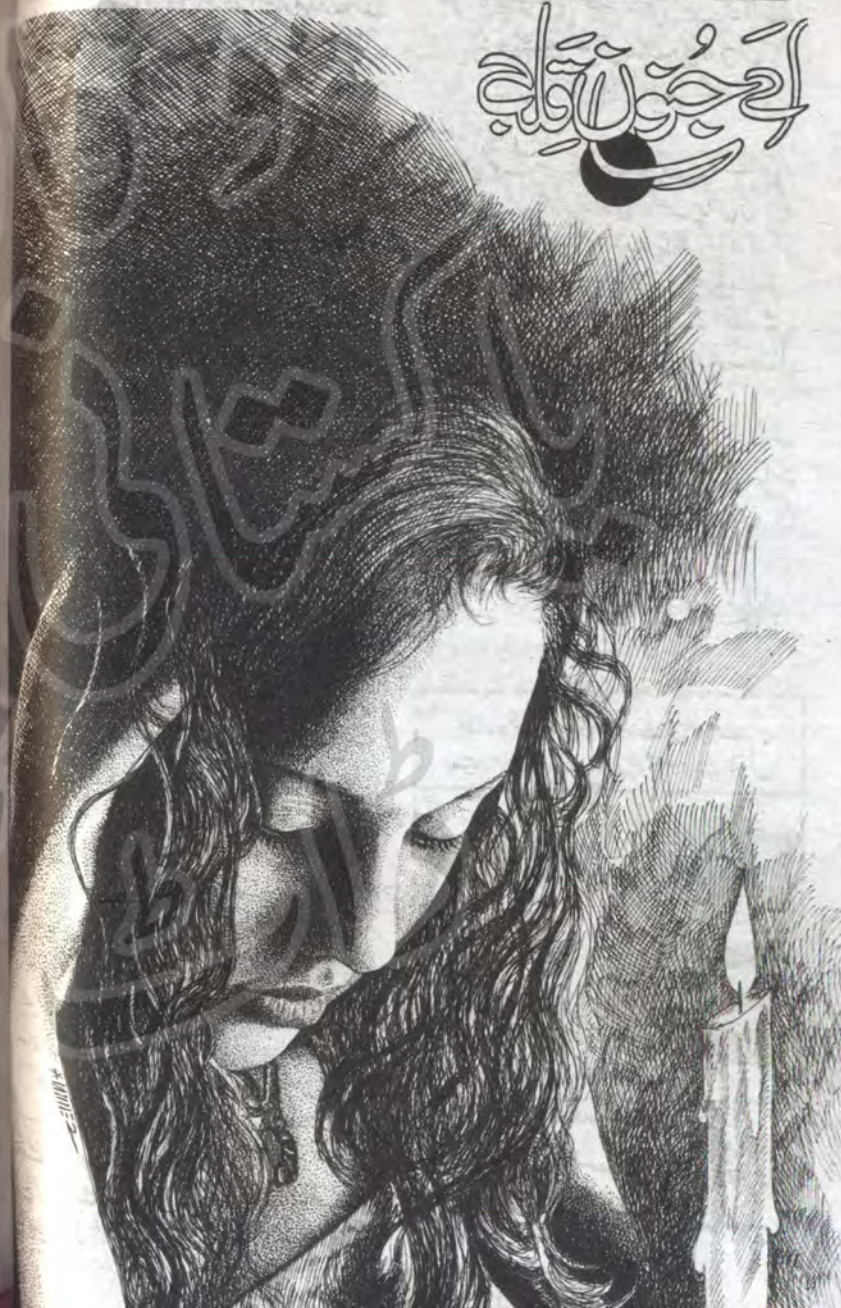
قیمت - 300 روپے

منگوانے کا پتہ:

مکتبہ عمران ڈائجسٹ

فون نمبر: 32735021

37، اردو بازار، کراچی



آج پھر اس کی گاڑی بڑے سے سیاہ آہنی گیٹ کے بار کی۔ چونک کر اپنے کاندھات دکھا کر وہ اندر جانے کی اجازت طلب کرنے لگی اور اجازت ملتے ہی بجٹ کی طرح تیزی سے آگے بڑھی۔ سامنے چوڑی سی لمبی سڑک تھی جو سوخ اینٹوں سے بنے کھلے سے برآمدے تک پہنچ کر ختم ہو رہی تھی۔ برآمدے میں لوگوں کا معمولی سا جھوم تھا۔ وہ بھی جھوم کا حصہ بن گئی اور تمام کارروائی پوری کرتے ہوئے اپنی مطلوبہ بیرک تک پہنچ گئی۔

وہ دونوں ایک چھوٹے سے کمرے میں ایک دوسرے کے روبرو کھڑی کی سخت کرسیوں پر بیٹھی تھیں۔ وہ آج پھر اپنی پرانی آفرے کر آئی تھی۔ مدیحہ بہت عرصے سے اسے ایک ہی بات کے لیے قائل کر رہی تھی۔

”رضیہ ایلیز مان جاؤ۔ آخر تم سمجھنے کی کوشش کیوں نہیں کرتیں۔ اس معصوم کو دیکھو، اس کا کیا قصور ہے؟ اس کے حصے میں کھلی فضا کیوں نہیں ہے۔۔۔ اس کا بھی تو آزاد آسمان پر حق ہے۔ پلیز رضیہ! امیر اقلین کرو میں اسے تعلیم دواؤں گی جیسا سکھاؤں گی۔ خدا کے لیے اس کے مستقبل سے مت کھیلو۔ اسے دوسری رضیہ مت بناؤ۔“

اس کی مسلسل درخواست پر رضیہ کی نگاہیں اس کے چہرے سے نہیں اور معصوم بچی پر جا ٹھہریں۔ ڈیڑھ دو سال کی وہ معصوم سی بچی اس کی گود میں لیٹی اپنے ہاتھوں سے کھیل رہی تھی۔ وہ بھی رضیہ کے بچل میں منہ چھپا لیتی تو بھی اس کے دوپٹے میں پھر فوراً ”چہرہ سامنے کر کے نور سے ہستی۔ غالباً“ وہ رضیہ کی توجہ جانے کے لیے ہنس رہی تھی مگر کم صبر یعنی رضیہ مسلسل اپنی گود میں بڑی بچی کو تنے جا رہی تھی۔

رضیہ نے بچی کے ہاتھ سے اپنا دوپٹا آہستہ سے چھڑوا کر اس کی ہتھیلیاں پھیلائیں اور پھر اپنی ہتھیلی اس کے ساتھ جوڑ کر جانے کیا تلاش کرنے لگی۔ وہ اس بات سے بالکل انجان بنی تھی کہ مقابل اسے کیا سمجھا رہا ہے رضیہ نے بچی سے نگاہیں ہٹا کر ذرا اسے

دیکھا۔ کیوں کہ وہ اب خاموش ہو گئی تھی اور یقیناً ملاقات کا وقت بھی ختم ہونے والا تھا۔ رضیہ اس کی نگاہوں میں دیکھتے ہوئے جانے کہاں پہنچ گئی۔

”رجی سنی رچی۔“

لکڑی کی ٹولی بھونپی برائے نام کھڑکی پر مسلسل دستک کے ساتھ مدھم سرگوشی ہو رہی تھی۔ یہ کھڑکی گھر کے پچھواڑے تنگ سی گلی میں کھلتی تھی۔

میتو کو پورا یقین تھا کہ رچی کھڑکی کے قریب ہی کہیں ہوگی۔ اسی لیے وہ ہلکی سی آواز کے ساتھ معمولی دستک دے رہا تھا۔ اس کا اندازہ بالکل درست تھا۔ وہ کھڑکی کے ساتھ چارپائی جوڑے دنیا و مافیہا سے بے خبر پڑی سو رہی تھی مگر جیسے ہی دوسری سرگوشی کان کے پردے سے لگرائی وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی۔ دوسرے ہی لمحے وہ اپنے سوکھی کھاس جیسے بھورے بال ہاتھوں سے جساتے ہوئے کھڑکی کے قریب آگئی۔

اس نے کھڑکی کی جڑ چر اٹھ روکنے کے لیے احتیاط سے ہاتھ جما کر کھڑکی کھولی۔ لوہے کی سلاخوں کے سامنے میتو سائیکل جوڑے کھڑا تھا۔ دونوں کی نگاہیں ملتے ہی نہ صرف چوہوں پر مسکراہٹ آگئی بلکہ آنکھوں میں خواب مچلے اور ہونٹوں پر گلاب بھی جلنے لگے تھے۔

”رک۔“ وہ ہاتھ سے اسے رکنے کا اشارہ کرتی کمرے سے باہر نکل آئی۔ کھلے کچے مچن میں جامن کی ٹھنڈی چھاؤں تلے اس کا باپ منہ پر صاف رکھے سو رہا تھا۔ ایک کونے میں اس کی ماں چولے سے سر کھپا رہی تھی۔

رجی نے پچل اتار کر ہاتھ میں لی اور دبے پاؤں چلتے بیرونی دروازے کی طرف پہنچ گئی۔ بغیر آواز پیدا کیے کھڑکی کھولی اور باہر گلی میں نکل آئی۔

پچھلے سے دروازہ بند کرنے پر آہٹ پیدا ہوئی جس پر اس کی ماں چوکی۔

”رجی سنی رچی سنی کٹھے مٹی ایسے۔“

وہ اسے آوازیں کستی دروازے تک آئی۔ باہر گلی کے دونوں جانب بھانکا مکروہاں نہ رہی تھی نہ اس کا نام نشان۔ وہ باہر بھاگتے ہوئے اسے مسلسل کوٹنے لگائیں دیتی رہی تھی مگر رچی کی جانے بلا۔ وہ تو اپنے میتوسے ملنے لگی تھی۔ جو صرف اس کا تھلا صرف اور صرف اس کا۔ اور دنیا کی کوئی طاقت انہیں ملنے سے نہیں روک سکتی تھی۔ نہ اس کا غصیل باپ نہ ڈپٹی مال۔

میتوں رچی کا پھوپھی زاد اور بچپن کا منگتیر تھا۔ ان کے گھر زیادہ دور نہیں تھے۔ صرف چند گلیوں کا فاصلہ تھا اسی لیے ہر وقت آتا جاتا لگا رہتا تھا۔ یہ علاقہ حاصل پور کا نواحی تھا اور کافی پسماندہ علاقہ تھا۔ اکثریت غریب غریبا کی تھی۔ کھلے کھلے صحنوں میں دو تین درخت اور ایک دو کمرے ہی بنے ہوتے تھے۔ وہ دونوں ان صحنوں میں پل کر جوان ہوئے تھے۔

درختوں پر چڑھنا، گلی ڈنڈا، اشاپو پھو گرم، ٹائز دوڑانا، لڑکے لڑکی کا بغیر فرق کیے ہمیشہ ساتھ کھیلنے تھے۔ میتو نے سائیکل چلائی سیکھی تو نہ صرف رضیہ کو سکھائی بلکہ اسے بٹھا کر پورا علاقہ بھی گھمایا۔ اور پھر یہ ان کا معمول بن گیا۔ وہ چھ لٹائی دوپہر میں چوری سے باپ کی سائیکل نکالتا، رچی کو ساتھ لیتا اور حاصل پور کے نواح میں بنے قلعوں کی سیر کو نکل کھڑا ہوتا۔

سنائے میں بنے یہ چوڑی سرخ اینٹوں کے قلعے ان کی اونچی اونچی فصیحین سفید سنگ مرمر کے محلات اور بارہ جن میں چھوٹے بڑے کئی فوارے نصب تھے۔ فواروں میں اچھلتا سفید ٹھنڈا پانی ویرانے میں اسے نہر کھینچتا، ان دونوں کو بہت متاثر کرتا تھا۔ وہ کئی کئی گھنٹے اس فوارے کے گرد ہی سنگ مرمر کی دیوار پر بیٹھے گزارتے۔ اب بھی وہ اس دیوار پر بیٹھے دونوں پانچ چھائے تالاب کے ٹھنڈے پانی میں پاؤں ہلاتے تھے۔

”میتو! پاؤں ہلاتے ہوئے رچی دھیرے سے بولی۔
”ہوں۔“ میتو نے سرسری سا کہا۔
”میتو! مجھے بہت خوف آتا ہے۔“

میتو کے ہلنے پاؤں رک گئے۔ ”کیوں؟“
”مگر وہ سب نہ ہوا جو تیری میری چاہ ہے تو میرے میں تو مچاؤں گی خستہ!“ وہ آنسو بھر کر بولی۔
”میں تیرے دشمن۔“ وہ جملہ پورا ہونے سے پہلے ہی بولا۔
”تو میری منگتیر ہے۔ بچپن کی کئی کئی گھنٹے مجھ سے کوئی جدا نہیں کر سکا۔ کوئی بھی نہیں کبھی بھی نہیں۔“
وہ نفی میں سر ہلاتا اس کا ہاتھ پکڑ کر پیچھے کی طرف کودا۔

”میتو! میں تیرے ساتھ کسی اور کو نہیں دیکھ سکتی۔ میری سارہ رک جائے گی۔“ وہ اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بے بسی سے بولی تھی۔

”رچی! یوں نہ کہا کہ محبت کو محبت ہی رہنے دے۔“
”پاگل پن نہ بنا۔“ وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر سائیکل کی طرف بڑھتے ہوئے رساں سے بولا۔ غالباً اسے گھر جانے کی فکر ہوئی تھی کیوں کہ فوارے کے ٹھنڈے پانی میں لہراتے اونچے پام کے درختوں کے بیچ چمکتے سونج کا عکس جھللاتے ہوئے گم ہونے لگا تھا۔

یقیناً ”گالیاں اگلتا اس کا ابا تار بیٹھا ہو گا اور جاتے ہی جوتیوں سے نوازے گا کہ سائیکل کمال لے گیا تھا۔ اگر چوری یا پکچر ہو جاتی تو۔ میتو یاد تھا کہ کھار بٹیراں پاس سر نیو ڈاکر بیٹھ جاتا۔ وہاں تھی۔ اسے پکارتے گی، روٹی دے گی اور تنبیہ بھی کرے گی۔ ”سارا سارا میاؤ اس نے لٹی پھرا کر جھلیا!“ مگر اس پر کسی تنبیہ کا کوئی اثر نہیں ہوتا۔

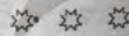
رچی کی طرف بھی یہی صورت حال تھی۔ اس کی گھاس جیسی چٹا کو نڈیاں اتنے جھٹکے دیتی گویا آج بڑے ٹکڑے دے گی۔ کمر پر دھمو کے برساتی مگر چھ دن بعد سب بے کار جاتا۔ وہ پھر اس کے ساتھ نکل کھڑی ہوتی۔

آج بھی وہ بلخ کی سیر کر کے مغرب کے بعد گھر پہنچے تھے۔ معمول کی طرح آج انہوں نے نہ مار کھائی نہ ڈانٹ نہ پھٹکار۔ بلکہ آج کچھ الگ ہو گیا تھا۔ تاروں کے جھرمٹ پر راج وصال تھا اور چاند ان کی خوش

رقصاں تھا۔ رات کے بڑے سے چھپ کر آتی چاندنی مدھم مدھم سرکوشیاں کرنے لگی۔ آج اس کی پھوپھی باندھی گئی کرنے آئی ہوئی تھی۔
رچی کا دل چاہا کہ گائے لٹائیاں ڈالے اور وہ ڈال بھی لیتی کیوں کہ وہ ایسی ہی تھی۔ اگر اسے ماں اور باپ کی مار کا ڈر نہ ہوتا یقیناً ”اسے کل کائنات مل گئی تھی۔ اسے وہ سب مل گیا تھا جس کی اس نے چاہ کی تھی جس کے بغیر نہ وہ جی سکتی تھی نہ مر سکتی تھی۔ اس کی ہر دعا اس سے شروع ہو کر اسی پر ختم ہوتی تھی۔

زندگی خوبصورت ڈگر پر رواں تھی۔ میتو اپنے باپ کے ساتھ اینٹوں کے بچھے پر کام پر جانے لگا تھا اور بھی کبھی فصل کی کٹائی پر بھی چلا جاتا۔ وہ سال بھر کا تاج جمع کر لیتا تھا۔ رات کو دونوں باپ بیٹا گھر آ جاتے۔ چاند کی شہری کرنوں سے غسل کرتے مٹی کے صحن میں چارپائیاں بچھائے پورا خاندان اکٹھے سوتا تھا۔ پھر سونج کی شعل چھوٹنے ہی معمول کی زندگی آگے بڑھنے لگتی تھی۔

دن رات آگے پیچھے بھاگتے چار سال ہو گئے تھے مگر ان کے کچے آنگن میں کوئی قلعاری نہیں کوٹھی تھی۔ بٹیراں نے رچی کا دائیوں سے بہت علاج کروایا۔ مٹی میں چڑھائیں مگر سب بے کار ہوتا نظر آتا تو بٹیراں کا قلق شدت اختیار کرنے لگتا۔ وہ اپنی خواہش کی کچھ رمت میتو میں بھی پیدا کر چکی تھی مگر وہ رچی سے بے پناہ محبت کرتا تھا اور اس امر میں اسے قصور وار نہیں کرنا۔ لگا لگا رہتا تھا۔ اسی لیے جہاں ماں کی خواہش کو ٹال جاتا وہاں رچی کو پھر سے امید دلا سے دیتا تھا۔



وہ ایک بازو آنکھوں پر رکھے چارپائی پر سیدھا لیٹا رہی سے ہلکی ہلکی باتوں میں مصروف تھا۔ آج کل برسات کی وجہ سے بچے بندھے اسی لیے وہ گھر پر تھا۔ رچی بھی اسی چارپائی پر اس سے پشت کٹائے چٹایا باندھ

رہی تھی۔ وہ اس کی باتوں پہ صرف ہوں ہاں سے شامل تھی۔ اس کی تمام توجہ سامنے چلتی کوئل پر تھی۔ جو ڈال ڈال کو کئی موسموں کے بدلنے کا پتہ دیتی تھی۔ رت بدلتی تو کوئلیں نئے گھونسلے بنانے لگتیں، انہیں سنوارتیں ان کی حفاظت کرتیں کیوں کہ اس میں ان کے انڈے پائے ہوتے۔

رچی اپنی چٹیا کوئل دیتی مسلسل کوئل کو تک رہی تھی۔ جو انار کے درخت سے پھول نوج نوج کر اپنے گھونسلے میں لے جا رہی تھی۔ انار کے درخت کے قریب ہی اوزار رکھنے کا مٹی سے بنا ہارا تھا۔ کبھی کوئل اڑ کر اس پر بیٹھتی اور جو بچہ کر اپنے گھونسلے میں لے جاتی۔ یقیناً ”وہ اپنے بچوں کے لیے خوراک کا بندوبست کر رہی تھی۔ کوئل کی متادیکھ کر رچی کی آنکھوں میں ایک سرخ مٹی سی ابھری۔

دروازہ کھلنے کی آہٹ پر اس کی نظر گھونسلے سے پھسل کر پوٹی دروازے پر پھر گئی۔ جہاں بٹیراں کے پہلو میں حلیمہ لہرائی ہوئی اندر آ رہی تھی۔ وہ ایک ہاتھ میں اپنے دوپٹے کا پلو گول گول گھماتے ہوئے خوش گپوں میں مصروف آگے بڑھ رہی تھی۔

اسے دیکھتے ہی رچی نے دانت ایسے پیسے جسے منہ کڑوے بادام سے بھر گیا۔ وہ ایسا کیوں نہ محسوس ہوتا۔ اس نے رات کو دل کی گمراہیوں سے کچھ اور دعا مانگی تھی۔ رات جب پورا چاند شہری چاندنی کے ہالے میں تھا۔ جب ٹھنڈی چاندنی میں گھبتی مست پروا جس میں انار کے پھولوں کی خوشبو رچی تھی۔ جب رات کی رائی اور چٹیلی سے خوشبو چرا ناخرا نکلیں زوا کا جھونکا ان کے بدنوں میں سنسان بٹ بٹ رہا تھا۔ جب ان کا خو پر اختیار نہ رہا تھا تو رات کے اس پچھلے پھر میں اپنے کمرے کی طرف بڑھتے رچی نے رب سے دعا مانگی تھی۔

”اے سوئے رب! میری گود بھی بھردے۔“
اور دن چڑھے تعبیر حلیمہ کی صورت نظر آئی تو اس کا دعاؤں پر سے یقین ڈگ لگانے لگا کہ خوبصورت پھر کی دعائیں قبول نہیں ہوتیں۔ کم از کم اس وقت حلیمہ کو

دیکھ کر تو ایسے ہی لگا تھا۔

رہی نے نفرت سے ناک منہ ٹیڑھا کیا۔

وہ دونوں جیسے ہی انار کے پڑ کے نیچے سے گزریں تو کوئل وکیل کراؤ لگی۔ ان کے آگے بڑھتے ہی کوئل اپنی شاخ پر واپس آگئی تھی۔ مگر اب وہاں ایک اور پیچھی بھی آجھٹا تھا۔ دونوں پرندوں کی چوچیں کچھ دیر لڑیں پھر شاخوں کے پتے ہلنے سے دونوں ہی سہم کراؤ گئے اور کھونسلمہ شاخ پر تھما چھوٹا رہ گیا۔

حلیمہ، میتو کی نایا زاد تھی۔ جب سے اس کے والدین فوت ہوئے تھے، اس کی اپنے بھائی بھابھوں سے خوب کھڑی رہتی۔ کچھ اس کی بھابھیں تیز طرار تھیں۔ کچھ حلیمہ ان سے دو ہاتھ آگے تھیں۔ جب بات بحث ٹکراتی رہے بڑھ کر ہاتھ پائی تک آجاتی تو بشیراں کو بلایا جاتا۔ وہ جا کر صبح کروائی اور چند دن کے لیے حلیمہ کو اپنے ساتھ لے آتی اور ایسا اکثر تہ ہوتا تھا جن دنوں بیٹھے بند ہوتے یا پھر میتو کسی وجہ سے گھر پر ہوتا۔ آج کل بھی بیٹھے پرست کی وجہ سے بند تھے اور میتو گھر پر تھا۔ بشیراں صبح صبح صلح کے بہانے گئی اور حلیمہ کو ساتھ لے آئی۔

وہ دونوں ان کے قریب پہنچنے کو تھیں۔ جب رچی نے ناگوار ”ہونہ۔“ کے ساتھ گرہ لگا کر پراندہ اپنی کمر پر بٹھا اور اندر جانے کے لیے کھڑی ہوئی۔

”بیٹھی رہ گندھہ جارہی ہے؟“ اس کے اٹھنے سے چارپائی کا وزن کچھ ہلکا ہوا تو میتو نے آنکھوں پر سے ہاتھ اٹھا کر رچی کی کلائی پکڑی اور فوراً ”چھوڑ دے۔“ اس کی نظموں اور حلیمہ پر پڑ گئی تھی۔

حلیمہ سلام کرتے ہوئے میتو کے سامنے تکی تک گئی اور بشیراں موڑھا تھپتھپ کر ان کے مقابل بیٹھ گئی۔ رچی کمرے کی طرف مڑی ہی تھی کہ بشیراں زور سے بولی۔

”نہ رچی۔ اندر کدے جلنی آئے جا کے چاء چاؤہ دیکھتی نہیں، پروہی آئی آئے۔“
”زہرنہ چاؤہ وال۔“ رچی منہ میں بڑبڑاتی ہی تھی کہ حلیمہ فوراً ”اٹھ کھڑی ہوئی۔“

”نہ چاہی نہ! میں کوئی پروہی نہیں“ اسے میڈل چاہے واگھراے، ما آپے چاء چاؤہ لال کی۔“

وہ جتاہے ہوئے چوہے کی جانب ہو گئی۔ جہاں اس کی فرماں برداری پر بشیراں اس کی بلاتیں لے رہی تھی، وہاں رچی حیرت سے منہ کھولے بھی حلیمہ کی اوامیں دیکھتی بھی بشیراں کامنہ۔ وہ تعلقاتی ہوئی لڑکرے میں چلی گئی۔

اس کے لیے حلیمہ کا وجود قابل برداشت نہ تھا۔ جب بھی وہ آتی تھی، بشیراں کی زبان اس کی تعریفوں کے بل باندھتی رہتی اور وہ میتو کے گرد منڈلاتی رہتی۔ ”میتو! اینہ کھلے، یہ پی لے، یہ میں نے بنایا۔“ رچی کو میتو پر برا تعین تھا۔ وہ جتنی محبت میتو سے کرتی ہے وہ بھی اس کے بغیر نہیں رہ سکتا تھا۔

وہ واقعی ہر ممکن کوشش کرتا کہ رچی کا دل نہ ٹوٹے۔ غصے میں جب بھی بشیراں رچی کو ”خبر بے خبر“ ٹھیکر کرتی تو وہ غصے سے ”ماں بس کر“ کہہ دیتا۔ وہ ہمیشہ رب کی رضا کہہ کر ماں کو ٹالتا آتا تھا مگر تک۔ اس کا پاپ اگلی نسل کی خواہش لے مٹی میں مٹی بن گیا تھا۔ اب بشیراں اس کے آگے نہیں کرتی

ایسے رب کے واسطے دینی پھر خاص طور پر بے آسرا یتیم حلیمہ کا حوالہ دیتی، اٹھوس پڑوس کے کتنے ہی مرنے گواہی جن کے دوسری شادی کرنے پر ہی اولاد ہوئی تھی اور جو دونوں بیویوں بچوں کے ساتھ ہنسی خوشی زندگی بسر کر رہے تھے۔ اب بھی وہ اسے کتنے دن سے قائل کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔

”میتو! میں کون سا رچی کو چھین دی گل کرنی آتا۔ تیری ماں ہوں۔ میڈی چاہ دی تھیں فرض آئے۔“ حلیمہ خوبصورت ہے۔ تیرے سگے چاچے کی دمی آئے۔

میتو کبھی ماں کی دلیلوں میں پھنس جاتا تو کبھی رچی کے زاویوں پر جو بشیراں کی فرمائش پر ہر دم بکڑے رہنے اور جب چلتی پھرتی حلیمہ نظر آتی تو وہ مزید الجھ کر جاتا۔

”لک چھپ کاہا، مکتی دادانہ، راجادی بیٹی آئی آئے۔“

آج اب آج۔“
کے صحن میں خاصی ہڑوگ مچی تھی۔ حلیمہ کے بیٹھا جتنی آٹھ چھلی کھیل رہے تھے۔ میتو چوکی پر بیٹھا تھا۔ ٹھنڈوں پر اوپر بازو رکھے، بازوؤں پر تھوڑی ڈکائے مسلسل بچوں کو دوڑتے بھاگتے حسرت سے دیکھ رہا تھا۔ بشیراں اپنا دل بہلانے یا پھر میتو کی دینی خواہش کو ابھارنے کے لیے اکثر حلیمہ کے بیٹھا، بیٹھی کو لے آتی تھی یا پھر کھلے کے چھوٹے بچوں کو بلاتی تھی۔ بچے تو کچھ دیر کھیل کود کر چلے جاتے تھے مگر ان کا آنا شور مچانا میتو کو قیقلے تک لے جانے میں خاصا مددگار ثابت ہوتا تھا۔

اس نے اپنی چوکی تھپتھپ کر رچی کے قریب کی۔ وہ چولے میں آگ جلانے کی کوشش کر رہی تھی۔ ”رچی! وہ بچوں کو محویت سے دیکھتے ہوئے کھوئے کھوئے سے لہجہ میں بولا۔

”ہول۔“ اس نے پتی پتی لکڑیوں پر کچھ کانڈر رکھ کر تلی پختی۔

”رچی! ایک بات کرنی ہے تیرے سے۔“
”تو کرنا۔“ وہ لاروائی سے بولی اور ایک طرف رکھی دھونکی اٹھائی۔ ”جھے بچے اچھے نہیں لگتے؟“

”لگتے ہیں۔“ وہ رک کر بولی۔

”بشیراں! نہیں کرتا ہمارے ویڑے (صحن) میں شور ہو۔“

وہ اس کی بات سن کر انہی کر کے لکڑیوں کو دھونکی سے جھج کر لے آئی۔ دھواں اس کی آنکھوں میں گھسا جا رہا تھا۔

”بول ناری!“
”مطلب کیا ہے تیرا؟“ اس کی بھونکیں سکڑ گئیں۔
”تو تو بے ناری! وہ تو ہی رہے گی۔ تیری جگہ کوئی نہیں لے سکتا۔“ وہ گردن اس کی طرف موڑے آہستہ آہستہ بول رہا تھا۔ وہ بشیراں کے منہ سے اکثر دوسری شادی کی باتیں سن چکی تھیں اور کچھ کچھ میتو کی

بدلتی سوچ کو بھی سمجھ رہی تھی۔ مگر وہ اتنی جلدی دوسری شادی کے لیے راضی ہو جائے گا، یہ اندازہ نہیں تھا۔ اسی لیے پھونکنی زور سے پختے ہوئے غصے سے کہا۔

”تو کہنا کیا چاہتا ہے۔“ وہ دھونکیں سے بھری آنکھیں اس کے چہرے پر جما کر بولی۔ آج وہاں کوئی اور ہی میتو تھا۔ وہ میتو نہیں تھا جسے وہ جانتی تھی۔ جس پر اسے مان تھا۔ بے اولادی کو جو ”رب کی رضا“ کہتا تھا۔ جو اس کی ذرا سی تکلیف پر بللا اٹھتا تھا۔ جب بشیراں اس پر دایوں کے ٹوٹے آزماتی تو وہ اس کی تکلیف پر اپنی ماں سے لڑتا تھا۔ جب رچی کو کسی نے ”ڈول کلنچ“ کا بتایا جو حاصل پور اور بھاول پور کے درمیان تھا۔ جس کے بارے میں مشہور تھا کہ ایک ڈول نامی بے اولاد ملکائی نے تعمیر کروایا ہے کیوں کہ اس کے ہاں ایک بدھا کی دعا سے لڑکی پیدا ہوئی تھی۔ اب جو بھی وہاں جا کر دعا کرتا ہے تو اس کے ہاں اولاد ہو جاتی ہے۔ رچی بھی چوری سے وہاں گئی تھی مگر جیسے ہی میتو کو پتا چلا تو کتنا لڑا تھا۔

”بے دینی بن، ورنہ رب کی رحمت سے دور ہو جائے گی۔“ اور جب وہ لوگ رچیوں پر ننگے پاؤں سبز چادر صرف اس لیے چڑھانے گئی تھی تاکہ وہ بھی ہری ہو جائے تو میتو نے ہی کہا تھا۔

”رب صرف مندر، دیار مسجد میں ہی نہیں ہوتا۔ وہ ہر جگہ ہوتا ہے، ہر جگہ سنتا ہے، بس اس کے سننے کا انداز الگ ہوتا ہے، وہ اپنی رضا سے سنتا ہے، قبول کو پونے سے نہیں سنتا۔ اور تو اتنی جنونی بن جاتی ہے کہ بھی مذہب بھول جاتی ہے تو بھی اپنی جان۔“

وہ اپنی دھواں دھواں ہوئی آنکھیں مسلسل اس کے چہرے پر جمائے ہوئے تھیں۔ ایک کوئلہ جھج کر اس کے پاؤں پر گر گیا۔ وہ اس کی جلد جھلسانے لگا تھا مگر اس کی جان اتنی نہیں تھی جتنی میتو کی بدلی باتوں سے اسے محسوس ہوتی تھی۔ جیسے ہی میتو کی نظر کوئلے پر گئی اس نے ہاتھ سے فوراً اسے گرایا۔ اس کے قریب ہی ایک کپڑے کی دھجی پڑی تھی۔ اس نے وہ

اٹھائی اور جلا کر اس کی راکھ رچی کے پاؤں پر چھڑکی۔
رچی نے اپنا پاؤں ناگواری سے دور سرکالیا تھا۔ ”رہن
دے۔“

”کیوں۔ تیرا پاؤں جل گیا ہے نا۔“ میتو اس کے
انکار پر لجاجت سے بولا۔ اور یا زہو بھرا کر راکھ اس کے
پاؤں پر چھڑکنے لگا تھا۔
”دروم کو ہوا؟“

”وہ مسلسل چولہے میں بھڑکتے شعلے دیکھ رہی تھی۔
اس کا دل کر رہا تھا یا تو خود لکڑیوں کے ساتھ جل
جائے یا پھر حلیمہ کو جلا دے۔“

”دیکھ رچی۔ حلیمہ بہت اچھی ہے۔ وہ تیری چھوٹی
بہن بن کر رہے گی اور اگر بچے ہوں گے تو تیرے
آنگن میں بھی رونق ہوگی۔ تو بھی ان کی ماں ہوگی۔“
وہ آج اسے منانے کی شان کر آیا۔ گویا وہ اس کی
اجازت سے ہی دوسری شادی کرنا چاہتا تھا مگر رچی اسے
مگر بھی اجازت نہ دیتی۔

”میتو! میں سب برداشت کر لوں گی، پر تیری
شرارت نہیں۔ وہ دو لوگ کہتی ہوئی وہاں سے اٹھ
کھڑی ہوئی تھی۔ وہ بھی اس کے پیچھے پیچھے تھا۔

”رچی! میری پوری بات تو سن۔۔۔ تجھے کی کوشش
تو کر۔“

”کیا سمجھوں۔ کیا سمجھوں میں۔ بتا کیا سمجھوں؟“
وہ غرا کر بھوکی شیرینی کی طرح پلٹی۔ اس کا سارو لاجڑہاں سلگتا
تھوڑا تھا۔ اس کی کھڑی پٹلی ناک نمی سے سرخ ہو رہی
تھی۔

”میتو! وہ اس کے بالکل مقابل کھڑی تھی۔ ”میں ہر
حد پار کر لوں گی۔ میں ہر چیز جلا کر راکھ کر دوں گی، اگر تو
دوسری شادی۔“ اس کے باقی الفاظ منہ میں رہ گئے
کیوں کہ سامنے حلیمہ تل پر جھک کر منہ دھو رہی تھی۔
وہ کسی درندہ کی طرح اس پر جھپٹی۔

”ڈائن، چیل، ناکن۔ تو کیوں اتنی میرے گھر میں
تیرا خون پی جاؤں گی۔“ وہ اسے پاؤں سے پکڑ کر جھٹکے
دیتے ہوئے کیفیت میں چلا رہی تھی۔
”ذلیل کمینی! میرے آدمی پر ڈورے ڈال رہی

ہے۔“ وہاں گلوں کی طرح چیخ رہی تھی۔

”رچی۔ کیا کر رہی ہے۔ چھوڑ اسے۔ چھوڑ
میتو بھاگ کر ان کے قریب گیا۔ شور سن کر بیڑیاں
بھی صحن میں آجھپی۔ گھر دہلی میں تو کوئی غیر مری ملازم
آئی تھی۔ وہ بھٹکانی ہوئی اپنے ناخن اس کی گھٹائی
میں اتارنے لگی۔ حلیمہ اس اچانک حملے کے لیے
بالکل تیار نہ تھی۔ وہ اس کے شعلے میں ڈولنے لگی۔
بشیراں اور میتو مل کر اسے چھڑوانے کی کوشش
کر رہے تھے۔ مگر وہ سب کو بددعا میں، گالیاں دے
رہی تھی۔

”کلی ہو گئی اے۔ چھڑو اے ایساں۔ رچی! چھڑ
دے۔ میں کیاں چھڑ دے۔“

میتو اور بشیراں نے بہت کوشش کی اے چھڑوانے
کی مگر جب اس کا جنون بڑھنے لگا اور گلے پر دباؤ بڑھنے
کی وجہ سے حلیمہ کی آنکھیں اٹنے لگیں تو میتو کا ہاتھ
اس کے گال پر نشان چھوڑ گیا۔ بعد میں وہ خود بھی
حیرت سے اپنا ہاتھ دیکھنے لگا۔ مگر اس کے پاس کوئی
طریقہ ہی نہیں تھا رچی کو روکنے کا۔

حلیمہ جھٹکے سے گری اور وہ اس کو گالیاں دیتی
بشیراں کے کمرے میں بھاگ گئی۔ رچی وہیں چکر کی گئی
کھڑی تھی۔ اس کا ایک ہاتھ اپنے گال پر تھا اور وہ
مسلسل میتو کو کٹے جارہی تھی۔

دھواں اب اس کی آنکھوں کو جلانے لگا تھا۔ اس کی
تپش سے اس کی سانوی جلد جلنے لگی۔ دوڑتے بھاگے
بچے سہم کر چار پاؤں پر ٹپک گئے۔

میتو نے ایک لمبی سی آہ بھری اور صافہ جھٹکتا ہوا
تھکے قدموں سے اپنے کمرے کی طرف چل دیا۔
رچی جوں کی توں بیت بنی کھڑی تھی۔ اس کی نگاہیں
میتو کی پشت پر کڑی تھیں۔ اس کا سر چکرانے لگا۔

”کیا یہ تھوڑی دیر پہلے والا میتو ہے جو میرے ذمہ
پر دوائی لگا رہا تھا۔ وہی ہے جسے میرے ننگے پاؤں
سے کانٹے کے جیسے کا ڈور ہوتا تھا۔ جو میری پیٹھ سے
لیے بے تاب ہوتا تھا جسے میرے بدن کی فکر نہیں
میرے دو پر لڑنے والا۔ وہ کیسے بدل گیا۔ وہ جو

صرف میرا تھا کیا اب میرا نہیں رہا۔؟“

وہ صرف ترازو میں اپنی محبت باقی تھی۔ وہ صرف
اپنے جنون کا پلڑا زمین پر لگائے رہتی تھی۔ مگر
جسٹ خدا اس کی سرشت میں نہیں تھا۔

وہ صرف یہ جانتی تھی میتو اس کا ہے۔ اس کی
محبت اس کی سانسیں اس کی روح بھی۔ ایک پاگل بن
کی کیفیت میں وہ اٹنے پاؤں گھر سے نکل گئی پاؤں ٹھپٹے
ٹھپٹے اس کے قدم اپنی ماں کے گھر کے تھے۔

وہ دھواڑے دروازہ کھول کر اندر چلی گئی۔ جامن
کے درخت کے نیچے پچھی چارپائی پر گر کر بچپیوں سے
روئے لگی۔

”رچی! رچی کی ہو یا؟“ نذیراں نے بیٹی کو آتے ہی
دھپ سے گرتے دیکھا تو فوراً اس کے قریب آئی۔
پچکوں اور سسکیوں سے رچی کا سارا بدن ہل رہا تھا۔
نذیراں بار بار اس سے پوچھ رہی تھی۔

وہ ماں کو کیا بتانی کہ اس کے محبت بھرے اشیائے
کے ٹکے ٹکے شروع ہو گئے ہیں۔ وہ کیا بتانی کہ اس نے
جس کا ساتھ مانگا تھا جسے سوچا تھا تقسیم ہونے لگا
ہے۔ اس نے تو اپنے رب سے صرف میتو چاہا تھا۔
پہاں تک کہ اس کے بعد رب سے کچھ نہیں مانگا۔
کبھی نہیں۔ حالانکہ اس کے ساتھ کوہ قرار رکھنے کے
لیے اسے ہر دم رب سے کچھ مانگنے کی ضرورت پڑنی
تھی مگر وہ میتو پر مہر لگاتی رہی تھی۔

رچی کو ماں کے گھر آئے تقریباً ”دس دن گزر گئے
تھے لیکن اسے نہ میتو لینے آیا نہ ہی بشیراں۔ نذیراں
اسے پہلے بھی سمجھاتی تھی۔ اب بھی سمجھا رہی تھی۔
”رچی! غلط کرنی اے۔ تو قسمت نال نہیں
لے سکتی۔“

نذیراں اس کے بکھرے بال پیار سے سمیٹ کر
لگتی گزرتی گئی۔ وہ ممتا سے بھری تھی۔ وہ اسے
نلانے کی اونچ نیچ سمجھا رہی تھی۔

”کچھ رچی! جو رب کی تقسیم تیرا نام نہ ہو تو تو

لوگوں سے چھین لے گی؟ نہیں نا۔۔۔ اگر سو متا رب
چاہے ہی نہ کہ تیرے لیے میں چیز آئے تو کوئی بندہ دے
سکتا ہے؟ نہ رچی نہ میری بیٹی! تجھے کی کوشش کر۔“
”تو اماں! میرے لیے کچھ کیوں نہ آیا، میں نے تو
صرف میتو ہی مانگا تھا۔ وہ بھی میری جھولی میں رہنے
نہیں دیا اتنے بڑے رب نے۔“ وہ بیٹی کے فرش کو
نظروں سے چھیدتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

”کیسے نہیں کتے جھلی! رب نے میتو تیری جھولی ہی
ڈالا ہے پر تو رب کا نظام نہیں سمجھتی۔ یہ دنیا سامنے
کے لیے اس کی تقسیم الگ ہے۔ کسی کو اتنا تو کسی کو
اتنا۔“ وہ اپنے ہاتھ سے چھوٹے بڑے بیانے بنا رہی
تھی۔ پھر ہاتھ نفی میں ہلاتے ہوئے اور کسی کو کچھ بھی
نہیں۔ وہ رب ہے کسی کو وقت سے پہلے تو کسی کو
وقت گزار کے دیتا ہے۔“

ماں کے کہنے پر اس کا ہاتھ توریوں سے بھر گیا۔ غرا
کر بولی۔

”کیا مطلب ہے تیرا وقت گزار کے۔“

”دیکھ رچی! وہ مولا ہے پروردگار ہے۔ وہ بہتر جانتا
ہے کہ کب کیا ضرورت ہے۔ وہ دیکھ سامنے والے
خدا بخش کو۔ اس نے دوسری شادی کی ہی تھی ساتھ
ہی پہلی سے بھی بچہ ہو گیا۔ یہ رب کی تقسیم ہے۔
اسے وقت گزار کے ملا۔ تو یہ دیکھ وہ دونوں کے ساتھ
خوش ہیں تو تو خوش نصیب ہے جو میتو تجھ سے
اجازت مانگ رہا ہے۔ میری پیاری دھی! تو اسے خوشی
خوشی اجازت دے۔ پھر دیکھ تو کیسے اس کے سر پر بیٹھتی
ہے، وہ ڈھیر تیرا خیال کرے گا۔ ساتھ رب سو متا بھی
خوش ہو گا۔ ہو سکتا ہے تیری بھی گود ہری ہو جائے۔“
نذیراں اس کے بال باندھ کر اس کی کمر سہلاتے ہوئے
سمجھا رہی تھی۔

”نہ اماں نہ! اس نے ماں کا ہاتھ غصے سے جھٹکا اور
کھڑی ہو گئی۔ ”میتو کی تقسیم کے بعد ہری گود کا کیا کرنا
ہے۔“

”کمیلے۔ تو کیوں نہیں سمجھتی اے۔“ نذیراں
نے دوبارہ پیار سے اسے اپنے قریب بٹھایا۔

”ہاں! میتو صرف میرا ہے، میری محبت، میری چاہ، میرا پیار، میرا سب کچھ۔“ وہ پھر غرائی تو نذیراں کو اس پر شدید غصہ آگیا۔ اپنی پات وار آواز میں چلائی۔
”وہ تیری محبت، تئیں بے صبری اسے۔ جمل پن اسے، جنون اسے تیرا۔ اور جنون بندے نوں گہری تھاں کھنڈوچ لے جاتا اسے۔ مجنون نہ بن۔ مجنون نہ رب نوں پسند اسے نہ اوڈے بندیاں نوں جھیلے۔! او بے نسلار ہے۔“

”ہاں!۔ ہاں!۔ میں پاگل ہوں۔“ وہ بولتے بولتے پاگلوں کی طرح ہی اپنے منہ کو پیٹنے لگی۔ ”مگر مجھے کس نے پاگل کیا ہے؟“ وہ سانس روک کر چلائی۔ ”میتو نے پاگل کیا ہے تو نے پاگل کیا ہے۔ پھو بھی نے پاگل کیا ہے۔ میں نے یہی سنا، ہمیشہ، میتو میرا ہے، میں نے میتو کے گھر جانا ہے، اس کے گھر رہنا ہے، اس کے ساتھ بسنا ہے۔ تم نے پاگل کیا ہے مجھے ماں تم نے۔“

وہ منہ کو پیٹتے ہوئے گھٹنوں کے بل زمین پر گری اور اپنا سینہ پیٹتے ہوئے دھری ہوئی گئی۔ اس کے آنسو بہہ بہہ کر اس کے منہ میں جانے لگے۔ یہی کی حالت پر نذیراں اس سے لپٹ گئی۔ وہ بھی بے بسی سے رونے لگی تھی۔



سیاہ فلک پر ہر دم گھٹنا چاند جس پر ننھے تاروں کے جھرمٹ مسکرا رہے تھے۔ مدھم ہوا کا جھونکا جاسن کے چوں میں سرسراہٹ پیدا کرتا، چند کمزور پتے جھوٹی شاخ سے ٹوٹ کر مٹی میں ٹپ جاتے۔

دور سے گیدڑوں کے ہنکارے، مڈیوں کا شور اور شاخ پر بیٹھے آلو کی آہرات کو تاریک سے تاریک تر بنا رہی تھی۔ اس کی آنکھوں سے نیند کو سول دور تھی۔ وہ چارپائی پر لیٹے لیتے کبھی دائیں، کبھی بائیں کوٹ بدلتی۔ اسے سینہ بھاری بھاری محسوس ہوا، اس کی سانس رکنے لگی۔ وہ منہ کھول کر سانس کھینچتی ہوئی بیٹھ گئی۔ اس کے حلق میں کانٹے پڑ رہے تھے۔ وہ دہانی پینے

کے لیے چارپائی سے اترتی۔ ابھی کھڑی ہی ہوئی تھی اسے ہلکا سا چلرا آگیا۔ چارپائی کی پٹی پکڑ کر وہ دہانے پر گئی اور چند لمحے بعد پانی پینے کھڑے تنک گئی۔ اسے گھونٹ ہی بھرے تھے کہ اس کا دل متلا گیا۔ شل بھوکا پیٹ ہونے کی وجہ سے ایسا محسوس ہوا۔ کچھ کہ اب وہ اکثر اثرات کو بغیر کھائے پیے سو رہی تھی۔ دن میں نذیراں ڈانٹ ڈپٹ کر چند ٹولے کھلا دیتی تھیں مگر رات کو تو اس نے نہ کھانے کی قسم اٹھا کر لی تھی۔

اسے اپنی ماں کے گھر بیٹھے پندرہ دن ہونے کو تھے اور ان پندرہ دنوں میں اس نے ایک بار بھی میو کی شکل نہیں دیکھی تھی۔ آج رات اس کی برداشت کی ہر حد ختم ہو گئی تھی۔

وہ کچے صحن میں دائیں بائیں چکر کاٹنے لگی۔ وہ سوچ رہی تھی، ”میتو اگر مجھے لینے نہیں آتا تو آئے میں خود چلی جاتی ہوں۔ ناراض میں ہوئی تھی مگر ابھی میں لوں گی۔ وہ میرا ہے۔ یقیناً“ فوراً ”ماں جانے گا۔“

چکر لگاتے ہوئے وہ شدت سے صبح ہونے کا انتظار کرنے لگی۔ تھوڑی ہی دیر میں مؤذن کی آواز گونجی۔ اسے ہلکی سی روشنی پھیلنے کا انتظار تھا۔ ماں گلیوں میں اندھیرا کچھ کم ہو جائے۔ جب آسمان پر صرف ایک تارہ رہ گیا تو اس نے جانے کے لیے پر توڑے۔ نذیراں ابھی چند لمحے پہلے ہی اٹھی تھی۔ وہ اس پر منہ دھو رہی تھی۔ رچی کو گھر سے نکلے دیکھا تو در سے نکاری۔

”کئی ہو یا رچی! اتنے سویرے کہاں جا رہی ہے؟“
”گھر۔ اپنے گھر۔ اپنے میتو کے گھر۔“
”تیرا دل غم کھانے پر ہے، اتنی صبح صبح؟“ وہ چلے چلے اس کے قریب پہنچ گئی۔

”مے گھر جانے کے لیے کوئی جلدی یا دیر نہیں ہوتی ماں!“
”رچی! تجھے رب کا واسطہ، سانس لے۔ دن بھر دے میں خود چلوں گی تیرے ساتھ۔“ وہ اس کا ہاتھ

کر اندر لانے کے لیے زور دے رہی تھی مگر رچی نے جھٹکے سے اپنا ہاتھ چھڑوایا۔

”نہیں ماں! میں نے ابھی جانا ہے۔“

وہ کہتی ہی دروازہ کھول کر باہر نکل آئی۔ نذیراں پہلے اسے پھر اس کے باپ کو پکارنے لگی، ”جو ابھی تنک رہا سو برا تھا۔ ان کے برابر والا گھر نذیراں کے دیور کا تھا۔ صحن میں ایک چھوٹی سی مشترکہ پکی دیوار تھی۔ وہ دیوار پر چڑھ کر دیور کے بیٹے کو پکارنے لگی، جو کھڑا مسواک کر رہا تھا۔ اس نے اسے رچی کے پیچھے دو ڈایا۔

نذیراں کل سے کچھ پریشان سی تھی۔ رچی ایکلی وہاں نہ جانے۔ وہ اس کے جنون سے ڈرنے لگی تھی۔ رچی گلیاں تیزی سے پار کرتی اپنے گھر تک پہنچ گئی اور وہ دونوں ہاتھوں سے دروازہ پیٹنے لگی، ”میری جو صی دستک رہ میتو نے دروازہ کھولا۔ وہ اتنی صبح رچی کو دیکھ کر خاصا حیران ہوا۔ کچھ لمحے اسے تکتا رہا۔ پھر ایک طرف ہٹ کر اسے اندر آنے کا رستہ دیا۔ وہ گھر میں داخل ہوئی تو کچھ اجنبیت کا سا احساس ہوا۔

کچھ گھر جانے کا کچھ ٹوٹ جانے کا احساس جو نکار بار تھا۔ آدھے صحن تک ہی پہنچی تھی جب سر جھپٹاتی ہیراں لکڑیاں جلانے کے لیے چولہے کے پاس پہنچی۔ رچی کو دیکھ کر اس کی آنکھیں پھٹ گئیں۔

”میرے بھائی! صبح سویرے ہی آگئی۔ آج میں نے خود آنا تھا تیرے پاس۔“ رچی ابھی اس کی بات سمجھ بھی نہ پائی تھی کہ اس کی نظر اپنے کمرے کے دروازے پر پڑی، جہاں کسمسائی ہوئی حلیمہ کھڑی تھی۔ وہ سرخ جوڑے میں ملبوس تھی اور اس کے بال بھرے ہوئے تھے۔ اسے دیکھتے ہی رچی کی پوری آنکھیں جھیل گئیں۔ اس نے جھٹکے سے گردن موڑ کر پیچھے آتے میتو کی طرف دیکھا۔

وہ گردن جھٹکے آہستہ آہستہ اس کی جانب بڑھ رہا تھا۔ گویا اسے شرمندگی محسوس ہو رہی تھی۔ وہ بھی کیا کرتا۔ کس کی مانتا وہ مجبور تھا، ایک طرف اس کی ماں کی گڑواہٹیں اور دوسری طرف خندی بیوی۔ جس دن رچی اس کے گھر سے نکلی تھی۔ میتو کو اس

پر غصہ بھی آیا مگر وہ پھر بھی اسے لینے کے لیے شام ہی کو جانا چاہتا تھا لیکن اس کی ماں نے کہا۔

”تجھے بیوی کی خندا اتنی پیاری ہے۔ بیوہ ماں کی خواہش کا کوئی احترام نہیں۔ اس ماں کی جس نے تجھ ذرا سے کوپال کر بیوی کے قابل کیا۔ اب اس کی محبت اتنی غالب آگئی کہ روٹی ماں نہیں دکھتی۔“ بشیراں رو پڑی۔

”میں کوئی ناچاز بات نہیں کر رہی ہوں۔ اسے چھوڑنے کا نہیں کہتی۔ بس میں تو اپنی سسل دیکھنے کی خواہش کر رہی ہوں اور اتنا میرا حق ہے تجھ پر۔ میں ان دونوں میں فرق نہیں کروں گی نہ تجھے کرنے دوں گی۔ خدا کے واسطے تو مان جا۔“

وہ ماں کی باتوں پر شش و پنج میں پڑ گیا تھا۔ جب بشیراں نے یقین دہانی کرائی کہ نکاح کے لگے ہی دن اسے خود منا کر لے آؤں گی، تو میتو ماں کی خواہش کے آگے ہار گیا۔ کل شام ہی اس کا دوسرا نکاح ہوا تھا۔ اس نے اپنا حق ہی استعمال کیا تھا مگر وہ پھر بھی رچی سے شرمسار تھا۔ اسی لیے گردن جھٹکے اس کی جانب بڑھ رہا تھا۔

”تو میرے کمرے میں کیسے؟“ رچی بھنوسیں سیکڑ کر بولی اور پھر بھاگ کر میتو کی طرف گئی۔

”میتو! یہاں کیسے۔ بول۔ بولنا کیوں نہیں۔ یہ یہاں کیسے۔ بول نا!“ وہ اس کے دونوں بازو پکڑ کر جھنجھوڑنے لگی۔ حلیمہ دُغم میں چلتی ہوئی کچھ آگے آگئی۔

”میتو بول! میں یہاں کیسے۔ اسے بتا میرا تیرا کیا تعلق بنا ہے۔“ وہ منہ پڑا کر بولی۔

”نہیں۔ نہیں۔ میتو! یہ۔ یہ مت بولنا میتو!“

وہ ایک ہاتھ سے اس کا بازو ہلاتی رہی تھی اور دوسرے ہاتھ کی انگلی سے حلیمہ کی طرف اشارہ کر رہی تھی۔

”میتو یہ جھوٹ بول رہی ہے نا۔ یہ نہیں ہو سکتا۔ بول نا۔ یہ جھوٹی ہے نا۔“ مگر میتو ہونٹ پیچھے کھڑا ہے۔

اسی سے رچی کو دیکھ رہا تھا۔

”میتو! تو بولنا کیوں نہیں۔“ وہ حلق کے بل

دھاتی ہوئی اس کے سینے کو پیٹنے لگی۔ اس نے اپنا سر بہت زور سے اس کے سینے پر مارا۔ میتو نے اپنا لرزتا ہاتھ اٹھایا اور اسے تسلی دینے کے لیے ابھی اس کے بالوں پر رکھا ہی تھا۔

”ہونہ!“ وہ جھٹکے سے یک لخت برے ہوئی اور دونوں ہاتھوں سے اسے پیچھے دھکیلتی ہوئی زخمی ٹانگوں کی طرح چھنکاری تھی۔ وہ لمبے لمبے سانس ہنپتے ہوئے سامنے پیڑ کے نیچے بنے مٹی کے پارے کو دیکھنے لگی، جہاں کلماڑا پہلے اور درانتی رکھی تھی۔

وہ کسی وحشی کی طرح ایک جست میں وہاں پہنچی اور تیز دھار درانتی اٹھالی۔ کیاس کی کٹائی قریب تھی اسی لیے درانتی تیز کروا کر گئی تھی۔

میتو نے جب اس کے ہاتھ میں درانتی دیکھی تو بھاگ کر اس کے قریب گیا۔

”نہ رچی نہ دیا کرنے لگی ہے۔“

”میتو۔ تو نے میرا دل جلا دیا ہے۔ میں تیرے سامنے اپنی سانس ختم کر لوں گی۔ میں تیرے سامنے خود کو مار لوں گی۔“ وہ ہر لفظ چبا کر سانس ہنپتے ہوئے کہہ رہی تھی۔ آنکھیں انکارہ ہو رہی تھیں۔

بشیراں کو اس کی حالت پر ترس بھی آ رہا تھا اور وحشت بھی۔ وہ تیز تیز قدموں سے اس کے قریب گئی۔

”نہ رچی۔ میڈی دھی! کیوں جھلی ہوئی اے۔“

”رک جا چھو پھی! رک جا۔“ وہ دھاڑ کر بولی۔ وہ درانتی ہاتھ میں مضبوطی سے پکڑے، بشیراں کو گھور رہی تھی۔

”میں تیری کچھ نہیں لگتی۔ میں کسی کی کچھ نہیں لگتی۔“ اس نے ہچکیاں لیتے ہوئے پہلے درانتی کو پھر بشیراں کو کھاجانے والی نظر سے دیکھا۔

”تو نے میری روح توڑ دی ہے، میرا دل توڑا۔ میں تیرے سامنے اپنی زندگی ختم کر لوں گی۔ میں کسی کی کچھ نہیں، کچھ نہیں۔“ اس نے اپنا ہاتھ اونچا لرایا۔ میتو بھاگ کر اس کے سامنے کھڑا اسے پکڑنے کی بھرپور کوشش میں تھا۔

”رچی چھوڑ دے دیکھ! میں کہہ رہا ہوں پھر دے۔“

وہ نفی میں سر ہلاتے ایک ایک قدم پیچھے ہٹ رہی تھی۔ میتو اسے کندھے سے پکڑ کر اس کا بازو پکڑنے کی کوشش میں تھا۔ رچی کے چاچا کا بیٹا جو ابھی چند لمبے پہلے ہی گھر میں داخل ہوا تھا۔ اسے اس حال میں دیکھ کر ایک ہی جست میں اس تک پہنچ گیا۔ وہ رچی کا ہاتھ پیچھے سے پکڑنا چاہتا تھا اور پکڑ بھی لیا تھا۔ اس نے جھٹکے سے اپنا ہاتھ چھڑانے کی کوشش میں آگے کیا تھا۔ فضا میں ایک دل خراش چیخ ابھری اور پھر کتنی ہی آوازیں پھیلتی چلی گئیں۔

رچی کی آنکھیں حیرت سے ابل پڑیں۔ وہ پورا دم کھولے نفی میں سر ہلانے لگی۔ اس کا وار میتو نے اپنے جگر پر روک لیا تھا۔ درانتی چھینا چھٹی میں اس کے جسم میں پیوست ہو گئی تھی۔ وہ لڑکھڑا کر نیچے گرا۔ رچی کے چاچا کا بیٹا ہانپتے ہوئے آگے بڑھا اور درانتی نکال۔ درانتی نکتے ہی میتو کی غرابٹ کے ساتھ خون کا فوارا ابل پڑا۔ رچی بے دم سی ہو کر وہ پ سے اسی پر جاگری۔ وہ اس منظر کو جھٹلا رہی تھی۔

”نئیں۔ نئیں۔ یہ نئیں ہو سکتا۔ میتو۔ میتو!“

وہ تڑپتے میتو کے خون میں اپنے ہاتھ بھر کر اپنے چہرے اور جسم پر پھیرنے لگی۔ اس کے خون میں اپنے گہرے چہرے، گردن سب کچھ لپٹ کر رہی تھی۔ بشیراں چپٹی چلاتی رچی کو کوئی اپنے گھٹنے پیٹ رہی تھی اور حلیہ اپنے اجڑتے سناگے راتم کنارں تھی۔ گالیاں دیتے ہوئے رچی کی کمر پر چھپرہ سارایا گی۔ لیکن رچی تو شاید دنیا و مافیہا سے بے خبر اس کے خون میں رنگ رہی تھی۔

رچی کے چاچا کے بیٹے نے میتو کو جلد از جلد اپنے پیچھے کی کوشش کی۔ مگر وہ گھر سے نکلنے ہی دم نہ گیا۔ گھر میں چیخ و پکار سے محلے والے اکٹھے ہوئے تھے۔

پولیس کو جانے کس نے خبر دی تھی۔ وہ رچی کو

قتل سمیت پکڑ چکے تھے۔
رہی ”میتو نہیں“ کرتی میتو کو پکارتی پولیس
والوں کے ساتھ ہنسنے لگی جارہی تھی۔
”میتو نہیں“ میں مری ہوں۔ میتو نہیں مر سکتا۔
رہی مر سکتی ہے۔“ وہ گلاباڑی ہوئی گاڑی میں دھکیل
دی گئی۔

چلتی گاڑی پر کئی فوٹو گرافر ٹوٹ پڑے تھے۔ اگلے
دن اخبار کے آخری صفحوں پر چھوٹی سی خبر تھی۔
”عبدالستین کو اس کی بیوی رضیہ نے اپنے آشنا
کے ساتھ مل کر قتل کر دیا۔“
تفصیل اس سے زیادہ شرمناک تھی۔ یہ تو رچی
جانتی تھی چاچا کا بیٹا آشنا تھا یا مساجینے آیا تھا مگر وہ
علاقے میں خوب رسوا ہوئی تھی۔ لیکن ابھی اس کے
جنون نے اسے گڑھے سے کھائی میں لے کر جانا تھا۔

آسمان پر سورج، چاند اپنی اپنی ڈیوئیاں بدلتے
رہتے۔ رچی جیل کی سلاخوں سے سرچسپی ”میتو میتو“
پکارتی خود کو لبو لبان کر لیتی تھی۔ ایک دو بار اس نے
سامھی قیدی عورتوں کو بھی زخمی کیا پھر اس کی ہیرک
بدل دی گئی۔ اب وہ اپنی ہیرک میں تنہا تھی۔ اکثر چکر
کر کر جاتی تھی۔ اس کا ذہنی توازن چیک کیا گیا۔ جو
تقریباً ”درست ہی تھا۔ مگر اس میں ایک اور تبدیلی
آ رہی تھی۔ جو زیادہ عرصہ کسی سے چھب نہیں سکی۔
اس تبدیلی کا پتا چلتے ہی رچی حیرت میں آ گئی تھی۔ وہ
یکسر بدل گئی۔

نولی مورتی کی طرح ایک کونے میں پڑی رہتی۔
اسے مکمل چپ لگ گئی تھی۔ لیکن اس کی چپ دنیا کی
تیز و ہار زبان نہ تروا سکی۔ سلاخوں کے پار جیسے ہی خبر
پہنچی تو جھگولیاں ہونے لگیں۔

کوئی کتا وہ شروع سے ضدی اور بددماغ تھی جو
اس کے دماغ میں سمائے اسے کوئی روک نہیں سکتا۔
یقیناً ”وہ قید سے گھبرا گئی ہوگی تب ہی باہر نکلنے کے لیے
جیلر یا تھانیدار کو خوش کیا ہوگا۔ کوئی اس کی حالت کو

انسپکٹر سے منسوب کرتا۔ چھوٹی چھوٹی جٹ پٹی خیر
روز اخبار کا پیٹ بھر تیں۔ شیراز رو رو کر کہتی۔
”اس بد ذات باجھ کی صرف حرام کاری ظاہر کر
کے لیے اللہ نے اسے ہر ایک ہے“ اللہ کیوں اس کی حرام
کاری پر پردے ڈالتا جس نے اپنے سر کا سامن
کر دیا۔ وہ ذلیل تو ہو۔“

اس نے چند مہینے بعد ہی حلیمہ کی شادی اپنے رشتے
داروں میں طے کر دی۔ شاید اس لیے کہ جب میتو کی
محبوبہ بیوی نفس پر قابو نہ رکھ سکی اور اس نے حرام
کاری شروع کر دی تو پھر اس معصوم کا صبر کیوں سہیل
وہ اتنے پیٹھے رچی کو بدو عا میں دیتی۔

رچی کے ماں باپ کہاں تک اتنی رسوائی برداشت
کرتے۔ وہ چند مہینوں میں ہی آگے پیچھے چلے گئے۔
حقیقت تو اللہ کے علاوہ رچی کو معلوم تھی کہ یہ حرام
کاری ہے یا اس روشن رات میں بائبل کی دعا کی تعبیر
جہاں اس پر تعبیر کی حقیقت کھلی تھی وہاں اپنی اہل
کی نصیحتیں اس کا من کاٹیں۔ وہ اکثر کہتی تھی۔
”صبر کرنے والے کے ساتھ اللہ خود چلا ہے
رچی!“ اس کی ماں کا ہر لفظ اس کے کان کے پردوں پر
چپک گیا تھا۔ وہ ہر وقت ان ہی کی بازگشت میں گھری
رہتی تھی۔

”کے نوں وقت لنگا دے ملنا ایہ۔ رب دی
رضائے راضی ہو جا رہی۔ اب برکت دے گا۔ ہو سکا
اے رب میتوں دی ہر اک دے۔“

اس کی گود ہری سے بھری ہو گئی تھی مگر اس کا
سکوت نہ ٹوٹا۔ وہ خاموشی سے بچی کو گود میں لیے بیٹھی
اپنے ماضی کے ایک ایک جنون پر پچھتاتی تھی۔
”کاش! میں بھی عام عورت کی طرح نہ ہوتی۔ میری
محبت بھی عام ہوتی۔ ماں کی بات ہی مان کر وہ زہرا
گھونٹ پی ہی جاتی۔ کم از کم میتو میرے جنون کی
تو نہ ہوتا۔“

وہ اپنی سوچوں میں اتنی دو تکی کہ بچی کو اگر وہ
پلانے لگتی تو پلائی ہی رہتی، اگر نہ پلاتا ہو تو اتنی ہی
اسے روئے بلتے دیکھتی رہتی مگر اس کا سکوت نہ ٹوٹتا۔

ایڈووکیٹ مدیحہ ایک بہت بڑی این جی او کی
چیر پرسن تھی۔ خواتین کی جیل میں اس کا اکثر آنا جانا
لگا رہتا تھا۔ وہ کافی عرصے سے یہاں رچی کو دیکھ رہی
تھی جو بیٹھ خاموش ایک کونے میں ہی لی۔ اس نے
پرانی قانون میں اس کا کیس چیک کیا۔ پھر کچھ
معلومات علاقے سے لیں اور پھر رچی کو کریدنا شروع کیا
تھا۔ رچی بہت مشکل سے بولی تھی۔ ایڈووکیٹ مدیحہ
نے رچی کی رہائی کے لیے سر توڑ کوشش کی تھی۔ مگر وہ
تمام شاید اٹل قتل اور اقبال قتل کے بعد اسے رہائی
نہیں دلا سکتی تھی۔ غلطی سے ہی قتل تو ہوا تھا۔ وہ رچی
کو منانے اکثر آتی تھی۔

آج بھی وہ اسی سلسلے میں بیٹھی اسے قائل کر رہی
تھی مگر رچی اجازت کا ایک لفظ بھی نہ بول پاتی تھی۔
بلکہ بچی کی ہتھیلی اپنی ہتھیلی کے ساتھ جوڑے جانے کیا
حلاش کرتی رہی۔ اس بچی کے ہاتھ ہی نہیں ہنس کا
ایک ایک نقش میتو کی اولاد ہونے کی گواہی دیتا تھا۔
مدیحہ کچھ دیر اسے دیکھتی رہی پھر دوبارہ بولی۔

”رضیہ! تمہیں متین سے بہت پیار تھا۔“
رچی نے چونک کر اس کی طرف خالی نظروں سے
دیکھا جیسے کہہ رہی ہو ”پیار نہیں۔ جنون۔“

مدیحہ نے ٹھنڈی سانس بھری۔ ”تمہاری محبت
نے جنون کا روپ دھار لیا تھا مگر اب۔۔۔ اب تم کون سا
بدل گئی ہو؟ شدت سے جب لگا رکھی ہے۔ اپنی بیٹی
کے ہنس نے پر بھی تم نہیں بخشیں۔ تم جانتی ہو تمہاری
بیٹی بھی تمہارے جیسی جنونی بنے؟ جانتی ہو یہاں کا
ماحول۔۔۔ یہ سب اس کی بجا مانہ ذاتیت بنانے میں کس
قدر معاون ثابت ہو گا؟ کیا تمہیں نہیں پتا رضیہ! پلیز
اپنے میتو کو اور تکلیف مت دو تم نے اس کے جسم کو
زخمی کر کے اس سے زندگی تو جین ہی لی اب اس کی
بیٹی کا مستقبل۔۔۔ جیل داؤ پر لگا کر اس کی روح کو تکلیف مت
دو۔ یہ اس کی آخری نشانی ہے۔ اسے ضائع مت
کر۔“

ابھی وہ بول ہی رہی تھی۔ جب ہیڈ کانسٹیبل نے
نور سے پکارا۔

”بیٹیو! ملاقات کا وقت ختم ہو گیا۔“
مدیحہ نے اس کی آواز پر ناگواری سے پیچھے دیکھا اور
پھر ناامیدی سے رضیہ کو جو آواز سنتے ہی کھڑی ہو گئی
تھی۔ وہ دو قدم دوڑا کر اس کی جانب چل کر واپس مڑی۔
پھر پتا نہیں کیا سوچا اور اپنی بیٹی مدیحہ کی گود میں ڈال
دی۔ پھر وہاں رکی نہیں۔ تیز تیز قدموں سے باہر نکل
گئی۔ مدیحہ برآمدے میں کھڑی بچی کے ہاتھ چوم رہی
تھی۔ وہ اسے کندھے سے لگائے مسلسل رضیہ کی
پشت تک رہی تھی جو تھکے ماندے قدموں سے اپنی
ہیرک کی طرف بڑھ رہی تھی۔ اس کا میلا پچھلا دوشا
زین پر گھس رہا تھا۔

”تم نے ایسا کیوں کیا رضیہ! مانا شو ہر کی تقسیم ہر
عورت کے لیے دنیا کا دشوار ترین امر ہے، مگر ہر روز
بہت سی عورتیں یہ زہریلا گھونٹ پیتی ہیں۔ تمہیں
متین سے شدید محبت تھی نا کچھ بھی کر گزرنے کی حد
تک۔۔۔ جہاں اتنی شدت پائی جائے وہاں آناش تو
آتی ہے۔ آہ۔۔۔ تمہیں رب نے بے اولاد رکھ کر
تمہاری محبت نالی تھی کہ تم کہاں تک قربانی دے پاؤ
گی۔ اپنے دل کی زمین پر قدم رکھ بھی پاؤ گی یا نہیں۔۔۔
تمہارے ایک قدم پر اللہ تعالیٰ نے تمہارے لیے کتنا
بڑا انعام چھپا رکھا تھا لیکن تمہارے جنون نے اس
انعام کو تمہاری رسوائی اور تمہاری بیٹی کے لیے اس
کے ”باپ کی قاتلہ ماں“ کا حوالہ بنا ڈالا۔“ وہ بچی کے
ہاتھ جوڑتے ہوئے تمام کارروائی پوری کرتی جیل سے
باہر نکل آئی۔

بے اولاد ایڈووکیٹ مدیحہ کی کہانی رچی سے زیادہ
مختلف نہیں تھی۔ شاید یہی ممالکت اسے رضیہ کے
قریب لے آئی تھی۔ مگر اس نے اپنے دل کی گلی
زمین پر قدم مضبوطی سے رکھ کر فیصلہ کیا تھا اور آج
اس کا ہمیشہ محبوب شوہر اپنی دونوں بیویوں کے ساتھ
ہنسی خوشی زندگی گزار رہا تھا اور اولاد رچی کی بیٹی کی
صورت آج انہیں مل گئی۔

مدیحہ نے اپنی گلی عینک کے شیشے صاف کیے اور
گاڑی گھر کے رستے پر ڈال دی۔

محبت سحر

کام بڑھ جانے کی صورت میں انہیں کارمگر زیادہ رکھتے بڑے اور اوپر نیچے اس گھر کو انہوں نے ایک چھوٹا سا کارخانہ بھی بنادیا۔

خود ایک اچھی کالونی میں پندرہ مرلے کی کوٹھی میں کرائے دار بن کر آگئے۔ کارخانے میں میٹرل کی سپلائی کے لیے بینک سے ایک سوزوکی فسطوں پر نکلوائی۔ اس سوزوکی کا ڈرائیور جمال تھا۔ وہی کارخانے کے سب ہی اندر باہر کے کام دیکھتا تھا۔ کارمگروں کے مسئلے حل کرتا تھا۔ حساب کتاب دیکھتا تھا۔ وہ ساتھ ساتھ پرائیویٹ میٹرک کے امتحان کی تیاری بھی کر رہا تھا۔

اسد نے ایف ایس سی میں کالج میں داخلہ لے لیا

مکمل ناول



تھا۔ قدانی اسٹڈیم میں دکانیں دوپہر کے بعد ہی کھلی ہیں۔ اس لیے اب ان دونوں کے پاس کافی وقت ہوتا تھا۔

اتنی اور مسرگورہر کی ساری توجہ اب ڈیڑا منگ گئی تھی۔ اب انہیں کسی کام پر نہیں ہونا پڑتا تھا کہ فلاں آرڈر نے فلاں طرز کا میٹل ہی بنانے کے لیے کہا ہے یا فلاں کپڑا اور ڈیزائن ہی مانگا ہے۔ اب انہیں مکمل آزادی تھی۔ وہ اپنی مرضی کا ڈیزائن کریں گی اور ”چتر“ میں ڈھیلے کریں گی۔ انہیں یقین تھا کہ ان کے ہر ڈیزائن کو پسند لیا جائے گا۔ اور پھر سے پرتا جائے گا۔ اب انہیں ریگولر سٹمبر مل گئے تھے جو سیدھا ”چتر“ ہی آتے۔ ویسے بھی انسانی خط ہے کہ وہ ایک بڑی پر

مارکیٹ سے گھسیٹا چڑھتی بھی بہت اطمینان کے ساتھ لے لے گا اور آخر سے سب کو بتائے گا۔ اوچی جگہ اور اونچے نام بہت سے تقاضے پر پردوں کا کام کرتے ہیں۔

لاہور کے اتنے شان دار علاقے میں ایک شاندار دکان نے انہیں دونوں میں خاطر خواہ سے زیادہ منافع دینا شروع کر دیا۔ منافع سے زیادہ وہ ملبوسات کی پسندیدگی سے خوش تھیں۔ ان کی محنت رنگ لارہی تھی۔ وقت دو طرح سے بدل جاتا ہے۔ ایک قیمت سے۔ ایک ہاتھ سے۔ قیمت سے نہ بدلے تو ہاتھ سے بدلنے کی کوشش ضرور کرنا چاہیے۔ قیمت ہار جاتی ہے۔ ہاتھ نہیں ہارتے۔ دنیا میں کتنی بھی انسانی ترقی ہوئی ہے۔ اسے ہاتھ سے ہی ممکن کہا گیا ہے۔ ورنہ ہاتھ باندھ کر بیٹھے رہنے والے لوگوں کے زین میں دے دیا جاتے بھی نہیں ملتے اور مل جائیں تو کار آمد نہیں ہوتے۔

افق کا مسز کو ہر کامیاب اور جلال کا۔ ان کا وقت بدل چکا تھا اور یہ وقت ہاتھ باندھے بیٹھے رہنے سے نہیں بدلتا تھا۔

اپنی سونو کی میں جمال افق کو ڈراپ کر دیتا۔ وقت ہوتا تو لے بھی آتا۔ ورنہ وہ خود ہی آجاتی۔ اماں نے گھر کے معاملات سنبھال رکھے تھے۔ وہ کام والی کی نگرانی کر لیتیں۔ کچن کو دیکھ لیتیں۔ ان سب کے لیے دوپہر کا کھانا بنوا کر کارخانے بھجوا دیتیں۔

رات کو فرزام آن لائن آجاتا۔ باری باری سب سے بات کرتا۔ افق کو اپنی یونیورسٹی کے بارے میں بتاتا۔ کیا کھایا، کیا پیا، کب سویا، کب جاگا۔ وہ اس سے دیر تک بتاتا اور اس سے بھی ڈھیروں سوال کرتا۔ آہستہ آہستہ دونوں میں اچھی گپ شپ ہونے لگی۔ وہ لیپ ٹاپ کے سامنے لا لاکر دکھاتا۔ یہ شرٹ لی، یہ پینٹ لی۔ یہ مک لیا۔ پین لیا۔ یہ مکی ماؤس وال کلاک۔ ایک منٹ تک ہر صورت بچنے والا اور مہم۔ یہ نیاسیٹ، نیالوشن، نئے جوئے، نئی گھڑی اور جڑائیں بھی۔

اگر وہ ہمیں اس کے پاس ہوتا تو شاید ایسے کبھی نہ

کرتا۔ لیکن سات سمندروں کے درمیان میں اُن کے سے اتنا دور ہو جانے سے اسے احساس ہوا کہ وہ اپنے پیچھے چھوڑ آیا ہے۔

وہ اپنے فٹارمنٹ، اپنی یونیورسٹی کی خوب صورت ترس لڑکی قرار دی جانے لگی۔ اسے پرک رک کر، مرکز دیکھا جاتا۔ پہلے وہ بے چاری تھی۔ بسوں میں رکشوں میں دھکے کھانے والی، کاؤنٹر کے پیچھے فاسٹ فوڈ کی ٹرے دینے والی، دیکھنے والے اس پر سمجھ کر دیکھتے تھے۔ اب وہ لمبے کرتوں اور تنگ پاجاموں میں، بیک کو کندھے پر لٹکائے، فائل کو باز میں پکڑے دیکھنے والوں کو پہنچنے سے دور نظر آتی۔ اس کے فٹارمنٹ کے لڑکے اس سے بہانے بہانے بات کرنا چاہتے تھے۔ اس کی ٹوہ میں لگے رہتے تھے۔ چند ایک لڑکیوں سے اس کی اچھی دوستی ہو گئی تھی۔ ان سے بات چیت ہوتی ہی وہ انہیں بتا چکی تھی کہ مس نہیں سمجھتا۔ اس سے مزگناستہ ہی لڑکیاں اس پر سوالیوں کی بوچھاڑ کر دیتیں۔ انہیں بہت چینی ہوئی تھی، یہ جاننے کے لیے کہ اگر یہ ایسی لڑکی ہے تو وہ کیسا ہوگا۔

لڑکوں کو جب یہ معلوم ہوا تو انہیں جھوٹ لگا۔ ایک نے اسے سفید جھوٹ کہا۔ وہ جانتے تھے کہ لڑکیاں لڑکوں سے دور رہنے کے لیے مشہور کر دیتی ہیں کہ ان کا نکاح ہو چکا ہے یا منقہ۔ اگر یہ سفید جھوٹ بھی تھا تو افق کا انداز ایسا تھا کہ لڑکا اس کے قریب جانے کی جرات نہیں کر سکتا تھا۔ فرزام سے شادی ہونے کے باوجود وہ لڑکوں سے نفرت کرتی تھی۔ جہاں لڑکے اسے موبائل ہاتھ میں پکڑے یا باتیں کرتے نظر آتے تھے اس کا خون کھڑک جاتا۔ لڑکوں کے گروپ میں ہنسی کے فوارے پھوٹ رہے ہوتے تو اس کے سینے نکلنے لگتے۔ اسے ہوجانا کہ کسی لڑکی کا مذاق اڑایا جا رہا ہوگا۔ وہ لڑکی

سے نفرت کرتی تھی یا ان سے خوف زدہ تھی۔ اس کا تاثر اس نے اپنے چہرے پر کبھی نہیں آنے دیا تھا۔ ہاں اس کی ذات میں ایک واضح نشان ضرور بن کر ابھر آیا تھا۔

”دور رہو۔“ جب وہ اور مسز کو ہر کسی ہوٹل میں منعقد کسی نمائش میں جاتیں تو لوگ اسے کوئی بڑی ڈیزائنر سمجھتے۔ وہ دونوں دوسروں کے کام کا بغور مشاہدہ کرتی تھیں۔ اس سے انہیں اپنے کام میں جدت لانے کے نئے نئے آئیڈیاز ملتے تھے۔ فیشن سے متعلق ہونے والے ایونٹ میں وہ دونوں اکثر جایا کرتی تھیں۔ ان کا اپنا ارادہ بھی ایک ایونٹ کروانے کا تھا۔ لیکن ابھی نہیں۔

آج کل وہ کرائے پر ایک کارز یا دکان حاصل کرنے کی کوشش کر رہی تھیں۔ اب وہ ایک اور دکان کا کرایہ انفرڈ کر سکتے تھے۔ ایڈوانس بھی ان کے پاس تھا۔ دوسری طرف مسز کو ہر کا خیال تھا کہ اگر کوئی مناسب دکان نہیں ملتی تو کسی اچھی سوسائٹی یا ٹاؤن میں وہ لوگ ماہوار قسط پر ایک اچھا گھر لے لیں۔ افق اس کے خلاف تھی۔ اس کا کہنا تھا کہ فی الحال بڑا س کوئی ترقی دی جائے۔ فرزام کا ووٹ مسز کو ہر کے حق میں گیا اور اس نے گھر لینے کے لیے کہہ دیا۔ اس کا مشورہ یہ تھا کہ جو ادائی گھر کے کرائے کے سلسلے میں کی جاتی ہے وہی گھر کی قسط کی مدد میں ادا کر دی جائے گی اور دکان کے ایڈوانس کے لیے وہ کچھ اور انتظار کر سکتے تھے۔

لاہور کے مرکز سے ذرا سا دور ایک اچھے ٹاؤن میں انہوں نے ایک جنگلی کی ایڈوانس پے منٹ کر دی۔ باقی رقم انہیں دو سال کے اندر اندر ادا کرنی تھی۔ مسز کو ہر کی خوشی دیکھنے لائق تھی۔ جیسے انہیں ان کا بچپا ہوا گھر والوں مل گیا ہو۔ وہ بے حد خوش تھیں۔ جمال اور اسد کو الگ الگ کمرے مل گئے۔ افق کو اپنے شوہر کا اپنا گھر مل گیا۔



سیاہ لاناگ کوٹ پہنے وہ ٹرائل کھینچی شیشے کے دروازے کے پار دیکھ رہی تھی۔ اس کی فلائٹ وقت پر آئی تھی۔ لیکن اس کا سامان کم ہو گیا تھا۔ اسے اپنے سامان کو ڈھونڈنے میں کافی وقت لگا۔ وہ لوگوں انٹر نیشنل ایر پورٹ پر موجود تھی۔ ایسا تو ہو نہیں سکتا تھا کہ فرزام اس کا انتظار کر کر کے چلا گیا ہو۔ اس نے کل ہی کہا تھا کہ اگر فلائٹ کے ساتھ کچھ ہوا تو وہ ایر پورٹ پر سو جائے گا۔ وہاں سے جائے گا نہیں اور وہ ہٹنے لگی تھی۔

”اتنے شور میں نیند آجائے گی؟“

ادارہ خواتین ڈائجسٹ کی طرف سے بہنوں کے لیے خوبصورت ناول

کتاب کا نام	مصنفہ	قیمت
بسا دلد	آمنہ پاش	500/-
ذریعہ	راحت جبین	750/-
زندگی اک روشنی	رخسانہ نگار عدنان	500/-
خوشبو کا کوئی گھر نہیں	رخسانہ نگار عدنان	200/-
شہر دل کے دورازے	شازبہ چودھری	500/-
حیرے نام کی شہرت	شازبہ چودھری	250/-
دل ایک شہر چوں	آمینہ مرزا	450/-
آئینوں کا شہر	فاخرہ اختر	500/-
بھول بھلیاں تیری گلیاں	فاخرہ اختر	600/-
بھلاں دے رنگ کالے	فاخرہ اختر	250/-
یہ گلیاں یہ چہ پارے	فاخرہ اختر	300/-
زمین سے گورت	غزالی عزیز	200/-

ناول منکوانے کے لئے فی کتاب ڈاک خرچ - 30/- روپے
منکوانے کا پتہ:
مکتبہ محمد عمران ڈائجسٹ - 37 اردو بازار کراچی۔
فون نمبر 32216361

وہ علامہ اقبال ایئر پورٹ نہیں ہے جہاں آوے
سے زیادہ لوگ پبلک منٹانے آجاتے ہیں۔ امریکیوں کا
ہوائی اڈہ ہے۔ ہزار کیا لاکھ بھی ہوں تو شور نہیں ہوتا۔
”کتنے اچھے ہیں امریکی پاکستانیوں کو تو کچھ آنا ہی
نہیں۔“

”طنز مت کرو۔ سلمان باندھ لو۔“

”وہ تو ہاں نے کب سے باندھ دیا۔“

”میرے لیے کیا لاری ہو؟“

”شکلور سوٹ۔“

”ہیں۔ اورس۔“

”اورس۔“

”جہاز میں بس لانے دیں گے کیا؟“ ”ذیر تک قہقہہ
گو جتا رہا۔“

امریکا میں پاکستانی کیونٹی نے ایک نمائش کا اہتمام
کیا تھا۔ فرزام نے ان کے لیے بھی ایک اسٹال بک
کروادیا تھا۔ ان دونوں افق کے ایم اے پارٹ ون کے
امتحان چل رہے تھے۔ اس کا خیال تھا کہ دونوں ہی
آجائیں، لیکن صرف مسز گوہر کو ہی جانا پڑا۔ دو ماہ امریکا
فرزام کے پاس رہ کر اور کامیاب نمائش چٹا کر وہ واپس
آگئیں۔ کارخانے میں ان میں سے کسی ایک کا ہونا
بھی ضروری تھا۔

امتحانات کے باوجود افق نے کارخانہ سنبھالے
رکھا۔ اس بار ویسی ہی ایک اور نمائش کے لیے افق
جاری تھی۔ اس کا ایم اے ہو چکا تھا۔ زلٹ آنے
والا تھا۔ فرزام بھی ایم ایس سی کر چکا تھا۔ جب وہ پہلے
ہی کر رہا تھا۔ آج کل ایک دو کورسز کر رہا تھا۔ امریکا
میں اس نے چند جگہ ایلانی کیا ہوا تھا اور اسے امید تھی
کہ اسے ایک آدھ کال تو ضرور آئے گی۔

افق کا ذہن وہ پہلے سے ہی بنا چکا تھا کہ ایم اے کے
بعد وہ ڈریس ڈیزائننگ کا کورس امریکا سے کرے گی۔
مسز گوہر اس کی ایسی باتیں سن لیں تو بہت ہنسیں۔

”ہاں ہاں! بھاگ جاؤ، بھاگ جاؤ، سب بھاگ جاؤ“
پہلے تم بھاگے، اب افق کو تیار کر رہے ہو۔
”یہ میری ماں نے کہا یا افق کی ساس نے؟“

”دونوں نے۔“ وہ کھلکھلا تھیں۔

افق کافی دیر سے کھڑی تھی۔ فرزام نظر اکر نہیں
دے رہا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ وہ نکلے ہی اسے سامنے
کھڑا ملے گا۔ لیکن اسب ہاں لڈرا دور سے آتا تھا
اسے نظر آیا تھا۔ وہ تیزی سے بھاگتا ہوا آ رہا تھا۔
ڈھائی سال دونوں نے ایک دوسرے کو آن لائن دیکھا
تھا۔ ڈھائی سال لپ ٹاپ سے آئیے سامنے رہے
تھے۔ اس نے اس کی ہر حرکت سنی تھی۔ بہت سے
لطیفوں پر ہنسی تھی۔ اس کی خریدی گئی بہت سی چیزیں
کو تاپند کیا تھا۔ بخار اور زکام میں اس کی سرخ ناک کا
مذاق اڑایا تھا۔ اور اسب وہاں کھڑے بھاگتے
ہوئے ایک شخص کو اپنے قریب آتے دیکھتے افق کو
عجیب لگ رہا تھا۔ اس کا دل دھڑک رہا تھا۔ اس پر اس
کی پہلی نظر پڑی اور اس کے دل نے چاہا کہ چھلانگ
لگا کر باہر آجائے۔ اس پر اس کی نظر پڑی تو بی نہیں چلا
کہ وہ نظرواپس لوٹ آئے۔

دونوں کی نظریں ملیں۔ فرزام خوش دلی سے
مسکرایا۔ اس کے ایک ہاتھ میں پھول تھے۔ اس کے
قریب آکر وہ بیک لگانے سے انداز میں رکا۔

”او میری افق!“ پھول اس کے ہاتھ میں دے۔
”ایک ایک سیڈنٹ ہو گیا تھا۔ ایک گھنٹے سے سڑک
جام تھی۔“

اس نے پھول پکڑ لیے۔ فرزام نے زبانی سنبھال دیا۔
”کسی نے تمہیں جہاز سے اتر جانے کے لیے نہ
نہیں کہا؟“

”ایک نے مشورہ دیا تھا کہ اتر جاؤ۔ کیوں پاگلوں
کے ملک میں جاری ہو۔“

فرزام کا قہقہہ ایئر پورٹ کی عمارت میں بکھر گیا۔
بہت خوش نظر آ رہا تھا۔ اس کی طرف دیکھ کر لگ رہا تھا
کہ وہ بہت دل لگا کر تیار ہوا ہے۔ اس کے بالوں کا
اشاکل، اس کا نایا نیا لکٹ، نیا منظر، نئی کھڑی خاص
پرفیوم۔

اس نے ان میں سے ایک بھی چیز اسے آن لائن
نہیں دکھائی تھی۔ وہ سب کا حال چال پوچھتا۔ اس نے

سلمان کار میں رکھنے لگا۔

”مسز فریوری ہوئی ہوگی۔ ہے نا؟“

”نہیں۔ میں یہ کتاب پڑھتی رہی۔“ اس نے
پھولے ہوئے بیک کی طرف اشارہ کیا۔ فرزام کا خیال
تھا کہ اس کے بارے میں سوچتی رہی۔ ان
گزشتہ سالوں میں دونوں میں بہت اچھی دوستی ہو چکی
تھی۔ فرزام جیسے لڑکے پر افق کو بہت ناز تھا۔ افق جیسی
بیوی فرزام کو بہت چاہی ہو گئی تھی۔

فرزام کا چھوٹا سا فلیٹ بہت پیارا تھا۔ شروع میں وہ
ہاسٹل میں رہتا تھا۔ پھر چار لڑکوں کے ساتھ لپارمنٹ
شیر کیا۔ جب اسے اچھی جاب مل گئی تو اس نے اپنا
اگ فلیٹ لے لیا۔ اس فلیٹ میں سلمان کم ہی تھا۔
افق کے لیے اس نے ذرا اچھی طرح سے اسے
ڈیکورٹ کر لیا تھا۔ وقت نکل نکل کر مار کیشوں میں
دھکے کھاتا رہا تھا۔ بروے، صوفے، ٹیبل، برتن آہستہ
آہستہ اس نے بہت کچھ لے لیا تھا۔ فلیٹ وہ بیڈ رومز
لاؤنج، کچن اور ڈرائنگ ایریا پر مشتمل تھا۔

”یہ میں کے گھر جتنا بڑا نہیں ہے۔ لان بھی نہیں
ہے۔ الگ ڈرائنگ روم بھی نہیں ہے۔ یہ بڑے
بڑے ہاتھ روم بھی نہیں ہیں، لیکن یہ جتنا بھی ہے
سارے کا سارا تمہارا ہے۔“

افق فریض ہو گئی تو وہ اسے ڈنر کے لیے لے گیا۔

”کیا لگ رہا ہے یہاں آکر؟“

”اچھا ہے۔“ افق نے فرزام سے نظر بچا کر ہال پر
ایک نظر دوڑائی۔

”اورس۔“

اس نے جیسے سنائی نہیں۔ مسکراہٹ چھپا گئی۔

”اورس۔“ اسے یار چلا کر پوچھا۔

”ٹھیک ہی ہیں۔“ ڈائننگ میں ہونٹ کا دائیں
طرف کا ٹوٹا کر کما۔ ہنسی کا ذرا ٹکٹن کو تھا۔

”پورے سو ڈالر دینے کے بعد میں ٹھیک ہی ہوں
بس۔“

افق نے سوڈا پر سوال دیکھا۔

”جی ہاں۔ Men's Spa سے آ رہا

ہوں۔ سوڈا لڑیں تیار ہو کر۔“

انداز میں خفگی تھی۔ سوڈا لڑ ضائع جانے پر یا
تعریف نہ کیے جانے پر وہ منہ پر ہاتھ رکھ کر ہنسی تو دیر
تک ہنسی ہی رہی۔ وہ کوئی لیڈی ڈینا تھی جس کے
آنے پر وہ اس طرح سے بن گھن رہا تھا۔ افق نے
آتے ہوئے لپ گلوڑ لگایا تھا جو اتنی ہی فلاح میں
کب کا گم ہو چکا تھا۔ یہاں آتے ہوئے بھی اس نے
صرف کپڑے ہی تبدیل کیے تھے۔ بلیک شیفون کا
سوٹ جس کے تنگ بازوؤں پر سفید موتیوں کی تین
لائن بنی تھیں اور ایسی ہی تین لائنیں دوپٹے کے
چاروں طرف تھیں۔ سامنے سے بال اٹھا کر انہیں چند
بل دے کر پیچھے پن لگائی تھی اور بالوں کی ڈھیل چولی بنا
کر انہیں پیچھے سے لاکر بائیں کندھے پر رکھا تھا۔
دائیں کندھے پر وہ پٹا سلنے سے جھما ہوا تھا۔

”اب تمہیں بہت ہنسی آیا کرے گی۔“

”کیوں؟“

”میں اب بہت الٹا پلٹا سا بچہ بن گیا ہوں۔“

اس انداز پر وہ اور ہنسی۔

”دیکھا۔ مجھے معلوم تھا۔ تمہیں بھی بتا دیا ہے۔“

ساتھ ساتھ وہ دونوں کھانا کھا رہے تھے۔
”تمہارے پاس ایک ہفتہ ہے کھونٹے پھرنے کے
لیے۔“

”پھر؟“ وہ سمجھی کہ شاید ایک ہفتہ بعد وہ کہیں چلا
جائے گا۔

”پھر تمہیں نہیں معلوم؟ ایونٹ پر نہیں جانا
تمہیں نمائندگی کرنے؟“

”جی ہاں!“ اسے یاد آیا کہ یہاں وہ چنکی آؤٹ لیٹ
(Out let) لے کر آئی ہے اور کچھ پاکستانی

پوٹیک مالکان تھے جن سے ان کی بات چیت چل رہی
تھی۔ اسے فرزام کے ساتھ مل کر یہاں مستقل ایک
کارنر ڈھونڈنا تھا۔ ان کے جو مستقل کسٹمرز اسٹیشن میں
رہتے تھے۔ انہوں نے وعدہ کیا تھا ہر طرح کی مدد کرنے
کا۔ ایونٹ دس روزہ تھا اور اس کے بعد ہی کچھ ہو سکتا
تھا۔ ابھی تو ہی لچل فرزام کو شپ منٹا لانا تھی۔

پاکستانی اور انڈین کیونٹی نے مل کر اس ایونٹ کا اہتمام کیا تھا۔ ان کے ایک کلائنٹ نے ہی انہیں اس کے بارے میں بتایا تھا۔ باقی معلومات فرزام نے حاصل کر لی تھی۔ بنگلہ انہیں آسانی سے مل گئی تھی۔ دس روزہ ایونٹ ٹھیک ٹھاک رہا۔ جب کے ساتھ ساتھ فرزام نے اس کی مدد بھی کی۔ اسی ایونٹ کے دوران ان سے ایک بڑی اور فعال این جی او کا نامنا سندہ ملا وہ انہیں این جی او کی طرف سے کرواتے جانے والے دوسرے ایونٹ میں شامل ہونے کے لیے راضی کر رہے تھے۔ جس کا مقصد فنڈز اکٹھا کرنا تھا۔

این جی او ٹرڈورلڈ میں بچوں کی عام وبائی بیماریوں کی ویکسین مفت سلائی کرنے کا کام کرتی تھی اور اس کی لیے وہ کیونٹیز کو اکٹھا کر رہی تھی۔ این جی او کے ساتھ کام کرنے والے مجموعی منافع کا پچیس فیصد رکھ سکتے تھے۔ باقی کامنا منافع انہیں این جی او کو فنڈز دینا تھا۔

افق نے پاکستان میں مسز کو ہر سے بات کی۔ انہیں کوئی اعتراض نہیں تھا۔ وہ مطلوبہ آرڈر تیار کروا کے امریکا بھجوا سکتی تھیں۔ افق نے معاہدے پر دستخط کر دیے۔ معاہدے کی رو سے اگر وہ ایک خاص شرح سے زیادہ فنڈز اکٹھا کر کے دیں گی تو اسے این جی او کا رکن جانا جائے گا اور وہ این جی او کو اپنی آراء اور مشوروں سے نواز سکتی ہے۔ ایونٹ کے باقاعدہ شروع ہونے میں ایک مہینہ تھا۔ ہفتہ اور اتوار دونوں انہیں شہر کے مختلف کیونٹی سینٹرز میں نمائش منعقد کرنی تھی۔ ہر ہفتے نئی جگہ ہوگی۔

این جی او نے اسے دور رضا کار بھی دے دیے۔ کام کرنے اور کسی بھی مسئلے سے نمٹنے کے لیے۔ مقامی اور غیر ملکی پچاس سے زیادہ گروپس شرکت کر رہے تھے۔ پمفلٹ پر ”ہنر“ کو بھی نمایاں جگہ دی گئی تھی۔ اخبارات میں اشتہارات دیے گئے۔ ٹی وی میں فنڈز ریزنگ کے لیے تشہیر کی گئی۔

اس سے آن لائن رابطے میں رہتی۔ دونوں اکٹھے ہر ڈسکس کرتی رہیں کہ کس ڈیزائن اور کس میٹرل کو لے کر کام کرنا ہے۔ رنگ کون سے اچھے رہیں گے اور کس کپڑے کو پوسٹن کے لوگ پسند کریں گے۔ پاکستانی مخصوص روایتی لباس ہی بنا رہے تھے۔ لیکن کیونکہ اس ایونٹ میں ہر ملک کے لوگ آنے والے تھے تو انہوں نے جینز پر پہننے کے لیے مختلف ڈیزائن کے کرتوں پر بھی کام کیا تھا اور چھوٹے کر اس بیکس پر ٹین این جی او کیوں کے اسٹائلز پر بھی۔

یہ ایونٹ تین مہینے تک جاری رہتا تھا۔ ان کے پاس کام کے لیے وقت تھا پہلا اسٹاک جلد ہی مل جاتا تھا۔ این جی او کی طرف سے انہیں بریفنگ دی جارہی تھی اور ٹریڈ کیا جا رہا تھا۔ انہیں بتایا جاتا کہ انہیں کیسے اپنی مصنوعات کو ڈپلے کرنا ہے۔ کم سے کم پرائز ٹیک کیا ہونے چاہئیں اور زیادہ سے زیادہ کیا۔ انہیں پہلے جمع کیے گئے فنڈز کے بارے میں بتایا گیا۔ انہیں اچھی طرح بریف کیا گیا کہ کس طرح وہ پہلے سے زیادہ فنڈز اکٹھا کر سکتے ہیں۔ این جی او کے ریکارڈ کو توڑ سکتے ہیں۔ ان سے سوالات کیے جاتے۔ مشورے مانگے جاتے۔ انہیں ٹرڈورلڈ کے پیار بچوں کی مختصر ڈاکو منٹرز دکھائی جاتیں۔ یوں انہیں فنڈز ریزنگ کے لیے اچھی طرح تیار کر دیا گیا۔

☆ ☆ ☆
”ایک بار ملانے لگا تھا کہ افق ”ہنر“ ہے تم تو زبان ہی ”پامٹ خیر“ بن گئی ہو۔“ بات اچھی تھی لیکن انداز ذرا افسردہ تھا۔
وہ ڈانٹنگ ٹیبل کی کرسی پر بیٹھی اپنا کام کر رہی تھی۔ قریب ہی پاکستان سے بھیجا گیا پہلا اسٹاک بھرا رہا تھا۔ وہ انہیں جانچ رہی تھی اور الگ الگ کر رہی تھی ساتھ ساتھ پیڈر نوٹس لکھتی جارہی تھی۔ ایونٹ کے پہلے ہفتہ کے لیے وہ خاص انٹرس کلیکشن کا انتخاب کر رہی تھی۔
”کیا مطلب۔؟“ مین کو تیزی سے چلاتے اس

نے پوچھا۔ فرزام نے آگے بڑھ کر اس کا پتہ لپک لیا۔
”کو تو میں نہ جاؤں۔“ قریب ہی کی کرسی پر وہ بیٹھ گیا۔
”اس کی سمجھ میں نہیں آئی تھی۔“ کہاں؟“
”کیونکہ“ دونوں ہاتھوں کو اواسی سے تھوڑی کے نیچے رکھا۔
”آپ کے آفس والے بھیج رہے ہیں؟“

”نہیں۔“ آٹھ ماہ پہلے میں نے وہاں کی ایک کمپنی کو درخواست دی تھی۔ ساتھ ہی اپنے کام کی تفصیل اور سی ڈی بھی بھیجی تھی۔ کمپیوٹر سے متعلق کچھ نئی اصلاحات پر کام کیا ہے میں نے۔ چند سوفٹ ویئرز بھی میں سمجھتا ہوں کہ میں کامیابی سے بنا سکتا ہوں۔ وہ مجھے انٹرویو کے لیے بلا رہے ہیں۔“ باتیں وہ اچھی کر رہا تھا۔ لیکن منہ بڑھتا ہی جا رہا تھا۔
”تو جاسیو نا۔“ دراصل وہ سمجھ ہی نہیں پائی تھی وہ اس کیوں ہو رہا ہے۔

”ہاں تو جاسیو رہا ہوں۔“ وہی لالی باپ نہ ملے گا انداز۔ افق کو حیرانی تھی کہ وہ خوش کیوں نہیں ہے۔
”تم مجھے پسند نہیں کرتیں؟“ اس نے اچانک پوچھا جیسے دراصل یہی پوچھنا چاہ رہا ہو۔ افق نے الجھ کر اس کی طرف دیکھا کہ اس نے یہ سوال کیوں کیا اور یہ کیوں سمجھا کہ وہ اسے پسند نہیں کرتی۔

”یہ کیسا سوال ہے۔؟“ وہ واقعی حیران تھی۔
”تم مجھے روک ہی نہیں رہیں۔ تمہیں کتنا چاہیے تھا کہ نہ جاسیو نا۔ تم نے کہہ دیا کہ جاسیو نا۔“
”اوہ۔“ افق کی سمجھ میں اب بہت آئی تھی۔ اس کی لگاؤں جب تک کہیں اور اس نے سامنے رکھے پیڈر نہیں گاڑ دیا۔
وہ چاروںوں کے تعلق کے درمیان ایک فاصلہ بناد سے ہی چلا آ رہا تھا۔ وہ اب بھی وہیں تھا وہ تم ضرور ہو رہا تھا لیکن ابھی تک موجود تھا۔ فرزام اس کے ساتھ چل کر آ رہا تھا۔ لیکن اس کی کمر میں اپنے بازو جمائے نہیں کرتا تھا۔ نہ ہی اس کا بازو تھامتھا تھا۔ جب

افق بچپن میں کام کر رہی ہوتی اور وہ اس کے پاس آکر کھڑا ہو جاتا تو کچھ نہ کچھ ضرور افق کے ہاتھ سے گر جاتا اور وہ مسکراہٹ دیتا یا بچپن سے چلا جاتا۔ اگر انہیں ایک ہی صوفے پر بیٹھنا ہوتا تو وہ ذرا فاصلہ رکھ کر بیٹھتے۔ ورنہ الگ الگ صوفوں پر ہی بیٹھتے۔ وہ روماس کے دور میں داخل ہو رہے تھے۔ لیکن روماس کرتے نہیں تھے۔ افق جب اکہلی ہوئی، بس میں بیٹھے۔ ٹیوب میں۔ این جی او کی بریفنگ لیتے۔ سبزی اور گوشت کی خریداری کرتے۔ ڈھیر سارے پھنکڑ کو ہاتھ میں پکڑے۔ فٹ ہاتھ پر چلتے۔ سڑک کو پار کرتے۔ ٹکٹ لیتے۔ گھر کا لاک کھولتے۔ وہ اسی کے بارے میں سوچ رہی ہوتی۔ وہ دن رات اسے سوچتی۔ کام کے دوران بھی اسے کھوتی۔ پاکستان میں وہ اس کے آن لائن آنے کا انتظار کرتی تھی۔ یہاں وہ اسے بار بار دیکھنے کا انتظار کرتی تھی۔ پاکستان میں وہ انتظار کم تھا۔ یہاں بہت بڑھ گیا تھا۔ فرزام اس کا شوہر تھا۔ جس کے کھوجانے کا اسے کوئی خوف نہیں تھا۔ جس کے چلے جانے کا کوئی خطرہ لاحق نہیں تھا۔ وہ اسے بہت بہت پسند کرتی تھی۔ بہت یاد کرتی رہی تھی۔

”نہ جاسیو۔“ اس نے اکتاؤ سے کہہ دیا۔ وہ یہ نہیں چاہتی تھی کہ وہ سمجھے کہ وہ اسے پسند نہیں کرتی اور وہ یہ بھی نہیں چاہتی تھی کہ جس کام کے لیے اس نے اتنی محنت کی ہے وہ صرف اس کی وجہ سے اس محنت کا ثمر نہ کھائے۔ اگر وہ امریکا نہ آئی ہوتی تو وہ چلا ہی جاتا۔ اس طرح اس کے کہنے پر وہ بہت خوش نظر آنے لگا۔ جیسے جانا تو اسے بھی ہے۔ لیکن روکے جانے کی اسے بہت خواہش ہے۔

”میں تمہیں یہاں بلا کر خود یہاں سے جانا نہیں چاہتا۔ میں جانتا ہوں۔ انٹرویو تو ہمانہ ہے۔ میرا کام ایسے پسند آ گیا ہے۔ وہ میرے آگے کانٹریکٹ رکھ دیں گے۔“ ٹیبل پر رکھے اس کے ہاتھ پر اس نے ہاتھ رکھ دیا۔
افق کا دل چاہا کہ وہ ہاتھ اٹھالے اور یہ بھی کہ وہ اس کے ہاتھ پر ہی رہے۔ وہ سمجھ گئی کہ وہ جانا ہی چاہ رہا ہے

”ایسے سنری موقتے بار بار نہیں ملتے۔“

اس بات پر وہ خاموشی میں سمٹ گئی۔ وہ چاہتی تھی کہ فیصلہ وہ خود کرے۔ اگر وہ اسے جانے کے لیے کہے تو شاید وہ رمان جائے اور اگر روک لے تو اس کا خواب توڑ دے۔

دونوں وہ ایسے ہی الجھ رہا۔

”اس پروجیکٹ پر کام کرنے سے مجھے اچھے خاصے پیسے ملیں گے۔ میں کافی امیر ہو جاؤں گا۔ بہت زیادہ اپنے پیسوں والا۔ پھر تم میرے ساتھ پیرس چلو گی؟“

یہ صرف ایک سوال تھا۔ لیکن سر ہلانے سے پہلے جب اس نے اس کی طرف دیکھا تو جانا کہ یہ صرف ایک عام سا سوال نہیں ہے یہ ان دونوں میں چھپی ہوئی ”عجبت“ ہے۔ مدھم سی مسکراہٹ اس کے ہونٹوں اور آنکھوں میں چکی۔ فرزام کی نظریں اسی چمک دھمک پر جمی تھیں۔

”ٹھیک ہے۔ طے ہوا۔ ابھی تو ایسا ہے کہ زندگی افزا تفری کا شکار ہے۔ تم فنڈ ریزنگ کے لیے کام کر رہی ہو۔ پوسٹن میں اتھریں ایک کارنر بھی چاہیے۔ مال مجھے بار بار فون کر کر کے کہہ رہی ہیں کہ ان کے کارنر کا کیا بنا۔ ایک دو لوگوں سے بات چل رہی ہے۔ ساتھ چلنا۔ تم بھی مل لینا اور میرے آنے سے پہلے ہر کام سے فارغ ہو جانا۔ ٹھیک ہے۔“ ساتھ سر بھی ہلایا۔

”پروجیکٹ پر ہی کام کروں گا۔ کمپنی مجھے چاہ بھی دے گی۔ لیکن مجھے کینیڈا میں نہیں رہنا۔ وہاں کام و سہ نہیں پسند مجھے۔ اگر وہ مجھے برطانیہ میں اپنی کمپنی کی برانچ میں سیٹ کر دے تو ٹھیک ہے۔ میرے بھی کچھ خواب ہیں اور میں چاہتا ہوں کہ میں برطانوی حکومت کو یہ پاسکوں کہ انہوں نے کس قدر لائق فائق لڑکے کو نکال باہر کیا۔ ویرا دینے سے انکار کر دیا۔ اس بار انہیں مجھے اعزاز سے سزا دینا ہو گا۔“

ماما کہتی تھیں کہ وہ پریشانی اور خوشی میں بولتا بہت ہے۔ اب ان کی یہ سوجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ خوشی

میں بول رہا ہے یا پریشانی میں۔ ان کے سوچا کہ اسے ایک بار پھر فرزام کو روکنا چاہیے۔ شاید وہ یہی چاہتا ہے۔

”کر دل نہیں چاہ رہا تو نہ جائیں۔“

بولتے بولتے رگ کر رہا اسے دیکھنے لگا۔ ”مڈل کر رہی ہو؟“

سرنگی میں ہلایا۔ ”روک رہی ہوں۔“

”اب میں تمہیں پیرس گھوما کر ہی رہوں گا۔ چہ دونوں کی بات ہے ہمیں سیٹ ہو جاؤں گا۔“ آخری بات کہتے کہتے منہ کو زیادہ لٹکایا۔

بہتے کے اندر اندر وہ چلا گیا۔ وہ اپنے کام میں بے حد مصروف تھی۔ لیکن اس بار یہ مصروفیت اسے اچھی نہیں لگی۔ پوسٹن آنے کے بعد دو ہفتہ وہ گھومتے رہے تھے۔ وہی ٹھیک تھا۔ وہ کام سے نہیں جھکتی تھی۔ لیکن اب اسے اپنے آس پاس فرزام چاہیے تھا۔ جیسے وہ نیپل پر بیٹھی کام کر رہی ہو تو وہ اچانک اس کا پین آکر اچک لیتا۔ سندس کو ”پائے پائے“ کہتا۔ چاکلیٹ دودھ کا گلاس اس کے سامنے لا کر رکھتا اور ایم پی ٹھری کے ایر فون اس کے دونوں کانوں میں لگاتا۔

”پہلے گلاس ختم کرو۔ پھر کم سے کم تین گانے سنو۔ پھر کام شروع کرنا۔“ وہ گلاس پی جاتی۔ تین گانے سن لیتی اور پھر سے پین پکڑ لیتی۔ رات گئے سندس کے ساتھ ڈیو چیٹ پر جب وہ ڈسکشن کر رہی ہوتی تو قریب ہی صوفے پر آؤاڑتھا لیٹے وہ اپنی جمائیاں روک رہا ہوتا۔ بظاہر وہ بیوی دیکھ رہا ہوتا۔ لیکن دراصل اسے الارم دے رہا ہوتا کہ اب بس کرو کام۔ اور دوسری تیسری بار جب وہ اس پر نظر ڈالتی تو وہ صوفے سے لڑھک کر نیچے کارپٹ پر سوجھا ہوتا۔ اس نے ٹھیک کہا تھا کہ وہ انٹیلٹنا ساجین بن گیا ہے۔

اور افاق جیسے اقوام متحدہ کی سفیر بن گئی تھی۔ کام اس کی طرف بھیجے جاتے۔ گھر کے کام اور کھانا وہ پہلی فرصت میں ہی بناتی تھی۔ باقی کے اپنے کام سارا وقت کرتی۔

”کیا تم روز کھانا بناتی ہو یا؟“ ایک دن وہ آفس سے آکر بولنے لگا۔

”نہ بنایا کروں؟“

”کبھی نہ ہی دیا کرو کہ“ فرزام جی! مجھ سے نہیں ہوتے اتنے کام۔ یہ کھانا دانا میں نہیں بنا سکتی اب۔ جلیں! کہیں باہر چل کر کھاتے ہیں۔“ وہ اس کی آواز اور انداز کی بھربھور نقل اتار رہا تھا۔

”فرزام جی!“ اسی کی طرح ”فرزام جی“ کو تان میں کھینچا۔ ”ہم یہ کھانا باہر چل کر کھالیں؟“

”یہ کھانا باہر کہاں؟“

”اس بلڈنگ کے گارڈن میں۔“ ہاتھ سے کھڑکی کی طرف اشارہ کیا۔

”تمہارا خیال ہے کہ باہر کھانا کھانے سے میرا یہ مطلب ہے گھر میں بیٹاؤ اور باہر جا کر کھالو۔ ہو گیا باہر جا کر کھانا۔ ایسا کرتے ہیں کسی ہوٹل کی پارکنگ میں اپنے پیچھے بیٹھیں اور گلاس لے کر چلتے ہیں اور وہاں کھاتے ہیں کھانا۔ ایسے ہو جائے گا ہوٹل میں کھانا کھانا۔“

وہ خوب ہنسی اور منٹوں میں تیار ہو کر آگئی۔ ”چلیں۔“

”کہاں؟“ فرزام کو معلوم تو تھا۔ لیکن اسے چڑا رہا تھا۔

”ہوٹل کی پارکنگ میں کھانا کھانے۔“

دونوں جی جان لگا کر ہنسنے۔

فنز ریزنگ کا سہلا ایونٹ ٹھیک ٹھاک رہا۔ لوگوں کی بڑی تعداد نے شرکت کی تھی۔ افاق کا سکور بھی اچھا رہا تھا۔ آئندہ کے لیے وہ اوپر پر امید ہو گئی۔ اسے معلوم ہو گیا تھا کہ اس کی مصنوعات میں وہاں کے لوگوں کی دلچسپی کا خاص مرکز کیا تھا اور کتنا زیادہ پسند کیا گیا اور کیا مقصد یہ تھا کہ اس کے موٹے کرتے تھے۔ جن پر کام تو مٹتی ہوا تھا۔ لیکن ان کے فیڈ بک ایسے تھے کہ لگتا تھا کہ ہاتھ سے بنائے گئے ہیں۔ مشینی کڑھائی میں

یورپین ممالک ہر ملک سے آگے ہیں۔ اس لیے وہاں کے لوگ ان چیزوں میں خاص دلچسپی لیتے ہیں جو کسی دوسری ثقافت کی نمائندہ ہو۔ ان کڑوں پر روایتی ٹانگوں کو مشین سے بنایا گیا تھا۔ کیونکہ ہر شخص وہ چیز لینا چاہتا ہے جو کسی دوسرے کے پاس نہ ہو تو ایسے میں دوسرے ملکوں کی روایتی چیزیں دھڑا دھڑا فروخت ہوتی ہیں۔ ہندوستانی اسٹالوں پر بھی کم و بیش ایسی ہی چیزیں تھیں۔ لیکن رنگوں اور ڈیزائن میں فرق ایک چیز کو دوسری سے الگ کر رہا تھا۔ وہاں ان کا مقصد متاع نہیں فخر و تہ ہے اور سب ہی چاہتے تھے کہ وہ اچھے فنڈز اکٹھے کر لیں۔ افاق کو اچھا لگا رہا تھا ان جی اوکے لیے کام کرنا۔ مختلف طبقہ ہائے زندگی اور شعبہ ہائے زندگی سے تعلق رکھنے والے بے شمار امریکی مشہور و معروف قانون دان، کھلاڑی، صحافی، اساتذہ، ڈاکٹر، وکیل، سینئیر زور بے شمار دوسرے لوگ رضا کار بنے ہوئے اپنے اپنے طور پر کام کر رہے تھے۔ سامان کو اٹھانے اور صفائی کرنے میں شرم محسوس نہیں کرتے تھے۔ جو دو رضا کار اس کے ساتھ تھے ان میں سے ایک ساتھ سالہ سرجن ڈاکٹر تھے۔ دوسرا رضا کار ایک نوجوان لڑکا تھا۔ جو ایک امیر باپ کا بیٹا تھا۔ ایسی صورت حال میں افاق کا جذبہ اور بلند ہو گیا۔

واپسی پر وہ فرزام کو ایک ایک بات بتاتی۔ پیر تک وہ مصروف رہی۔ اگلے دو دن اس کے پاس بہت وقت تھا۔ اس نے گھر کے لیے ضروری خریداری کی۔ فرزام کے دوست کی بیوی نعل اس کے ساتھ ہی تھی۔ اس نے زندگی میں کسی لڑکی کو لپ اسٹک کے لیے اتنا جنونی نہیں دیکھا تھا، جتنی وہ تھی۔ وہ شاپنگ مال میں، ٹیکسی میں بیٹھے ہوئے، ریستورانٹ میں آکس کریم کھاتے ہوئے آس پاس موجود خواتین پر نظریں گاڑے رکھتی۔ ان کے ہونٹوں پر۔۔۔ اگر خاتون دور ہوتی تو آنکھیں سکڑ لیتی۔ ورنہ ذرا سا قریب چلی جاتی۔ وہ اس حساب کتاب میں رہتی کہ چمکتی آنکھوں والی، سنہرے بالوں والی، گلابی رنگت والی لڑکی نے جو پرل سی ڈرا سی ہلی اور بے بی پنک سے ذرا سی گہری لپ اسٹک یا لپ

گلوڑ لگایا ہے۔ وہ اس کے پاس ہے۔ نا۔ اس کے ساتھ ساتھ چلتے وہ بتاتی جاتی۔
 ”یہ جو ٹیلے اسکرٹ میں لڑکی گزری ہے۔ نا۔ ہاں۔
 وہ۔ وہ۔ اس نے جو لپ اسٹک لگائی ہے وہ میرے پاس ہے۔ اور وہ جو موٹی عورت نے لگائی تھی وہ نہیں ہے۔“ اکثر وہ ان کے پاس چلی جاتی۔ بین سے ہاتھ پر برائڈ اور لپ اسٹک کا نمبر لکھتی اور ”تھینک یو“ کہہ کر پلٹ آتی۔

اس کے وارڈروپ میں اتنے کپڑے اور جوتے نہیں تھے جتنے لپ اسٹک اور لپ گلوڑ کے پاس تھے۔ افق میک اپ نام کی چیز سے واقف نہیں تھی۔ نہ ہی اسے شوق تھا۔ لیکن مکمل کے کہنے پر اس نے میک اپ کی کچھ چیزیں لے لیں۔ اس نے سوچا کہ وہ میک اپ کر کے فرزام کو حیران کر دے گی۔ اسے بھی معلوم ہو کہ وہ اس کے لیے کیا کچھ کر سکتی ہے۔

اسی دن شام کو وہ کلوچ پر دروازہ ایک پرانی فلم دیکھ رہی تھی۔ قریب ہی چائے کا بڑا مکان رکھا تھا۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے تک وہ محل کے ساتھ خرید اہوا میک اپ کا سامان لگا لگا کر دیکھ رہی تھی۔ اسے سب اچھا ہی لگا۔ ابھی اسے میک اپ کرنا نہیں آتا تھا۔ لیکن اگر وہ روز بک سا کر لیا کرے تو فرزام کے آنے تک سلیقے سے کرنا آئی جائے گا۔

چائے پیتے، فلم دیکھتے اس نے آج خرید کر لائے میگزینز میں سے ایک کو میز پر سے اٹھالیا۔ یہ مقامی سطح پر شائع ہونے والا اردو میگزین تھا۔ نہ اسے فلم میں دلچسپی تھی نہ ہی فی الحال میگزینز میں۔ اسے فرزام کے فون کا انتظار تھا۔ اس نے فون کیا تو اس نے یہ کہہ کر بند کر دیا کہ ”میں بھی کرتا ہوں۔“ اور پچھلے ڈیڑھ گھنٹے سے اس کا ابھی چل رہا تھا۔

میگزین کی ورق گردانی کرتے اس کا ہاتھ ایک صفحے پر آکر ساکت ہو گیا۔ نیوی اسکرین پر ہیروئن رو رہی تھی، چلا رہی تھی۔ لیکن اسے سنائی نہیں دے رہی تھی۔ اندھیرے کا ایک کمرہ اس کی آنکھوں میں سے ہو کر گزر رہا تھا۔ حقیقت یہ تھی کہ وہ ایک پل کے

لیے تڑپ کر مر گئی۔ محلی اور سانس اکٹھے کرنا کا شعور احساس ہوا۔ وہ واش روم کی طرف بھاگی اور منہ ٹھنڈے پانی کے چھینٹے مارے۔ منہ صاف کر کے دوبارہ لاؤنج کی طرف آئی تو اس میگزین کو کھولنے کے بجائے اس کے اس طرح اٹھ کر جانے پر کلوچ سے پتھر کر گیا تھا۔

اس میگزین میں عدن تھا۔ اس شخص پر نظر پڑنے ہی نفرت سے ہی سسی سس کی سانسیں اکٹھے لگتی۔ وہ پلٹ کر وہی افق بن گئی جو ڈی ایچ اے سے غلام علی غلام کے ہاتھوں سے اپنی عزت بچا کر نکلی تھی۔ جس کے گلے میں چادر جھول گئی تھی اور جو سرگ پر جاسے پناہ کے لیے بھاگی پھر رہی تھی۔

اس کا خیال تھا کہ اس شخص سے آئندہ اگر کبھی ملی تو وہ اس پر ہونک دے گی۔ لیکن اب وہ کانپ رہی تھی۔ یہ اس کا وہاں تھا۔ جس پر وہ بہت پشیمان تھی۔ تھوڑی دیر وہ ایسے ہی کھڑی کارپٹ پر گرے عدن کو دیکھتی رہی۔ پھر آگے بڑھ کر میگزین کو اٹھا لیا۔

”میں بی بی ایس ڈاکٹر عدن غلام علی پاکستان“ اس تعارفی سطر کے نیچے مختصراً ”اس کے ساتھ پیش آنے والا واقعہ درج تھا۔ یہ ایک آرٹیکل تھا۔ جسے ایک مقامی مسلمان صحافی نے شائع کیا تھا۔ یہ ان لوگوں کے بارے میں تھا۔ جنہیں بے گناہ یا بے حد معمول الزامات لگا کر سالوں سے جیلوں میں قید کر رکھا تھا۔ ان پر دہشت گردی کا شبہ کیا گیا تھا اور سالوں سے وہ شبہ نہ تو تصدیق میں بدل رہا تھا اور نہ ہی مخالفت میں۔ آرٹیکل میں کل بیس ایسے لوگوں کا ذکر مکمل تعارف اور تفصیل کے ساتھ کیا گیا تھا۔ باقی اعداد و شمار الگ سے تھے۔ افق نے آرٹیکل کو ایک بار پڑھا اور عدن کے ساتھ ہوئے واقعے کو یقین پار۔

جب وہ بار بار اس کے ساتھ پیش آنے والے واقعے کو پڑھ رہی تھی تو شاید اچانک نے میں وہ اس کے باپ کے ہاتھوں ہوئی اپنی بے عزتی کا بدلہ لے رہی تھی۔ لیکن

صرف ایسا بھی نہیں تھا۔ حیرت اور افسوس کی ایک تیز دھار اس کے اندر سے پھوٹ رہی تھی۔ وہ ایک دم ایک ایسی لوری سختی بن گئی۔ جس پر ”عدن“ بھی ڈوب اُبھر رہا تھا۔

ڈور بیل بہت زور و شور سے بجنے لگی۔ اس بار وہ آواز پر چوکی۔

”تم ٹھیک تو ہو افق؟“ نمل نے چھوٹے ہی پوچھا تو وہ اور گھبرا گئی کہ اس نے یہی کیوں پوچھا۔

”فرزام کا فون آیا تھا۔ کہہ رہا تھا۔ تم دونوں میں سے کوئی بھی فون نہیں اٹھا رہیں۔ وہ کب سے فون کر رہا ہے۔“

”میں واش روم میں تھی۔“ اس نے جھوٹ بولا۔ لاؤنج کی طرف واپس آتے وہ اور پریشان ہو گئی۔ اسے قریب ہی رکھے موبائل کے چھ بار بجنے پر بھی پتا ہی نہ چلا۔ آخر کیوں؟ کس لیے؟

فرزام کو فون کیا۔ واش روم کا پتایا۔ وہ بات اس سے کر رہی تھی۔ دیکھ میگزین کو رہی تھی۔

”تھک گئی ہو افق؟“

”نہیں تو۔“ جواب کے درمیان ذرا سا وقفہ آیا۔ ”تم آرام کرو۔ پھر بات ہوگی۔“ وہ ناراض نہیں ہوا تھا۔ اس کی عتاب دہانی پر خود ہی یقین کر لیا کہ وہ تھک گئی ہوگی۔

وہ اسی اور لپ ٹاپ گود میں رکھ کر بیٹھ گئی۔ عدن کی تفصیل میں اس کے وکیل کا ذکر بھی تھا اور بیان بھی۔ سرچ آج سے اس نے یو ٹیوب کے وکیل

عبدالعزیز کو دھونڈ لیا۔

افق کو معلوم نہیں تھا کہ اس نے عدن سے متعلق اس آرٹیکل کو کیوں پڑھا۔ فرزام کی کالز کو کیسے مس کر دیا اور اب اس کے وکیل کو کیوں ڈھونڈا۔ افسوس کی بجائے اس کے اندر سے اٹھی تھی۔ سب اسی کے زیر اثر کیا۔ ایسا تو تھا ہی نہیں کہ وہ عدن کی شکل بھی دیکھنا

میں چاہتی تھی۔ اسلام آبادی۔ ایم۔ ایچ کے باغ میں بیٹھ کر اس نے دعا کی تھی کہ زندگی میں یہ شخص ایک بار تو ضرور اسے ملے۔ بے شک افق کے ہاتھ میں

کشول ہو اور عدن کے ہاتھ میں خیرات۔ وہ اس شخص سے ضرور پوچھے گی کہ عزت سے چھوڑ دینے کے لیے تو اس نے خود کہہ دیا تھا۔ اسے دھوکا دے کر بھاگنے کی ضرورت کیا تھی؟

وکیل عبدالعزیز کا نمبر ملایا۔

”محبت ماریہ سے کرنا تھا۔ شادی بھی اسی سے کی۔ دھوکے کے لیے افق ہی کیوں؟“ نمل جاری تھی۔

”اگر وہ کبھی افق کی زندگی میں نہ آتا تو وہ اس کے گدھے باپ کے سامنے نہ جاتی۔“

”لائبر عبدالعزیز اسپیکنگ۔۔۔ واٹ کین آئی ایملپ یو؟“

”ڈاکٹر عدن غلام علی کے وکیل آپ ہیں؟“

”ہیں۔“

”کیا وہ افقی بے گناہ ہے؟“

”پہلے اپنا تعارف کروائیں لڈی!“

”کیا وہ دہشت گرد ہے؟“

”آپ کا نام لڈی؟“

”کتی سزا ہوگی۔؟ رہا ہو گا بھی کہ نہیں۔؟ کیا وہ بیچ بھڑ دہشت گرد ہے؟“

”آر یو مس افق۔۔۔؟“

”مس افق۔۔۔ مس افق۔۔۔ مس افق۔۔۔“

فرزام کے فلیٹ میں اس فقرے کی بازگشت کو بچنے لگی۔ فون افق کے ہاتھ سے کرتے کرتے بچا۔ وہ اسے کیسے جانتا تھا۔ سات سمندر پار۔ ایک انجانا شخص۔ جس سے آج اس کی پہلی بار بات ہو رہی تھی۔ وہ اس کا نام لے رہا تھا۔

”آر یو دیر مس افق۔۔۔؟“ وہ یقین ہی کر بیٹھا تھا کہ وہ افق ہی ہے۔ خاموشی کا وقفہ جاری رہا۔

”آر یو اوکے۔۔۔؟“

آخر کار اس نے مری مری آواز میں ”ہیں“ کہا۔

”آپ مجھے کیسے جانتے ہیں؟“

”تو آپ مس افق ہی ہیں۔ میرا اندازہ ٹھیک ہی تھا۔ پچھلے چار سالوں سے میں نے ایک ہی نام لاکھوں

بار سنا ہے۔ افق۔ افق۔ افق۔ اسے کو میرے لیے دعا کرے۔ مجھے آزاد کروا لے۔ افق کی؟ کہاں ہے وہ؟

فون اس کے ہاتھ سے گر گیا اور اس کی ہینڈی الگ ہو گئی۔ منہ پر ہاتھ رکھ کر اس نے اپنی چیخ کو روکنا چاہا۔ یہ کیا ہو رہا ہے؟ عدن تو دھوکے باز ہے۔ اسے تو اس پر تھوکتا ہے۔ اس کا گریبان پکڑتا ہے۔ پھر یہ سب اتنے سارے وہ اسے یاد کرتا رہا ہے۔ اس کا نام لیتا رہا ہے۔

منہ پر ہاتھ رکھ کر وہ بیٹھی رہی۔ ذرا دیر بعد اس پاس ایسے دیکھنے لگی جیسے پستانا ٹوٹ گیا ہو۔ یا اپنے میں ہو اور بلک بلک کر التجا کر رہی ہو کہ یہ خواب ہی ہو اور بس۔

”او خدا یا!“ اس نے سر کو تھام لیا۔ آنسو آنکھوں سے رواں ہو گئے۔ اب یہ آنسو کس احیاس کے تحت تھے۔ افق اس کا فیصلہ ابھی نہیں کر سکتی تھی۔ بہت دیر تک وہ ایسے ہی بیٹھی رہی۔ فون کی ہینڈی اس میں واپس ڈال کر فون آن کیا۔ عبدالعزیز کا ایک میسج موجود تھا۔

”میرے آفس میں آکر ملیں۔“ ساتھ ہی آفس کا پتا بھی لکھا تھا۔ اس نے افق کو آفس میں آنے کے لیے کیوں کہا اور وہ کیوں جانے؟ کس لیے؟ وہ نہیں جانے گی۔ اسے نہیں جانا چاہیے۔ وہ کیوں نہ جانے؟ اسے کیوں نہیں جانا چاہیے؟

سوالات آگے پیچھے اس کے اندر باہر بن رہے تھے۔

نیلا کرتا، جینز اور جو گرز پن کر بیگ کو کندھے پر لٹکا کر وہ دروازے کو لاک لگا کر نیچے آگئی۔

افق نے عدن کا اعتبار کیا تھا۔ اس کی مدد لینے ڈی ایچ اے اس کے باپ کے پاس پہنچی تھی۔ یہ وہ بڑی غلطیاں تھیں۔ لیکن اس بار وہ ایک فاش غلطی کرنے جا رہی تھی۔

”مجھے صرف تجسس تھا۔ میں اس لیے یہاں آئی

ہوں۔“ وہ آگئی تھی۔ مگر اب پچھتاہی تھی۔ اس کی بجائے وہ ہشت گردی سی۔

”آپ صرف تجسس منانے کے لیے آئی ہیں؟“ ایک کہنے مشق وکیل نے اس کی بودی وکیل کو ہنسنے سے ایک طرف کر دیا۔

”یہ سچ ہے۔“ وہ اس کا طعنے سمجھ گئی۔

”سچ کے بارے میں آپ بھی جانتی ہیں۔ لیکن آپ عدن کی مدد نہیں کریں گی؟“

”ہیں۔؟“ اس لفظ مدد کا تو اسے گمان بھی نہیں تھا کہ اسے کہا جائے گا اور اس سے یہ سوال پوچھا جائے گا۔

”آپ پہلی خاتون ہیں۔ دراصل کوئی پہلا انسان ہے جو اس کیس کے سلسلے میں میرے پاس آیا ہے۔“

”ان کی وائف۔؟“

”ان دونوں کی علیحدگی ہو چکی ہے۔“

”عدن کا خاندان؟“ وہ لفظ قادر استعمال کرنا نہیں چاہتی تھی۔

”وہ یہاں نہیں آسکتے۔ اس کے فادر نے کوشش کی تھی۔ انہیں ویزا ہی نہیں دیا گیا۔“

قادر کے نام پر ایک آسانی بجلی اس میں سے ہو کر گزری۔

”میری جب بھی اس سے ملاقات ہوتی ہے اس کا پہلا سوال یہی ہوتا ہے۔ ”کیا افق ملی؟“ کہاں پڑا گئی وہ؟“ مس افق! اسے آپ بہت یقین ہے کہ آپ اس کے لیے بہت کچھ کر سکتی ہیں۔ آپ دوست ہیں اس کی۔“

افق نے گھور کر اسے دیکھا۔ وہ خاموش سا ہو گیا۔

”میں نے بہت سی این۔ جی۔ او اور قانونی اداروں کو خطوط لکھے ہیں۔ لیکن کسی کی طرف سے کوئی تحلیف نہیں ملا۔ اس کا کیس اتنی سست روی کا شکار ہے کہ اگر فیصلہ اس کے حق میں ہو بھی گیا تو سالوں لگ جائیں گے۔ آپ عدن کی مدد کریں گی مس افق؟“

پھر وہی سوال۔ افق بری طرح سے چڑ گئی۔ ”میں

کیوں۔؟“ ”آپ اس کی مدد کرنا نہیں چاہتیں۔؟“ اس نے آنکھیں پڑھتے ہی وکیل کو ڈھونڈ نکالا تھا۔ اس کے پریشانی فون کیا تھا۔ اس کے آفس آگئی تھی اور اب مدد کے نام پر اتنا چڑ رہی تھی۔ ”ہاں، نہ نہیں کر رہی تھی۔“

”جس نفسیاتی کیفیت سے وہ گزر رہا ہے۔ اسے یقین ہے کہ صرف آپ ہی اسے آزاد کروا سکتی ہیں۔ آپ اس کی امید ہیں۔ اس کا یقین ہیں۔ اس کا ماننا ہے کہ آپ سب کچھ کر سکتی ہیں۔“

”مطلب ماننا ہے۔“ افق کی آواز تیز ہو گئی۔

”میں نے کہا۔ آپ اس کے لیے دعا کریں گی۔“

”اللہ ہر بے گناہ پر رحم کرے۔“

”اس سے چھوٹی سی غلطی ضرور ہوئی ہے۔ لیکن وہ دہشت گرد نہیں ہے۔“

”اللہ ہی بہتر جانتا ہے۔“

”جو جانتا ہے اسے بتانے کے لیے وہ خود زمین پر نہیں آتا۔ ہندوں کو یہی سچ اور جھوٹ ثابت کرنے کی کوشش کرنی ہوتی ہیں۔“

”تو پھر یہ آپ کا کام ہے۔“ مطلب افق نے انکار کر دیا۔

”آپ کس کام سے میرے پاس آئی ہیں؟“ بہت قلم پوچھا گیا۔

وہ دونوں اس کے آفس میں ایک طرف رکھے صوفوں پر آنے سامنے بیٹھے تھے۔

”ایسے ہی۔“ وہ اگر وہاں بیٹھ کر یہ سوال سن کر پھر ہنسیاں ہوتی۔

”ایسے ہی۔؟“ اصرار سے پوچھا گیا کہ ثبوت دو کہ یہ ایسے ہی ہے۔

اس سوال اور انداز پر افق نے کوئی اور رد عمل نہیں دکھایا۔ وہ اٹھ کر جانے ہی والی تھی۔

”آپ دونوں پاکستانی ہیں۔ مسلم ہیں۔ وہ آپ کو جانتا ہے تو آپ بھی اسے جانتی ہوں گی۔ پاکستانی کیونٹی میں سے کوئی اس کے لیے آگے نہیں بڑھ رہا۔

آپ لوگوں میں مدد کرنے کا جذبہ ہی ختم ہو گیا ہے۔ میرے پاس ایسے تین اور کیسز تھے۔ وقفے وقفے سے تینوں ختم ہو گئے۔ کیونٹی نے، این جی اوز نے اس کی بہت مدد کی۔ کچھ اور بڑے نام سامنے آئے۔ دو کا تعلق تھائی لینڈ سے تھا، ایک کا سریبا سے کیا سب پاکستانی سو رہے ہیں؟ کیا سب مسلم سو رہے ہیں؟

”کیا آپ دونوں میں اتنا سا تعلق بھی نہیں ہے کہ آپ۔۔۔“

”میرا اس سے کوئی تعلق نہیں ہے۔“ وہ درمیان میں ہی بولی۔

”انسان تو ہیں آپ دونوں۔ تعلق نہیں ہے۔ انسانیت کا رشتہ تو ہے۔ سچ سال سے وہ ایشیاں رگڑ رہا ہے۔ دوبارہ خود کشی کی کوشش کی ہے۔ نفسیاتی دورے پڑتے ہیں اسے۔ خود کو زخمی کر لیتا ہے۔ دیواروں سے سر ٹکراتا ہے۔ چلاتا ہے۔ روتا ہے۔ چند ہفتوں بعد زخمی ہو کر وہ اسپتال ضرور جاتا ہے اور اس پر بھی وہ جب مجھے ملتا ہے تو کیس کا نہیں آپ کا پوچھتا ہے۔ وہ اس امان کے بارے میں بات کرتا ہے، مجھے افق جانتی ہے۔ اس کے لیے کچھ بھی کر سکتی ہیں تو کریں۔ شاید تھوڑا ہی بہت ہو۔ اگر پاکستانی کیونٹی کو اس بارے میں بتا سکتی ہیں تو بتائیے۔ انہیں جگائیں۔ اس سانحے کو سب کی نظروں میں لائیں۔ انسانیت کے ناتے رحم کے ناتے۔ چیریٹی ہی سمجھ کر۔ خدا کے لیے۔“

افق یہ سب ایسے سن رہی تھی۔ جیسے اپنی کسی بیماری کے بارے میں ہدایات سن رہی ہو۔ ایسی بیماری جس کا اسے علاج کروانا ہی نہیں۔ رات بھر وہ خواب میں ڈرتی رہی تھی۔ سالوں پہلے اس کی یہ حالت تب ہوئی تھی۔ جب وہ عدن کے باپ کے ہاتھوں سے بچ نکل تھی۔ اسی رات سوتے میں اس نے دل خراش چچیل ماریں اور دورے سی کیفیت میں آگئی تھی۔

اماں، جمال، اسد سم کر اٹھ بیٹھے۔ اماں اس کے ہاتھ پاؤں سلانے لگیں۔ جمال پانی کے لیے بھاگا۔ اسد ڈور کے مارے رونے لگا۔

وہ دورہ دھوکے اور بے عزتی کے نام پر پڑا تھا۔ اس

کے اندر آگ لگی ہوئی تھی۔ چھوٹے سے گھر میں ہاتھ روم میں جا کر اس نے اپنی چیخیں دیاں تھیں۔ رات گئے اس کی آنکھ لگی تو خواب میں وہ دھاڑیں مارتی رہی تھی۔ اس کی حالت دیکھ کر ماں بیسنے میں نہ آگئیں۔ انکی انکی سائیس لینے لگیں۔ اٹن نے باقی ماندہ چٹنوں کا دم کھوٹ دیا۔ اس نے اپنی ماں کی حالت کو دیکھا اور لب سی لیے ورنہ جس طرح اس کے باپ کے مرنے پر اس کی پھوپھی نے پین ڈالے تھے۔ ٹھیک اسی طرح وہ بھی بین ڈالنا چاہتی تھی۔ اس کی اگلی سسکی اس کی ماں کی جان لے لے گی۔ اس دن کے بعد سے اٹن اپنے وجود میں قید ہو گئی۔ کیا اسے قید کی سزا نہیں ہوئی تھی تب؟

اس کا جرم محبت تھا اور سزا کے نام پر اسے بہت کچھ بھگتنا پڑا تھا۔ محبت کے نام پر اس نے بھیا نک سزا کائی۔

”کیا آپ ہماری مدد کریں گی؟“ اس سے پھر پوچھا جا رہا تھا۔ وہ خود سے پوچھنے لگی کہ اسے اس کی مدد کیوں کرنی چاہیے۔ وہ اسے چھوڑ گیا۔ اسے بھی ایسا ہی کرنا چاہیے۔ اس کی مدد اس پر فرض نہیں ہے۔ دنیا میں اور بھی لاکھوں انسان اسی کی طرح ہیں۔ ہر شخص اپنے نصیب کے مطابق ہی دکھ اٹھاتا ہے۔ جیسے وہ اپنے نصیب کے میٹھے پھل اکیلے اکیلے کھاتا ہے۔ عدنان نام کا باب اس نے اپنی زندگی سے بھاڑ پیچھا ہے۔ اب وہ اس شخص کا نام بھی کہیں شامل کرنا نہیں چاہتی۔

”مجھے افسوس ہے کہ آپ مجھے کوئی جواب نہیں دے رہیں۔ جس شخص نے سالوں آپ کا انتظار کیا۔ اسے یہ جان کر بہت مایوسی ہوگی۔“

”آپ اسے میرے بارے میں نہیں بتائیں گے۔“

”ظاہر ہے۔ میں ایک مایوس شخص کو اور مایوس کیوں کروں گا؟“

اٹن وہاں سے اٹھ آئی اور بے مقصد سڑکوں پر چل قیدی کرتی رہی۔ دوپہر کے کھانے کے لیے گئی اور آرڈر

دے کر اٹھ گئی۔ وہ بیٹھنا چاہ رہی تھی، گھر سے چلنا۔ اس وقت اسے معلوم نہیں تھا۔ وہ یہ کہ وقت کر رہی تھی۔ بے مقصد گھومتے پھرتے ہوئے آگئی۔ صبح ناشتا بھی نہیں کیا تھا۔ دن میں صرف کھانے لے کر بیٹھا تھا اور اب بھی کھانے کے بجائے وہ ڈھیر ہو گئی۔

دل غ میں آٹھ سالوں کے خال کے پرزے پر زنا کر اڑ رہے تھے۔ جھپک جھپک سب آجاریا تھا۔ لینڈ لائن فون بجنے لگا۔ دو ٹھنٹے سے وہ کاؤچ پر تھی۔ شام گہری ہو رہی تھی۔ گھر کے اندر اندر ہر طرف تھا۔ کوئی لائٹ بھی اس نے روشن نہیں کی تھی۔

”تمہارا فون کیوں بند ہے؟“
”وہ! بچا رہ نہیں کیا تھا۔“
”تم ٹھیک ہو؟“
”بالکل۔“
”کہاں تھیں تم؟“
”میں سو رہی تھی۔“

”سارا دن سوئی رہی ہو؟ اس سے پہلے کہ تھیں؟“

”میں شاپنگ کرنے گئی تھی۔“
”کیوں گئیں؟“ فرزام کو غصہ آ گیا۔
”کیوں نہ جانی؟“ وہ حیران ہوئی۔

”تمہیں میسیج بھی کیا تھا اٹن! تم کیوں گئیں؟“ اس کی جھنجھلائی آواز بلند ہوئی اور پھر وہ خاموش ہو گیا۔ ”چلو ٹھیک ہے۔ اب تو تم گھر میں ہی ہو۔ تمہیں بھابھی کے پاس چلی جانا۔ فارغ ہو کر ان ہی کے پاس چلی جایا کرو۔ پور نہیں ہوگی۔“

”میں تیار ہو کر چلی جاتی ہوں۔“ اس نے پوچھا۔ نہیں کہ وہ اسے باہر جانے سے کیوں روک رہا تھا۔ اٹن نے موبائل آن کیا۔ ویل کے آٹس میں جانے سے پہلے اس نے خود ہی اسے بند کر دیا تھا۔ پاکستان سے یا فرزام کی کال نہ آجائے اور اس کے سے نکل جائے کہ وہ کہاں آئی ہے اور کس کے پاس اور کیوں ہے۔

”رات میں نیند میں ڈر گیا۔ خواب تھا شاید۔“ لیکن اس خواب اور ڈر کا تعلق خواب مجھے یاد نہیں۔ لیکن اس خواب اور ڈر کا تعلق ہے۔ خدا میں نے خود ہی یہ نتیجہ اخذ کر لیا کہ کہیں مجھے کوئی نقصان نہ پہنچے والا ہو۔ میری تسلی کے لیے تمہارا احتیاط سے رہنا۔ گھر سے تو باہر جانا ہی نہ۔ نمل بھابھی کے چلی جانا بس۔“

فرزام کا میسیج پڑھ کر کل سے اب تک اسے پہلی بار سکون کی سانس آئی۔ اپنے شوہر کے اتنے فکر مند ہونے پر اس کا دل بھر آیا۔ وہ اس میسیج پر ہاتھ پھیرنے لگی۔ دلوں میں سب سے پیارا دل فرزام کا تھا اور اس دل کی مالک وہ تھی۔ اس نے عدنان کے خوف سے بچنے کے لیے اس کے لیے جو کچھ لینے کے ڈر سے فرزام سے شادی کی تھی۔ اور کون تھا جو فرزام کو پسند نہیں کرنا تھا اور وہ اسے سب سے زیادہ پسند کرنی تھی۔ اس نے اس کا نفسانی علاج کیا تھا۔ اسے پر اعتماد بنایا تھا۔ اسی نے اسے سکھایا تھا کہ لوگوں سے ڈرنا چھوڑ دے اور یونیورسٹی میں اس نے کسی بھی لڑکے سے ڈرنا چھوڑ دیا تھا۔ وہ بہانے بہانے سے اس سے باتیں کرتے آتے تھے اور وہ بڑے طریقے سے انہیں سیدھا راستہ دکھا دیتی تھی۔

فرزام اس کی ذہنی تعمیر میں حصہ دار تھا۔ وہ اس کے غریب ہونے، چھوٹے گھر کی ہونے پر اسے کچھ جتنا تھیں تھا۔ اس نے بھی بھول کر بھی عدنان کا نام اس کے سامنے نہیں لیا تھا۔ دونوں کا بہت ہی خاص قریبی رشتہ تھا اور دونوں ہی اس خاص رشتے کے ساتھ ایک دوسرے کے لیے بہت خاص تھے۔

تیار ہو کر وہ نمل کے پاس آگئی ڈنر اس کے ساتھ کیا اور رات میں تین عدد نیند کی گولیاں کھا کر سو گئی۔ اٹن صبح عبد العزیز کا میسیج موجود تھا۔ وہ اسے دوبارہ ملنے کے لیے بلارہا تھا۔ اٹن نے میسیج ڈیلیٹ کر دیا۔ آج اسے بہت سے کام تھے۔ اسے این جی او جانا تھا۔ انیس اگلے ایونٹ کے لیے ریفننگ دی جانا تھی۔

دوسرے ہفتے کا ایونٹ بھی شاندار رہا۔ اور مجموعی

طور پر کافی منافع ہوا۔ اس کا اسکور اس بار بھی اچھا ہی تھا۔ سب کے لیے مشترکہ تالیاں بھجوائی گئیں۔ ”فرذا“ ان کی تعریف کی گئی۔ مسٹر جین اس کے پاس بھی آئے۔ وہ پچاس پچاس سالہ چھ فٹ کے سفید فام امریکن تھے۔ سب سے ایسے بائیں کرتے۔ جیسے وہ ان کے شکر دار اور سامنے والا ان کا استاد محترم ہے۔ اتنی عاجزی تھی کہ سارا وجود ہی جھکا ہوا تھا۔ ہاتھوں پیروں کی انگلیاں بھی۔

”کیا آپ کو امریکی جیلوں کے بارے میں معلوم ہے کہ وہاں کتنے بے گناہ لوگ قید ہیں؟“ وہ اس کی تعریف کر رہے تھے اور وہ اچانک سے ہی ان سے یہ سوال کر بیٹھی۔ مسٹر جین کی آنکھوں کا رنگ بدلا جیسے وہ جانتے تھے کہ یہ صرف ایک سوال نہیں ہوتا۔ مختلف ملکوں کے دوروں کے دوران ان سے ایسے سوال پوچھ دیے جاتے تھے۔ خاص طور پر نوجوان تو ان کی جان کو آجاتے ہیں۔ صرف اس لیے کہ وہ خود ایک امریکی ہیں اور کسی بھی گورے کو دیکھ کر انہیں لگتا ہے کہ یہ بھی گوانتا ناموبے کے ظالموں میں سے ایک ہے۔ اگر نہیں ہے تو اس ڈھانچے کا حصہ تو ضروری ہے اور اگر یہ بھی نہیں تو چلو وہ امریکی تو ہے نا جو اپنے علاوہ ہر مذہب اور قوم سے نفرت کرتا ہے۔ لیکن وہ ایک ایسی این جی او کے فعال کارکن تھے جو ٹھوڑے ورلڈ کے لیے کام کرتی ہے۔ وہ صرف انسانیت کے لیے کام کرتے تھے اور اس میں ان کا کوئی ذاتی فائدہ شامل نہیں تھا۔

”میں کچھ کہہ نہیں سکتا۔“ وہ گڑبڑائے اور مزید بحث سے بچنا چاہا۔

”آپ کی این جی او کو اس کے لیے بھی کام کرنا چاہیے۔“ بہت سے امریکن بھی ان حالات کا شکار ہیں اور ایسے ہی جیلوں میں قید ہیں۔ ”وہ دراصل یہ ایک نکتہ واضح کرنا چاہتے تھے کہ صرف مسلمان ہی اس سب کا عتاب نہیں بنتے۔“

”پھر آپ کو ان سب کے لیے کام کرنا چاہیے۔“

”بہت سے دوسرے ادارے اس پر کام کر رہے ہیں۔ ہم ان مسائل پر کام نہیں کرتے۔ ہماری این جی او کا یہ منظور نہیں ہے۔“

”میں آپ کے لیے اتنی محنت کر رہی ہوں مسٹر چین۔ آپ کو بھی ہمارے لیے کچھ کرنا چاہیے۔“

”آپ نے سنا ہی نہیں کہ مسٹر چین نے کیا وضاحت دی۔ دوسرے لوگوں کی طرح اس کا بھی یہی ماننا تھا کہ امریکی سب کچھ کر سکتے ہیں۔ تباہی بھی اور آباد کاری بھی۔“

”آپ کے لیے کیا؟“ اس بات پر وہ اور الجھ گئے۔

”افق کا مسٹر چین کو روک کر یہ سب کئے گا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ لیکن جب وہ اس کے پاس آئے تو نہ چاہتے ہوئے بھی اسے تھوڑا سا غصہ آ گیا۔ اسے آرنیکل میں موجود باقی لوگوں اور دوسرے اعداد و شمار کا خیال بھی آیا اسے ایک دم سے یہ لگا کہ اپنے کام کے لیے تو یہ امریکی اس سے کام لے رہے ہیں تو اس کے کام کے لیے کیا یہ آگے آئیں گے؟ یہ سب سوچتے وہ یہ بھول رہی تھی کہ تھوڑے روز میں پاکستان بھی شامل ہے اور پاکستان کے دیہی علاقوں میں اسی این جی او کے کارکن ویکمیں کی سپلائی کے لیے پہنچتے ہیں۔ مختلف انجمنش اور ڈرائیون کی طرف سے جاتے ہیں۔“

اس نے انہیں ڈاکٹر عدنان کے بارے میں بتادیا۔ وہ خاموشی سے سب سنتے رہے۔ دو دن بعد انہوں نے افق کو این جی او کے لیے اپنے رضا کار صحافی سے ملوایا۔ صحافی کا تعلق ایک بڑے میڈیا گروپ سے تھا اور وہ اس گروپ کے اخبار ”میگزین اور نیوی وی“ کے لیے کام کرتا تھا۔ صحافی کی ملاقات اس نے عبدالعزیز سے کروادی۔ وہ اس معاملے میں پڑنا نہیں چاہتی تھی اور اگر وہ اس معاملے میں تھوڑا بہت شامل ہو ہی گئی تھی تو آگے نہیں آتا چاہتی تھی۔ اس نے عبدالعزیز سے وعدہ لیا تھا کہ اس کا نام اور شناخت سامنے نہیں آئے گی۔ خاص طور پر عدنان کو اس بارے میں بالکل خبر نہیں ہونی چاہیے۔ عبدالعزیز کا خیال تھا کہ صحافی ان کی بہت مدد کر سکا ہے اور وہ اس صحافی سے مل کر حقیقتاً ”بہت خوش“ تھا چنانچہ ہی ہفتوں بعد مسٹر چین

نے افق کو چند دوسری این جی او کی طرف بھیج دیا۔ انہیں افق کا کیا کیا نظر بہت برا لگا تھا۔ وہ بار بار سر کے ساتھ یہ کہتے تھے کہ وہ جو کچھ کر سکتے ہیں اس میں کس گے۔ افق نے نہ چاہتے ہوئے بھی ان کی اس بات کو ماننا شروع کر دیا۔

مسٹر چین کے ساتھ کی گئی حادثاتی بات چیت کا کارگر ثابت ہو رہی تھی۔ پیچھے ہٹتے ہٹتے نہ کہ نہ ہٹتے بھی افق اس سب میں اتنی شامل ہو گئی۔ این جی او کے نمائندوں نے وکیل سے ملاقات کی۔ اس سے کیس ہسٹری لی۔

”آپ نے مجھے حیران کر دیا ہے۔“ عبدالعزیز اسے میسج کیا۔ اس کا منہ بن گیا پھر کہ اسے یہ تعریف اچھی نہیں لگی۔ کاش! وہ بھی آتش کی بن ہوئی اور نہیں تو اس نے وہ رسالہ ہی نہ خریدا ہوگا۔

عبدالعزیز کی براہ راست بات چیت این جی او سے ہونے لگی۔ اس نے عبدالعزیز سے صاف صاف کر دیا کہ اس نے جتنے ریفرنس دینے تھے وہ دے چکی۔ اب اسے پریشان نہ کیا جائے۔

آئندہ آنے والے چند اور ہفتوں میں ایک اور ہولہ صحافی اسکاٹ جو اس سارے معاملے کے لیے مولوا اکٹھا کر رہا تھا۔ اس نے دو سینئر زور ایک قانون دان کے سامنے ایک لائوٹا ٹاک شو کے دوران اس مسئلے کو اٹھایا۔ عبدالعزیز کی طرح ایسے ہی کیسز پینڈل کرنے والے دوسرے وکلا اور متاثرین کے خاندان کے افراد بھی شامل تھے۔ چند ڈاکومنٹری چلائی گئیں۔ صرف شب پر قید مجرموں کی بابت طرح طرح کے سوالات کیے گئے۔ ایسے شو وہاں آئے دن ہوتے ہیں۔ لیکن اس سے یہ ضرور ہوتا ہے کہ جن لوگوں کی تقریروں سے ایسے واقعات چھپے ہوئے ہیں، ان کے اس طرح ان کے کانوں تک یہ خبر ضرور پہنچ جاتی ہے۔ اسکاٹ نے اسی مسئلے پر ایک فیچر لکھا اور اس نے راست حکومتی اداروں پر تنقید کی۔ چند اخبارات نے سرے سے عدنان اور اس جیسے کیسز کے بارے میں خبروں کو نمایاں جگہ دی۔ سالوں سے قید

ملاؤں پر لوگوں کو بہت ترس آیا۔ یہ ان جیلوں میں بند کسی اور کے لیے وسیلہ بن رہا تھا یا صرف عدنان کے لیے یہ قدرت ہی بہتر جانتی تھی۔ لیکن اس تھوڑی سی حرکت سے شاید کسی کو بہت فائدہ ہوئے والا تھا۔

این جی او کا ایک نمائندہ جا کر عدنان سے جیل میں ملا۔ اسی این جی او نے مختلف کمیونیسٹس کے لوگوں کو اکٹھا کر کے واک کا اہتمام کیا۔ افق کو بھی بلایا گیا۔ لیکن افق نہیں گئی۔ اب تو اسے ڈر لگنے لگا تھا۔ وہ یہ نہیں چاہتی تھی کہ اگر ایسے کیسز حل ہو جائیں تو منظر عام پر آئے لایا جائے کہ یہ سب اس کی وجہ سے ہوا ہے۔ اور نہیں تو کوئی صحافی اسی کے پاس نہ آجائے انٹرویو لینے۔ سوک پر چلے اگر کوئی اسے ایسے ہی دیکھ لیتا تو اسے یقین ہوتا کہ وہ کہہ رہا ہے کہ ”چھ! وہ تم ہو جو عدنان کے لیے اتنا سب کر رہی ہو؟ کون ہے عدنان تمہارا؟“

”نہیں! میں نے کچھ نہیں کیا۔ اگر کیا تو ترس کھا کر انسانیت کے ناتے۔“

پھر اسے جانے کیوں کھوکھلے قہقہے بلند ہوتے سنائی دیے۔ بہت دن گزرے اسے عبدالعزیز کا فون آیا۔ ”عدنان ٹھیک ہی کتا تھا کہ افق ہی اسے آزاد کروا سکتی ہے۔“ وہ شاید اس کے تعاون کا اپنے الفاظ میں شکریہ ادا کر رہا تھا۔

”میں نے کچھ نہیں کیا۔“ وہ تقریباً چلا اٹھی۔

”آئی ایم سوری۔ آپ ناراض مت ہوں۔“

عبدالعزیز گھر آیا۔ افق شرمندہ ہوئی۔

”میں ناراض نہیں ہوں۔ کیونکہ میں نے کچھ کیا ہی نہیں ہے۔ میں نے صرف آپ کے کہنے پر چند این جی او کو اس مسئلے کے بارے میں بتایا تھا۔ جو کچھ کیا ہے وہ آپ نے اور ان لوگوں نے کیا ہے۔ آپ پلیز مجھے کریڈٹ نہ دیں۔ سنہ ہی آپ میرا نام سامنے لائیں گے۔ آپ نے مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ آپ میرا نام ظاہر نہیں کریں گے۔“

”میں اپنے وعدے پر قائم ہوں مس افق! آپ مجھے وعدہ خلاف نہیں پائیں گی۔ چند اخبارات میرا

انٹرویو لے چکے ہیں۔ عدنان کے فادر سے میں نے فٹنڈ منگوائے ہیں۔ یہی صحیح موقع ہے کہ ان این جی او کو فٹنڈ دیے جائیں۔ اس سے خاطر خواہ فائدہ ہوگا۔ چند پاکستانیوں نے رابطے کیے ہیں مجھ سے۔ وہ ہر طرح کے تعاون کے لیے تیار ہیں۔“

”آپ مجھے دوبارہ فون نہیں کریں گے۔“ اس نے ساری تیز تہذیب ایک طرف رکھ کر کہا۔

”ٹھیک ہے۔“ اس نے فون بند کر دیا۔

عبدالعزیز نے اپنا وعدہ پورا کیا اور دوبارہ فون نہیں کیا۔ ویک اپ کال دی جا چکی تھی۔ عدنان جیسے پندرہ اور لوگوں کے کیسز نکل آئے تھے۔ سوشل میڈیا ان کیسز کے لیے زیادہ فعال تھا۔ باقاعدہ احتجاج کے چارہ تھے۔ آئے دن نئی نئی خبریں سامنے آتی تھیں۔ ان کے خاندان کے لوگوں کے بیانات سامنے آتے تھے۔ ستر رفتار سے عدالت میں چلنے والے ان کیسز نے کچھ رفتار پکڑ لی۔

☆ ☆ ☆

این جی او سے کیا کیا فٹنڈ ریزنگ کا معاملہ مکمل ہوا اور اسے بہترین کارکردگی اور این جی او کا رکن بننے پر سرٹیفیکٹ دیا گیا۔ جسے اس نے فریم کروا کر ریک پر سجایا۔

فرزام نے ہفتہ بھر پہلے کالج میں اس کا آن لائن ایڈمیشن کروا دیا تھا۔ اس نے چھ ماہ کے ڈراما ٹنگ کورس کے لیے کالج جو آن کر لیا تھا۔ فرزام کے آنے تک اسے فارغ نہیں رہنا تھا۔ صبح سے دوپہر تک وہ کالج ہی میں ہوتی۔ وہاں سے اکثر اسٹور چلی جاتی۔ ایک پاکستانی اسٹور پر انہیں ایک سائڈ کارنر مل گیا تھا۔ ”چتر“ کا لیبیل اس کارنر پر لگا دیا گیا۔ اس نے کارنر کی میسجنگ کر لی۔ دو دن بعد وہ وہاں کا چکر لگا لیتی تھی۔ رات کو وہ اپنے کالج کے اسٹانڈنٹ پر کام کرتی۔ ہلکی چھلکی مصروف زندگی جاری تھی۔ سب ٹھیک ہی تھا۔

اس کے پاس عبدالعزیز کا میسج آیا کہ وہ اسے ایک ضروری بات بتانا چاہتا ہے۔ افق کو یقین تھا کہ وہ

اسے یہ بتائے گا کہ عدن کا کیس ختم ہو گیا ہے۔ اسے خبر سے کوئی دلچسپی نہیں تھی کہ کیس ختم ہوتا ہے یا وہ چند سال اور جیل میں رہتا ہے۔

عدن کے بارے میں بڑھتے اور جانتے ہی وہ تھوڑی جذباتی ہو گئی تھی۔ لیکن اب وہ مضبوط تھی۔ اس کے اعصاب قابو میں تھے۔ عدن کتنا بھی بے گناہ تھا۔ لیکن اس کے لیے وہ دھوکے بازی تھا اتنے سال اگر وہ اسے یاد کرتا رہا ہے تو "شاید ڈوبے تو تنکے کا سہارا" کے مصداق وہ افق کا سہارا لیتا رہا ہے۔ ماضی میں وہ اسے دعاؤں کے لیے کہتا رہا تھا اور اس کا عقیدہ بن چکا تھا کہ صرف افق کی ہی ہر دعا قبول ہوتی ہے اور ضروری قبول ہوتی ہے۔ اس طرح کی قید میں رہ کر کوئی بھی ایسے سہارے ڈھونڈ سکتا ہے۔ ایسے وقتوں میں ایسے افراد کو پھر ماضی ہی یاد آتا ہے۔ پھر وہ ان ہی لوگوں کو یاد کرتے ہیں جو اچھے تھے، مخلص تھے۔ ایسے افراد کو دھوکا دیا جاسکتا ہے بھلائی نہیں جاسکتا۔ وقت کا دھار ابد لے لے ہی ایسے مخلص لوگ تھر کر سامنے آکھڑے ہوتے ہیں۔ افق نے اس سب پر بھی یہ نہیں سوچا تھا کہ عدن کے ساتھ جو وہ افق کے ساتھ برا کرنے کی سزا ہے۔ افق اتنے پیارے دل کی تھی کہ اس نے یہ سوچا ہی نہیں۔ صرف اتنا تھا کہ وہ اپنے اندر سے اس شخص کی سب باقیات نکال پھینک رہی تھی۔

"عدن آپ کے بارے میں پوچھ رہا تھا۔" عزیز کی آواز گونجی۔ فون پھسل کر اس کی گود میں آگرا۔ کچھ دیر سوچنے کے بعد اس نے خود ہی فون کر لیا۔

"کیسے؟ آپ نے اپنا وعدہ توڑا؟"

"جی ہاں! وہ وعدہ تھا کہ اسے جیل ملے گیا تھا۔ اس نے ذکر کیا آپ کا۔ اس بار میری اس سے ملاقات ہوئی تو وہ آپ کا بہت شدت سے پوچھ رہا تھا۔ میں خاموش ہی رہا اور لا علمی ظاہر کی۔ لیکن کیا آپ اس سے ملنا چاہیں گی؟"

"ہرگز نہیں۔" اس نے سختی سے کہا۔

چھٹی گھبراہٹ میں بدل گئی۔ اس شخص کو یہ معلوم ہو گیا ہے کہ وہ یہاں ہے۔ اس کے لیے یہ سب افق نے کیا۔ افق جو یہ فیصلہ کر چکی ہے کہ وہ اسے اپنے لیے بھی نہیں چاہتی۔ اب وہ شخص اس سے ملنا چاہتا ہے۔ بہت کوشش کی اس نے کہ اس انٹرنیٹ پر کام کرے۔ لیکن نہیں کر سکی۔ فرزام رات دن کر کے ٹھک جاتا تھا۔ وہ سو رہا ہو گا۔ ورنہ وہ اسے فون کر لیتی۔ اگر وہ سو رہا ہوتا تو اس وقت آن لائن ہی ہوتا۔ اٹھ کر وہ ٹھل کے پاس آئی۔ وہ ایک انگلیش فلم دیکھ رہی تھی۔ وہ بھی ساتھ بیٹھ گئی۔ ٹھل نے قریب رہی پلیٹ اس کی طرف بڑھائی۔

"کچھ اور لاؤں؟"

"نہیں۔" کہہ کر اس نے دکان کا ایک پیس اٹھالیا۔

"پریشان ہو؟" فلم کی ہیروئن کی لپ اسٹک پر نظر رکھ کر ٹھل نے پوچھا۔

"نہیں۔" وہ زبردستی مسکرائی۔

"فرزام کو یاد کر رہی ہو؟" اس سوال پر وہ صرف مسکرا دی۔

"فرزام سے کو؟ ایک چکر لگا جائے۔ اتنا مصروف ہے کیا وہ؟" ٹھل کی نظریں اب بھی اسکرین پر ہی جمی تھیں۔

"بہت مصروف ہیں۔ ویک اینڈز میں بھی کام کر رہے ہیں۔"

"پھر تو ٹھیک ہے۔ جلد ہی فارغ ہو کر آجائے گا۔"

یہ تو فرزام بھی اس سے کہتا تھا کہ رات دن دس لوگوں کی ٹیم کام کر رہی ہے۔ چھ مہینے کے اندر اندر کام کو مکمل کرنا ہے۔ اس کے بعد وہ سوفٹ ویئر میں تیکنیکی خرابیاں جانچیں گے۔ پھر اسے اپلائی کیا جائے گا۔ مارکیٹ میں لایا جائے گا۔ اب جب وہ اس سے آن لائن باتیں کرتا تو چھوٹے چھوٹے جملے بنا جھجکے کہہ دیتا۔ وہ اسے بہت یاد آتی ہے کہ اس کی آنکھوں میں آنسو آجاتے ہیں اور بھی سبھی اتنا کہ وہ

کمانڈر لکھنے کے بجائے اس کا نام لکھ دیتا ہے۔ اب وہ اسے یاد کرتے ہوئے سوتا ہے اور یاد کرتے ہوئے اٹھتا

ہے۔ مزید اسے دھند پر چائیں کہ کینڈا سے پرواز کر کے وہ اس کے پاس آجایا کرے۔ کبھی کبھی اس کا جی چاہتا کہ وہ کمپنی کے ساتھ معاملہ چرا کر بھاڑ کر پھینک دے۔ ایک دن وہ لپ ٹاپ پر ذرا آگے کوچھا اور دو انگلیاں اسکرین پر رکھیں۔

"میں تمہاری ناک کو پکڑ کر ایسے ایسے کرنا چاہتا ہوں۔" انگلیاں دائیں بائیں ہوئیں۔ "اور پھر تمہاری ٹھوڑی کو ایسے پکڑ کر چرے کو اوپر اٹھانا چاہتا ہوں۔" ساتھ ہی ٹشو سے لپ ٹاپ کی اسکرین صاف کی۔ "سب گلابی گلابی کیوں ہو رہا ہے۔"

وہ ہنسی اور گلابی ہو گئی۔

"تم بہت خوب صورت ہو۔" ٹھل کر سرگوشی کی۔

اس نے اسے ٹھوڑی کے نیچے پھینکا۔

"اور تمہاری آنکھیں جب ذرا سا جھک کر اٹھتی ہیں اور میری آنکھوں سے ملنا نہیں چاہتیں۔ اس پاس سے بچ کر ٹھل جاتی ہیں تو مکمل لگتی ہیں۔ ہاں۔ ہاں۔ بالکل ایسے ہی۔"

ٹشو سے پھر اسکرین صاف ہونے لگی۔

باقی کا وقت وہ ان باتوں کو بار بار سوچ سوچ کر گلابی ہو کر رہی اور پھر اس کا جی چاہتا کہ فرزام ایسی ہی باتیں کرنا جائے بس۔ بلکہ وہ دونوں ہی ایسی چھوٹی چھوٹی باتیں کرتے رہیں۔ خوش ہونے کے سامان پیدا کرتے رہیں اور محبت کی طرف بڑھتے ہی جائیں۔ ٹھل کے ساتھ فلم دیکھتے دیکھتے وہ اونکھنے لگی تو اپنے گھر میں آکر سو گئی۔ فرزام کے بارے میں سوچتے سوچتے وہ ایسے ہی گہری نیند میں چلی جاتی۔ نعمت ہوتے ہیں وہ تعلق وہ رشتے جو ٹھیک ٹھیک کر سلا دیتے ہیں۔ سکون کی نیند کا باعث بنتے ہیں۔ والدین کی آغوش میں بچے ایسے ہی جھٹ سے نہیں سو جاتے۔ اور ایسے تعلق جو نیندیں نہیں لیں۔؟



کالج میں اس کی دو تین اچھی دوستیں بن گئی تھیں۔ وہ انہیں ہنسی کلکیشن دکھانے اسٹور بھی لے گئی۔

وہ سب اس بات پر کافی حیران ہوئیں کہ وہ پہلے سے ہی زندگی میں اتنی کامیاب ہے۔ اس کامیابی کے لیے افق نے کافی پارہ پہلے تھے اور کامیاب ہونے کے لیے پارہ تیل لینے چائیں۔ محنت اور کام سے گھبراتا نہیں چاہیے۔

ان ہی دوستوں کے ساتھ وہ کبھی کبھار سیر کے لیے بھی چلی جاتی تھی۔ وہ لوگ اکٹھے خریداری بھی کر لیتے تھے۔ ٹھلانی پیتے تھے، اس کے کیم کھاتے تھے، اس انٹرنیٹ میں ایک دوسرے کی مدد کرتے اور فون پر گپ شپ لگا لیتے تھے۔

کالج سے نکل کر وہ سڑک پر آئی۔ اسے بس اسٹاپ تک پیدل جانا تھا۔ اسے ایسی کوئی جلدی بھی نہیں تھی وہ آرام آرام سے چل رہی تھی۔ اکثر وہ راستے میں آنے والے ایک ہندوستانی ریٹائرڈ سے لچ کر لیا کرتی تھی۔ لیکن یہ اس کے مزاج اور بھوک پر تھا کہ وہ ریٹائرڈ سے لچ کر لے یا گھر جا کر ٹھل کے ساتھ۔ آہستہ آہستہ چلتی وہ سوچ رہی تھی کہ ایک دم سے کسی نے پیچھے سے آکر اس کی آنکھوں پر ہاتھ رکھے۔ اس نے اتنی زور سے چیخ ماری کہ تیز تیز پیدل چلتے راہ گیر بھی رک کر اسے دیکھنے لگے۔

"یہ میں ہوں۔" فرزام اس کے سامنے آیا۔ ریٹائرڈ کا دروازہ کھولے ایک امریکی کھڑا سی کی طرف دیکھ رہا تھا۔ جیسے پوچھ رہا ہو۔ "سب ٹھیک ہے نا؟"

"سارے سر پرانز کا مزا خراب کر دیا تم نے۔" فرزام بری طرح سے شرمندہ ہوا۔ "کلن جے آر بی ہو یا کوئی ہار مویو دیکھ کر۔"

اس کے اوسان اور سانس بحال ہوئی جیسے "اوہ! تو یہ تم ہو"

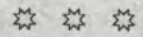
وہ اپنی جگہ پر بہت شرمندہ ہوئی۔ رات سے ہی ڈری ہوئی تھی۔ گھر کے دروازے کے باہر کھڑکی سے باہر کوئی کھڑا محسوس ہو رہا تھا۔ کالج آتے ہوئے کوئی پیچھے آتے محسوس ہو رہا تھا کی دونوں سے ایسے ہی چل رہا تھا۔ فرزام کو دیکھ کر خوش بھی نہیں ہو سکی۔ چرے

سے نکلتی ہی نمایاں تھی۔
 ”مجھے لگا کہ خوشی سے تم مجھ سے لپٹ جاؤ گی۔ تم نے تو سب کو ہی چونکا دیا۔“ اس کا اشارہ راہ گریوں کی طرف تھا۔
 ”میں ڈر گئی تھی۔ میں حیران بھی ہوئی ہوں۔“ اس نے بات کو سنبھالا۔
 ”بہر حال میں بہت ناراض ہوں اب۔“ ہاتھ سینے پر باندھ کر فوجی مارچ کے سے انداز میں وہ آگے آگے چلنے لگا ”تیز تیز۔“
 ”میں منالوں گی۔“ وہ پیچھے پیچھے ساتھ ساتھ آنے لگی۔

وہ منہ پھلائے چلتی ہی رہا۔ تیز سے تیز ہوتا گیا۔
 ”پلیز نو۔“ ساتھ ساتھ تیز تیز چلتے وہ بانٹنے لگی۔
 وہ اور تیز ہو گیا۔ اب وہ تقریباً ”بھاگتی“ ہوئی اس کے عین سامنے جا کھڑی ہوئی۔

”اُئی ایم سوری۔“ دونوں کان پکڑ کر بے چاری سی صورت بنا کر کہا۔
 فرزام نے اس کی ناک پکڑ لی اور دائیں بائیں زور زور سے جھٹکے دینے لگا۔

”آہ۔ مجھے درد ہو رہا ہے مٹھ۔“
 ”اس ہولناک چیخ سے میں بھی ڈر گیا تھا میڈم!“
 ناک بدستور دائیں بائیں ہلاتی جا رہی تھی۔ کان بدستور پکڑے ہوئے تھے۔ دونوں ایک فریم میں اچھی تصویر بنا رہے تھے۔



فرزام جمعہ کو آیا تھا اور دو دن رہ کر چلا گیا اس پار افق کا جی چاہا کہ اسے واقعی میں نہ جانے دے۔ اسے پکڑ کر گھر میں لاک کر دے اور خود بھی لاک ہو جائے۔ لیکن وہ صرف اس سے ملنے کے لیے آیا تھا اور اس کا کہنا تھا کہ اگر وہ اب بھی ملنے کے لیے نہ آتا تو یقیناً اس کا دم نکل جاتا۔

”چند ہفتوں کا ہی کام رہ گیا ہے۔ میں کسی بھی وقت آسکتا ہوں۔ خیر ایسا سربراہ تو تمہیں اب نہیں دوں

گا۔ بس تم تیار رہنا۔ ساری خریداری کر لیتا اپنی باہم مل کر کرکریں گے۔ بہت اچھے پیسے مل رہے ہیں مجھے۔ بہت کچھ لے کر دے سکتا ہوں تمہیں۔ چاہو تو فرسٹ بنالیتا۔ ڈھونڈ ڈھونڈ کر جیس لکھتا۔ انکار نہیں کروں گا۔ دونوں ماؤں کو پہلے سے ہی پیسے بھجوا دیے ہیں اور تمہارے برنس میں بھی پیسے انویسٹ کروں گا۔ جب کا کانٹریکٹ سائن کرتے ہی تمہیں امریکا میں یا جہاں تم کوئی ایک اسٹور لے دوں گا۔ وہی کیسا رہے گا؟ برطانیہ جانے کا خیال میں نے دل سے نکل دیا ہے اب میں برطانیہ کو سزا دینا چاہتا ہوں۔ اسے مجھ جیسا قابل لڑکا نہیں ملنا چاہیے۔ عارضی شہری کے طور پر بھی نہیں۔ کیا معلوم وہ مجھے تھپتا ہی لے۔ مجھ سے کہے کہ شہریت لے لو یہاں کی۔ لیکن میں انکار کروں گا۔ میرا خیال ہے، کمپنی مجھے ساؤتھ ایشیائی بھیجے گی۔ میں اؤکے ہوں۔ وہ مجھے جہاں بھی بھیج دیں۔ کیا خیال ہے تمہارا؟“

”میں بھی اؤکے ہوں۔“
 ”مجھے تو لگتا ہے کہ تم نے میری کوئی بات سنی ہی نہیں۔“

”یہاں سے سن کر یہاں سے نکال دی۔“ اس نے دائیں سے بائیں کان کی طرف اشارہ کیا۔
 ”تم پریشان ہو افاق؟“ وہ سن رہی تھی۔ لیکن اسے لگا کہ وہ خود پر دے ڈال رہی ہے۔

”ایسا کیوں ہو گا بھلا؟“ جواب نہیں دیا۔ سوال کر لیا۔
 ”الٹا کہ سوال کا جواب کیا دیتی۔ خوف نام کی ایک تیل اس کے اندر پھولتی پھولتی ہر شے سے لپٹی جا رہی تھی وہ ٹھیک کہہ رہا تھا کہ وہ پر دے ڈال رہی ہے۔ ہنسی اور مسکراہٹ کے اگر وہ یہ پردے ہٹاتی تو فرزام اس سے کئی سوال کرتا۔ ہر سوال کا جواب نہیں تھا اس کے پاس اور اگر ہر سوال کا جواب دے بھی دیتی تو شاید فرزام کی تسلی نہ ہوئی اور ان دونوں میں کچھ نہ کچھ ضرور بگڑ جاتا۔ اس نے خود کو روکے رکھا اور اس سے کہا نہیں کہ کانٹریکٹ کو چرا کر پھاڑو اور آؤ! بھاگ چلتے ہیں امریکا سے راتوں رات اور پاکستان چل کر اپنی

زندگی گزارتے ہیں۔ آؤ! ہم دونوں ساتھ ہی چلتے ہیں۔ لیکن وہ کہہ نہیں سکی اور فرزام اکیلا ہی واپس چلا گیا۔ لیکن واقعی چند مزید ہفتوں کے لیے۔ وہ اسے اپنے آپ پورٹ گئی۔ رات کو فرزام نے اس کا بازو پکڑ کر اپنے بازو میں دیا اور دونوں نیو بری (New Bury) آگئے۔

فرزام بہت خوش تھا۔ جیسے ہر کام سے فارغ ہو چکا ہو۔ جیسے طویل محنت کے بعد اسکول کے نچے امتحان سے فارغ ہوتے ہیں اور جیسے ایک لمبے انتظار کے بعد کوئی خاص دن آتا ہے۔ آخر آئی جانا ہے۔ دونوں ساتھ ساتھ چل رہے تھے۔ افق نے فرسٹ نہیں بنائی تھی۔ اچھا ہی کیا تھا کہ نہیں بنائی کیونکہ بنا فرسٹ کے ہی وہ اتنا سب کچھ لے رہا تھا۔ اس نے اس سے جس فروٹ کا وعدہ کیا تھا ایک بڑے اسٹور سے وہ فروٹ لے رہا تھا۔

”پیرس فروٹ کے بغیر نہیں جانا چاہیے۔“ ساتھ اسے بتایا۔

وہ بار بار اس کی پسند کے کوٹ پہن پہن کر دیکھتی رہی۔ جول سے اس پر اچھا لگا وہ اس نے لے لیا۔ پھر اس کے دائیں بائیں ہاتھوں میں طرح طرح کے ہولڈنگ بیگجو پکڑا پکڑا کر بیگجو پسند کیے۔ بڑے بڑے شولڈر بیگجو الگ سے لیے۔ اس وقت اس کا خریداری کا تجربہ اچھے اچھوں کو مات دے سکتا تھا۔

”مگر پیرس میں مجھے کسی نے یہ کہہ دیا کہ میری بیوی کتنی اولڈ فیشن ہے تو میں اس کا تجربہ تو دوں گا۔ کیا تم چاہتی ہو کہ میری وہاں کسی سے ایسے لڑائی ہو؟“ وہ احتیاطی تنبیہ کی سے سوال کر رہا تھا۔

”تم سے ایک روٹیکس کا وعدہ بھی کیا تھا میں نے۔“

سارے وعدے اس نے خود ہی کیے تھے اور سارے وعدے وہ یاد سے خود ہی پورے کر رہا تھا۔ اس کے پاس واقعی بہت پیسے آگئے تھے۔ افق نے اسے اپنا کریڈٹ کارڈ دینا چاہا۔ لیکن اس نے اس کا بیگ کھول کر اس میں سے چند ڈالر نکال لیے۔

”تمہاری طرف سے فی الحال آؤس کریم کھالیتے ہیں۔“

وہ ڈبل ڈیک آؤس کریم لے آیا۔ آؤس کریم اتنی بڑی تھی کہ وہ دونوں ہیندر مٹھ سے اسے کھا رہے تھے۔ شاپنگ بیگجو ہاتھوں میں پکڑے نیو بری کی سڑکوں پر گھوم رہے تھے۔

”تم نہیں کھڑی رہنا۔ میں ابھی آیا۔ دیکھو! میرے پیچھے نہ آنا۔ اگر تم میرے پیچھے آئیں یا مجھے دیکھا کہ میں کہاں ہوں اور کیا کر رہا ہوں تو میں اتنے سارے لوگوں کے درمیان سڑک کے عین وسط میں بیچ بچ زمین پر پھیل کر روئے لگوں گا۔“

رش میں اسے ایک طرف کھڑا کر کے وہ کہہ کر اسے اپنی طرف سے الٹی طرف گھما کر اس کے پیچھے سے چلا گیا۔ کچھ ہی دیر میں افق فوراً پلٹی۔ اس نے دیکھ لیا تھا کہ وہ ایک بڑی چیلری شاپ میں جا رہا تھا۔ وہ مسکرانے لگی۔ وہ جانتی تھی وہ اس کے لیے ایک عداوت کو ختم لینے جا رہا ہے۔ ایک ایسی انگوٹھی کا نہ اس نے وعدہ کیا تھا نہ ہی تذکرہ۔ وہ اسے پروپوز کرے گا۔ پروپوز کرنے کا بھی اس نے وعدہ نہیں کیا تھا۔ لیکن اس کی اسے خواہش تو بہت ہوگی۔ پرانی انارکلی میں وہ اس سے شادی کا کہہ رہا تھا۔ اب وہ اس سے اپنی محبت کا کہہ گا۔ پہلے اس نے بتایا تھا کہ وہ اس سے شادی کرنا چاہتا ہے۔ اب وہ بتائے گا کہ وہ اس سے کس قدر محبت کرتا ہے۔

نیو بری کی پر رونق سڑکوں کی رونق مزید بڑھ گئیں۔ رات کی چمکا چوند میں اضافہ ہو گیا۔ گماں بھی بڑھنے لگی۔ دور و نزدیک بڑی بڑی دکانوں اور اسٹورز پر لگے بورڈز اور جگمگانے لگے۔ اپنی مام ڈیڈ کے ہاتھ پکڑے پارپ کارن، آؤس کریم کھاتے مسکراتے بچے ایک دوسرے کے ہاتھوں میں ہاتھ دیے نو جوان لڑکے لڑکیاں۔ یہ سب افق کو بہت اچھا لگا۔

”فرزام اس کے لیے انگوٹھی لینے گیا ہے۔“
 چند دنوں سے وہ جتنی پریشان تھی۔ وہ پریشانی جاتی رہی۔ وہ افق سے صرف مس فرزام بن گئی۔ ایک

عرصے سے اس کی زندگی مستحکم تھی۔ لیکن اب وہ وقت تھا جب وہ بے حد خوش تھی۔ ایک عورت کو اپنی زندگی میں ہر مل اس ایک لمحے کا انتظار ضرور ہوتا ہے جب کوئی مرد اس کے سامنے گھٹنے ٹیک دے اور وہ اس بات کا اقرار کرے کہ اس کے دل پر اس کا راج ہے اور وہ اس راج میں غلام بننے کے لیے بخوش تیار ہے۔ اس گھٹنے ٹیکنے کے غلام پر خود کو لٹا دینے کو جی چاہتا ہے۔ اسے اپنا سر وارہنے سر کا تاج بنانے کو جی چاہتا ہے۔ دونوں ایک دوسرے پر راج کرتے ہیں اور دونوں ہی ایک دوسرے کے غلام ہو جاتے ہیں۔

ان گئے سالوں میں وہ فرزام سے متاثر ہوئی تھی۔ اسے اچھا جانا تھا۔ وہ میرے کے دل والا تھا اور اس میرے کے دل میں اس نے اپنی تصویر دیکھ لی تھی۔ وہ دنیا میں سب سے پیارا تھا اور وہ اسے بھی سب سے زیادہ پیارا تھا۔

سڑک کے ایک طرف کنارے پر کھڑے افق یہ اعلان کرنے کے لیے تیار تھی کہ انسانوں میں ایک بے حد پیارے انسان "فرزام" سے وہ محبت کرتی ہے اور بے حد کرتی ہے۔ کرتی رہے گی اور کیے بنا رہے گی نہیں۔ اس اعلان کو کرتے وہ جھجکے گی نہیں۔ وہ وہاں سے گزرتے ہر شخص کو روک روک کر یہ بتا رہا جاتی تھی کہ دیکھو! میں کتنی خوش قسمت ہوں۔ تم سب کتنے بد نصیب ہو۔ فرزام صرف میرے پاس ہے اور تم سب اس جیسے کے بغیر ہو۔ وہ تمہیں نہیں ملے گا۔ وہ صرف میرا ہے۔ اب وہ یہ بھی چاہتی تھی کہ وہ آئیں کریم والے کو بیگ میں سے نکال کر بہت سارے ڈالرز پٹاڑے اور کہے کہ سب میں ساری آئیں کریم مفت بانٹ دے۔ سب کو آئیں کریم ملنی چاہیے سب کو مسکراتا چاہیے۔ آس پاس سے گزرتے لوگوں کو چاہیے کہ اسے فردا "فردا" مبارک باد دیں۔ سب اسٹھے ہو کر اسے چیئر کریں۔ مل کر تالیاں بجا لیں اس کے لیے کوئی محبت بھرالوک گیت گائیں۔ ہر تہوار کی آمد کا جشن منایا جاتا ہے۔ محبت کی وقوع پذیری کا جشن بھی شان سے منایا جانا چاہیے۔ اس

جشن میں باقی سب جشنوں کو مات دے دینی چاہیے۔ محبت کی دھنک ابھر کر جب سامنے آئی ہے تو اس کے ساتھ جھول کرنا پنے گانے کوئی جی چاہتا ہے۔ خودی کے رقص ایسے ہی نہیں ہو جاتے۔ یہ واقعہ صرف محبت ہی واقع کرتی ہے۔ وہ عشق حقیقی ہوا مجازی جھوم جانے کو دونوں میں ہی جی چاہتا ہے۔ نشوے ہونٹ صاف کر کے افق پتہ قدم چل کر اس شاپ کی طرف گئی۔ جس طرف فرزام گیا تھا۔ لیکن وہ اسے باہر نکلتا نظر آیا۔

"کیوں آ رہی تھیں میرے پیچھے؟" وہ خفا ہوا۔
"میں کب تک اس کی کھڑی رہتی آخر؟"
"تھوڑی سی دیر تم ایسی نہیں رہ سکتیں؟"

"نہیں۔" اس نے ساتھ تیزی سے بچوں کی طرح سر ہلایا۔ فرزام کے ہاتھ میں کوئی شاپنگ بیگ نہیں تھا۔ جاتے ہوئے وہ اپنے ہاتھ میں پکڑے ہوئے بھی اسے ہی پکڑا گیا تھا۔ انگوٹھی پھر پتینا "اس کے کوٹ کی جیب میں ہوگی۔ افق نے نظروں ہی نظروں میں اس کا جائزہ لیا اس نے بازو اس کی کمر میں جمائی کیا اور اسے ساتھ لے کر چلنے لگا۔ وہ اس کی طرف ہی دیکھ رہی تھی۔

"کیا تمہیں مجھ سے کچھ چاہیے؟" یہ سوال ایسے تھا۔ جیسے کیا ایک اور آئیں کریم کھاتی ہے۔ وہ اسے انتظار کروانا چاہتا تھا۔ ابھی یہ مرو گھٹنے ٹیکنے میں وقت لے گا۔

"ہاں! فوراً! کہا۔" جو اندر سے لائے ہو۔
"کہاں اندر سے؟" اس نے ذرا سی گردن جھکا کر پیچھے کی طرف دیکھا۔

"میں نے تو کچھ نہیں لیا دیکھو! میرے ہاتھ خالی ہیں۔" دونوں ہاتھ آگے کے۔

"کوٹ کی جیب میں ہوگا۔" وہ اس کی آنکھوں میں دیکھ کر بولی۔ اس نے دائیں طرف کی جیب میں ہاتھ ڈالا۔ خالی باہر نکالا۔ پھر بائیں جیب میں ہاتھ ڈالا۔ خالی ہاتھ آگے کیا۔

"کچھ ہی نہیں۔" مسکراہٹ گہری ہو گئی۔

"اندروالی جیب میں ہوگا۔" کوٹ کا دایاں کونا اٹھا کر اس نے کہا۔
فرزام کا ہاتھ اندر گیا۔ "آل۔۔۔ چلو! دیکھتے ہیں۔"

کچھ مل ہی نہیں رہا۔
وہ جس رہا تھا۔ پھر ہاتھ باہر آگیا اور وہ مٹھی کی صورت بند تھا۔

"دیکھا ہے اس میں کچھ۔۔۔ کھول لے اسے۔"
"سوچ لو افق! یہ خالی بھی ہو سکتا ہے۔"

"اگر یہ خالی ہوا تو یہاں سب کے درمیان نیچے بیٹھ کر میں رو دوں گی۔"
"چھا! پھر ذرا آنکھیں بند کرو۔"

وہ اس کا بازو تھام کر کھینچ کر ایک طرف کونے میں لے گیا۔ دونوں آنے سامنے کھڑے تھے۔ ذرا دور ایک بیچ پر ایک درمیانی عمر کا جوڑا بیٹھا برکھارہا تھا۔ دونوں کا انداز اور مسکراہٹ ایسی تھی کہ وہ افق اور فرزام کی طرف ایسے ہی دیکھنے لگے۔ افق نے آنکھیں بند کر لیں اور سندی ہی تھیں کہ تڑپ کر کھول دیں اور بجلی کی سی تیزی سے پیچھے پٹنی۔ جبکہ فرزام تو سامنے کھڑا تھا۔ مٹھی اس نے گھول لی تھی انگوٹھے اور شہادت کی انگلیوں میں انگوٹھی پکڑ لی تھی لیکن "افق" کی آواز سے وہ پیچھے دیکھنے لگی۔

اس کی بد قسمتی اس کی فاش غلطی پیچھے کھڑی تھی۔
"تم آئی کیوں نہیں؟" وہ پوچھ رہا تھا۔ "شام پانچ بجے کا وقت دے رہا تھا۔ اب دس بجے رہے ہیں۔"

انگوٹھی کو مٹھی میں ہی پیچھے کر فرزام دو قدم آگے ہوا۔ اس کے برابر اگر کھڑا ہوا اور اس کی طرف دیکھنے لگا۔ ایک نظرائق کو دیکھا۔ وہ اس وقت چکر کر گرنے کے قریب تھی۔

مسکراتا تھا۔ "تمہیں میں بعد میں پوچھتا ہوں۔ یہ کون ہیں؟ ان سے تعارف کرواؤ۔ تمہارے کزن ہی ہوں گے۔ میں اپنا تعارف خود ہی کروا دیتا ہوں۔ آئی ایم ڈاکٹر عدنان غلام علی۔ آپ کہہ سکتے ہیں افق کا

المن۔"

ہاتھ اس نے آگے کیا۔ جسے تھاما نہیں گیا۔ فرزام

افق کی طرف دیکھ رہا تھا۔ افق عدنان کے آس پاس پھیلے اندھیرے کو دیکھ رہی تھی۔ جو اسی کی طرف بڑھ رہا تھا۔ افق گوگلی بن گئی اور فرزام بہرا ہونے کے قریب تھا۔

"افق! کاہن! فقرے کی بازگشت بہت جان لیوا تھی اور یہ بازگشت تھم ہی نہیں رہی تھی۔ کینیڈا میں ترتیب دیے گئے سارے جملے اس بازگشت کے محور میں جا پھنسے۔"

"ایک ہفتہ پہلے مجھے یہ ملی تھیں۔ آج کے دن کا وعدہ کیا تھا، دوبارہ ملنے کا۔ یہیں قریب میں ہی ایک ہوٹل ہے۔ میں کلنی دیر سے وہاں بیٹھا انتظار کر رہا تھا۔ وہاں تو یہ آئیں نہیں یہاں نظر آئیں۔ میرے رہا ہونے کو سیلبرٹ کرنا تھا۔ سب افق کی وجہ سے ہی ہوا۔ ورنہ میں ابھی تک جیل میں ہی ہوتا۔"

افق نے فرزام کا بازو پھینچا۔ "چلیے! بگھر چلتے ہیں۔"

"یہ کیا کہہ رہا ہے افق؟" فرزام کو اپنے کانوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ وہ جو سن رہا تھا اس کے بعد لگتا تھا کہ اگلا کچھ خالی نہیں دے گا۔

"یہ جھوٹ بول رہا ہے۔" افق بمشکل کہہ سکی۔ سامنے کھڑا عدنان مسکرایا۔ "یہ کرڈیٹ لینا ہی نہیں چاہتی۔ میں نے ٹیبل صرف دو لوگوں کے لیے ہی ایک کرویالی ہے۔ ورنہ میں آپ کو بھی ضرور انوائٹ کرتا۔ آپ سمجھ ہی سکتے ہوں گے۔" وہ فرزام کی طرف دیکھ کر بات کر رہا تھا۔ آخر میں گھٹیا انداز سے آنکھ ماری۔

شریف بیویوں کے شریف شوہر سر راہ ایسے الفاظ اور ایسے گھٹیا انداز پر گریبان پکڑ لیا کرتے ہیں۔

"یہ کیا کہہ رہا ہے؟" پھر سے یہی سوال حتیٰ سے کہا گیا۔

"چلیے گھر پلیز۔" افق اس کا کوٹ کھینچ رہی تھی۔

"یہ مجھے بلا دجے تنگ کر رہا ہے۔"

"میں تنگ کر رہا ہوں۔" وہ نہا۔ "تم ایسے کیوں بات کر رہی ہو؟ ابھی چند دن پہلے تو تم مجھ سے ملی

تھیں۔ ملی تھیں کہ نہیں؟ تو تم ٹھیک تھیں۔ اب ایسے بات کر رہی ہو۔ اپنے گزرنے سے ڈر رہی ہو؟ انہیں میرے بارے میں بتایا نہیں؟
 افتخار نے فرزام کے بازو پر دباؤ ڈالا اور آگے چلنے لگی۔

”تمہارا یہ رویہ مجھے حیران کر رہا ہے افتخار! ساتھ ساتھ چلتے ہو بلند حیران آوازیں بولا ”تم نے مجھے جیل سے ضمانت پر آزاد کروایا ہے۔ مجھے اپنا شکریہ تو ادا کرنے دو۔“

وائٹ گولڈ کی انگوٹھی فرزام کی مٹھی میں ہی خرمندہ ہو گئی۔ اس کا بازو گھسیٹتی تیز تیز چلتی افتخار اسی انگوٹھی میں ٹوٹ پھوٹ گئی۔ فرزام نے اپنا بازو افتخار کے ہاتھ سے آزاد کروایا۔

”تم نے اسے جیل سے آزاد کروایا؟“ خود رک کر اور اسے بھی روک کر وہ پوچھ رہا تھا۔ عدنان دو قدم دور کھڑا تھا۔ افتخار نے فرزام کی طرف التجا سے دیکھا کہ یہاں سربراہ اس گناہ کے سامنے جو قدم ہی پیچھے کھڑا ہے یہ سب نہ پوچھے۔ اس پر شک ضرور کرے لیکن اس پر یقین بھی رکھے۔

اپنے پیچھے کھڑے شخص سے اسے نفرت تھی۔ اپنے سامنے کھڑے شخص میں اس کی جان بھی اور ان دونوں کے درمیان کھڑی وہ ڈوب مرنے کے قریب تھی۔ اس کی خوشی ملیا میٹ ہو گئی۔ اس بار سربراہ اس کی عزت پر غلام علی نے نہیں عدنان غلام علی نے ہاتھ ڈالا تھا۔

کیا وہ یہ کہتی ہاں کیا۔ یا کہتی نہیں۔ دونوں ہی سچ تھے اور دونوں ہی جھوٹ تھے۔ اس سوال کا سیدھا جواب کوئی نہیں تھا۔ اس سوال کے سبب لائے اور اچھے ہوئے جواب تھے۔ جواب دینے میں یہ معمولی سا تامل فرزام کو بہت سے جواب ایسے ہی دے گیا۔ ایک دم ہی وہ افتخار سے بہت دور جا کھڑا ہوا۔ بہت دور۔

”تم اپنا وعدہ پورا کرو۔“ وہ آگے بڑھا۔ اس کے ہاتھ سے ہچکچاہٹ لے کر تیزی سے چلنے لگا۔
 ”فرزام! اس نے بلند آواز میں چیخ ماری تھی۔

وہ رکا نہیں۔ وہ بھی تیز تیز چلتی اس کے پیچھے لگ کر ”میری بات سنیں! میں سب بتا دیتی ہوں۔ ایسے کریں۔“
 ”جیتا ہوا تو تو تم چھپاتیں کیوں؟“

اسی کی طرح تیز آوازیں اپنی آواز کی نمی چھپا کر بھاگنے کے قریب تیز ہو گیا۔ اگر وہ رکا تو وہ واقعی عین سڑک پر سب کے درمیان زمین پر پھیل کر اونچی آواز سے رونے لگے گا اور اس بار وہ بہت روئے گا۔

افتخار ”فرزام! فرزام! ہی کرتی رہ گئی۔ وہ ٹیکسی لے کر چلا گیا۔ افتخار ہانپنے لگی۔ کوٹ کا کالر آنسوؤں سے بھیک چکا تھا۔

فرزام کے لیے کیا گیا میک اپ بہہ رہا تھا۔ وہ پھر سے گھٹنوں میں سر دے کر رونے کے لیے تیار تھی اور وہ اونچی آواز سے رونے لگی۔ عدنان اس کے سر پر آکھڑا ہوا۔

”چلیں افتخار!“
 ساری نفرت اور پوری قوت سے اس نے پلٹ کر زوردار پھپھڑاس کے وائس گال پر لگایا۔ اس بددعا پر جو نہ جانے اسے کون دے گیا تھا۔ وہ وقت ہی ہو گا۔

چند قانون دانوں کے بیانات اور سینٹرز کے شور مچانے پر اٹھا ضرور ہوا کہ ایسے کیسوں کی سماعت میں تیزی آگئی۔ ویسے بھی وہ سالوں سے بند تھے۔ انہیں اب سزا سنائی جاتی تھی یا رہا کر دیا جاتا تھا۔ عدنان اور اس جیسے چند اور لوگ باہر رہ کر کیس لڑ سکتے تھے۔ لیکن وہ امریکا سے باہر نہیں جاسکتے تھے۔ کیس کی سماعت میں تیزی آتی ہی عزیز نے جان لگا دی تھی۔ وہ ایک بے حد حقیقی اور ایمان دار انسان تھا اور حقیقتاً ”عدنان کے لیے پریشان تھا۔ اسے معلوم تھا کہ لالچ میں اس سے غلطی ضرور ہوئی ہے۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ اس کے ساتھ یہ سب کیا جائے۔

اسے امید تھی کہ جلد ہی اس کا مقدمہ بھی ختم ہو ہی جائے گا۔ فی الحال یہی بہت تھا کہ وہ باہر آچکا تھا۔

عدنان نے عزیز کی بہت منت ساجت کی کہ وہ اسے افتخار کے بارے میں بتائے۔ لیکن عزیز نے صاف لاطعلی غماہ کر دی کہ وہ اس بارے میں نہیں جانتا۔ عدنان کو یقین نہیں آ رہا تھا۔

عزیز نے اس کے لیے رہائش کا انتظام کر دیا تھا۔ پاکستان میں وہ سب سے بات کر چکا تھا۔ اب اسے صرف بات کرنے کے لیے افتخار چاہیے تھی۔ وہ اس ہیومن رائٹس کے ادارے کے دفتر آیا۔ جس کا نمائندہ اسے سیل میں آکر ملا تھا۔ بظاہر وہ ان کا شکریہ ادا کر رہا تھا۔ لیکن باتوں ہی باتوں میں وہ معلومات لیتا گیا کہ ان کے پاس عدنان کا کیس لے کر کون آیا تھا۔

اسے مسٹر جین کے اور ان کی این جی او کے بارے میں بتایا گیا۔ افتخار کے بارے میں بھی بتایا گیا۔ مسٹر جین کی این جی او کی ویب سائٹ پر اسے چندہا پہلے ہوئے فنڈز ریڈنگ ایونٹ کی بہت ساری تصاویر ملیں۔ اسے بتایا گیا تھا کہ افتخار نے ان کی این جی او کے لیے کام کیا ہے ان کے لیے فنڈز اکٹھے کیے ہیں۔ مختلف ویب سائٹس پر کا جائزہ لیتے اس کی نظر اس سچ پر بھی پڑی۔ جس میں فنڈز ریڈنگ میں اچھے اسکور لینے والوں کے نام اور ان کے جمع کیے گئے فنڈز کی نشاندہی کی گئی تھی۔ بہت سے ناموں میں ایک نام افتخار کا بھی تھا۔ ایک طرف اس کی پیش کی گئی برائے ”چتر“ کا نام درج تھا۔ بریکٹ میں ملک کا اور شہر کا نام درج تھا۔

عدنان نے سرچ انجن میں چتر کی ویب سائٹ نکال لی اور جہاں جہاں برائے چتر مل سکتی تھی وہ تہے بھی ان میں سے ایک پتا بوسٹن کے ایک اسٹور کا تھا جہاں سے اس برائے کو خریداجا سکتا تھا۔

وہ بہت خوش تھا۔ اس نے اسے ڈھونڈ لیا تھا۔ اب وہ افتخار کو سر پر اتار دینا چاہتا تھا۔ ایک بار اسٹور جا کر اس نے تصدیق کر لی تھی کہ وہی افتخار ہے۔ اسے بتایا گیا تھا کہ وہ دو یا تین دن بعد وہاں کا چکر لگانی ہے۔ رابطہ نمبر کے طور پر اسے پاکستان میں موجود اس کا کارڈ بھی دیا جا رہا تھا۔

وہ مسلسل دو دن وہاں جاتا رہا۔ وہ قریبی ریڈیو سٹورٹ

میں بیٹھ جاتا۔ جہاں سے وہ اسٹور پر نظر کر سکتا تھا۔ سارا دن ایسے ہی بیٹھا رہتا۔ سالوں بعد وہ اسے دیکھنے جا رہا تھا اس سے ملنے جا رہا تھا۔ اس نے اس کی زندگی بچائی۔ اسے باہر نکالا۔ اس پر اس کی زندگی کا سب سے بڑا احسان کیا۔ عین مرنے کے وقت اسے زندگی کی نوید دی۔ اس کا اسپتال ضبط کر لیا گیا تھا۔ ڈاکٹری کلائنکس منسوخ کر دیا گیا تھا۔ اس کی صحت اس کا مروانہ حسن و وجاہت سب کچھ تباہ ہو چکا تھا۔ رشتے اور رتبے کے نام پر اس کے پاس کچھ نہیں رہا تھا۔ شروع کے صرف دو ڈھائی سالوں میں ہی اس کی بہت پست ہو چکی تھی۔ ماریہ جس طرح اسے چھوڑ گئی۔ اس نے اپنا سر دیواروں پر مارا۔

وہ اسے چھوڑ جاتی لیکن اس کی تھوڑی مدد تو کر دیتی۔ وہ امریکن تھی۔ وہاں پیدا ہوئی تھی۔ اس کے لیے بہت کچھ کر سکتی تھی۔ الزاناس نے طلاق لے لی اور اس کا سر جس کی گندی بیٹی کی وہ چوکیداری کرتا رہا تھا۔ ایک بار اگر اس سے ملا تھیں۔ وہ دونوں ان دونوں کو گالیاں دیتا رہا۔ وہ انہیں بدذات سمجھتا تھا۔ وہ عدنان کے لیے ایسے بے غیرت تھے۔ جن میں نام کی بھی غیرت نہیں تھی۔ نائٹ کلب میں ڈانس کرنے والی ڈانسر بھی اس کے نزدیک ماریہ سے زیادہ شریف اور قابل عزت تھی۔

اسے احساس ہوا کہ وہ دراصل اپنے پیانے سے گر گیا تھا۔ اس کا پیانہ صرف افتخار تھی۔ جہاں اس نے کالج کی بہت سی جان چھڑکنے والی امیرزادوں کو لفٹ نہیں کروائی تھی۔ وہاں اس نے یہ لفٹ صرف افتخار کو کروائی تھی۔ اس نے فاش غلطی کی جو وہ بہک گیا۔ جبکہ اس نے سوچ ہی لیا تھا کہ اسے صرف افتخار سے ہی شادی کرنی ہے۔ وہ اچھے خاصے منگے پر انیویٹ اسپتال میں نوکری کر سکتا تھا۔ اپنا کلینک بنا سکتا تھا۔ بے حد پر آسائش نہ سہی آرامہ زندگی ضرور گزرتی۔ لیکن یہ آرامہ زندگی اسے امریکی چند فٹ سیل میں بیٹھ کر دکھائی دی۔ جب وہ یہاں نہیں تھا تو اسے ڈبل اسٹوری اسپتال بنانا یا بوسٹن میں نظر آ رہا تھا۔ اتنا کہ

استور کی چین نظر آرہی تھی۔ غلام علی غلام کو آغا کے ذاتی طیارے کے مالک ہونے کا غور توڑتا تھا انہیں اس شخص آغا سے شدید نفرت تھی۔ اس شخص نے ہمیشہ انہیں ہر میدان میں پیچھے چھوڑا تھا۔ مکینہ عیاشی، اُلُو، بے غیرت۔ وہ اسے بہت سے ناموں سے یاد کرتے۔ لاس ویگاس میں وہ جا جا کر کیا کرتا ہے۔ ایک دن غلام علی نے بہت رازداری سے ازبک بیوی کے کان بھرنے چاہے وہ پہلے تو اپنے شوہر کی طرح سنتی رہی۔

”وہ ایک ماہر جواری ہے۔ یہ میں جانتی ہوں۔ باقی کی معلومات مجھے کسی بھی دوسرے شخص سے زیادہ ہیں۔“ مطلب آئندہ اپنی بکواس بند کر رکھنا۔

تب اسے ماریہ جنت نظیر نظر آئی تھی۔ جو حور بھی تھی اور ایک دنیاوی جنت کی مالک بھی۔ تب کیوں سب ٹھیک لگتا تھا؟ اب سب کیوں برا لگ رہا ہے؟ عدنان یہ بات نہیں جان سکا۔ وہاں وہ دن رات ایک ہی کام کرتا۔ ”وہ افق کو یاد کرتا“ ان دنوں اس پر افق کی محبت کا بھوت بری طرح سے طاری ہو گیا۔ اسے اس کے نام کے دورے پڑتے۔

وہ بھی تانے بانے بنا رہا تھا کہ اگر وہ آج یہاں نہ ہوتا تو ایک گھر میں افق کے ساتھ زندگی گزار رہا ہوتا۔ اس کے بچے ہوتے۔ بے حد محبت کرنے والی بیوی ہوتی۔ تب اسے معلوم ہوا کہ زندگی میں ان دو چیزوں کے علاوہ کسی تیسری کی تمنا نہیں کرنی چاہیے۔ ”سکون اور محبت“

اسے یاد آتا تھا کہ وہ اس سے کتنی بے لوث محبت کرتی تھی۔ ایسی محبت جو کچھ مانگتی نہیں پڑے سب دیتی ہے۔

”مٹی اچھی پلائنگ میں یہ سب کیسے ہو گیا۔“ وہ اپنے بال نوچا۔ جب سب افق کے ساتھ سارے منصوبے بن چکا تھا تو وہ سب کیوں نہ مضبوط رہا۔

اتنے سالوں میں غلام علی نے بیسہریانی کی طرح ہلایا تھا۔ آسٹریلیا میں پڑھنے والا اس کا چھوٹا بھائی حارث کا شکار ہو گیا تھا۔ اس کی ریڑھ کی ہڈی تباہ ہو چکی تھی۔

غلام علی کے پیسے کے کونئیں خالی ہو رہے تھے۔ ان گزرے سالوں میں ان کی کمزوری چکی تھی۔ فیکٹریاں نقصان میں ہی جاری تھیں۔ قرضوں کی قسطوں کی ادائیگی نہ ہو سکی۔ سودور سوڈیہ گیا۔ غلام علی کے ہاتھوں سے نکل گیا اور دونوں فیکٹریاں بینک نے ضبط کر لیں۔ جس فیکٹری میں آگ لگی تھی اس سمیت بینک نے فیکٹریاں غلام کریس۔ غلام علی کے پاس ایک چھوٹی تین کینال کی فیکٹری ہی بچی تھی یہ ایسے ہی تھا جیسے وہ مر سب زچلاتے چلاتے سائیکل پر آگئے ہوں۔ لاہور ڈی ایچ اے کا بنگلہ بھی بک چکا تھا۔ سیالکوٹ کا گھر ہی بچا تھا۔ فارم ہاؤس پر بھی مزید قرضہ لے لیا گیا تھا۔

غلام علی چاہتے تھے کہ بس وہ جلد سے جلد واپس آجائے۔ اب بھی وہ اسے ایک چھوٹا سا اسپتال تو بنا کر دے ہی سکتے تھے۔ تاہم اسپتال کے کاروبار میں اتنا منافع ہے کہ وہاں میں ہی ان کا نقصان پورا ہو ہی جائے گا۔ پھر وہ تو امریکن ڈاکٹر بھی ہے۔ کہنے میں کیا جاتا ہے کہ اتنے سال اس نے امریکا میں پریکٹس کی ہے۔ امریکیوں کا علاج کرتا رہا ہے۔ پاکستان میں انہوں نے اس کے جیل جانے کی خبر کو سب سے چھپا کر رکھا تھا۔ وہ فیکٹری بیچ کر اسے ایک بڑا اسپتال بنادیں گے اور انہیں تو چھوٹے چھوٹے دیتین ہی بنائیں گے۔ غلام علی نے بہت اعلیٰ منصوبے بنائے تھے۔

”حالات یہی رہے تو ہم فٹ پاتھر پر آجائیں گے۔“ بارہ کینال کے گھر میں رہنے والے غلام علی کو فٹ پاتھر کے نام سے ہی نفرت تھی۔ جبکہ یہی فٹ پاتھر گاہے بگاہے انہیں خواب میں دکھائی دیتا تھا۔

”تم بھاگ نہیں سکتے وہاں سے؟ کوئی ایجنٹ ڈھونڈو عدنان! کوئی تمہیں کینیڈا کے راستے یا برازیل کے راستے نکال سکے۔ میں یہاں بھی ایسا ایجنٹ ڈھونڈ رہا ہوں۔ تم بھی کوشش کرو۔“ سنا ہے یہ سیاہ فام بہت طاق ہیں ان کاموں میں۔ بہت سوں کو امریکا لے آئے ہیں غیر قانونی۔“

اس نے سنتے ہی صاف صاف انکار کر دیا۔ ”میں

دیوارہ چھن جاؤں گا اگر ایسے بھاگتے پکڑا گیا تو ان کا ٹک ٹکٹین میں بدل جائے گا۔ وہ مجھے وہشت گرد ہی سمجھ لیں گے۔ میں مارجاؤں گا۔ میں مقدمہ بھگتے بھگتے لیکن دیوارہ جیل نہیں جاؤں گا۔“

”مرد بو عدنان۔ زندگی میں خطرات مول لینے ہی پڑتے ہیں۔“

”میں سوئی چھپنے جتنا خطرہ بھی مول لینا نہیں چاہتا۔“ صاف انکار۔

”تو ڈر پوک ہو تم۔“ انہیں غصہ آ گیا۔

”جیل میں رہا ہوں۔ پولیس والوں کی شکل دیکھتے ہی جان نکل جاتی ہے۔“

”مریکا کا پانی پی کر تم بزدل بن گئے ہو۔“ وہ اسے انکار ہے۔

”مریکا میں جیل کا پانی پی کر۔“

”مرد ہی جیلوں میں جاتے ہیں۔“

”چھوٹی مرد کی اور قابل نہیں رہتے پاپا۔“

انہوں نے فون ہی بند کر دیا۔ ایک طرف اس کے آنے کی خوشی دوسری طرف اس کی بزدلی پر افسوس۔

اس کی ہائی فائی فیشن اسٹیل ماں ڈپریشن کی مریضہ بن چکی تھی۔ وہ روٹی پہلے تھی۔ بات بعد میں کرتی تھی۔ اس کی بہن نے یونیورسٹی کے ایک لورڈ ٹل

کلاس لڑکے سے خود ہی شادی کر لی تھی اور آج کل وہ دینی میں تھی۔ غلام علی کو ایک عرصہ منانے کے بعد

اس نے اس لڑکے سے خود ہی نکاح کر لیا۔ اس کے باپ کے پاس دولت کے علاوہ کوئی دلیل نہیں تھی دی جانے کے لیے اور اس کے پاس دولت کے علاوہ ہر

دلیل تھی اس لڑکے کے حق میں دی جانے کے لیے۔ اسے اپنی بہن کے بارے میں معلوم ہوا تو اسے خود پر

اور افسوس ہوا۔ کاش! وہ بھی اپنی بہن کی طرح کا ہی ہوتا۔

دہائی کے تیسرے روز رات کے وقت اپنے قلیٹ میں اندھیرا کیسے آخری بازی ہار شخص بنا بیٹھا تھا۔

سوڈنیاں کا حساب وہ جیل میں ہی لگا چکا تھا۔ ماریہ سے لے کر اپنی ڈاکٹری تک۔ غلام علی سے آغا تک۔ اس

نے ہر چیز کی گنتی کر لی تھی۔ اسے سب پایا اور کھو کھلا نظر آیا۔ سب بے کار۔ اسے بہت احساس ہوا کہ زندگی کی اصل کامیابی اصل اور کھرے انسانوں کا حاصل کرنا ہے۔ انسانی تعلقات میں اول اتنا ضروری ہے۔ جذلوں اور سچائی میں اول۔ وہ جان گیا کہ برے وقت میں انسان کو صرف ایک ہی چیز کی ضرورت پڑتی ہے۔ ”اپنے انسان کی“

قید کے عرصے میں وہ ایسی کان میں دیوارہ، جہاں اسے کونوں اور ہیروں کی پچان ملی۔ تاہم اس نے کونوں سے ہی خود ہی کو سیاہ کیا تھا۔ ہیرے کو تو اس نے ٹھوکر مارنے کی بھی زحمت نہیں کی تھی۔ افق کو۔ ملا۔

اس کی بہن فضا کو۔ اپنے اسکول دوست طاہ کی بہن فضا کو اپنے پیچھے پاگل کر دیا۔ آج وہی طاہ اقوام متحدہ کے ایک ذیلی ادارے کا ہیڈ تھا۔ اس کی بہن جس نے عدنان کے لیے نیڈر کی گولیاں کھالی تھیں۔ ریڈ کر اس کے لیے کام کرتی تھی اور وہ چار دوست جو اس کے ساتھ ڈی ایچ اے کے بنگلے میں رہے تھے وہی ایگل گروپ کے ممبر تھے۔ آج بڑے بڑے ڈاکٹر بن چکے تھے۔ ایک تو امریکا میں ہی ہارٹ سرجن تھا۔ غلام علی نے تعاون کے لیے جب رابطہ کیا تو اس نے صاف انکار کرنے کی زحمت بھی نہیں کی اور آئندہ سے ان کا فون سننا ہی بند کر دیا۔

تو ایسی صورت حال میں۔ اس سب حساب کتاب میں اس کے پاس افق ہی بچی تھی۔ ابن جی او کے نمائندے سے اس کے بارے میں جان کر پہلے تو اسے یقین ہی نہیں آیا کہ غیلے گند میں رہنے والی بمشکل ایف اے پاس لڑکی نے اتنی بڑی ابن جی او کو حرکت دے دی ہے۔ اس نے بار بار نمائندے سے پوچھا کہ ”کیا وہ ایک پاکستانی مسلم لڑکی افق کی بات کر رہا ہے؟“ تو اس نے بتایا کہ ”ہاں! یہی لڑکی ان کے دفتر میں آئی تھی اور اس کے بارے میں بتا کر گئی تھی۔“

اس رات عدنان نے یہ نہیں سوچا کہ وہ کیسے اتنی کامیاب ہو گئی۔ اس نے صرف اتنا سوچا کہ اس کے لیے افق اتنی فضا ہو گئی۔

نے ہر چیز کی گنتی کر لی تھی۔ اسے سب پایا اور کھو کھلا نظر آیا۔ سب بے کار۔ اسے بہت احساس ہوا کہ زندگی کی اصل کامیابی اصل اور کھرے انسانوں کا حاصل کرنا ہے۔ انسانی تعلقات میں اول اتنا ضروری ہے۔ جذلوں اور سچائی میں اول۔ وہ جان گیا کہ برے وقت میں انسان کو صرف ایک ہی چیز کی ضرورت پڑتی ہے۔ ”اپنے انسان کی“

قید کے عرصے میں وہ ایسی کان میں دیوارہ، جہاں اسے کونوں اور ہیروں کی پچان ملی۔ تاہم اس نے کونوں سے ہی خود ہی کو سیاہ کیا تھا۔ ہیرے کو تو اس نے ٹھوکر مارنے کی بھی زحمت نہیں کی تھی۔ افق کو۔ ملا۔

اس کی بہن فضا کو۔ اپنے اسکول دوست طاہ کی بہن فضا کو اپنے پیچھے پاگل کر دیا۔ آج وہی طاہ اقوام متحدہ کے ایک ذیلی ادارے کا ہیڈ تھا۔ اس کی بہن جس نے عدنان کے لیے نیڈر کی گولیاں کھالی تھیں۔ ریڈ کر اس کے لیے کام کرتی تھی اور وہ چار دوست جو اس کے ساتھ ڈی ایچ اے کے بنگلے میں رہے تھے وہی ایگل گروپ کے ممبر تھے۔ آج بڑے بڑے ڈاکٹر بن چکے تھے۔ ایک تو امریکا میں ہی ہارٹ سرجن تھا۔ غلام علی نے تعاون کے لیے جب رابطہ کیا تو اس نے صاف انکار کرنے کی زحمت بھی نہیں کی اور آئندہ سے ان کا فون سننا ہی بند کر دیا۔

تو ایسی صورت حال میں۔ اس سب حساب کتاب میں اس کے پاس افق ہی بچی تھی۔ ابن جی او کے نمائندے سے اس کے بارے میں جان کر پہلے تو اسے یقین ہی نہیں آیا کہ غیلے گند میں رہنے والی بمشکل ایف اے پاس لڑکی نے اتنی بڑی ابن جی او کو حرکت دے دی ہے۔ اس نے بار بار نمائندے سے پوچھا کہ ”کیا وہ ایک پاکستانی مسلم لڑکی افق کی بات کر رہا ہے؟“ تو اس نے بتایا کہ ”ہاں! یہی لڑکی ان کے دفتر میں آئی تھی اور اس کے بارے میں بتا کر گئی تھی۔“

اس رات عدنان نے یہ نہیں سوچا کہ وہ کیسے اتنی کامیاب ہو گئی۔ اس نے صرف اتنا سوچا کہ اس کے لیے افق اتنی فضا ہو گئی۔

تو ایسی صورت حال میں۔ اس سب حساب کتاب میں اس کے پاس افق ہی بچی تھی۔ ابن جی او کے نمائندے سے اس کے بارے میں جان کر پہلے تو اسے یقین ہی نہیں آیا کہ غیلے گند میں رہنے والی بمشکل ایف اے پاس لڑکی نے اتنی بڑی ابن جی او کو حرکت دے دی ہے۔ اس نے بار بار نمائندے سے پوچھا کہ ”کیا وہ ایک پاکستانی مسلم لڑکی افق کی بات کر رہا ہے؟“ تو اس نے بتایا کہ ”ہاں! یہی لڑکی ان کے دفتر میں آئی تھی اور اس کے بارے میں بتا کر گئی تھی۔“

اس رات عدنان نے یہ نہیں سوچا کہ وہ کیسے اتنی کامیاب ہو گئی۔ اس نے صرف اتنا سوچا کہ اس کے لیے افق اتنی فضا ہو گئی۔

تو ایسی صورت حال میں۔ اس سب حساب کتاب میں اس کے پاس افق ہی بچی تھی۔ ابن جی او کے نمائندے سے اس کے بارے میں جان کر پہلے تو اسے یقین ہی نہیں آیا کہ غیلے گند میں رہنے والی بمشکل ایف اے پاس لڑکی نے اتنی بڑی ابن جی او کو حرکت دے دی ہے۔ اس نے بار بار نمائندے سے پوچھا کہ ”کیا وہ ایک پاکستانی مسلم لڑکی افق کی بات کر رہا ہے؟“ تو اس نے بتایا کہ ”ہاں! یہی لڑکی ان کے دفتر میں آئی تھی اور اس کے بارے میں بتا کر گئی تھی۔“

اس رات عدنان نے یہ نہیں سوچا کہ وہ کیسے اتنی کامیاب ہو گئی۔ اس نے صرف اتنا سوچا کہ اس کے لیے افق اتنی فضا ہو گئی۔

تو ایسی صورت حال میں۔ اس سب حساب کتاب میں اس کے پاس افق ہی بچی تھی۔ ابن جی او کے نمائندے سے اس کے بارے میں جان کر پہلے تو اسے یقین ہی نہیں آیا کہ غیلے گند میں رہنے والی بمشکل ایف اے پاس لڑکی نے اتنی بڑی ابن جی او کو حرکت دے دی ہے۔ اس نے بار بار نمائندے سے پوچھا کہ ”کیا وہ ایک پاکستانی مسلم لڑکی افق کی بات کر رہا ہے؟“ تو اس نے بتایا کہ ”ہاں! یہی لڑکی ان کے دفتر میں آئی تھی اور اس کے بارے میں بتا کر گئی تھی۔“

اس رات عدنان نے یہ نہیں سوچا کہ وہ کیسے اتنی کامیاب ہو گئی۔ اس نے صرف اتنا سوچا کہ اس کے لیے افق اتنی فضا ہو گئی۔

تو ایسی صورت حال میں۔ اس سب حساب کتاب میں اس کے پاس افق ہی بچی تھی۔ ابن جی او کے نمائندے سے اس کے بارے میں جان کر پہلے تو اسے یقین ہی نہیں آیا کہ غیلے گند میں رہنے والی بمشکل ایف اے پاس لڑکی نے اتنی بڑی ابن جی او کو حرکت دے دی ہے۔ اس نے بار بار نمائندے سے پوچھا کہ ”کیا وہ ایک پاکستانی مسلم لڑکی افق کی بات کر رہا ہے؟“ تو اس نے بتایا کہ ”ہاں! یہی لڑکی ان کے دفتر میں آئی تھی اور اس کے بارے میں بتا کر گئی تھی۔“

اس رات عدنان نے یہ نہیں سوچا کہ وہ کیسے اتنی کامیاب ہو گئی۔ اس نے صرف اتنا سوچا کہ اس کے لیے افق اتنی فضا ہو گئی۔

تو ایسی صورت حال میں۔ اس سب حساب کتاب میں اس کے پاس افق ہی بچی تھی۔ ابن جی او کے نمائندے سے اس کے بارے میں جان کر پہلے تو اسے یقین ہی نہیں آیا کہ غیلے گند میں رہنے والی بمشکل ایف اے پاس لڑکی نے اتنی بڑی ابن جی او کو حرکت دے دی ہے۔ اس نے بار بار نمائندے سے پوچھا کہ ”کیا وہ ایک پاکستانی مسلم لڑکی افق کی بات کر رہا ہے؟“ تو اس نے بتایا کہ ”ہاں! یہی لڑکی ان کے دفتر میں آئی تھی اور اس کے بارے میں بتا کر گئی تھی۔“

اس رات عدنان نے یہ نہیں سوچا کہ وہ کیسے اتنی کامیاب ہو گئی۔ اس نے صرف اتنا سوچا کہ اس کے لیے افق اتنی فضا ہو گئی۔

تو ایسی صورت حال میں۔ اس سب حساب کتاب میں اس کے پاس افق ہی بچی تھی۔ ابن جی او کے نمائندے سے اس کے بارے میں جان کر پہلے تو اسے یقین ہی نہیں آیا کہ غیلے گند میں رہنے والی بمشکل ایف اے پاس لڑکی نے اتنی بڑی ابن جی او کو حرکت دے دی ہے۔ اس نے بار بار نمائندے سے پوچھا کہ ”کیا وہ ایک پاکستانی مسلم لڑکی افق کی بات کر رہا ہے؟“ تو اس نے بتایا کہ ”ہاں! یہی لڑکی ان کے دفتر میں آئی تھی اور اس کے بارے میں بتا کر گئی تھی۔“

اس رات عدنان نے یہ نہیں سوچا کہ وہ کیسے اتنی کامیاب ہو گئی۔ اس نے صرف اتنا سوچا کہ اس کے لیے افق اتنی فضا ہو گئی۔

تو ایسی صورت حال میں۔ اس سب حساب کتاب میں اس کے پاس افق ہی بچی تھی۔ ابن جی او کے نمائندے سے اس کے بارے میں جان کر پہلے تو اسے یقین ہی نہیں آیا کہ غیلے گند میں رہنے والی بمشکل ایف اے پاس لڑکی نے اتنی بڑی ابن جی او کو حرکت دے دی ہے۔ اس نے بار بار نمائندے سے پوچھا کہ ”کیا وہ ایک پاکستانی مسلم لڑکی افق کی بات کر رہا ہے؟“ تو اس نے بتایا کہ ”ہاں! یہی لڑکی ان کے دفتر میں آئی تھی اور اس کے بارے میں بتا کر گئی تھی۔“

اس رات عدنان نے یہ نہیں سوچا کہ وہ کیسے اتنی کامیاب ہو گئی۔ اس نے صرف اتنا سوچا کہ اس کے لیے افق اتنی فضا ہو گئی۔

تو ایسی صورت حال میں۔ اس سب حساب کتاب میں اس کے پاس افق ہی بچی تھی۔ ابن جی او کے نمائندے سے اس کے بارے میں جان کر پہلے تو اسے یقین ہی نہیں آیا کہ غیلے گند میں رہنے والی بمشکل ایف اے پاس لڑکی نے اتنی بڑی ابن جی او کو حرکت دے دی ہے۔ اس نے بار بار نمائندے سے پوچھا کہ ”کیا وہ ایک پاکستانی مسلم لڑکی افق کی بات کر رہا ہے؟“ تو اس نے بتایا کہ ”ہاں! یہی لڑکی ان کے دفتر میں آئی تھی اور اس کے بارے میں بتا کر گئی تھی۔“

باہر نکلتے ہی وہ اب اس شادی کر لے گا۔ اس نے اور افق نے بہت انتظار کر لیا۔ بس۔ اسے اس کی ٹیٹھی آواز اور بھولی صورت یاد آئی۔ شرافت سے جھکا اس کا سر اور محبت سے بھرا اس کا دل۔ اب یہ دل کسی اور کا نہیں۔

کالج سے سیدھا وہ اسٹور آگئی تھی۔
”کوئی آپ کے بارے میں پوچھ رہا تھا۔“ اسٹور کے دور کرنے لے آیا۔
”کون تھا؟“
”ہام نہیں بتایا۔ صرف پوچھ رہے تھے۔“
”آرڈر دینا تھا؟“

”میں نے آرڈر کا پوچھا تو مسکرانے لگے۔ پوچھ رہے تھے کہ آپ کب تک آتی ہیں۔ میں نے کارڈ دے دیا تھا آپ کے ہیڈ آفس کا۔“ کچھ ہی دیر میں وہ اسٹور سے باہر آگئی۔ جب پیچھے سے کسی نے آگراس کی آنکھوں پر ہاتھ رکھا۔

”فرزام۔“ ایسا صرف وہی کر سکتا تھا۔
”یہ فرزام کون ہے؟“ ہاتھوں کو فوراً ہٹا لیا گیا۔
آواز پر وہ ایسے پلٹی۔ جیسے سانپ نے کاٹ مار لیا ہو۔ جس پر اس کی نظر پڑی۔ وہ ہڈیوں کا ڈھانچہ۔ شاندار عمارت کا بد نما کھنڈر بنا عدن تھا۔ اس کی سرخ و سفید دودھیا رنگت، لیے عرصے سے گردوں کے عارضے میں جٹلا مریض سی بد رنگی اور گد مٹی ہو چکی تھی۔ تھوڑا بہت جو گوشت جسم پر بچا تھا وہ ڈھلتی عمر کے بیماری زدہ مرد کی جھریوں بھری کھال جیسا تھا۔

اپنے وقت کا شاہکار عدن عرف امان کھنڈرات بنا کھڑا تھا۔

”یہ فرزام کون ہے افق؟“ اس نے دوبارہ پوچھا۔
کون تھا جو اس طرح اس کی آنکھوں پر ہاتھ رکھ سکتا تھا اور کون تھا جس کے ہاتھ رکھنے پر افق کو کوئی اعتراض نہیں تھا۔ وہ صبح سے اس کا میاں آکر انتظار کر رہا تھا۔ ریسٹورنٹ اسٹور کے سامنے تھا۔ لیکن

سڑک پار کر کے۔ کئی بار وہ اسٹور کے قریب بھی چلا گیا تھا۔ ریسٹورنٹ اوپن تھا اور دن کے شروع میں وہاں زیادہ رش نہیں ہوا تھا۔ اس کی نظر ایک طرف اٹھی اسے گمان ہوا کہ یہ افق ہی ہے۔ لیکن اسے یقین نہیں آیا کہ کیا یہ افق ہو سکتی ہے۔ وہ کپ آؤس کریم کھا رہی تھی۔ نیلے رنگ کی چپل جینز پر اس نے مشرقی طرز کا کرتا پہنا ہوا تھا۔ ہلکے خاکی کرتے پر اس نے کمرے سرخ رنگ کا اسکارف گردن کے گرد لپیٹا ہوا تھا۔ بال کھلے ہوئے تھے اور بالوں میں سرخ ہی بہرہ بینڈ لگا ہوا تھا۔ دونوں کانوں میں ایر فون فکس تھے اور کپ سے چچے سے آؤس کریم نکال نکال کر کھاتے ہوئے وہ ہنس رہی تھی۔ وہ یقیناً ”کسی سے فون پر بات کر رہی تھی۔“

”میں تمہارے آس پاس ہی ہوں۔“ فرزام کہہ رہا تھا۔

”کوئی نہیں۔“ اس نے آس پاس دیکھا۔
”گردن کھماؤ مت نا۔ اسے ذرا سا جھکالو۔“

وہ ہنسی۔ وہ سمجھ گئی۔ اس کے پاس چند منٹ ہی تھیں بات کرنے کے لیے۔ عدن کو یقین نہیں آ رہا تھا کہ وہ یقین کرے کہ سرخ اسکارف میں جو لڑکی شرارتی چال چلتی جا رہی ہے وہ افق ہی ہے۔

اتنے سالوں میں کیا اس نے صرف یہی ایک کام کیا کہ وہ اور سے اور خوب صورت ہوئی تھی۔ اس بار اس نے اپنے ساتھ کیا کیا۔ کیا کہ وہ اتنی خوب صورت ہو گئی، اتنی پر اعتماد۔ بو سٹن کی سڑک پر وہ ایسے چل رہی ہے۔ جیسے بو سٹن میں ہی پیدا ہوئی ہے۔ چادر کا کونامہ میں دبا کر۔ سر کو جھکا کر پیدل چلنے والی۔ ہر لا پر گھبرانے والی۔ ڈر جانے والی۔ کس او اسے ہنس رہی ہے۔ اسے دیکھ کر لگ رہا ہے کہ اسے کوئی فکر، کوئی غم نہیں ہے۔ عدن کا تصور ذرا الٹ تھا۔ اس میں ایک تصور خاص غالب تھا کہ وہ او اس آنکھیں لیے ہر طرح سے بہت او اس ہوگی۔ اپنے امان سے دور۔ اس کی جدائی میں گھلتی، اس کے پیار کے لیے تڑپتی، افق عبد القدوس۔

وہ چل کر اسٹور کے پاس ہی آکر کھڑا ہو گیا تھا۔
افق نے نفرت سے اسے دیکھا۔ عدن اس نظر پر حیران رہ گیا۔
”ہو آریو؟“ اس سوال پر بھی حیران رہ گیا۔
”میں کون ہوں؟“ اس نے ہنسنے کی صرف کوشش کی۔

”تمہاری جرات کیسے ہوئی مجھے ہاتھ لگانے کی؟“
اگلا سوال پہلے سے بھی برا تھا۔ انداز اس سے بھی بدتر تھا۔ ساتھ ہی وہ اپنے بیگ میں سے کچھ ڈھونڈنے لگی۔ موبائل ہاتھ میں نکال کر پکڑا۔
عدن اسے دیکھتا ہی رہ گیا۔ ”تم پولیس کو فون کر رہی ہو؟“ اسے یقین ہی نہیں آ رہا تھا کہ یہ سب افق کر رہی ہے۔

”آئی۔ ایم سوری افق۔ ایسے تو نہ کرو۔“ فون کو ہاتھ میں پکڑے پکڑے ہی افق نے اسے دیکھا۔
”تم نے مجھے ہاتھ کیوں لگایا؟“ کتنا تو وہ یہ چاہتی تھی کہ تمباک، بیٹے نے مجھے سمجھ کیا رکھا ہے۔
”میں پھر سے سوری کہتا ہوں۔ لیکن تم میرے ساتھ ایسا کیوں کر رہی ہو؟“ اس کے انداز اور کڑے تیروں پر وہ بری طرح سے الجھ گیا۔ ساتھ ہی اس کی آواز زندہ گئی اور آنکھوں میں نمی نظر آنی لگی۔ افق کو برا ترس آیا۔

”کیا چاہتے ہو؟“ عدن نے کیوں آئے ہو یہاں؟“
”میں شکر یہ کہنے آیا تھا۔“ فی الحال وہ یہ کہہ ہی نہیں سکا کہ تم سے فوری شادی کرنے کے لیے آیا ہوں۔ جو افق اب اس کے سامنے کھڑی تھی وہ چادر کا کونامہ میں دبا کر ٹیٹھی افق نہیں تھی۔
”کیوں؟“ افق نے حیران ہونے کی کمال اداکاری کی۔

”مجھے معلوم تھا کہ تم ہی مجھے آزاد کرواؤ گی؟“
”میں نے؟ میں نے کیا کیا؟ تم جیل میں تھے کیا؟“
عدن اس پر الجھ گیا۔ ”تم ہی این جی او کا نمائندہ تم ہی نے تو بھیجا تھا میرے پاس۔ مارش نام تھا اس کی۔“

”میں نے تمہارے پاس کوئی نمائندہ نہیں بھیجا تھا۔“
”اس نے خود مجھے تمہارا نام بتایا تھا۔“
”تو تم بھی جیل میں تھے؟ وہ تمہارے پاس بھی چلا گیا؟“ عدن اور الجھ کر اسے دیکھنے لگا۔

”ہاں جی او جن لوگوں کے لیے کام کر رہی تھی۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ ان میں تم بھی ہو۔ ہم نے عرب۔ بنگلہ دیش اور چند دوسرے ملک کے لوگوں کے لیے تھوڑا سا کام کیا تھا اور بس۔“ افق نے کندھے اچکائے۔
”تم جھوٹ بول رہی ہو۔“ عدن کو یقین ہی نہیں آیا۔

”تم کیا سمجھ رہے ہو، مجھے اس سے مطلب نہیں ہے۔“
”تم ایسے کیوں کر رہی ہو افق؟“ وہ پھر سے رو دینے کے قریب ہو گیا۔
”کیسے؟“

”جیسی کیوں بن رہی ہو۔ اتنے سالوں بعد ملی ہو۔ کوئی حال احوال پوچھو۔ کوئی بات کرو۔ میں پاگل ہو رہا تھا تم سے ملنے اور تمہیں دیکھنے کے لیے۔“
”تم نے کہا، تمہیں میرا شکریہ ادا کرنا تھا۔ جب کچھ کیا ہی نہیں تو کیسا شکریہ۔“ افق نے کلائی پر بندھی گھڑی کی طرف دیکھا۔

”تم جھوٹ بول رہی ہو۔ صاف جھوٹ۔ تم تو جھوٹ بولتی ہی نہیں افق اب کیوں؟ میں جانتا ہوں، تم ناراض ہو مجھ سے۔“

اس سب پر افق کا جی چاہا کہ وہ دھکا دے کر اسے سڑک پر گرا دے۔ اب یہ شخص اس سے اور کیا چاہتا ہے۔ اس کی سب خوبیوں کو جانے ہوئے بھی چھوڑ گیا تو اب اور کیا چاہتا ہے۔ نہ چاہتے ہوئے بھی اس کے ہاتھوں اس کی مدد ہو گئی تھی۔ اس مدد کو اس نے انسانیت کے خاتمے میں لکھ دیا تھا۔ عدن کے خاتمے میں نہیں۔
”تم نے اپنی محبت کا حق ادا کر دیا۔“ عدن کی اگلی

بات افق کو چاٹنے کی طرح لگی۔
 ”کون سی محبت؟“ افق کا سر گھوم گیا۔ اب ٹھیک ٹھیک اندازہ ہو رہا تھا کہ یہ سب ٹھیک نہیں ہو رہا۔ شاید بہت غلط ہونے جا رہا ہے۔

”ہماری محبت۔“ اس نے بڑے دھڑلے اور جوش سے کہا۔
 ”ڈاکٹر عدنان۔ زبان سنبھال کر۔“ اس نے انگلی اٹھا کر تنبیہ کی۔ ”میری محبت میرا شوہر ہے اور بس۔ اس چکر کو جس میں مجھے پھنسا ہوا تھا اسے محبت کا نام دو۔“

قید سے پہلے ”تم و ہشت گرد ہو۔“ اس پر آسانی بجلی بن کر گر ا تھا۔ رہائی کے بعد ”میری محبت غیر اشوہر“ وہی بجلی بن کر اس پر گرا۔ جی ای، صدمہ، خوف، لاچارگی، بے بسی، دکھ، سب آگے پیچھے اس پر وارو ہوئے۔ جب اسے مارش نے افق کے بارے میں بتایا تو وہ بھی سمجھا کہ قسمت افق پر مہمان ہوئی ہے اور اس نے کسی نہ کسی طرح اتنی ترنی کر لی ہے کہ وہ امریکا تک آ پہنچی ہے۔

”تم نے شادی بھی کر لی افق؟“ یہ بازی بھی ہاتھ سے گئی۔ عدنان کا یہ سوال ایسے تھا کہ تم نے تو مجھے موت کی بی سزا سنا دی۔ اس کا گدہ میلا رنگ سیاہ پڑ گیا۔ دو آنسو آنکھوں سے نکلے۔

ایک بار پھر سے افق کو اس پر ترس آیا۔
 ”کیوں نہ کرتی؟“ اس نے بہت اعتماد سے پوچھا۔
 عدنان کو تو شکر گزار ہونا چاہیے تھا کہ وہ اس کا گربان نہیں پکڑ رہی۔ کوئی سوال نہیں کر رہی۔ اس نے بے شکل سر کو ہلایا۔

”ہاں کرنی چاہیے تھی۔“ اس کی طرف سے پیٹھ موڑ کر وہ مخالف سمت میں چلنے لگا۔

”دوبارہ کبھی میرے راستے میں مت آنا۔“ افق کی آواز اس کے پیچھے آئی۔ اس نے تائید میں سر کو ہولے سے ہلا دیا۔ اب وہ ایک ایسے انسان کی طرح سڑک پر چل رہا تھا جو نہ کسی میدان کا کھلاڑی تھا نہ ہی تماشائی۔ دنیا کے سب ہی ٹھیک تماشے اس کے لیے

ختم ہو گئے۔ بے نام قدم ہی اٹھیں گے اب۔ جو کچھ بھی رک جاتے ہیں اور کسی سمت بھی نہیں جاتے۔

ساری رات وہ سڑکوں پر گشت کرتا رہا۔ اندھے کا فائدہ اٹھا کر رونا بھی رہا۔ دراصل اب ہی وہ صحیح معنوں میں خالی ہاتھ ہوا تھا۔ افق کے اب کبھی نہ ملنے پر اسے اصل دکھ ابھی ہوا۔ وہ اپنے شوہر سے محبت کرتی ہے۔ اس پر زیادہ ہوا۔ ہاں صرف شوہر۔ اس نے اپنی تم آنکھیں دائیں ہاتھ کی ہتھیلی سے صاف کیں۔ وحشت زدہ پاگل آنکھیں جو صدمے اور دکھ میں جا رہی ہیں اور تیزی سے پو پھٹنے لگنے بھی لگتی ہیں۔ وہی نفسیاتی دورے کی کیفیت جو اسے قید کے دوران پڑتے تھے۔

انتارو کر، اتنا پچھتا کر بھی عدنان روز اسٹور کے قریب چلا جاتا۔ دو چار چھ دن افق وہاں آ ہی نہیں رہی تھی۔ عدنان کو ہنسی آئی۔ وہ اس سے ڈر رہی تھی۔ ایک ہفتے بعد وہ تھوڑی سی دیر کے لیے آئی اور چلی گئی۔ فاصلہ رکھ کر عدنان اس کے پیچھے پیچھے اس کے گھر تک جا پہنچا۔ پھر وہ روز اس کے گھر تک جانے لگا۔ وہ اس کے شوہر کے انتظار میں تھا۔ افق اکیلی ہی گھر سے باہر نکلتی نظر آتی۔ وہ سمجھ گیا کہ افق نے اس سے جھوٹ بولا ہے کہ وہ شادی شدہ ہے۔ کیوں بولا ہے یہ پوچھنے کے لیے وہ اس کے ساتھ ساتھ کالج گیا۔ اس پر گھر پڑتے ہی افق کا رنگ پھیکا پڑ گیا۔

”میری سمجھ میں نہیں آ رہا افق! تم مجھ سے اتنا کترا کیوں رہی ہو؟ میں وہی امان ہوں جو تمہاری جان ہے۔“

عدنان نے کالج کی طرف جاتی سڑک پر اسے جالیا تھا۔ افق نے سختی سے اپنے لب پیچھے اور ایسے ظاہر کیا کہ نہ اسے جانتی ہے نہ ہی اسے سن رہی ہے اور تیز چلنے لگی۔

”تم اتنا سخت ناراض ہو مجھ سے۔ میں نے تمہیں فون نہیں کیا اس لیے۔ میں حالات میں پھنس گیا

تھا۔ تمہیں چھوڑ کر نہیں گیا تھا۔ تم میری بات تو سنو۔ تم اس طرح منہ موڑ کر کیسے میرے بغیر رہ سکتی ہو۔“ افق کے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ یہ شخص کتنے مزے سے اس سے جھوٹ بول رہا تھا۔

”کیسے حالات؟“ اس نے پوچھا۔
 ”میں امریکا تو کوری کے لیے آیا تھا۔ مجھے اچانک آنا پڑا۔ جہاں اپلائی کیا تھا وہاں سے فوری کال آ گئی تھی۔ تیاری کرنے میں میں اتنا مصروف ہو گیا کہ تمہیں ایک فون نہیں کر سکا۔ سوچا تھا امریکا آ کر لوں گا۔“
 ”وہ اسپتال تمہارا اپنا نہیں تھا، جہاں تم تو کوری کرتے رہے ہو؟“

وہ سمجھ رہا تھا کہ افق کو کچھ نہیں معلوم اور اسے یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ وہ عزیز سے بھی مل چکی ہے اور آرٹیکل بھی پڑھ چکی ہے۔ وہ اسے وہی افق سمجھ رہا تھا جو فیکٹری جایا کرتی تھی۔ ایف اے میں فیل ہو گئی تھی۔ کچھ جانتی ہی نہیں تھی۔
 ”وہ کسی آغا عباس حیدر کا تھا۔“
 ”اور وہ آغا عباس حیدر تمہارے سر نہیں تھے؟“

اب عدنان کا حلق خشک ہو گیا۔
 ”ان کی بیٹی۔ تمہاری بیوی۔ ماریہ۔ تمہارے بچپن کی محبت۔“

عدنان کے فرشتوں کو بھی گمان نہیں تھا کہ وہ نہ صرف اس کی شادی بلکہ ماریہ تک کے بارے میں جانتی ہے۔ وہ اتنا سب کچھ کیسے جانتی ہے؟
 ”میں اسے چھوڑ چکا ہوں۔“ اسے یہی بات سوچھی۔

”مطلقاً اس نے لی تھی تم سے۔“ افق کی معلومات زیادہ جامع تھیں۔
 ”تم اس لیے ناراض ہو کہ میں نے ماریہ سے شادی کر لی؟ یا نہ زبردستی۔“
 ”میری طرف سے تم دنیا میں موجود ہر ماریہ سے شادی کر لو۔“ افق نے تسخیر آڑایا۔

”نوز میرے راستے میں ایسے مت آیا کرو۔ میں اپنے شوہر کو بتا دوں گی۔ میرا شوہر روایتی پاکستانی بھی

ہے اور امریکا کا لاء تو تم جانتے ہی ہو۔ دونوں اگر مل گئے تو۔“

عدنان جس کا شرمندگی سے حلق خشک ہو چکا تھا۔ افق کے اس دھمکی بھرے انداز سے آنکھوں میں خون اتر آیا۔ اسے دو دو پیسے کے کام کرتے دیکھا تھا۔ ہمارے ملازم۔ جو تپاں اٹھانے والے۔ گندے برتن دھونے والے۔ آواز پر جی کھنکھانے والے۔ ترقی کر کے کسی بھی آسمان پر جا نہیں۔ کسی کے لیے وہ تب بھی ملازم ہی رہتے ہیں۔

”شوہر کو؟“ وہ ہنسنا۔ ”کس شوہر کو جو سرے سے ہے ہی نہیں۔ کہاں ہے وہ۔ بلاؤ۔“

افق نے اسے نظر انداز کرنا ہی مناسب سمجھا۔ اتنی بات کر کے بھی بے وقوفی ہی کی تھی۔ اس کی طرف دیکھے بغیر وہ آگے بڑھی اور عدنان نے اسے آگے بڑھتے دیکھا اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر رونا کھانا چاہا۔
 ”میں ہر بار تمہاری بہ جرات معاف نہیں کروں گی۔“ وہ حلق کے بل چلائی۔

”تمہیں میری بات سننا ہی ہوگی۔“ وہ بھی چلایا۔
 ”ورنہ میں بار بار تمہارے راستے میں آؤں گا۔ تمہارے گھر آ جاؤں گا۔ تمہیں ایک بار مجھے موقع دینا ہی ہو گا۔“

افق اس سے ڈرتی نہیں تھی۔ لیکن اندر ہی اندر اسے ڈر گئی۔ وہ کالج تک اس کے پیچھے آ گیا تھا۔ اب بار بار آئے گا۔ گھر بھی آ جائے گا۔ وہ نہ جانے کیوں ایسے پاگل ہو رہا ہے۔

اس کی بات آخری بار سننے کے لیے وہ قریب کی کافی شاپ میں آ گئی۔

”تم مجھے سمجھ رہی ہو کہ میں تمہیں چھوڑ گیا تھا۔ بتاؤ! کس کی قسم کھاؤں کہ تمہیں یقین آ جائے میں نے تمہارے لیے اپنے خاندان کو پیلا کو بھی منایا۔ گھر چھوڑنے کی دھمکی دی۔ دونوں ہول میں رہا۔ ماما بپا ہو گئے۔ تو وہیں پیلا کی طبیعت زیادہ بڑھ گئی۔ اپنے باپ کے لیے میں اتنا بھی نہ کر سکا کہ اس کی مرضی سے شادی کر لیتا؟ کس منہ سے تمہیں فون کرتا؟ سب بتاتا۔“

مجھ پر الزام لگا کر جیل بھیج دیا گیا۔ ماریہ نے طلاق لے لی۔ اس سبب میں میرا قصور کہاں ہے؟ میں نے نہیں بہت یاد کیا۔ افق بہت میں نے بیٹھ صرف تم سے محبت کی۔ تمہارا کتنا احترام کرتا رہا ہوں میں۔ اتنے سال میں تمہارے لیے روتا رہا ہوں اور تم ایسے دور جاری ہو۔ مجھ پر کچھ رحم کرو۔ اتنی بڑی سزا نہ دو۔ میرے پاپ نے زبردستی میری شادی کر دی۔ افق صرف آخری بار اس کی بات سن رہی تھی۔ تاکہ وہ بار بار اتنی بات کہنے کے لیے اس کے راستے میں نہ آئے۔ اسے کوئی مطلب نہیں تھا کہ وہ جھوٹ اور کتنا بول رہا ہے۔

”میں نے سب سن لیا ہے۔ ساری باتیں۔ تم اپنی زندگی میں خوش رہو۔ اور مجھے میری میں رہنے دو۔“

”تمہارے بغیر میں کیسے خوش رہوں؟“ افق نے بمشکل غصہ ضبط کیا۔ ”میں اپنی قسمت پر رشک کرتی ہوں کہ اس نے مجھے فرما دیا۔“

”مجھے اس کی قسمت پر رشک ہے۔“

”یہ ہماری آخری ملاقات ہے۔“ وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

”میں تمہاری منت کرتا ہوں کہ مت جاؤ۔ تم تو کہتی تھیں کہ تم میرے بغیر رہ نہیں سکتیں؟“

”تب میں بے وقوف تھی۔“ اس نے بہت عتاب سے کہا۔

”تم اب بے وقوف بن رہی ہو اور مجھے بتا رہی ہو۔ تمہارے اندر آج بھی میں ہی ہوں۔ ورنہ تم میری مدد نہ کرتیں۔ تمہاری اماں نے زبردستی تمہاری شادی کروادی اور تمہاں گئیں۔“

”تمہارے باپ نے تمہاری زبردستی شادی کی اور تم مان گئے۔“ کرنے پر آئی تو کڑے طنز افق کے پاس بھی بہت تھے۔

فرزام کو تا عمر کے لیے ”ہاں“ کی تھی۔ اپنے منہ سے اس کے عین سامنے ہو کر۔

”حالات کے پیش نظر ”ہاں“ کر دی ہوگی۔ محبت نہیں۔ تم مجھ سے جھوٹ نہیں بول سکتیں۔ محبت تم صرف مجھ سے کرتی ہو۔ تم میرے علاوہ کسی اور کے بارے میں سوچ ہی نہیں سکتیں۔“ اکتا جانتا تھا وہ افق کو۔ اسی لیے اکتا دور تھا اس سے۔

”ہاں! شاید صرف خالی خوبی محبت نہیں کرتی۔ کیونکہ یہ جذبہ تو اس سے بھی آگے کا ہے۔ میں فرزام کے لیے اپنی جان دے سکتی ہوں۔ ڈاکٹر عدنان۔ اور کسی کی جان بے بھی سکتی ہوں۔“

اس نے ٹھہر ٹھہر کے عین اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔ اسے اندازہ ہونا چاہیے کہ افق کتنا بڑا بول رہی ہے۔ خالی خالی دعوے نہیں۔

عدنان تڑپ اٹھا۔ افق کے منہ سے کسی اور کے لیے یہ سن کر اس کا پی اس شخص کو مار دینے کو چاہا۔

”کچھ اس کا پی۔“ وہ چلایا۔ ”جھوٹ مت بولو۔“

افق نے پروا بھی نہ کی اور قدم آگے بڑھا دیے۔ وہ پیچھے لپکا۔

”تم نے کہا تھا تم میرے بغیر سانس نہیں لیتیں۔ تمہارا دن رات ہوں میں۔ مجھے سوچ کر نہیں نیند آتی ہے اور میں تمہارے سب ہی خواب ہوں۔“

افق آگے آگے تھی۔ وہ پیچھے پیچھے تھا۔ جو وہ کہہ رہا تھا۔ وہ اسے بال میں گرا تا جا رہا تھا۔ وہ اس شخص سے اب اور نفرت کرنے لگی۔

”تم مجھ سے اب کیا چاہتے ہو؟“ پلٹ کر وہ چلائی۔ وہ اس کے پیچھے ہی آتا جا رہا تھا۔

”فرزام کو چھوڑ دو۔ آؤ! ہم شادی کر لیں افق۔“

جس نے ایک امیر باپ کی بیٹی سے شادی کر کے مجھے چھوڑ دیا۔ اس شخص کے بیٹے کے ساتھ جس نے میری عزت پر ہاتھ ڈالا۔“

افق یہ بات کسی کو بھی بتانا نہیں چاہتی تھی۔ یہ اس کی عزت کا پردہ تھا۔ اسے وہ چاک کرنا نہیں چاہتی تھی۔ لیکن اب عدنان کے منہ پر یہ بات مارنی ہی پڑی۔ آخری بات سن کر عدنان سناتے میں رہ گیا۔

”تمہارا کمینہ باپ۔“ موچھوں والا گدھ۔ جب اپنی ماں کے علاج کے لیے تم سے مدد لینے تھیں ڈھونڈتی میں وہاں گئی۔ تو اس نے میرے آگے پیچھے اور میری عزت پر ہاتھ ڈالا۔ تمہارے باپ نے میرے سامنے نہیں فون کیا تھا۔ تم اور ماریہ جب بنی مون پر تھے اور تم چاہتے ہو کہ اب بھی میں تمہارے جیسے انسان کا احترام کروں؟ تم سے بات کروں؟“

”ہو نہ۔ سفید جھوٹ، سراسر الزام۔“ وہ الٹا بدک گیا۔ اگر حالات دوسرے ہوتے تو وہ گدھ کہنے اور ایسے الزام لگنے پر اس کی گردن دیا دیتا۔

”یہ تم اپنے باپ سے جا کر پوچھو۔ ہاں! میری وجہ سے تم باہر کھڑے ہو اس وقت۔ شاید اللہ میرے ہی ذریعے تمہیں باہر لانا چاہتا تھا۔ جو تم سے مدد لینے کے لیے آئی تھی کسی کسی کے ذریعے۔ جاؤ! جا کر بتاؤ اپنے باپ کو یہ افق ہے جس نے تمہاری مدد کی ہے۔ عزت بچا کر بھاگ جانے والی کے ہاتھ سے مدد کا یہ پتھر بہت زوردار ہے۔ یہ پتھر تم دونوں کو بے یک وقت لگا ہے۔ بات پاگل بنالیا تم نے مجھے۔ بہت ذہین نہیں ہوں۔ لیکن تم سے اب ہمیشہ دور ہی رہوں گی۔ اتنی سمجھ دار تو ضرور ہوں۔“

افق جی گئی۔ عدنان بت بنا وہیں کھڑا رہا۔ ماں اور باپ صرف یہ دو ایسے رشتے ہیں کہ کتنے بھی گناہ گار ہوں گویا کسی تیسرے کے منہ سے ان کے گناہ نہیں سن سکتے۔ اپنے باپ کو افق کے بارے میں بتا بھی چکا تھا۔ پھر بھی اپنے بیٹے کی پسند کے ساتھ۔ افق کے ساتھ۔ فون بولتے تھے اس نے فون کیا۔

”افق! آپ کے پاس آئی تھی کبھی؟“

”کون افق؟“ لمحہ بھر کے تامل کے بعد کہا گیا۔ ”جس کی عزت پر آپ نے ہاتھ ڈالا تھا۔ جو میرا پوچھنے ڈی ایچ اے والے بیگلے میں آئی تھی۔“ آخری حد پر تھا محل کی۔

”کیا بکواس ہے یہ؟“

”ہاں نہ میں جواب دیں۔“ تن کر کہا۔

”کچھ اس بند کر گدھے۔ اپنے باپ پر الزام لگا رہے ہو؟“

”اسی افق نے بوٹن میں مجھے اس سیل سے آزاد کروایا ہے۔ جہاں زمین پر میں نے اڑیاں رگڑی ہیں اور دیواروں سے سر لکرایا ہے۔ اس۔“

”کیا بک رہے ہو؟“ فون بند ہو گیا۔ عدنان جان گیا۔ افق سچ کہہ گئی ہے۔ ایسا تو نہیں تھا کہ وہ اپنے باپ کی سرگرمیوں سے واقف نہیں تھا۔ لیکن اسی لڑکی کے ساتھ جس کا ذکر وہ ان سے کر چکا تھا۔ اسی کے ساتھ یہ سب کچھ۔ عزیز کے ہاتھوں جب وہ بار بار پیغام بھیجوا تا تھا کہ افق کے گھر جائیں۔ اسے عدنان کے بارے میں بتائیں تو اسے ایک ہی جواب ملتا تھا کہ وہاں کوئی ایسا گھر نہیں ہے۔ نہ ہی وہاں کوئی افق رہتی ہے۔

وہاں کوئی گیلیا نہیں تھا۔ اس کا باپ کس منہ سے وہاں جاتا۔ زندگی کے اس حصے میں باپ نام کا بھرم رکھے اس شخص کی عزت بھی اس کے اندر سے گئی۔ تو اب سب کچھ چلا گیا عدنان کے پاس سے۔ عدنان خالی ہاتھ رہ گیا۔ اس سے اچھا تو وہ امریکی سیل میں ہی تھا۔ سر ہی پھوڑتا ہے تو آزادی میں ہی کیوں۔ پاکو کی طرح اس نے ایک ہی سڑک کے دس چکر لگائے۔ بڑبڑاتا رہا۔

اب اس کے پاس کچھ نہیں بچا۔ جو بچا تھا اسے چھین لیا گیا۔ اب اسے زندہ رہنا ہے تو صرف اپنی مرضی کے ساتھ۔ اپنے من پسند لوگوں کے ساتھ۔

چند دن وہ عزیز کے ساتھ مقدمے کی سماعت میں مصروف رہا۔ چند اخبار والوں نے اس کے تفصیلی

☆☆☆

انٹرویو بھی لیے۔ عزیز اسے اپنے ساتھ چند دوسرے
اداروں میں لے کر گیا جو مزید اس کی مدد کر سکتے تھے۔ وہ
ہفتے سے کچھ زیادہ دن مصروف رہا۔ فارغ ہوتے ہی
اس نے افق کی گرانی شروع کر دی۔ اب وہ گھر سے کم
ہی باہر نکلتی تھی۔ لیکن جب بھی نکلتی، فرزام ساتھ
نہیں ہوتا تھا۔ اسے فرزام کے آنے کا انتظار تھا۔
عینکی میں بیٹھ کر ایک دن افق بہت بن ٹھن کر ایر
پورٹ گئی۔ اسے وہ شخص دیکھا تھا، جس کے لیے وہ
جان لے بھی سکتی ہے تو اس کا خیال تھا کہ پھر یہ
”جان“ لینا فرزام کی ہی سہی۔ فرزام کی جان لے لینی
چاہیے۔

اسی دن شام کو وہ دونوں اکٹھے باہر نکلے۔ وہ ان کے
پیچھے ہی تھا۔ بس ایک بار اس نے انہیں ایک سڑک
سے گم کر دیا تھا۔ دھنسنے وہ انہیں نیویری میں ڈھونڈنا
رہا۔ جب وہ اسے دوبارہ نظر آئے تو دونوں آمنے
سامنے کھڑے ہنس ہنس کر باتیں کر رہے تھے۔
فرزام کی جان نکلنے کا یہ بہترین موقع تھا۔ وہ ان
دونوں کے پاس چلا گیا تھا۔
پچھتر بار گروہ اس کا گریبان جھنجھوڑ رہی تھی۔ ”تم
نے میرے ساتھ یہ کیوں کیا؟ اتنا جھوٹ بولا؟ میں نے
تمہاری مدد کی۔“ وہ ساتھ ساتھ دور ہی تھی۔
”تم نے میری مدد نہیں کی۔ تم ہی نے کہا تھا کہ تم
نے میرے باپ کے منہ پر پچھڑے مارا ہے۔ اس
پچھڑے کے بارے میں میں نے انہیں بتا دیا ہے۔“ خود کو
اس کے ہاتھوں سے چھڑا کر اس نے اطمینان سے
کہا۔

”تم نے ایک بار پھر میرے ساتھ برا ہی کیا تھا۔
تمہاری مدد کر کے میں خود اپنے ساتھ برا کیا۔“
”میں تمہارے بغیر نہیں رہ سکتا افق! چھوڑ دو
اسے۔ تم صرف مجھ سے محبت کرتی ہو۔ میں ہوں
تمہارا ماں۔“
ایک اور پچھڑے سے اپنا ہاتھ روک کر افق اسے وہیں
کھڑا چھوڑ کر اپنے گھر کی طرف بھاگی۔
فرزام کا فون بند جا رہا تھا۔ پہلے جب اس نے کیا تھا

تو ایک بیل گئی تھی۔ عینکی میں بیٹھی وہ مسلسل
فون کر رہی تھی۔ اب وہ اسے سب کچھ بتا دے گی۔
اسے چھپانا ہی نہیں چاہیے تھا۔ وہ ناراض
ہو گا۔ لیکن ماں ہی جانے گا۔ بات بگڑ گئی تھی تو سہی
بھی جائے گی۔
دروازہ کھول کر وہ اندر آئی تو ہر طرف اسے فرزام
غصہ بکھرا نظر آیا۔ شاید کچھ دوسرا دوسرا بکھرا
پڑے تھے۔ جیسے ایک ایک کو اٹھا کر پھینکا گیا ہے
سارے جوتے، پیچھے، کوٹ، کپڑے، شرٹس، پیر
جیولری، اوسر اوسر بکھری پڑی تھی۔ گل دان بھی
ٹوٹا ہوا تھا۔

”فرزام!“ وہ لپک کر اس کے پاس آئی۔ وہ
ڈانٹنگ ٹینل پر سر رکھے بیٹھا تھا اور ایسے بیٹھا تھا جیسے
کسی سے بے عزت کر کے نکالا گیا ہو۔ اس نے سر
اٹھا کر ایک تیز نظر اس پر ڈالی۔
”مجھے وہاں اکیلا چھوڑ آئے۔ مجھے سننے تو سہی۔“
راستے بھر وہ روٹی آئی تھی۔ اسے دیکھتے ہی پھرتے
روئے گئی۔
”لے لی تم نے اس کی ٹیٹ؟ کیا سارا ڈنر؟“
”نکو اس کر رہا تھا۔“ وہ چلائی۔ ”جھوٹ بول رہا
تھا۔ میں نے نہ تا کر غلطی کی۔ اب نہیں کروں گی۔“
فرزام اٹھ کر صوفے پر آ بیٹھا۔ جیسے اسے سن ہی
نہیں رہا۔
”پلیز میری بات سنو فرزام۔ میں نے ماں لیا کہ
میں نے غلطی کی۔ میرا یقین کرو۔ میں سب بتا دیتی
ہوں۔“

”سن آیا ہوں۔ تم نے اس کی مدد
کی۔“
”ویسے نہیں۔ جیسے آپ سمجھ رہے ہیں۔“
”پھر کیسے؟ تمہیں کیسے معلوم ہوا کہ وہ کہاں
ہے؟“ وہ ایسے جرح کر رہا تھا۔ جیسے مقدمے کا فیصلہ
پہلے ہی ہو چکا ہے۔ اب تو صرف وہ ایسے ہی سوال کر رہا
ہے۔ ”تم اسے بھولیں نہیں؟ تم نے اسے ڈھونڈنا

نکالا۔“
اس نے صرف نفی میں سر ہی ہلایا۔ اتنے سے ہی
سوالوں پر اسے اندازہ ہو چکا تھا کہ بات اتنی بھی آسان
نہیں رہی۔ اب اس یقین پر جواب دے دینے پر بھی
کابل نہیں ہو گا۔ سرتیزی سے نفی میں ہلایا۔
”ایسا نہیں ہے فرزام۔“ آواز اور بھگ گئی۔
”پھر کیسا ہے؟ کیسے ہوا یہ سب؟“
”میں نے میگزین میں اس کے بارے میں پڑھا
تھا۔“ وہ جانتی تھی۔ اس سلسلے میں پوچھا گیا اگلا سوال
تھوڑے سے بچے کچھ یقین اور اعتماد کی بھی موت
کر دے گا۔

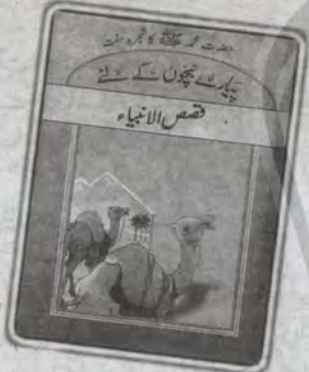
”پھر۔“ اس کے لیے پہلی بار فرزام کا انداز سخت
تر ہو گیا۔ اس ”پھر“ کا جواب تو وہ خود نہیں جانتی تھی۔
اس ”پھر“ کا جواب ہی اسے لے ڈوبے گا۔ یہ ”پھر“
بہت اٹھا ہوا تھا۔
”میں اس کے وکیل کے آفس گئی۔“ اس کی آواز
اٹک گئی۔ حلق خشک ہو گیا۔ الفاظ سارے غائب
ہو گئے۔

”تمہیں اس کے وکیل کا کیسے معلوم ہوا؟“
”میں نے سرج کیا تھا۔“ شرمندہ سے وہ اور
شرمندہ ہوئی۔
”لو کہ۔“ یہ اس کے بہت جان لیوا تھا۔
”تم آفس کیوں گئیں؟ وہ سوال کر رہا تھا۔ وہ اپنا اور
اس کا مذاق اڑا رہا تھا۔“

پاگل تھی جو گئی۔ خود نہیں جانتی
تھی۔ اب بتا اور سمجھا نہیں سکتی تھی۔
”میں پاگل تھی فرزام! جو چلی گئی۔ خدا جانتا ہے۔
میں ہٹا کی وجہ سے گئی۔ وکیل نے میری بہت منت
ناہت کی۔ مجھے اکسایا۔ انسانیت کے واسطے دیے۔
مسلمان ہونے کا کہا۔“
”تم نے انسانیت کے نام پر یہ سب کیا؟“ وہ بظاہر
بہت اطمینان سے یہ سب پوچھ رہا تھا۔
”ہائیل۔“ میرا یقین کرو۔ حالات ایسے۔“
”لاکھوں لوگ جیلوں میں بند ہیں۔ پاکستانی، مسلمان“

پیارے بچوں کے لئے

قصص الانبیاء



تمام انبیاء علیہ السلام کے بارے میں مشتمل
ایک ایسی خوبصورت کتاب جسے آپ
اپنے بچوں کو پڑھانا چاہیں گے۔

ہر کتاب کے ساتھ حضرت محمد ﷺ
کا شجرہ مفت حاصل کریں۔

قیمت - 300/- روپے

بذریعہ ڈاک منگوانے پر ڈاک خرچ - 50/- روپے

بذریعہ ڈاک منگوانے کے لئے

مکتبہ عمران ڈائجسٹ

37 اردو بازار، کراچی۔ فون: 32216361

انسان بھی۔“

”مجھے معاف کریں فرزام۔“ اس کے پاس فرزام کے ایسے سوالوں کے جواب نہیں تھے۔ سوال کے نام پر اب اس کے پاس مانگنے کے لیے صرف معافی ہی تھی۔

”تم کس دن آفس گئیں؟“

”جس دن آپ کا میسج آیا تھا کہ گھر سے باہر نہ جانا۔“ اب مسئلہ یہ تھا کہ وہ جتنے بھی بول رہی تھی۔ وہ حیثیت میں دو کوڑی کے بھی نہیں تھے۔ ایک جج جو جج کے سامنے بول کر کسی کو پھاسی سے بچا لیتا ہے۔ اگر بروقت نہ بولا جائے تو بعد ازاں بے شک ساری دنیا کے سامنے بلند و بانگ بولا جائے۔ پھر وہ جج صرف ایک گونج ایک اعلان ہی بن کر رہ جاتا ہے۔

”مجھے معاف کریں فرزام۔ میں نے اتنا کچھ چھپایا۔ میرے اور اس۔۔۔“

”معاف کیا۔“

اسے درمیان میں ہی ٹوک کر وہ خود اٹھ کر بیڈ روم میں چلا گیا۔ دروازہ لاک کر لیا۔ لکھوں میں ہی اس نے اس دن سے اب تک کی ساری فلم آنکھوں میں چلائی۔ اس کے سارے جھوٹ فرزام کے کانوں کو سنائی دے گئے۔ افق لاؤنچ میں کھڑی رہ گئی۔ گھٹنے میٹھے والا مرد مقفل ہو کر اکیلا ہی بیٹھ گیا۔ اٹکو بھی نہ جانے کہاں گئی۔ عیس کی کھڑکی سے باہر۔ یا اس گھر کی پہلی بار افق نے اپنی قسمت کو کوسا۔ منہ پر ہاتھ رکھ کر وہ رونے لگی۔ فرزام کی جگہ کوئی بھی ہوتا تو وہ یہی کرتا۔ شاید اسے سرراہی ہی چھپنا دیتا۔ گھر سے نکال دیتا۔ عدن نامی دیا اسے ہمیشہ ناکام کروا دیتی تھی۔ آج وہ فرزام کے آگے بھی ٹپل ہو گئی۔

اگلے دن صبح جوتے پہن چلا گیا۔ وہ گھر میں ہی اس کا انتظار کرتی رہی۔ ابھی وہ غصے میں ہے۔ اس سے بہت ناراض ہے۔ وہ مان ہی جائے گا۔ وہ اس سے بہت محبت کرتا ہے۔

رات گئے وہ آیا اور سیدھا کمرے میں چلا گیا۔ اس

نے کوشش کی بات کرنے اور کمرہ کھلوانے کی۔ مگر اس نے بات کی نہ ہی کمرہ کھلا۔ آنے والے چند اور دن بھی ایسے ہی چلتا رہا۔ پیرس جانے والا جوڑا اور خریدی گئی اتنی ساری چیزیں دھری کی دھری رہ گئیں۔ وہ سارا وقت روٹی رہتی۔ دونوں کے درمیان وقت اور حالات کی جو خلیج تھی اور جسے دونوں ہی چلنے تھے اور وقت کے ساتھ ساتھ ختم کر رہے تھے۔ وہ خلیج ایک دم ہی پھیل کر انہیں بہت دور لے گئی۔ اب جب وہ اس کے قدموں میں بیٹھنا چاہتی تھی۔ وہ اس سے بات بھی نہیں کرنا چاہتا تھا۔

کچھ غلطی نقصان کا باعث بنتی ہیں۔ کچھ غلطی لے دو بتی ہیں اور کچھ چل کر ملیا میٹ کر دیتی ہیں۔ عدن یہ تینوں غلطیوں تھا اور یہ تینوں افق سے ہوئی تھیں۔

اس کے باپ کو پچان لینے پر بھی وہ اس کی خصلت کو نہیں جان سکی۔ آخر خون تو ایک ہی تھا۔ تار وار کر دیا ناعدن نے اس پر ایسا وار کہ اس کی جان ہی نکال ملی۔ اگر انسانیت کے نام پر اسے یہ سب کرنا ہی تھا تو فرزام سے کیوں چھپایا؟ یہ غلطی اسے ملیا میٹ کر چکی تھی۔ اب اسے وقت کا ہی انتظار تھا کہ فرزام اس پر یقین کر لے۔

جس کمپنی کے ساتھ وہ کینیڈا کام کر کے آیا تھا۔ اسی کی ایک اشتراکی کمپنی میں وہ کام کرنے لگا۔ آفس کے پہلے دن جو اسے پھولوں کے بکے ملے۔ اسے اس نے ٹپل برقع ڈیا۔ سارے منصوبے خاک ہو گئے۔ وہاں کی لمبی چٹھی اور یورپ کی سیر۔ صرف اس کی پیاری بیوی افق اور ساتھ صرف وہ۔

افق نے کاج جانا چھوڑ دیا۔ اسٹور جانا بھی چھوڑ دیا۔ وہ اس حالت میں ہی نہیں تھی کہ کہیں جاتی۔ سارا دن لفظ جوڑتی رہتی اور فرزام کی طرف نظر اٹھتی ہی اس کا دم نکل جاتا۔ وہ اس سے بات نہیں کرتا تھا۔ اس کی طرف دیکھتا نہیں تھا۔ ناشتا کر کے نہیں جاتا تھا۔ گھر اگر کھانا نہیں کھاتا تھا۔ رات رات بھر افق رو رہی

دیکھیں کرتی رہتی۔ وہ فرزام کے بغیر نہیں رہ سکتی تھی۔ لیکن وہ فرزام کے ساتھ ایسے بھی نہیں رہ سکتی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ وہ اس سے محبت کرتا ہے اور اسے وہ جانتی تھی کہ وہ اس سے کس قدر محبت کرتی ہے۔ دونوں ایک ہی راستے پر ایک ساتھ چلتے چلتے ایک دوسرے کی پشت پر آ گئے۔

ایک روز وہ حسب معمول رات گئے آیا تو اس نے آتے ہی اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

”خدا کے لیے میرے ساتھ ایسے نہ کرو فرزام! مجھے ارادہ برا بھلا کو۔ لیکن ایسے نہ کرو۔“

سارا دن بھی وہ روٹی رہی تھی۔ اس کے سامنے بھی روٹی تھی۔

اس نے جھکے سے اپنا ہاتھ اس سے آزاد کروایا۔ ”اور تم نے میرے ساتھ کیا کیا افق! تم نے مجھ سے سب کچھ چھپایا۔ جھوٹ پر جھوٹ بولا۔ کئی بار میں نے تم سے پوچھا۔ تم ٹھیک ہو۔ تم یہی کہتی رہیں کہ تم ٹھیک ہو۔ آن دونوں تم اس سے مل رہی تھیں نا؟ چھپ کر اتنا کچھ کر رہی تھیں۔“

”میں اس سے نہیں ملی تھی۔ وہ میرے راستے میں آتا تھا۔“

”کیوں اس شخص کے لیے تم اس وکیل کے آفس جا پہنچی تھیں۔ مجھے یقین دلاؤ افق! تم بنا کسی وجہ کے کی تھیں۔ تم اس شخص عدن کے لیے نہیں گئیں۔ اسی تک وہ تمہارے اندر ہے۔“

”میں اس سے نفرت کرتی ہوں۔ میرا یقین کرو۔“

ہاں! مجھے یقین دلاؤ افق۔ میں یقین کرنا چاہتا ہوں۔ تم سے محبت کرتا ہوں۔ تمہارا ہی تو یقین کرنا چاہتا ہوں۔ لیکن تم نے اس یقین کا بہت غلط استعمال کیا۔ تم نے میرا اعتماد تار تار کر دیا۔ اتنے سال سے میرے ساتھ ہو۔ مجھے جان نہیں سکیں۔ تم نے مجھ سے اتنے جھوٹ بولے۔ جس نے شادی سے پہلے ہر کوسے بچ کو سن کر بھی تمہیں انبیا۔ اگر تمہیں اس شخص سے نفرت ہوتی تو تم اس میگزین کو ہی پھاڑ کر پھینک دیتیں۔ یہ ہوتی تمہاری نفرت۔ اپنے قدم باہر

کی طرف بڑھانے سے پہلے تم میری طرف آئیں۔ سالوں پہلے میں نے ہزاروں بار یہ شکوہ کیا تھا کہ کس قوت نے مجھے برطانیہ سے نکال باہر کیا۔ تم سے شادی کرتے ہوئے مجھے اس قوت پر بہت ہار آیا۔ میں نے لاکھوں بار شکر ادا کیا کہ مجھے افق کے لیے بروقت وہاں سے نکال دیا گیا۔ رومی سے دور کر دیا گیا۔ آج مجھے یقین ہوا ہے افق! کہ مجھے تو تم سے میرے ناکارہ گناہوں کی سزا دینے کے لیے ملوایا گیا ہے۔ جس کے بعد میں کسی اور قاتل ہی نہ رہوں۔ بس تم ہی میرا ہی انجام ہو۔ ہر خواب کی اجڑی تعبیر۔ زندگی میں جس تباہی سے میں بچتا رہا اس تباہی کو خود اپنی زندگی میں شامل کر لیا۔ مجھے یقین دلاؤ افق! تم اس شخص سے نفرت کرتی ہو۔ اور یہ سب کچھ تم نے نفرت میں کیا؟ اب نہ جانے یہ وقت کتنا وقت لے گا۔ پھر سے محبت کے لیے۔“

فرزام چلا گیا۔ افق کھڑی رہ گئی۔

اب اکثر وہ اسے آن لائن رومی سے بات کرتا نظر آتا۔ افق نے چھپ کر عدن سے بات کی تھی۔ وہ سامنے کرنا تھا۔ مسٹر فرزام کے گھر میں مسٹر فرزام اجنبی ہو گئیں۔ دنیا کے ہر کام سے افق کا دل اچاٹ ہو گیا۔ ایک فرزام کے علاوہ اسے کسی کی فکر نہ رہی۔ ایک اسی کے علاوہ اسے کوئی دکھ نہ رہا۔ اس کی سب سے بڑی خوشی اس کے لیے سب سے بڑا غم بن گیا۔ وہ آفس سے جلدی آ گیا۔ اسے آواز دے کر سامنے صوفے پر بٹھایا۔ دونوں کے درمیان آواز دے کر کر بلائے اور ایسے موقع پر آئے سامنے بیٹھے کا رواج ختم ہو گیا تھا۔ وہ اس کی شکل کی طرف دیکھ رہی تھی اور اس کی طرف دیکھ کر اس کا جی چاہا کہ کانوں میں انگلیاں دے لے۔

”میں کاغذات بنوا رہا ہوں۔ اسلامک سینٹر گیا تھا۔“

”کیسے کاغذات؟“ اس نے درمیان میں ہی ٹوک دیا۔

”طلاق کے۔“ کتنے آرام سے اس نے کہہ دیا۔

”نہیں اتنے آرام سے بھی نہیں کہا۔ قیامت دونوں طرف ہی آئی تھی۔“

”کیسے کاغذات؟“ اس نے درمیان میں ہی ٹوک دیا۔

”کیسے کاغذات؟“ اس نے درمیان میں ہی ٹوک دیا۔

”کیسے کاغذات؟“ اس نے درمیان میں ہی ٹوک دیا۔

”کیسے کاغذات؟“ اس نے درمیان میں ہی ٹوک دیا۔

”کیسے کاغذات؟“ اس نے درمیان میں ہی ٹوک دیا۔

سکینہ

سکینہ جمیلہ مائی اور اللہ داتا کھار کی اکوٹی بیٹی ہے جو شادی کے سترہ سال بعد پیدا ہوئی اور چودہ برس کی عمر میں کبر سے
ہیں کی بیماری میں مبتلا ہو گئی۔ پانچ سال لگا کر علاج کے بعد بیت المال والوں نے اسے سرکاری اسپتال میں پرائیویٹ کرا
دلوادیا۔ جہاں ڈاکٹر خاور اس کا مفت علاج کر رہے ہیں۔ عام سی شکل و صورت والی سکینہ ڈاکٹر خاور کو پسند کرنے لگتی ہے۔
سکینہ کی آواز بہت خوب صورت ہے تاہم ڈاکٹر خاور اسے صرف اپنی مریضہ سمجھتے ہیں۔

ماہم منصور حسین ترین سائیکالوجسٹ ہے اور اپنا ذاتی کلینک چلاتی ہے۔ راس علی اس کا مریض ہے۔ ماہم بلا کی
حسن پرست ہے۔ اس کی دوست عائشہ قدرے کم صورت ہے۔ عائشہ کا بھائی موحد رحیم ماہم کو پسند کرتا ہے مگر سوات
آپریشن میں اس کی دونوں ٹانگیں ضائع ہو جانے کے سبب ماہم اس سے کھینچ جاتی ہے۔ ماہم کی بڑی بہن شبن عائشہ کے
کزن انصر کی بیوی ہے اور ڈیفنسٹ ہے۔

راس علی اپنے نفسیاتی عارضے کی وجہ سے خود کشی کی کوشش کرتا ہے لیکن بچ جاتا ہے۔ اس حادثے کے بعد راس اور
ماہم ایک دوسرے کے قریب آ جاتے ہیں۔

سکینہ کی خوب صورت آواز کی وجہ سے ڈاکٹر خاور اسے ایک نعت کپیشن میں حصہ لینے کے لیے کہتے ہیں۔ ڈاکٹر خاور
کی ساتھی ڈاکٹر زویا کو ان کا سکینہ پر مہمان ہونا ناگوار گزرتا ہے۔ سکینہ اور ڈاکٹر خاور کو ان کی ناپسندیدگی کا علم ہے۔ جمیلہ مائی
وقفا "فوقا" سکینہ کو سمجھاتی رہتی ہیں۔ نعت کپیشن میں سکینہ کی ملاقات موحد اور عائشہ سے ہوتی ہے۔ عائشہ کی
بینسن گز سے متاثر ہو کر علی اس میں دلچسپی لینے لگتا ہے۔ مگر ماہم کو یہ بات اچھی نہیں لگتی۔

ناولٹ



درخت کی طرح ہوں اور میری بیماری بھی مجھے اسی آکاس بیل کی طرح کھا جائے گی۔ ”سکینہ کی بات نے جیلہ کو ہلا کر رکھ دیا۔

”اللہ کو مان سکینہ! ایسی باتیں کرتی ہے۔“

”اماں! بعض باتیں اور چیزیں انسان کے دل میں وحی کی طرح اترتی ہیں۔ ان کی تصدیق کے لیے انسان کو کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ ان کی سچائی اور حقیقت خود بخود پائی کی طرح اپنا راستہ بناتی ہے۔“ سکینہ ہنسی تو جیلہ مائی کو اس کی آوازیں ٹوٹنے کا کچھ کی جھٹکار سنائی دی۔

”دیکھ سکینہ! اللہ سے براگمان نہ رکھا کر اسے اپنے بندے کے منہ سے نامیدی اور مایوسی کی باتیں اچھی نہیں لگتیں۔“ جیلہ مائی سچ سچ خفا ہوئیں۔

”پھر اللہ انسان کو ایسی آزمائش میں ڈالتا ہی کیوں ہے۔“ بہت دن کے بعد سکینہ نے شکوہ کیا تھا۔

”دیکھ! بندے کو یہ ذنب نہیں دیتا کہ وہ اپنے رب سے سوال جواب کرے۔ جس سے محبت ہو اس سے کیا کیوں اور کیسے والے سوال نہیں کیے جاتے۔ خود کو بس اس کی مرضی پر ڈال دیا جاتا ہے۔ اس کی رحمت بندے کی آزمائش سے بہت زیادہ ہے۔ بس اللہ سے رحمت اور کرم مانگا کر۔“ جیلہ مائی عصر کی نماز پڑھنے کے لیے کھڑی ہو گئیں۔

”اماں! تو بہت عجیب باتیں کرتی ہے۔“ سکینہ نے برا سامنہ بنا کر کتب اٹھالی۔ اماں مسکراتے ہوئے واش روم کی جانب بڑھ گئیں۔ اسی لمحے کمرے کا دروازہ ہلکا بھار کڑا کڑا اور اندر داخل ہوئے۔

”ڈاکٹر صاحب! ایسا لگتا ہے جیسے کوئی گشہ چیز آپ کو صحیح سلامت واپس مل گئی ہے۔“ سکینہ نے ان کے سلام کا جواب دے کر فوراً ہی کہا۔ وہ چونکے اپنی جگہ پر ٹھٹھکے اور مسکرا دیے۔

”تمہیں کیسے پتا لگا سکینہ؟“ وہ اسٹول سمجھ کر سکینہ کے بیٹھ کے پاس بیٹھ گئے۔ ان کے ہاتھ میں سکینہ کی فائل تھی۔

”بہت دن کے بعد میں نے آپ کے چہرے مسکراہٹ دیکھی ہے۔“ سکینہ کی بات پر وہ ہنسے۔

”مجھے لگتا ہے کہ تم نے اپنی آنکھوں میں ایکسے مشین فٹ کر دی ہے یا خوردبین؟“

”اندر کی باتیں بھی جاننے لگی ہو۔“ انہوں نے پھلکے انداز سے بات کو ٹالنے کی کوشش کی۔

”ڈاکٹر صاحب! یہ جو محبت ہوئی تا اس کے خوردبین سے بھی زیادہ طاقت ہوئی ہے۔ ہمیں بندے سے محبت ہو، اس کے اندر جھانکنے کے کسی ایکسے مشین یا خوردبین کا سہارا لینے کی ضرورت نہیں۔ ایک نظری آپ کو وہ سب سمجھاتا ہے جو دنیا کی کوئی جدید مشین نہیں بنا سکتی۔“

”سکینہ! فرض کرو، آپ کو کسی سے محبت ہو اسے آپ سے نہ ہو تو؟“ ڈاکٹر خاور کے سوال پر ایک بڑا گہرا تاریک سایہ سکینہ کے چہرے پر پھیلا۔

”محبت کوئی لین دین کا سوا تو نہیں جو کچھ لو اور کچھ دو کی بنیاد پر کیا جائے۔ یہ تو ایسا سوا ہے جو نقصان سے بے نیاز ہو کر کیا جاتا ہے۔“ سکینہ تھوڑا افسردہ ہوئی۔

”اور اگر دونوں طرف الگ برابر لگی ہو تو؟“ ڈاکٹر خاور نے بال پوائنٹ اپنے وانتوں تلے دباتے ہوئے ایک اور سوال کیا۔

”اگر ایسا ہو تو اس سے بڑھ کر انسان کی کیا فزائمی ہو سکتی ہے۔“ سکینہ زبردستی مسکرائی۔

”اچھا! سکینہ اب آپ ان تمام فلسفوں کی سے نکل آئیں اور اپنے آبریش کے بارے میں سوچیں جو اگلے صفحے ہو گا۔“ ڈاکٹر خاور نے بات ایک دم ہی پلٹ دی۔ سکینہ تھوڑی سی مایوس ہوئی۔

”ڈاکٹر صاحب! ایک بات پوچھوں۔“ سکینہ خوار سا تذہب کا شکار ہوئی۔

”ہاں! ہاں ضرور۔“ ڈاکٹر خاور نے اس کی حوصلہ افزائی کی تو وہ جھجک کر بولی۔

”آپ ناراض تو نہیں ہوں گے؟“

”ہرگز نہیں۔“

”ابنا مجھے جیسی لڑکی سے کسی کو محبت ہو سکتی ہے؟“

سکینہ کے سوال نے ڈاکٹر خاور کو بری طرح چونکا دیا۔

”ہاں! بالکل ہو سکتی ہے۔“ وہ بغیر کسی جھجک کے بولے تو اس دفعہ حیران ہونے کی باری سکینہ کی تھی۔

”کیا میری جیسی لڑکی سے آپ جیسے مرد کو محبت ہو سکتی ہے؟“ سکینہ نے اس دفعہ کمرے میں بلاسٹ کی کیا۔

”آف کورس۔“ ڈاکٹر خاور نے ایک دفعہ پھر سکینہ کو حیران کیا۔

”میری بیماری کے باوجود؟“ اسے نہ جانے کیوں یقین نہیں آیا۔

”دیکھو، محبت کے پاس ظاہری بصارت نہیں ہوتی، وہ اپنے محبوب کو ہمیشہ باطن کی آنکھ سے دیکھتی ہے۔ وہ اسے وہاں ہی دیکھتی ہے، جیسا اس کا دل اسے دکھاتا ہے۔ چاہے ساری دنیا مل کر اسے آنکھیں کیوں نہ دے دے، وہ اپنے محبوب کے معاملے میں اندھی رہتا ہی پسند کرتی ہے۔“ ڈاکٹر خاور کا سحر انگیز لہجہ سکینہ کو بالکل کر رہا تھا۔

”تو کوئی ایسا شخص میری قسمت میں بھی ہو گا۔“ سکینہ کے لمحے میں گشہ اعتماد لوٹ آیا، جو ڈاکٹر خاور کو بہت اچھا لگا۔

”اماں! ضرور۔ ان شاء اللہ۔“ وہ جیلہ مائی کو واش روم سے نکلتے دیکھ کر مسکرائے۔

”اماں! جی! سکینہ کے لیے دعا کریں۔ اس کے آبریش کی فٹ فائل ہو گئی ہے۔“ ڈاکٹر خاور کی بات پر سکینہ اور جیلہ مائی دونوں ہی زبردستی مسکرائیں۔

”سکینہ! آنکھوں میں ایک ہلکا سا خوف در آیا۔

”مائی! ام سوری عائشہ! میں اس دن کچھ تلخ ہو گئی تھی۔“ تاہم اس دن اچانک ہی ان کی طرف آنکلی۔

عائشہ پہلے تو اسے دیکھ کر حیران ہوئی لیکن اسے ماہم کا تلخ لہجہ اور گفتگو یاد آئی تو اس کا دل ایک دم ہی اکٹا بہت کا شکار ہوا۔

”اؤ بیٹھو۔“ اسے لان میں بیٹھ کر چائے پیتی عائشہ نے سیاٹ لمحے میں گما تو ماہم نے ایک لمحے میں اس کا اجنبی سا انداز محسوس کیا۔

”مجھ کو سبیل یار! اصر بھائی کے گھر والوں نے پورے خاندان میں یہ بات آگ کی طرح پھیلا دی تھی۔“ ماہم نے صفائی دینے کی کوشش کی۔

”میں اس ٹاپک پر تم سے کوئی بات کرنا نہیں چاہتی۔“ عائشہ روکھے انداز میں بولی تو ماہم کو دھچکا سا لگا۔

”پلیز مائی ٹو انڈر اسٹینڈ۔“ مجھے غصہ آگیا تھا کہ تم نے مجھے بتایا کیوں نہیں۔“ ماہم نے ایک دفعہ پھر وضاحت کرنے کی کوشش کی تو عائشہ نے ہاتھ کے اشارے سے اسے مزید بولنے سے روک دیا۔

”غصہ صرف تمہاری میراث نہیں ہے کسی اور

ادارہ خاتین ڈائجسٹ کی طرف سے بہنوں کے لیے خواہ صورت ناول

سیدہ خاتون

عجیب کہانیاں



قیمت - 400/- روپے

مکتبہ عمران ڈائجسٹ فون نمبر: 32735021 اردو بازار لاہور

کو بھی آسکتا ہے۔ مگر میری تمہیں برداشت نہیں ہوگا سو پلیر کوئی اور بات کر دے۔ "عائشہ کے لیے میں اس قدر رکھائی اور اجنبیت تھی کہ ماہم کچھ لمحے تک بول ہی نہیں سکی۔

"تمہارا کلینک کیسا جا رہا ہے۔" عائشہ نے دانستہ موضوع بدلایا۔

"ٹھیک۔" وہ ابھی تک سنبھل نہیں پائی۔ سخت حیرت سے اپنے سامنے بیٹھی عائشہ کو دیکھ رہی تھی۔ جس کی شخصیت کا یہ عجیب سا پہلو اس کے سامنے آیا تھا۔

"اور ٹمن آپ ٹھیک ہیں؟" عائشہ نے آج فارمل گفتگو کرنے کے سارے ریکارڈ توڑ دیے۔

"ہاں ٹھیک ہیں، بس احیان کو مس کرتی ہیں۔" ماہم کی بات پر ایک طنزیہ سی مسکراہٹ نے عائشہ کے چہرے کا احاطہ کیا۔ لیکن اس نے دانستہ اس بات پر بھروسہ کرنے سے پرہیز کیا۔

"تمہارے لیے چائے بنواؤں؟" عائشہ کی اس بات پر ماہم کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا۔

"میرا خیال ہے کہ تم مجھ سے مزید بات کرنا نہیں چاہتی ہو۔" وہ ایک جھٹکے سے کھڑی ہوئی۔

"یہ تمہارا ذاتی خیال ہے اور ضروری نہیں کہ ٹھیک بھی ہو۔" عائشہ نے لابرڈائی سے کندھے اچکائے۔ اسی وقت ملازمہ کا رڈ لیس اٹھائے لان میں نمودار ہوئی۔

"عائشہ بی بی! آپ کی کال ہے،" رامس صاحب ہیں۔" ملازمہ کی بات پر ماہم کے چہرے کی رنگت متغیر ہوئی۔ وہ جو جانے کے لیے پر تزلزل رہی تھی۔ دانستہ وہیں جم کر کھڑی ہو گئی۔

"ہاں، بھی کیسے ہو رامس! ملا کیسی ہیں؟ سوری میں آج نہیں آسکی۔" عائشہ کی بات پر ماہم کی آنکھوں میں حسد اور جلن کی کیفیت نمودار ہوئی۔

"زیادہ فضول باتیں کرنے کی ضرورت نہیں۔ اگر کوئی مسئلہ ہے تو خود آکر لے جاؤ، میری گاڑی درکشاپ میں ہے۔" عائشہ نے دوسری جانب اس کی

کسی بات کے جواب میں بے تکلفی سے کہا تھا۔ تن بدن میں آگ سی لگ گئی۔

"تمہارے پاس تو انصر بھائی سے زیادہ مسرور موجود ہے۔ سوری! مجھے اس کا خیال ہی نہیں آتا۔"

اس نے جیسے ہی فون بند کیا، ماہم نے طنز کا طعنے عائشہ نے بمشکل خود کو مشتعل ہونے سے روکا۔

"میرے پاس رامس سے بھی بستر آپشن ہے۔" تمہیں کمان نہیں ہوگا۔" عائشہ نے کھڑے ہوئے بڑے اعتماد سے ماہم کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر تو اس کے جھکے جھوٹ گئے۔

"وہی ان سے اڑنا، فضا میں بہت عقاب ہیں اور کسی معصوم فاختہ کی طرح ہو۔" ماہم اب براہ راست طنز اتر آئی۔

"وضاحت کا بہت شکریہ۔" میں اپنی ہی فضاؤں میں اپنی ہی حدود کے اندر اڑتی ہوں۔ اس لیے مجھے عقابوں کا کوئی خوف نہیں، تم اپنی فکر کرو، کہیں پرل آسمانوں کی تلاش میں سورج کی پیش ہی برداشت کر سکو اور سارے پروں کو جلا بیٹھو۔" عائشہ کی بات نے ماہم کو سلا کر رکھ دیا۔

"اس کا فیصلہ تو وقت ہی کرے گا۔" ماہم کا لبہ عائشہ کو چپچپ کر رہا ہوا محسوس ہوا۔

"اور مجھے یقین ہے کہ وہ وقت دور نہیں۔" عائشہ نے ایک دفعہ پھر اسے حیران کیا۔

وفا کے وعدے وہ سارے بھلا گیا چپ چاپ وہ میرے دل کی دیواریں ہلا گیا چپ چاپ کمرے کی تاریکی اور خاموشی میں یہ غزل موجود

بہت اچھی لگ رہی تھی۔ آنکھیں بند کیے وہ وکیل چیئر پر بیٹھا کسی اور ہی دنیا میں گم تھا۔ جس کا دے پاؤں اس کے کمرے میں داخل ہوئی۔ اس

دروازے کے پاس دیوار پر لگے سارے بن ایکس روشن کر دیے۔ کمرے میں روشنی کا پورا طوفان اٹھ اٹھا۔ موحد کی آنکھیں چندھیا گئیں۔ اس

ساتھ اپنی آنکھوں پر دونوں ہاتھ رکھ لیے۔ "بھائی! آنکھوں پر ہاتھ رکھنے سے حقیقت بدل نہیں جاتی۔ زمانے کو فیس کرنا کیسے۔" عائشہ نے بڑی محنت سے اس کے دونوں کندھوں پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

"جی نہیں کیوں،" روخیاں میری آنکھوں کو اچھی نہیں لگتیں۔" وہ شدید قسم کی قنوطیت کا شکار لگ رہا تھا۔

"میرے آگے آپ کے چہرے پر اداسی اور رنجیدگی اچھی نہیں لگتی۔" عائشہ کے لہجے کی کھنک پر وہ تھوڑا سا حیران ہوا۔

"ہائش! بہت خوش لگ رہی ہو۔" موحد نے آنکھیں کھول کر اپنی پیاری بہن کی پرسکون چہرہ دیکھا اور دل ہی دل میں نظریہ سے تجھے کی دعا کی۔

"خوشی کا تو پتا نہیں، لیکن بہت مطمئن ہوں ہیں۔" وہ اس کے سامنے آن بیٹھی۔ اس کا چہرہ اندرونی خوشی کے احساس سے جگمگا رہا تھا۔

"مطمئن ہونا خوش ہونے سے زیادہ قیمتی جذبہ ہوتا ہے۔ سکون ایسی دولت ہے جو کسی کی دل کو ہی نصیب ہوتی ہے۔" موحد نے اس کی چپکتی آنکھوں سے بمشکل آنکھیں چرا لیں۔

"ان شاء اللہ! آپ کو بھی اللہ اس دولت سے مالا مال کرے گا۔" عائشہ نے دل کی گہرائیوں سے اپنے بھائی کو دعا دی۔

"پتا نہیں۔" وہ نہ جانے کیوں مایوسی سے گھبرا ہوا تھا۔

"کیا حال ہے آپ کی پہلن آف ٹرائے کا۔" عائشہ نے اسے چھیننے کی کوشش کی۔

"پتا نہیں، ایک ہفتے سے کوئی رابطہ نہیں۔" موحد کے جواب پر وہ چونکی۔ "کیوں۔"

"میں نے اسے ماہم کے بارے میں بتا دیا تھا۔ اب مجھے نہیں لگا کہ وہ کبھی مجھ سے دوبارہ رابطہ کرے گا۔" موحد نے اپنے دل کا بوجھ بکا کر دی دیا۔

"کیا بتایا؟" عائشہ کی بے باکی پر وہ افسردگی سے مسکرایا۔ "یہی کہ میرے دل پر بہت عرصہ اس نے حکمرانی کی تھی۔"

"یہ بتانا کیا ضروری تھا؟" عائشہ ناراض ہوئی۔

"اس نے پوچھا تھا اور میں نے جھوٹ بولنا مناسب نہیں سمجھا۔" اس کی سادگی پر عائشہ نے بے ساختہ اپنے ماتھے پر ہاتھ مارا۔

"بھائی! ہر حقیقت بتانے کے لیے نہیں ہوتی۔ کچھ چیزوں پر جب اللہ پردہ ڈال دیتا ہے تو ہرگز ڈال دینا چاہیے۔" عائشہ نے اسے سمجھانے کی کوشش کی تو وہ اپنے محلے باب کھٹکے لگا۔

"پتا نہیں کیوں، لیکن میں اس سے جھوٹ نہیں بول سکتا۔" موحد نے کھلے دل سے اعتراف کیا۔

"چھ! آپ اس کا نام بتائیں اور مناسب سمجھیں تو مجھے اس کا نمبر دیں۔" عائشہ کی فرمائش پر اسے جھٹکا سا لگا۔

"تم کیا کر رہی؟"

"اخبار میں تلاش گمشدہ کا اشتہار دوں گی۔" وہ ہلکا سا جھنجھلائی۔ "بھئی، اس سے بات کروں گی اور کیا کروں گی۔" اس نے موحد کی سوالیہ نگاہوں سے گھبرا کر فوراً وضاحت دی۔

"میرے لیے خوشیوں کی بھیک مانگوں؟" وہ تلخ ہوا۔

"کیوں؟ آپ کوئی لو لے لنگڑے ہیں جو آپ کے لیے بھیک مانگوں گی۔" عائشہ اپنی رولانی میں خاصا غلط بول گئی۔ لیکن موحد کا تاریک چہرہ دیکھتے ہی اسے اپنی غلطی کا احساس ہوا۔

"اپنی ایم سوری بھائی! اس نے شرمندگی سے سر جھکا لیا۔

"کوئی بات نہیں، سچ منہ سے نکل ہی جاتا ہے۔ تمہیں شرمندہ ہونے کی ضرورت نہیں۔" موحد کا ساٹ لہجہ عائشہ کو دکھی کر گیا۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتی، موحد اپنی وہیل چیئر کے پہلوں پر تیز تیز ہاتھ مارتا ہوا کمرے سے نکل گیا۔ عائشہ کو لگا جیسے اس کی ناگوں سے جان نکل گئی ہو۔

”ہوں۔ بات تو آپ نے واقعی غلط کی اور بہت ہی زیادہ غلط کی۔“ وہ رامس کو اپنا سارا کھڑا سنا کر چپ ہوئی تو فون کی دوسری جانب سے رامس نے فوراً ہی اسے مزید شرمندہ کیا۔

”اب کیا کروں؟“ اس کی معصومیت پر رامس کو ہنسی آگئی اور دوسری جانب موجود عائشہ کو اس کی ہنسی کی آواز نے بتایا۔

”میری جان پرینی ہوئی ہے اور تم ہنس رہے ہو۔“ وہ باقاعدہ جل کر گویا ہوئی۔

”آپ بات ہی بننے والی کر رہی ہیں۔ بھی سیدھی سی بات ہے کہ جب کوئی غلطی ہو جائے تو اس پر ایکسکیوز کر لینا چاہیے۔“ رامس نے مسکراتے ہوئے اسے مشورہ دیا جو عائشہ کو بالکل بھی پسند نہیں آیا۔

”تمہارا کیا خیال ہے کہ میں نے سوری نہیں کیا ہوگا۔“ اس نے طنزاً پوچھا۔

”جی ضرور کیا ہوگا۔“ رامس مسکرایا۔ ”لیکن اس انداز سے کیا ہوگا کہ اگلا بندہ مزید دکھی ہو گیا ہوگا۔“ وہ رامس کے درست انداز سے برحیران ہوئی۔

”ہمیں کس نے بتایا۔“ اس کی حیرت پر وہ اب قہقہہ لگا کر رہا۔

”چھا! اب ایسا کریں کہ جس مسئلے کی وجہ سے موجود بھائی پریشان ہیں۔ وہ حل کر دیں۔“ رامس نے اسے ایک نئی راہ دکھائی۔

”کیا مطلب۔“

”بھئی مطلب یہ کہ اس لڑکی کو فون کریں یا اس سے جا کر مل لیں۔“ رامس نے مشورہ دیا۔

”ماشاء اللہ بہت عقل مند واقعہ ہونے ہیں آپ۔“ عائشہ کے لہجے میں طنز کی آمیزش شامل ہوئی۔ ”اس لڑکی کا فون نمبر مانگنے کی وجہ سے ہی تو ساری گڑبڑ ہوئی ہے۔“ عائشہ نے اسے یاد دلایا۔

”اوہ۔“ وہ چونکا کچھ سیکنڈ کے توقف کے بعد بولا۔

”فون نمبر تلاش کرنا تو کوئی مسئلہ نہیں۔“

”وہ کیسے۔“ عائشہ نے عجلت بھرے انداز میں پوچھا۔

”یہ بتاؤ کہ موجود بھائی کے فون کا نمبر کہاں آتا ہے گھر پر یا آفس کے کیڈریس پر۔“ رامس کے سوال پر حیران ہوئی۔

”گھر پر۔“ عائشہ نے مختصراً بتایا۔

”بس پھر تو سارا ہی مسئلہ حل ہو گیا۔ ان کے پچھلے مہینے کا نمبر چیک کرو جس نمبر پر سب سے زیادہ اور سب سے لمبی کالز ہوئی ہوں گی۔ وہ اسی لڑکی کا نمبر ہوگا۔“ رامس نے چٹکی بجا کر اس کا سارا ہی مسئلہ حل کر دیا۔

”وہ مائی گاڈ! تم کتنے چالاک ہو رامس! عائشہ ایک دم ہلکی پھلکی ہوئی۔

”دیکھ لو، پھر بھی آپ کی دوست کے ہاتھوں دھوکا کھا گیا۔“ اس نے استغناء سے اپنا مذاق اڑایا جو عائشہ کو بالکل اچھا نہیں لگا۔

”اس کی تو تم بات ہی نہ کرو ہم سب مل کر بھی ماہم کے دماغ کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔“ عائشہ نے ہنسنے ہوئے کہا۔

”خیر اب ایسی بھی بات نہیں۔ اونٹ بھی نہ بھی تو بھاڑ کے نیچے آئے گا۔“ رامس کا لہجہ خاصا معنی خیز تھا۔ عائشہ بخود سا ابھی۔

”چھوڑو، ہمیں کیا ضرورت ہے۔ بس اللہ سب کو ہدایت دے۔“ عائشہ کی بات پر وہ مسکرایا۔

”آپ بہت اچھی فطرت کی حامل ہیں۔ لیکن افسوس کہ آپ جیسے لوگ بہت کم ہوتے ہیں۔“

رامس نے کھلے دل سے اعتراف کیا۔

”چاہت نہیں۔“ عائشہ نے لاروائی سے کہا۔ ”بس ہر چیز کے لیے اپنے اللہ گئے اور اپنے ضمیر کے آگے جواب دہ ہوں۔ دوسرے کیا ہیں اور کیسے ہیں

میں ان باتوں پر اپنا وقت ضائع نہیں کرتی۔“

”بہت اچھا کرتی ہیں۔ ورنہ ہم میں سے اسی لہجہ لوگ اپنی ذات کے بجائے دوسروں کی ٹوہ میں

رہتے ہیں۔ اسی سے معاشرے میں بگاڑ پیدا ہوتا ہے۔“ رامس سنجیدہ ہوا تو وہ سر ہلا کر رہ گئی۔

”تمہارے بھائی کا کیا حال ہے۔“ عائشہ نے کچھ جھجک کر پوچھا۔

”بھائی بہت زیادہ بڑی ہیں۔ آج کل کم کم ہی ملاقات ہوتی ہے۔“ رامس نے سادگی سے بتایا تو اس نے فوراً پوچھا۔

”کیا کرتے ہیں تمہارے بھائی؟“

”کیا مطلب؟“ رامس ٹھنکا۔ ”میں نے آپ کو نہیں بتایا؟“

”میں میں نے ان سے کبھی نہیں پوچھا۔“ عائشہ کی سادگی نے رامس کو کافی زیادہ حیران کیا۔

”مائی گاڈ! ایسی لڑکی ہیں آپ۔“ وہ خوش گوار انداز میں ہنسنا تو دوسری جانب عائشہ چڑھی گئی۔

”بس ایسی ہی ہوں۔“ وہ اس کے جل کر ہونے پر بے اختیار ہنسنا اور ہنستا ہی چلا گیا۔

”سیکنڈ! آخر تو مجھے غلط کیوں سمجھتی ہے۔“ آنکھوں میں دھیروں سرمہ اور تیل سے چڑے ہوئے یاہوں کے ساتھ جاتی پچھلے ایک ٹھننے سے سیکنڈ کی برداشت کا امتحان لے رہا تھا۔ اللہ داتا کھار اور جلیلہ مائی ڈاکٹر کے ساتھ سیکنڈ کے آپریشن کے سلسلے میں بات کرنے گئے تھے۔

”مجھے میری محبت کا اعتبار کیوں نہیں آتا؟“ جابی کے سوال نے اسے سلگا کر رکھ دیا۔

”میں نے تیری محبت کا کیا اچار ڈالنا ہے۔“ وہ فوراً مشتعل ہوئی۔

”چھو! پھر کس کی محبت کا اچار ڈالے گی۔“ جابی نے بھی آج بھائی کے سارے ریکارڈ تو ڈیوے۔ اس کے سوال پر سیکنڈ ایک دم ہکا بکا ہوئی۔

”مجھے کیا یہ میرا معاملہ ہے۔“ سیکنڈ نے اماں کی غیر موجودگی کا بھرپور فائدہ اٹھایا۔ جابی کا چہرہ ایک دم تاریک سا ہو گیا۔

”دیکھ سیکنڈ! محبت اپنے ماں کے لوگوں میں اچھی رہتی ہے۔ اپنے سے اونچا دیکھے کی تو گردن اٹھ جائے گی۔“ جابی کے ذمہ معنی انداز نے سیکنڈ کو ایک لمحے کو چپ کر دیا۔ اسے پہلی دفعہ احساس ہوا کہ وہ اتنا بھی بے خبر نہیں جتنا وہ اسے سمجھتی ہے۔

”میری گردن اٹھائے یا ٹوٹے، مجھے کوئی مسئلہ نہیں ہونا چاہیے۔“ سیکنڈ نے نظریں چراتے ہوئے تلخ لہجہ میں کہا۔

”مجھے ہی تو سارا مسئلہ ہوگا۔“ جابی کے لہجہ میں محبت کے ساتھ ساتھ افسردگی بھی تھی۔

”مجھے تیرے مشکلوں سے کوئی سروکار نہیں۔“ سیکنڈ نے بے رخی سے کہتے ہوئے اپنا رخ موڑ لیا۔ وہ اب لان میں پچھلی دھوپ کو دیکھ رہی تھی۔ چمیلی دھوپ نے سارے پودوں کو اپنی پلیٹ میں لے رکھا تھا۔

”دیکھ سیکنڈ! تو جتنی بھی میرے ساتھ بے رخی برت لے، لیکن یاد رکھنا کہ زندگی میں جب بھی تو کوئی قدم اٹھائے گی۔ مجھے اپنے پیچھے پائے گی۔“ جابی کا پر اعتماد انداز سیکنڈ کو سخت برا لگ رہا تھا۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ جابی کو کبھی ہٹا کر سامنے دوچار پر چکا دے۔

”یہ دیکھ! جان چھو میری۔“ سیکنڈ نے باقاعدہ اس کے آگے ہاتھ جوڑے تو جابی کا چہرہ پھیکا پڑ گیا۔ اندر داخل ہوتے ڈاکٹر خاور نے یہ آخری منظر اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ وہ استغیاب سے نگاہوں سے دونوں کو دیکھنے لگے۔ جابی تو گڑبڑا کر کھڑا ہوا اور کمرے سے نکل گیا۔

جبکہ سیکنڈ کا چہرہ زبردستی مسکرائے کی کوشش میں عجیب سا اثر دینے لگا۔

”جو لوگ ہم سے محبت کرتے ہوں۔ ان کی قدر کرتے ہیں سیکنڈ! نہ جانے کیوں ڈاکٹر خاور کے منہ سے نکلنے والے یہ الفاظ سیکنڈ کے دل پر کسی اینٹ کی طرح لگے۔

”پھر آپ میری قدر کیوں نہیں کرتے؟“ اس نے بے باکی سے ڈاکٹر خاور کی طرف دیکھا جو اپنی جگہ پر ساکت رہ گئے۔ ابھمن بھری نگاہوں سے سیکنڈ کو

دیکھتے ہوئے انہوں نے خود کو بڑی جلدی سنبھالا۔
”مگر میں نے بھی آپ سے اس لمحے میں بات کی“
جس لمحے میں آپ انجانے کرتی ہیں۔ ”ڈاکٹر خاور کی
بات پر سیکرٹری گھڑوں پانی پر گیا۔ وہ سخت زہ انداز سے
اپنے لبوں کو چٹکنے لگی۔ وہ برے طریقے سے لا جواب
ہو چکی تھی۔

”وہ مجھے اچھا نہیں لگتا۔“ اپنے ہاتھوں کو مسلتے
ہوئے اس نے بچکانہ سے انداز میں کہا۔ ”کئی برس کے
ساتھ ڈاکٹر زویا اسی لمحے کمرے میں داخل ہوئیں۔
”لیکن مجھے تو آپ اچھی لگتی ہیں۔“ ڈاکٹر خاور کا یہ
جملہ ڈاکٹر زویا کے تن بدن میں آگ سا لگا گیا۔ انہوں
نے دروازے کو ہلکا سا جاکر اپنی موجودگی سے باخبر کیا۔
دونوں بے اختیار چوٹے۔

”میرا خیال ہے میں نے خاصے غلط نام پر انٹری دی
ہے۔“ ڈاکٹر زویا کے لمحے میں ہی نہیں آنکھوں میں
سے بھی شعلے نکلے۔

”آپ انٹری غلط نام پر انٹری دیتی ہیں اور بد قسمتی
کی بات یہ ہے کہ آپ کو خود بھی کافی دیر کے بعد پتا چلتا
ہے۔“ ڈاکٹر خاور اپنی بات کہہ کر رکے نہیں اور
کمرے سے نکل گئے۔ ڈاکٹر زویا کو یوں لگا جیسے ان کی
قوت گویائی سلب ہو کر رہ گئی ہو۔

”تھنکس گاڈ! امی کی طبیعت ٹھیک ہوئی اور
ڈاکٹر نے ان کو گھر شفٹ کرنے کا کہہ دیا۔“ ثناء ملکہ نے
اپنے بیڈ کی چادر ٹھیک کرتے ہوئے ثناء سے کہا۔
”ہاں یار! ان کی بیماری نے تو واقعی ہاتھ پیر پھلا کر
رکھ دیے تھے۔“ ثناء نے اپنے کندھوں کو دباتے
ہوئے جواب دیا۔

”تھینک یو ثناء۔“ ثناء ملکہ بیڈ کی چادر درست
کر کے اس پر بیٹھ گئی۔

”مگر مزید کوئی بکواس کی تو یہ بیک گھما کر تمہارے
سر پر دے ماروں گی۔“ ثناء نے کھانچنے والی نگاہوں
سے ثناء ملکہ کو دیکھا۔

”قسم سے تمہارا بہت آسرا ہے مجھے۔“ کاش
مکینہ بھائی بے وفائی نہ کرتا۔ ”ثناء ملکہ کے لمحے میں
حسرتوں کا ایک جہاں آباد تھا۔

”تھینک گاڈ! تمہارے خود غرض اور لاپرواہی
سے میری جان چھوٹ گئی، ورنہ تمہارا ہیڈرسم کتنے
کے میری زندگی میں آتا۔“ ثناء نے لڑی ٹانگیں سے
تنگلی سے میز پر رکھتے ہوئے ثناء ملکہ کو چھیڑا۔

”ہاں، کہہ تو تم ٹھیک ہی ہو، لیکن تم اس کی
خود غرضی کی انتہا دیکھو کہ پورے ایک ہفتے میں صرف
ایک کال کی اور اس میں بھی اپنی غیبت کے روئے
شروع کر دیے اس نے۔“ ثناء ملکہ کو اپنا ایک اور دکھ یاد
آیا۔

”مٹی والو اس پر یہ بتاؤ کہ تمہارے ہیرو کا کوئی فن
آیا؟“ ثناء نے موضوع تبدیل کرنے کی غرض سے
پوچھا۔

”نہیں یار! ثناء ملکہ افسردہ ہوئی۔ ”وہ سمجھ رہا ہوگا
کہ میں اس سے خفا ہوں۔“ ثناء ملکہ کو اپنی آخری گفتگو
تمام تر جزئیات کے ساتھ یاد آئی۔

”ویسے ثناء! سوچنے کی بات ہے کہ ماہم منصور نے
آخر اس کے ساتھ ایسا کیا، کیا تھا جو وہ اتنا اس سے
بدظن ہو گیا۔“ ثناء ملکہ نے مزید کہا۔

”ہو سکتا ہے کہ ماہم کا تصور اتنا نہ ہو۔“ ثناء نے
ایک نکت نکالا۔

”جتنا میں اسے جانتی ہوں، میں مان ہی نہیں سکتی
کہ وہ کسی کے ساتھ کچھ برا کر سکتا ہے۔“ ثناء ملکہ کے
لمحے میں موجد کے لیے اندھا اختیار تھا۔

”واہ جی! واہ! صدقے جاؤں تمہارے اس اعتقاد
پر۔“ ثناء نے ہنستے ہوئے اس کا مذاق اڑایا۔

”زیادہ فضول بولنے کی ضرورت نہیں۔ میرے
کزن کو کچھ غیرت دلاؤ کہ اس کی پچھو اتنی بیماری
ہیں وہ اب تو انہیں دیکھنے آجائے۔“ ثناء ملکہ کو اچانک
یاد آیا۔

”میں کی اپنی والدہ ایک ہفتے سے اسپتال میں
ایڈمٹ ہیں۔ میں نے تمہیں اس لیے نہیں بلایا کہ

میں تم پریشان نہ ہو جاؤ۔“ ثناء نے کی بات پر وہ حیران
ہوئی۔

”ممانی جان بیمار ہیں۔“ ثناء ملکہ ایک دم فکر مند
ہوئی۔ ”ماموں پاکستان واپس آگئے؟“ اسے یاد آیا تو
”ہاں“ پوچھ لیا۔

”نہیں۔“ ثناء نے آہستگی سے کہتے ہوئے نظریں
چرائیں تو ثناء ملکہ چونک سی گئی۔

”اور دیکھو میری طرف ثناء! تم مجھ سے کیا چھپا
رہی ہو۔“ ثناء ملکہ کی چھٹی حس نے اسے بروقت چوکنے
کیا۔

”مہرے پاس تمہارے لیے اس حوالے سے کوئی
اچھی خبر نہیں۔“ ثناء نے کی بات پر اس کا دل بے ہنگم
طریقے سے دھڑکا۔

”کیا مطلب ہے تمہارا؟“ ثناء ملکہ نے بے تابی سے
پوچھا۔

”دراصل تمہارے ماموں کا وہ سال پہلے انگلینڈ
میں انتقال ہو چکا ہے۔“ ثناء نے اس کے سر پر مہی تو
پھوڑا تھا۔ وہ دکھ سے اسے دیکھتی رہ گئی۔ اسے یقین ہی
نہیں آ رہا تھا کہ ایسا بھی کچھ ہو سکتا ہے۔

وہ آج پھر اپنے کیونس اور رنگوں کے ساتھ پارک
میں موجود تھی۔ بہت عرصے کے بعد اس کا دل چاہا تھا
کہ وہ کوئی خاص چیز بیٹھ کرے۔ آج وہ اپنے وقت
سے بہت پہلے ہی اپنی مقررہ جگہ پر آ پہنچی تھی۔ یہی
وجہ تھی کہ جب تک وہ جوگ ٹریک پر آیا۔ عائنہ اپنا
اسی فیڈ کام پٹا چلی گئی۔ ایک بہت خوب صورت
بیننگ اپنے آخری مراحل میں تھی۔ جب عائنہ کو
اپنی بہت پروردگاری نظروں کا حصار محسوس ہوا۔ اس
نے اپنے اختیار مقررہ دیکھا۔ سامنے سنگ مرمر کے بیچ پر
وہ لاپرواہی سے بیٹھا ہوا تھا اور اس کی توصیفی نگاہیں
کیونس پر جمی ہوئی تھیں۔ عائنہ کا دل ایک دم ہی
بے ساختہ پر اتر آیا۔ وہ اسٹوک لگا بھول گئی۔

”اول ہوں۔“ اس کے منہ سے نکلنے والی آواز پر

عائنہ کا ہاتھ کانپا۔ اس نے پیچھے مڑ کر اسے گھور کر
دیکھا۔

”غلط جگہ پر اسٹوک لگا رہی ہیں آپ۔“ وہ لاپرواہی
سے کہتے ہوئے سامنے درخت پر بیٹھی گول کو دیکھنے
لگا، جس کی آواز صبح کے سنائے میں بہت دلفریب لگ
رہی تھی۔

”میری بیننگ ہے، میں جیسی بھی بناؤں۔“ عائنہ
نے خود کو سنبھالتے ہوئے دانستہ ہلکا پھلکا لہجہ اختیار
کیا۔

”آپ عادتاً اپنی چیزوں کو خراب کرتی ہیں یا
فطرتاً ایسی ہیں۔“ وہ اس کے بالکل قریب آ کر اپنے
دونوں بازو سینے پر باندھ کر بڑے گہرے لمحے میں گویا
ہوا۔ عائنہ کے لیے اپنی دھڑکنوں پر قابو پانا دشوار
ہو گیا۔

”میں خود سے ایسے نہیں کرتی، چیزیں خود بخود مجھ
سے خراب ہو جاتی ہیں۔“ اس کے ساتھ انداز پر علی
نے اپنے چہرے پر آنے والی مسکراہٹ کو بحال
چھپایا۔

”پھر تو یہ بہت خطرناک چیز ہے۔ کیا آپ اپنے
ریلیشنز کے معاملے میں بھی ایسی ہی لاپرواہ ہیں۔“ علی
کا جنہیت سے لبر لہجہ عائنہ کی جان نکل رہا تھا۔

”آپ کتنا کیا چاہتے ہیں۔“ وہ جھٹکنے سے مڑی تو
عین اس کے پیچھے کھڑے علی کے سفید ٹریک سوٹ
سے اس کا برش غرا گیا۔ سفید شرٹ پر رنگوں کی ایک
لائن بنی گئی۔ عائنہ ایک دم ہولنا کر اپنے دوپٹے
سے اس کی شرٹ کو صاف کرنے لگی تو علی نے فوراً

ہی اس کی کلائی پکڑ لی۔
”پہلے چیزیں خراب کرتی ہیں، اس کے بعد اپنا
نقصان کرتی جیتی ہیں۔“ علی نے تحرائیں لمحے میں کہا۔
اس کی آنکھوں سے نکلنے والی محبت کی کرنیں عائنہ
کے سارے وجود کو منور کر رہی تھیں۔ اسے لگ رہا تھا
جیسے ساری دنیا ایک ہی تال پر محو ہے۔ ہلکوں پر
ڈھیروں بوجھ آں پڑا۔ اس کے لیے نظر اٹھا کر اپنے
سامنے کھڑے دشمن جاں کو دیکھنا محال ہو گیا تھا۔

”میرا ہاتھ تو چھوڑیں۔“ عائشہ کے ہاتھ سے برش
 چھوٹ کر زمین پر جا گرا۔
 ”یہ چھوڑنے کے لیے نہیں پکڑا۔“ علی کا لہجہ
 عائشہ کے جھکے چھڑا ہاتھ اس نے پلکیں اٹھا کر اسے
 دیکھا۔ جس کی آنکھوں میں محبت اور شرارت کے
 بڑے انوکھے رنگ تھے۔
 ”میں آپ سے خفا تھا۔ آپ نے مجھے منایا کیوں
 نہیں۔“ اس نے بڑے استحقاق سے اس کی آنکھوں
 میں جھانکا۔ عائشہ گزربا گئی۔
 ”پلیز، میرا ہاتھ تو چھوڑیں۔“ عائشہ کی آنکھیں غم
 ہوئیں تو علی نے فوراً اس کا ہاتھ نرمی سے چھوڑ دیا۔
 وہ گہرا کر اس سے چند قدم دور ہو کر کھڑی ہو گئی۔ اس
 کے رخساروں پر انار سے پھوٹتے ہوئے محسوس
 ہو رہے تھے۔
 ”جن لوگوں سے محبت ہو، ان کے ساتھ ایسے
 کرتے ہیں بھلا؟“ علی نے گہمیر لہجے میں کہا۔
 ”ہاں تو آپ نے کیوں ٹھیکہ اٹھا رکھا تھا سارے شہر
 کی لڑکیوں کے ساتھ گھومنے کا۔“ وہ جل کر بولی تو علی کا
 بے باک قہقہہ فضاؤں میں پھیل گیا۔
 ”جیلس ہو رہی تھیں۔“ وہ ایک دم آگے بڑھ
 آیا۔
 ”مجھے کیا ضرورت پڑی ہے جلنے کی۔“ وہ دانستہ رخ
 موڑ کر کھڑی ہو گئی۔
 ”چھپا۔ واقعی؟“ وہ دوسری جانب سے اس
 کے سامنے آن کھڑا ہوا۔ عائشہ بیٹھا گئی۔
 ”میں۔۔۔ ہنڈ ریڈ پر منسٹ۔“ عائشہ نے لاپرواہی
 سے کہا۔
 ”چھا۔۔۔ چلو دیکھتے ہیں۔“ اس نے کندھے
 اچکائے۔ ”چھا یہ بتائیں آج کل آپ کے جو ڈھیروں
 ڈھیر پروپونل آئے ہوئے ہیں۔ ان میں سے کوئی
 فائنل ہوا؟“ علی کی بات نے عائشہ کو چونکا دیا۔
 ”آپ سے یہ کس نے کہا؟“
 ”آپ کی بیسٹ فرینڈ ماہم نے۔“ عائشہ بے
 اختیار چوٹی۔

اس کا شوقی ہے
 لبر رائنڈ از عائشہ کو سا لگا گیا۔
 ”اور آپ نے ماہم کو پروپونز کر دیا۔“ میں نے تو آپ
 سے کچھ نہیں کہا۔“ عائشہ کی جھلکی پر وہ مسکرایا۔ ”میں
 اپنے ہوش و حواس میں تو آپ کی دوست کو پروپونز
 نہیں کر سکتا۔ بے ہوشی کی کیفیت میں کچھ کہہ دیا ہو تو
 مجھے یاد نہیں۔“ وہ سراسر عائشہ کا مذاق اڑا رہا تھا۔ جسے
 محسوس کر کے اس کا منہ بن گیا۔
 ”آپ کی خاطر کئی کئی گھنٹے آپ کی دوست کو
 برداشت کرنا پڑا۔ اوپر سے وہ ہر ملاقات میں آپ کے
 کسی نہ کسی پروپونل کی داستان سنا کر میرا دل زخمی
 کر دیتی تھی۔“ علی کی بات پر وہ زبردست انداز میں
 چونکی لیکن دانستہ خاموش رہی۔ ناراضی کے بادل
 چھٹ چکے تھے۔ آج بہت عرصے کے بعد دونوں کو اس
 خوب صورت صبح میں دلکشی کے سارے رنگ دکھائی
 دیے تھے۔ کچھ ہی دیر کے بعد دونوں آپس میں اس
 طرح محو گفتگو تھے جیسے درمیان کا عرصہ ہیچ نہیں آیا ہی
 نہ ہو۔
 * * *
 ”پتا ہے ڈاکٹر صاحب! جب میں ٹھیک ہو جاؤں گی
 تو بہت سا پیسہ کمائوں گی۔“ سیکینہ کی بات نے ڈاکٹر خاور
 کو حیران کیا۔ وہ آج سیکینہ کو دیکھ کر پھر ان کی طرف
 آگئے تھے۔ انہیں دیکھ کر سسٹمراریہ فوراً ہی اٹھ کر
 چلی گئیں۔ سیکینہ کو احساس ہوا کہ آج کل ڈاکٹر خاور
 اس کو زیادہ سے زیادہ ناگوار رہے ہیں۔
 ”ڈھیر سارا پیسہ لے کر کیا کریں گی؟“ ڈاکٹر خاور
 سامنے درختوں کے جھنڈ سے ایک سفید رنگ کا پھل
 توڑ کر لے آئے۔
 ”میں اس پیسے سے معذور بچوں کے لیے ایک
 ادارہ بناؤں گی۔ ان میں ایسے بچوں کو رکھوں گی۔ جن
 کے والدین کے پاس ان کے علاج کے لیے پیسہ نہیں
 ہوگا۔“ سیکینہ آج کل انہیں قدم قدم پر چونکا رہی
 تھی۔

”اور میں اس ادارے کے بچوں کا مفت علاج
 کروں گا۔“ ڈاکٹر خاور کے منہ سے نکلنے والی بے ساختہ
 بات نے سیکینہ کا ڈھیروں خون بڑھا دیا۔
 ”وعدہ۔“ وہ بالکل بچوں کے سے انداز میں خوش
 ہوئی۔
 ”اگلا وعدہ۔“ ڈاکٹر خاور نے اس کی جانب پھول
 بڑھاتے ہوئے اسے یقین دلایا۔
 ”پتا ہے ڈاکٹر صاحب! آج کل مجھے زندگی بہت
 خوب صورت لگنے لگی ہے۔“ سیکینہ نے مسکراتے
 ہوئے پھول پکڑا تو انہوں نے سوالیہ نگاہوں سے اس
 کی طرف دیکھا۔
 ”لیکن اس کے ساتھ ساتھ ایک عجیب سا دھڑکا
 بھی میرے دل کو لگا رہتا ہے۔“ اس کی آنکھوں میں ہلکا
 سا خوف در آیا۔
 ”دیکھو سیکینہ! اپنے آپ کو دونوں قسم کے حالات
 کے لیے تیار رکھو۔ اگر تمہارا آریشن کامیاب ہو گیا تو
 یقیناً اس سے زیادہ اچھی بات کوئی نہیں ہو سکتی۔
 لیکن آج مجھ سے یہ بھی وعدہ کرو کہ خدا خواستہ ایسا نہ
 ہوا تو تم اپنے والدین اور خود کو پریشان نہیں کرو گی۔“
 ڈاکٹر خاور نے اسے ذہنی طور پر ہر قسم کے حالات کے
 لیے تیار کرنا چاہا۔
 ”مجھے معلوم ہے ڈاکٹر صاحب!“ وہ زبردستی
 مسکرائی۔
 ”دیکھو سیکینہ! ایک مسیحا کی حیثیت سے میرے
 ہاتھ میں جو کچھ ہوا، میں کروں گا۔ مجھے اپنے اللہ پر
 یقین ہے کہ وہ کوئی نہ کوئی اچھی راہ ضرور نکالے گا۔“
 ڈاکٹر خاور کا مثبت رویہ سیکینہ کے دل میں امیدوں کے
 گلی چلن روشن کر گیا۔
 * * *
 ”کیا مصیبت ہے جو یہ میرا فون اینڈز نہیں کر رہا۔“
 ماہم کا کوفت کے مارے برا حال تھا۔ وہ غصے اور
 ہنسنے سے اپنے کمرے کے کئی چکر کاٹ چکی
 تھی۔ اس کے ہاتھ میں سیل فون تھا جس پر وہ بار بار

ایک ہی نمبر ڈائل کر رہی تھی۔
 ”مجھتا کیا ہے خود کو ایسا کون سا نواب لگا ہوا
 ہے۔“ ماہم نے ہاتھ میں پکڑا سیل فون غصے سے بیڑ پر
 پھینک دیا۔ اس کا چہرہ غصے کی زیادتی سے نمٹا کر طرح
 سرخ ہوا۔
 ”ایک عائشہ صاحبہ ہیں جن کے مزاج میں مل
 رہے۔ اگر اللہ نے دھنک کی شکل دے دی ہوئی تو
 محترمہ آسمان پر کندیں والی پھرتیں۔“ ماہم کا دل غ
 بری طرح گھوما ہوا تھا۔ وہ کبھی علی کو اور کبھی عائشہ کو
 بلند آواز میں کونے کونے لگتی۔ اسی لمحے سیل فون کی گھنٹی پر
 وہ متوجہ ہوئی۔ اس نے بڑی عجلت سے اسکرین پر
 آنے والے نمبر کو دیکھا۔ علی کا نام دیکھ کر اس کے غصے
 کا لیول کئی ڈگری نیچے آ گیا۔
 ”آئی ایم سوری ماہم! میں کچھ بڑی ہوں“ آپ کو پھر
 کال کروں گا۔“ دوسری جانب وہ بھی خاصی عجلت میں
 تھا۔
 ”لیکن مجھے تو آپ سے تفصیلاً بات کرنی ہے۔“
 وہ جھلی۔
 ”مجھے اس ہفتے میں تو ممکن نہیں ہاں اگلے ہفتے
 دیکھوں گا۔“ وہ جلت بھرے انداز میں گویا ہوا۔
 ”آپ کو پتا ہے کہ عائشہ کی ایک بھینٹ ہو رہی
 ہے رامس علی کے ساتھ۔“
 ”ہو۔۔۔“ وہ ہلکا سا چونکا۔ ”میری طرف سے
 مبارک باد دے دیجئے گا انہیں۔“ ہلکے جھلکے لہجے میں
 کہہ کر وہ فون بند کر چکا تھا۔ ماہم کو اس کے انداز پر
 کرٹ سا لگا۔
 ”گھو ٹو ہیل“ اس نے سیل فون پوری طاقت سے
 زمین پر دے مارا۔ اس کا پچھلا حصہ ٹکڑا اور ہشوی نکل
 کر بیڈ کے نیچے جا گری۔ وہ اب دونوں ہاتھوں سے اپنا
 سر تھامے صوفے پر بیٹھ چکی تھی۔ دماغ میں سوچوں کا
 ایک طوفان تھا۔ اسے پتا ہی نہیں چلا کہ کب ٹمن آئی
 پریشانی کے عالم میں اندر داخل ہوئیں۔
 ”تمہیں پتا ہے ماہم! انصر نے اپنی ایک کو لیگ کی
 بہن سے کورٹ میں ج کر لی ہے۔“ ٹمن آئی کی بات پر

وہ چونکی۔

”بھڑ میں جائے انصر! آپ کو کیا رہا ہے۔ اب وہ جس سے مرضی شادی کرے۔“ ماہم کا سارا غصہ ثمن آپ پر نکل گیا۔

”تم کیوں لال چلی ہو رہی ہو۔“ ثمن آپ کی بڑی جلدی اس کے خراب موڈ کا اندازہ ہوا۔
”اس علی کے بچے نے دماغ خراب کر رکھا ہے۔“ وہ روانی میں بول گئی۔

”میں دفع کرو اسے۔ یاد رکھو مرد اس عورت کی کبھی قدر نہیں کرتا جو اسے آسانی سے مل جائے۔ خود کو ناقابلِ تخریب بنا کر پیش کرو، تمہارے پیچھے پاگل ہو جائے گا۔“ ثمن آپ نے اپنے تجربے کی روشنی میں بتایا۔

”رہنے دیں آپ! یہ بھی کر چکی ہوں۔“ ماہم نے بے زاری سے کہا۔ ”وہ مردوں کی اس قسم سے ہے جو ناپید ہو چکی ہے۔ بس کوئی ایک آدھ نادر عجوبہ باقی ہے۔“

”پھر دفع کرو اسے، تم نے کون سا کوئی میوزیم کھولنا ہے جہاں ایسے نادر عجوبے رکھو گی۔“ ثمن آپ کا انداز اکٹھا ہٹ لیے ہوئے تھا۔

”اس نے ماہم منصور کو انور کیا ہے اور کوئی مجھے نظر انداز کرے، یہ کیسے ہو سکتا ہے۔“ ماہم کا لہجہ خاصا عجیب تھا۔

”تو پھر کیا کرو گی؟“ ثمن آپ نے یونہی پوچھا۔
”جب تک اسے اپنی زلفوں کا اس پر نہیں بتاؤں گی، مجھے سکون نہیں آئے گا۔“ ماہم کی آنکھوں سے شعلے نکلے۔ ثمن حیرانی سے اپنی بہن کو دیکھتی رہ گئیں جس کا خوب صورت چہرہ اس وقت شدید تناؤ کا شکار ہو کر بہت بد صورت لگ رہا تھا۔

”میں موصد کی بہن ہوں، مجھے آپ سے بات کرنی ہے۔“ ثمن ایک دم پریشان سی ہو گئی۔ اس نے گھبرا کر چوہا بند کر دیا۔
”میں آپ سے ملنا چاہتی ہوں۔“ عائشہ کی اگلی

فرمائش نے اسے مزید پریشان کیا۔

”آپ عائشہ بات کر رہی ہیں؟“ دوسری جانب سے جھجک کر پوچھا گیا تو عائشہ مسکرا دی۔

”آپ کو کھانا نے میرے بارے میں بتایا ہے کیا؟“ اس کا دوستانہ انداز ثمن کو کھوڑا سا پرسکون کر گیا۔
”جی، وہ اکثر ہی آپ کا ذکر کرتے تھے۔“ ثمن نے دوبارہ چوہا بند کر دیا اور کوہلی آنچ پر دم دیا۔ عائشہ کو بڑی سادہ سی لڑکی لگی تھی۔

”آپ مجھ سے کیوں ملنا چاہتی ہیں۔“
”میں دیکھنا چاہتی ہوں کہ آخر وہ کون سی لڑکی ہے جو میرے بھائی سے لڑتی رہتی ہے۔“ عائشہ کے شرارتی انداز پر ثمن نالہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ اس کے بعد دونوں میں جو گفتگو کا سلسلہ شروع ہوا وہ اگلے بیس منٹ تک جاری رہا۔ آخر کار طے یہ پایا تھا کہ ثمن اپنی دوست کے ساتھ عائشہ سے ملنے آئے گی۔

”یہ کس سے ہنس رہی ہیں؟“ ثمن نے پوچھا۔
”یہ کس سے ہنس رہی ہیں؟“ ثمن نے پوچھا۔
”یہ کس سے ہنس رہی ہیں؟“ ثمن نے پوچھا۔

”موصد کی بہن تھی عائشہ۔“ ثمن نے مختصر بتایا جبکہ اس اطلاع پر ثمن کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔
”توبہ! کتنی مبینہ تھی، ہو تم، کہاں کہاں کنکشن ملا رکھے ہیں اور مجھے کانٹوں کا نذر نہیں۔“ ثمن نے شرارت سے اس کے کندھے پر مٹکا مارا۔ اس نے مزہ کر کے گھور کر دیکھا۔
”کتنی بد تمیز ہو تم ثمن۔“

”اس میں تو کوئی شک ہی نہیں۔“ اس نے ڈھٹائی سے سرخم کیا۔

”یہ پیالہ اٹھا کر کیا مانگتے آتی ہو، خبر ہو گئی ہو گی کہ میں مرٹلاؤ بننا رہی ہوں۔“ ثمن نے اسے چھیڑا۔
”محترمہ میں مانگتے نہیں، بلکہ لٹانے آئی ہوں اور“ بھی اپنی اماں کے ہاتھ کا پینا حلیم۔“ ثمن نے خٹے ہوئے اطلاع دی۔ ثمن نے ایک دفعہ پھر اسے گھور کر

”جھانسنو! وہ تمہارا اکزن اپنے اہل و عیال کے ساتھ رات کو تشریف لا رہا ہے۔“ ثمن کی بات پر اسے ہنسا سا لگا۔

”کیا واقعی؟“ اس نے خوشگوار حیرت سے پوچھا۔
”ہم سے ملنے آ رہا ہے یا تمہارے رشتے کی بات کرنے۔“ ثمن نے اس کے گلابی ہوتے چہرے کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”ابھی تو حالات کا جائزہ لینے آ رہا ہے۔“ ثمن نے اپنی پلیٹ میں بے تکلفی سے چاول نکالتے ہوئے بتایا۔

”صبر کرو، سکون سے کھا لیتا، اپنا منہ جلاؤ گی کیا۔“ ثمن نے اسے گرم گرم چاول کھاتے دیکھ کر ٹوکا۔
”جو مزہ گرم گرم چیز کھانے میں ہے وہ ٹھنڈے میں کھاں؟“ ثمن نے غلٹ بھرے انداز سے کھاتے ہوئے اپنا نظریہ بتایا۔ اس سے پہلے کہ ثمن اس کی بات کا کوئی جواب دیتی، داخلی دروازے کی تیل نے دونوں کو اپنی طرف متوجہ کیا۔

”اس وقت کون آیا ہوا۔“ تم دروازہ بند کر کے آئی تھیں کیا؟“ ثمن صحن میں نکل آئی۔ ثمن نے بھی اس کی پیروی کی۔

”کون ہے؟“ ثمن نے دروازے کے پاس پہنچ کر مٹا کر آواز میں پوچھا۔
”دروازہ کھولو، میں ہوں۔“ ایک انتہائی ماؤس آواز نے ثمن کو اور ثمن نے دونوں کو سواٹ کا جھٹکا دیا۔

”یہ فوراً“ ہی بڑی بے تابی کے ساتھ دروازہ کھولا۔ سانسے کھڑے شبیر کو دیکھ کر ثمن نالہ کھانک رہا تھا۔ جب کہ ثمن کے ہاتھ سے چاولوں کی پلیٹ چوٹ کر زمین پر جا گری۔ چاول اور مٹر کے دانے پورے صحن میں پھیل گئے۔ وہ دونوں خوشی اور بے بسی سے سانسے کھڑے شبیر کو دیکھ رہی تھیں۔

”کیونہ کے ایلا! کچھ دن سے دل کچھ پریشان سا

ہے۔“ جیلہ مائی کے منہ سے نکلنے والی اس غیر متوقع بات نے اللہ ونا کو حیران کیا۔ وہ دونوں اس وقت لان میں بنے بیچ پر بیٹھے تھے۔

”کیا ہوا ایسے کیوں دیکھ رہے ہو؟“ جیلہ مائی کو اپنے میاں کی حیرت نے حیران کیا۔

”اصل میں تیرے منہ سے ایسی باتیں بہت کم نکلتی ہیں نا، تو تو اپنے سارے دکھ سکھ اللہ موسیٰ سے کرنے کی عادی ہے نا، اس لیے حیران ہو گیا۔“ اللہ دانے ان کی تسلی کے لیے تفصیل سے جواب دیا۔

”ہاں مگر کبھی کبھی دل چاہتا ہے نا کہ اللہ کے بندوں سے بھی دل کا حال احوال کہا جائے۔“ جیلہ مائی اداسی سے مسکرائیں۔

”اللہ کے بندے کہاں اس قابل کہ ان سے دل کی باتیں کی جائیں۔ ان کے دل بڑے چھوٹے ہوتے ہیں۔ آپ کے دکھ سکھ کے سانسے تو بن جاتے ہیں لیکن کسی نہ کسی ویلے جتا بھی دیتے ہیں کہ ہم نے تمہارا اوکھے ویلے میں کتنا ساتھ دیا۔ اس لیے اللہ کی باتیں اللہ کے ساتھ ہی جیتی ہیں۔“ اللہ دانہ اتنا حق پتا نہیں کہاں سے بھروا لائے تھے۔ اب بے تکلفی سے بیٹھے کس کس لگا رہے تھے۔

”اب بندہ کیا اپنے مجازی خدا کے ساتھ بھی دل کی باتیں نہ کرے۔“ جیلہ مائی کو اپنے میاں کی بات اچھی نہیں لگی۔ اس لیے ہلکی سی ناراضی ان کے لہجے میں در آئی۔

”یہ مجازی خدا تو زیادہ خطرناک ہوتا ہے۔ اس لیے کہ جو عورت اس کے نکاح میں آ جاتی ہے وہ اس پر اپنے رب سے زیادہ حق سمجھنے لگتا ہے۔ اسے ”مجازی“ کا لفظ بھول جاتا ہے، صرف ”خدا“ یاد رہ جاتا ہے۔ اس لیے یاد رکھ یہ میاں بیوی کا رشتہ جتنا مضبوط ہوتا ہے اس سے زیادہ نازک ہوتا ہے۔ مرد کا جب دماغ خراب ہوتا ہے تو وہ فوراً اس حق کو استعمال کرنے کی دھمکی دیتا ہے جو اللہ کے نزدیک حلال ہونے کے باوجود سب سے ناپسندیدہ ہے۔“ اللہ دانہ اٹھارہ آج بڑے ترنگ میں تھے۔ جیلہ مائی کے چہرے پر پھیلتے

ناگاری کے رنگ انہیں بہت اچھے لگ رہے تھے۔ وہ جان بوجھ کر انہیں پھینک رہے تھے اور اس کو شش میں کامیاب بھی ہو گئے۔

”اچھا یہ بتا کہ لاڈلانی کیسی ہے؟ ڈاکٹر نے اس کو ورزش کروائی۔“ اللہ دانا کو اچانک یاد آیا۔

”ہاں کروائی ہے، اب تھک کے سو گئی ہے۔“

جیلہ مائی کے لہجے میں دلی ادا سی تھی۔

”پھر یہ بتا کہ او اس کیوں ہے؟“ اللہ دتے نے اپنا حقہ ایک سائیڈ پر کر کے دونوں ٹانگیں اوپر کیں اور اُلٹی بات مار کر تیج پر بیٹھ گئے۔

”بہت عجیب سا خواب دیکھا میں نے دوپہر میں۔“ جیلہ مائی کی آنکھیں نم ہوئیں تو وہ چونک گئے۔

”میں نے دیکھا کہ ہم اپنے پنڈوالہ گھر میں لیکن ہمارے ساتھ سیکنہ نہیں ہے۔“ جیلہ مائی کے چہرے پر ریشانی واضح تھی۔

”پھر یہ؟“ اللہ دتے کی رنگت بھی ایک لمحے کو متغیر ہوئی لیکن انہوں نے خود کو سنبھال لیا۔

”اس کے بعد میں نے اپنے پنڈوالہ گھر میں نکلے بچے پھلتے دیکھے، ایک بڑوسن نے مجھ سے حیرانی سے پوچھا، ”جیلہ یہ بال (بچے) کس کے ہیں؟ اس سے پہلے کہ میں کوئی جواب دیتی، تو نے باہر نکل کر کہا، ہمارے پتر کی اولاد ہے تو ہمارے پوتے پوتیاں ہوئے نا۔“ جیلہ مائی نے ابھرنے کے بعد انداز سے اپنا خواب سنا۔ اللہ دانا ان کا خواب سن کر کچھ لمحے کو بالکل چپ ہو گئے۔

”فکر نہ کر، سیکنہ کی ماں! دن کے خواب کہاں سے ہوتے ہیں۔“ انہوں نے لا روایتی سے کہہ کر حقہ اٹھایا۔ آگ سرد ہو چکی تھی لیکن وہ بے خیالی میں پھونٹیں مارے جا رہے تھے۔

”ہوں۔“ جیلہ مائی نے بھی غائب دماغی سے سر ہلا دیا۔

”دیکھ سیکنہ کی ماں! یہ جو مومن کی دعا ہوتی ہے نا“ اس میں بڑا زور اور بڑی طاقت ہوتی ہے جب دل کی

گہرائیوں سے اللہ پاک پر پورا یقین رکھ کر کی جائے یہی دعا تقدیر کے آگے آن گھڑی ہوتی ہے۔ سہارا سچا رہے اپنے پیارے بندے کی اس اوپر فرماں ہو گا۔ بس تو بھی دعا کی سنجی کو پکڑ لے۔ سوچ لے سارے نالے اسی سنجی سے کھلتے ہیں۔ اللہ پاک کرم کرے گا۔“

اللہ دتے کی بات سے جیلہ مائی کو تھوڑا سا مطمئن ہوا۔

”عائشہ! سیکنہ کا میسج آیا ہے، وہ ہم دونوں سے ملنا چاہتی ہے۔ اس کا آپریشن ہے۔“ موصد نے اس دن عائشہ کو باہر نکلتے ہوئے دیکھ کر روکا۔ وہ چونک کر رنگ کے سلسلے میں کسی میٹنگ میں جا رہی تھی۔ اس کی بات پر چونک گئی۔

”سیکنہ کا آپریشن؟ کب ہے؟“ اس نے اظہار پر جتنے موصد کو دیکھا۔ جو خاصا کمزور کمزور سا دکھائی دے رہا تھا۔ اس کی آنکھوں کے نیچے چند ہی دنوں میں سیاہ حلقے بن گئے تھے۔ عائشہ کو ڈھیروں تاسف نے کان گھیرا۔

”آپریشن پر سوں ہے۔“ موصد کی اطلاع پر چونکی۔

”پھر کب جانا ہے؟“ اس نے فوراً ہی سوالیہ نگاہوں سے دیکھا۔

”جب بھی تمہیں فراغت ہو۔“ موصد نے گیند اس کے کورٹ میں پھینکی۔

”میں تو ابھی بھی جلنے کو تیار ہوں۔“

”پھر ابھی حلے چلتے ہیں۔“ موصد کی بات پر اس نے فوراً ہی گاڑی کی چابی اٹھائی اور موصد کے خاص ملازم کو بلائے چلی گئی جو ایسے موقعوں پر اس کے ساتھ ہوتا تھا۔

وہ دونوں جب اسپتال کی حدود میں داخل ہوئے تو شام کا وقت تھا۔ سورج ڈوبنے کی تیاریوں میں تھا۔ کازر درنگ عجیب سے انداز میں آسمان پر کھلا ملا سا لگا

رہا تھا۔ عائشہ، موصد کی دھمیل چیر کو دھکیلتی ہوئی اس پر ایسٹ وارڈ کی جانب آئی گئی۔ سیکنہ کے دروازے کو اس نے ہلکا سا بجایا۔ دروازہ کھلا گیا۔ موصد کی گود میں پھولوں کا ایک بڑا سا گلدستہ تھا جو دونوں ہنسنے لگی تھیں۔ سیکنہ کے لیے لائے تھے۔ ان دونوں کو دیکھ کر اس کمرے کے کینوں کے چروں پر چلنے والی حیرانی بہت دلچسپ تھی۔

”سیکنہ! ملانے تمہارے لیے بہت سی دعائیں اور پیر بھیجا ہے۔“ عائشہ نے بڑے خلوص اور محبت سے اس کا ہاتھ تھام کر کہا تو سیکنہ جھپٹ سی گئی۔

اللہ دانا اور حاجی ان کے لیے چائے لینے یٹین کی طرف بڑھ گئے۔

”میری دعا ہے سیکنہ! تم ایک دن ضرور زمین کو اپنے قدموں کے ساتھ محسوس کرو۔“ موصد کے لہجے میں پیچیدگی تھی۔ جیلہ مائی کو بے چین کر گئی۔

”پترا! اللہ پاک ان شاء اللہ تجھے بھی وہ دیلا ضرور دکھائے گا۔ بس اللہ سوہنے سے اچھی امید رکھ۔“

”بس اتنی! آپ میرے بھائی کے لیے بھی دعا کیجئے گا۔“ عائشہ کی بات پر جیلہ مائی مسکرائیں۔

”پھر میں آپ کو اور سیکنہ کو اپنے بھائی کی شادی پر بھی بلاؤں۔“ عائشہ کی اپنائیت جیلہ مائی کو بہت اچھی لگی۔

”بھائی کی کہیں منگنی شمنگنی کی ہے بیٹا!“ جیلہ مائی نے سوال کیا۔

”جی ہاں! مجھیں کہہ دی گئی ہے۔“ عائشہ کے منہ سے انداز پر موصد کے چہرے پر بڑا تاریک سا سایہ پڑا۔ وہ سیکنہ کے انداز سے مسکرایا۔ وہ اور سیکنہ باہر غامض تھے۔

”اللہ پاک قسمت اچھی کرے۔“ جیلہ مائی نے اس کے ہاتھ پر ہاتھ رکھا۔

”آپ لوگ یہاں کب سے ہیں؟“ عائشہ نے پراپرٹیٹ روم کو توصیفی نگاہوں سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”ہمارا ایسی ایسی اوقات کہاں! یہ تو اللہ پاک نے

کرم کیا اور ڈاکٹر خاور کی مہربانی ہے جو رہنے کو چھت ملی ہوئی ہے اور میری سیکنہ کا مفت علاج ہو رہا ہے۔“ جیلہ مائی کی بات پر موصد چونکا۔

”یہ ڈاکٹر خاور کی دلی ہی ہیں نا جو اسپتال سرجن ہیں اور ایک کلینک میں بھی شام کو بیٹھتے ہیں۔“ موصد نے غلٹ بھرے انداز میں پوچھا تو جیلہ مائی ساواگی سے بولیں۔

”پتر مجھے یہ تو نہیں بتا کہ انہوں نے کیا کیا ہے بس بڑے بڑے آپریشن کرتے ہیں اور غریب مریضوں کا مفت علاج کرتے ہیں۔“

”جی جی وہ دلی اسپتال سرجن ہیں۔“ سیکنہ نے امل کو ہلکا سا گھورتے ہوئے جواب دیا۔ جب کہ امل ایک دفعہ پھر اپنی سادہ لوحی کے ہاتھوں مجبور ہو کر انہیں سیکنہ کی بیماری کی ساری داستان سنانا شروع ہو گئی تھیں۔ سیکنہ کی کھوپریاں بے اثر تھیں۔

”یسا ہے ڈاکٹر تو پترا! سیکنہ کی ڈائٹ سے ساری سولڈ چیزیں آج سے بند کر دیں۔“ کوئی بہت تیزی سے اندر آیا۔ اسے دیکھ کر عائشہ کو کرنٹ سا لگا جب کہ وہ اپنی روایتی میں سیدھا اس اسپینڈ کی طرف بڑھا جہاں سیکنہ کی فائلیں اور رپورٹس پڑی ہوئی تھیں۔ اس نے اندر موجود کینوں پر کوئی غور نہیں کیا۔ ویسے بھی سیکنہ کا بیڈ دیوار کی سائیڈ پر تھا اور دروازہ کھلتے ہی سامنے اسپینڈ رکھا ہوا نظر آتا تھا۔

”ڈاکٹر خاور! سیکنہ کی ساری رپورٹس آچکی ہیں۔ آپریشن کی تیاری مکمل ہے۔ باقی جو آپ کہیں۔“ ان کے عین چپچپے کھڑے ڈاکٹر نے بھی بڑے مصروف انداز میں کہا۔

”ڈاکٹر خاور۔ السلام علیکم۔“ موصد کی پرچوش آواز پر انہوں نے فائل سے سر اٹھایا اور سامنے بیٹھے موصد کی طرف بڑے دوستانہ انداز میں دیکھا۔

”ہیلو جمنٹلمین۔“ وہ فائل ایک طرف رکھ کر اب بڑی گرم جوشی کے ساتھ موصد کے ہاتھ مل رہے تھے۔ عائشہ کا سارا وجود زلزلوں کی زد میں آ گیا۔ وہ سخت بے یقینی سے اپنے سامنے کھڑے شخص کو دیکھ رہی

تھی۔

”ان سے ملیں یہ میری سسرہیں عاتشہ بہت اچھی مصورہ ہیں۔“ موحّد کی بات پر وہ مڑے۔ انہیں جھٹکا سا لگا۔ ان کی آنکھوں میں پھیلتی جیرانی اس بات کی گواہ تھی کہ وہ اس بات سے پہلے سے باخبر نہیں تھے۔

”السلام علیکم! مجھے ڈاکٹر خاور علی کہتے ہیں۔ میرے بابا کو علی نام بہت پسند تھا۔ اس لیے وہ مجھے اسی نام سے پکارتے تھے۔“ انہوں نے سر کو ہلکا سا خم دے کر سلام کرتے ہوئے بڑے ذومعنی انداز سے حتایا۔

”عاتشہ! یہ ڈاکٹر خاور علی ہیں بہن کاشیں اور ماں اکثر گھر میں ذکر کرتے ہیں۔“ موحّد کے لہجے کی خوشی اس بات کی گواہ تھی کہ اسے اس اچانک ملاقات سے خوشی ہوئی ہے۔

”بھائی! میں ڈاکٹر خاور کو بہت اچھی طرح جانتی ہوں۔“ عاتشہ کے شرارت بھرے انداز پر ڈاکٹر خاور نے بوکھلا کر اسے دیکھا۔ جس کی آنکھوں میں شوخی کسی روشن ستارے کی طرح جگمگا رہی تھی۔ جب کہ ڈاکٹر خاور کے چہرے پر واضح گہرا ہٹ کے آثار تھے۔

”وہ کیسے؟“ موحّد نے جیرانی سے دریافت کیا۔ جب کہ عاتشہ اب کھل کر مسکرائی۔ سیکنہ نے ابھن بھرے انداز سے پہلے عاتشہ اور پھر ڈاکٹر خاور کو دیکھا۔ وہ ایک دم ہی بے چین ہو گئی تھی۔ اس کا دل نہ جانے کیوں ایک نئی داستان اسے سناتے لگا تھا۔

”کیا مصیبت ہے یہاں تک آگئی ہو تو اندر کیوں نہیں جا رہی ہو۔“ ثانیہ نے کنیال مار مار کر ثنائہ کی کر زخمی کر دی۔

”اب تم نے ایک دفعہ بھی اور مجھے کہنی ماری تو میں تمہاری بیٹی توڑ دوں گی۔“ موحّد کے آفس کی طرف جاتے ہوئے ثنائہ نے منہ پر ہاتھ پھیر کر اسے دھمکی دی۔

”تم بھی یہ فلمی ہیروئینوں کی طرح لمبے لمبے سانس لینا بند کرو اور شرافت سے اپنے ہیرو کے کمرے میں

چلو، غضب خدا کا ایک تو نیا جو تاکاٹ رہا ہے اور ہے تمہاری مصنوعی ادا میں دماغ خراب کر رہی ہیں۔“ ثانیہ نے وہیں کا ریڈیو میں کھڑے کھڑے اس کی ٹھاس لی تو وہ اسے مھورتی ہوئی موحّد کے آفس کی طرف بڑھ گئی۔

”اب کیا تمہارے قدموں کے نیچے اہلقلی لگ گئی ہے۔“ اسے دروازے کے پاس جم کر کھڑے دیکھ کر ثانیہ چب گئی۔

”کاش اہلقلی اس وقت میرے پاس ہوتی تو میں کم از کم تمہارے ہونٹوں پر ضرور چپکا دیتی۔“ ثنائہ غصے سے کچھ اونچائی بول گئی۔

”کم ان۔۔۔“ اندر سے آنے والی رعب دار آواز نے دونوں کو ہی بوکھلادیا۔

”السلام علیکم! میں ثانیہ ہوں، ثنائہ کی سیسٹ فرینڈ۔“ ثانیہ نے دروازے سے جھانک کر شوخی سے کہا۔

”میں سکندر شاہ ہوں، ثنائہ کی کمانی کا ہیرو۔“ دوسری جانب سے بھی شرارت کا مظاہرہ ہوا۔

”تھینکس گاڈ! آپ تو اچھے خاصے شریف انسان ہیں یہ ثنائہ نے تو مجھے اچھا خاصا ڈرا دیا تھا۔“ ثانیہ کی بات پر ثنائہ نے غصے سے اسے گھورا جبکہ موحّد کے چہرے پر پھینکنے والے رنگ بہت خوب صورت تھے۔

”انہوں نے کیا بتایا تھا میرے بارے میں۔“ موحّد نے کنیال میز نکالتے ہوئے بڑی دلچسپی سے پوچھا اور ساتھ ہی دونوں کو بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

”بتا دوں ثنائہ؟“ ثانیہ نے شرارتاً ثنائہ کو دیکھا جس کا بوکھلایا ہوا چہرہ ان دونوں کو بہت لطف دے رہا تھا۔

”بوکو مت۔۔۔!“ ثنائہ نے کھا جانے والی نظروں سے اسے دیکھا۔

”دیکھ لیں بھئی! آپ بھی کچھ سوچ لیں، آپ کا حال بھی مستقبل میں میرے جیسا ہی ہوگا۔“ ثانیہ کی شرارتیں عروج پر تھیں۔ موحّد کو یہ ہلکی پھلکی چھڑ چھاڑ مزا دے رہی تھی۔ اعصاب پر چھایا ہوا بوجھ

دھڑے دھڑے سرک رہا تھا۔

”اللہ مالک ہے میرا بھئی۔“ موحّد کھل کر مسکرایا۔ ”اور یہ بتائیں چاہئے گی کیا کافی؟“

”جانے نہ کافی۔ ہم تو کھانا کھانے کے موڈ میں ہیں۔ یا کم از کم پڑا ہٹ سے گر کر گرم فریش چیز والا پڑا شوٹ لیں، رسم بہت بھوک لگی ہے۔“ ثانیہ کی بے تکلفی موحّد کو اچھی لگ رہی تھی جب کہ ثنائہ کا بس نہیں چل رہا تھا کہ اس کا بازو پکڑ کر کھینچتی ہوئی باہر نکل جائے۔

”جی ضرور۔۔۔“ موحّد نے اثر کلام اٹھا کر کسی کو ہدایت دیں۔

”اور سنائیں جی! کیسی گزر رہی ہے زندگی؟“ ثانیہ اب بے تکلفی سے اس کا انٹرویو اشارت کر چکی تھی۔ جب کہ موحّد اس سے گفتگو کرتے ہوئے کن اکھیوں سے ثنائہ کو دیکھ رہا تھا جو دونوں کی گفتگو کے دوران خاموش تھی جب کہ اس کے لبوں پر ہلکی سی مسکراہٹ تھی۔

”ایکسکیوز می! میری ایک ضروری کال آ رہی ہے۔ آپ لوگ بات کریں، میں ابھی آپ کو جوائن کرتی ہوں۔“ ثانیہ بڑی بے تکلفی سے اپنے بیگ سے سیل فون نکال کر کھڑی ہوئی اور بجلت بھرے انداز سے ان کے آفس سے نکل گئی۔

”آپ کی دوست تو خاصی سمجھ دار واقع ہوئی ہیں۔“ اس کے کمرے سے نکلتے ہی موحّد نے اسے پوچھا۔

”ہاں، خاصی سمجھ دار ہے، جب تک خاموش رہے۔“ ثنائہ نے جل کر کہا تو موحّد کے حلق سے نکلنے والا قہقہہ بڑا جان دار تھا۔

”ناراضی ختم ہو گئی آپ کی؟“ موحّد نے اسے لگا بول کے حصار میں لیتے ہوئے کہا۔

”ناراضی آپ سے ناراض تو نہیں تھی۔“ ثنائہ نے ہلکا سا ترتیب دھڑکنوں پر قابو پاتے ہوئے جواب دیا۔

”تھکے؟“ موحّد کی سوالیہ نگاہوں کے جواب میں

وہ فوراً گویا ہوئی۔

”میں ناراض نہیں، بلکہ حیران تھی کہ ایسی کون سی بات تھی جس نے آپ جیسے انسان کو اتنا ہانپ کر دیا۔“ ثنائہ کی بات نے موحّد کو حیران کیا۔

”ہو سکتا ہے کہ میری کئی بات نے تمہاری فیورٹ سائیکولوجسٹ کو مجھ سے بدظن کر دیا ہو۔“ موحّد کی بات پر ثنائہ نے تیزی سے اس کی بات کاٹی۔

”تیسرا نہیں ہو سکتا کہ آپ کی کسی بات پر ایسا ہوا ہو۔“ ثنائہ کی بات میں چھپا یقین موحّد کو تعجب میں مبتلا کر گیا۔ وہ کئی لمحوں تک بول ہی نہیں سکا۔ بس ثنائہ کو ہی دیکھتا رہا جس نے آج اسے بہت معتبر کر دیا تھا۔

”بابا! میں نے تجھے اور ماں کو بہت تنگ کیا ہے نا۔“ ”ارے نہیں پتر اولاد تو اپنے والدین کی آنکھوں کی ٹھنڈک ہوتی ہے اور ٹھنڈک تو دل کو سکون دیتی ہے۔“ جمیلہ مائی نے نوالہ منہ میں ڈالتے ہوئے سیکنہ کو محبت سے دیکھا۔

”لیکن میں نے تو ہمیشہ آپ دونوں کا دل ہی دلایا ہے۔“ سیکنہ شدید قسم کی قنوطیت کا شکار تھی۔ اس کے والدین نے چونک کر اس کا رنجیدہ چہرہ دیکھا۔

”ایسی بات نہیں کرتے میری جان۔“ جمیلہ مائی نے بے اختیار اٹھ کر اپنی بیٹی کا ماتھا چوما۔ سیکنہ کی آنکھیں نم ہو گئیں۔

”دیکھ نالال! میں تم دونوں کی اکوں اک اولاد تھی، مگر میری وجہ سے ساری زندگی بس اسپتالوں کے ہی دھکے کھائے کوئی خوشی نہیں ملی میری طرف سے۔“ سیکنہ کا لہجہ خود بخود بھٹکتا چلا گیا۔

”اچھا! یہ بتا دھی رانی! اگر اللہ ہمیں تیری صورت میں بھی اولاد کی نعمت نہ دیتا تو ہم کیا کرتے۔“ اللہ دتا نے بڑے پرسکون انداز میں پوچھا۔

”بتا نہیں بابا! اس نے سادگی سے جواب دیا۔ ”ہم دونوں کے پاس زندگی گزارنے کے لیے کوئی

مقصود نہ ہوتا۔ ہم دونوں ہی زندگی کے لگے بندھے
اصول کے تحت بس وقت گزارے جاتے ہے نا؟
اللہ دنا تمہارے سکینہ کے مضطرب انداز کو غور سے
دیکھا۔

”مجھے اللہ سے کوئی شکوہ نہیں۔ اس نے ہمیں
معذور سہی لیکن اولاد تو دی۔ اس نے ہماری زندگیوں کو
ایک محور تو دیا اور مجھے کیا پتا پڑا تو نے ہماری زندگیوں
میں کتنے خوب صورت رنگ بھرے ہیں۔ ہمیں ماں
باپ بننے کی سعادت نصیب کی ہے۔ اس لیے ایسی
باتیں نہ کیا کرتی ہوں کہ تو تکلیف ہوتی ہے۔“ اللہ دنا
کے لمحے میں محبت کی فروانی تھی۔

”چلو بھی سکینہ! شام کی واک پر چلتے ہیں۔“ سسٹر
ماریہ ایک دم ہی سسرے میں داخل ہوئی تو سب کی توجہ
اس کی جانب مبذول ہو گئی۔

”پتا ہے مجھے ڈاکٹر خاور نے بھیجا ہے کہ سکینہ کو
لے کر لان میں آؤ۔“ سسٹر ماریہ کے رازدارانہ انداز پر
سکینہ چونکی۔ وہ دونوں اس وقت کارڈیور میں تھیں اور
لان کی طرف بڑھتے ہوئے سسٹر ماریہ نے سکینہ کو
بتایا۔ ڈاکٹر خاور سامنے بیچ پر بڑے اطمینان سے بیٹھے
ان کے منتظر تھے۔

”سکینہ! او اس کیوں ہو؟“ ڈاکٹر خاور نے اس کا چہرہ
غور سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔ سسٹر ماریہ اسے چھوڑ کر
اندر جا چکی تھی۔

”آپ کو کس نے کہا کہ میں او اس ہوں۔“ اس
نے چونک کر انسا سوال کیا۔ وہ مسکرائے۔

”چہرہ شناسی کا دعوا صرف آپ کو ہی تو نہیں ہے۔
کوئی اور بھی اس ہنر میں کمال رکھ سکتا ہے۔“ ڈاکٹر
خاور کی بے تکلفی سکینہ کو حیران کر گئی۔

”بد صورت چہروں کو کون دیکھتا ہے؟“ وہ تلخ ہوئی۔

”چہرے بد صورت نہیں ہوتے، ان کو دیکھنے والی
نگاہ خوب صورت یا بد صورت ہوتی ہے۔ جو سامنے
والے منظر کو اپنے مطابق رنگ دیتی ہے۔“ ڈاکٹر خاور
سننے پر ہاتھ باندھ کر اسے غور سے دیکھ کر بولے۔ ایک
پھینکی سی مسکراہٹ سکینہ کے چہرے پر پھیلی۔

”یہ بتائیں سکینہ! اس دن عائشہ کو دیکھ کر کس
ٹینس کیوں ہوئی تھیں؟“ ڈاکٹر خاور نے کب کا کار کاہر
سوال اس سے پوچھ ہی لیا۔ جس مقصد کے لیے انہوں
نے اسے یہاں بلایا تھا۔ سکینہ نے بغور ڈاکٹر خاور کو
دیکھا۔

”یہ سوال آپ اپنے آپ سے پوچھیں۔“ اس کی
بات نے ڈاکٹر خاور کو ایک لمحے کو لوکھلا کر رکھ دیا۔
”کیا مطلب ہے آپ کا؟“ انہوں نے جاچتی
نگاہوں سے اس کا چہرہ کوجھا۔

”عائشہ بہت اچھی ہیں۔“ سکینہ کچھ لمحے چپ
رہنے کے بعد بولی تو وہ مسکرائے۔

”اس کا مطلب ہے کہ آپ کو اچھی لگیں۔“
”جو لوگ دل کے اچھے اور سچے ہوں وہ کس کو اچھے
نہیں لگتے۔“

”بہت سے لوگ ہیں دنیا میں جن کو دل کی اچھائی
اور سچائی سے کوئی سروکار نہیں ہوتا۔ وہ بس ظاہری
خوب صورتی کے پیچھے بھاگتے ہیں۔“ ڈاکٹر خاور نے
شجیدگی سے کہا۔

”لیکن آپ ایسے نہیں ہیں، مجھے پتا ہے۔“ سکینہ
کے لمحے میں یقین کا ایک سمندر تھا۔

”بہت اچھی ہو سکینہ!“ ڈاکٹر خاور اپ سامنے
والے بیچ پر بڑی فرصت سے بیٹھ گئے۔ اپنی تعریف پر
سکینہ کا چہرہ بالکل سپاٹ رہا۔ یہ بات ڈاکٹر خاور کے لیے
اچھے کا باعث بنی۔

”کیا بات ہے سکینہ کوئی ناراضی ہے کیا؟“
”مجھے ناراضی کا کوئی حق نہیں ہے ڈاکٹر صاحب!“
اس کا لہجہ بڑا عجیب سا ہوا۔

”دیکھو سکینہ! آج تو یہ بات کروی، لیکن آج کے
بعد ایسی کوئی بات نہیں کرنی۔“ اُدکے۔“ انہوں نے
ایک دم کھڑے ہوتے ہوئے ہلکی سی برہمی سے کہا۔
سکینہ کے چہرے کی رنگت متغیر ہوئی۔ پارکنگ میں
کھڑی ڈاکٹر زویا نے یہ منظر بہت شغور سے دیکھا۔



”بھابھی! آپ ایک دفعہ مجھے بتائیں تو سی ہمارے

کر اپنے بھائی کو دیکھنے آجاتی۔“ ثنائکہ کی والدہ کے
آنسو کی صورت نہیں ٹھہم رہے تھے، جب سے
انہوں نے اپنے بھائی کے انتقال کی خبر سنی تھی۔ وہ اس
وقت اپنے بیٹے راس کے ساتھ ثنائکہ کے کمر میں
موجود تھیں۔

”ہاں کیا بتاتی، میرے اوپر تو خود غموں کا ایک طوفان
لوٹ پڑا تھا۔ ایک تو پردیس اور اوپر سے اتنی محبت
کرنے والے شریک حیات کی جدائی نے مجھے تو نیم
اگل سا کر دیا۔“ وہ بہت محبت سے اپنی منہ کا ہاتھ پکڑ
کر ساری تفصیل بتاتی گئیں۔

”پاکستان آنے کے بعد میں نے سوچا کہ آپ کے
حصے کی رقم پہلی فرصت میں آپ تک پہنچا دوں۔ اس
کے بعد خود بیمار ہو گئی۔ اس لیے ویل صاحب کو بھجوا
دیا۔“ ان کی بات پر بالکل چپ بیٹھے شیر نے بے چینی
سے ہلایا۔

”یہ تو اچھا خاصا پنڈ سم بندھ ہے، لیکن پتا نہیں
کیوں مجھے ایسا لگتا ہے کہ میں نے اسے کہیں دیکھا
ہے۔“ کچن میں ان لوگوں کے لیے کھانا تیار کرنی ثنائکہ
نے اپنی آنکھیں نابیہ سے بیان کی۔ جو راس کی والدہ کی
آہ کا سنتی ہی نورانی تیر کی طرح آن پہنچی تھی۔

”دیکھو اب تم اپنے سکندر شاہ کی طرف ہی دھیان
دلاؤ، کئی ضرورت نہیں اس پر بری نظر ڈالنے کی۔“ نابیہ
نے سلا کے لیے کھیرے کاٹتے ہوئے اسے شرارت
سے جواب دیا۔

”جب بھی بات کرنا، کوئی نہ کوئی ہو گی ہی مارنا۔“
اس نے کباب تلنے ہوئے جل کر جواب دیا تو نابیہ
کھلکھلا کر گئی۔

”ایک گلاس پانی مل جائے گا۔“ شیر کے سپاٹ
انداز پر وہ دونوں چونکیں۔ وہ نہ جانے کب کچن کے
دروازے میں آن کھڑا ہوا تھا۔ ثنائکہ نے فوراً ”فرق تیر
سے بڑا نکال کر اس کی طرف بڑھائی۔ جسے لے کر وہ
اندر کی جانب بڑھ گیا۔

”یہ تمہارے بھائی کے منہ پر کیوں ساڑھے بارہ
بیسے ہوئے ہیں۔ جب سے آیا ہے، ایسے ہی کھا جانے

والی نگاہوں سے دیکھ رہا ہے۔“ نابیہ نے ہلکے ہلکے
انداز میں جتایا تو ایک تاریک ساسیہ ثنائکہ کے چہرے
پر پھیلنا۔

”ہاں! اسے سخت غصہ ہے کہ ہم نے ماموں سے
رابطے کی بات اس سے کیوں چھپائی اور یہ کہ پیسے گھر کی
مرمت پر کیوں ضائع کیے۔“ ثنائکہ کی بات پر نابیہ کو
جھٹکا لگا۔

”دماغ ٹھیک ہے تمہارے بھائی کا، خود تو کویت جا کر
بیٹھ گیا اور تم لوگوں کو اس کھنڈر جیسے گھر میں چھوڑ کر
دوبارہ مگر نہیں پوچھا۔“ نابیہ سلا دینا بھول گئی۔

”اسے غصہ ہے کہ اگر وہ پیسے اسے مل جاتے تو وہ
پاکستان آکر کوئی بزنس کر لیتا۔“ ثنائکہ نے ہاتھ دھوئے
ہوئے طنز یہ لہجے میں بتایا۔

”ہو نہہ! اب اس کی مطلبی اور خود غرض بیگم اسے
چھوڑ کر حل جی گئی تو اسے پاکستان کی یاد آگئی۔“ نابیہ کا لہجہ
زہر آلود ہوا۔

”خواتین! آج کی تاریخ میں کھانا مل جائے گا۔“
راس کے خوشگوار انداز پر وہ دونوں چونکیں۔ نابیہ
کے ہاتھ میں پکڑا کھیرا چھوٹ کر زمین پر جا کر۔ جب
کہ اپنے دوپٹے سے ہاتھ صاف کرتی ثنائکہ مسکرا دی۔
”بھئی! میں تو اپنے حصے کا کام نبھا چکی ہوں، یہ
دوسری پائی ہی اتنی ست ہے تو کیا کیا جائے۔“ ثنائکہ
نے شرارت سے نابیہ کی طرف اشارہ کیا جو اس حملے پر
گڑبڑاسی گئی۔

”اوہو تو یہ مسئلہ ہے۔“ راس دونوں بازو اپنے
سینے پر جاکر اب بڑی گہری نگاہوں سے نابیہ کو دیکھ رہا
تھا۔ اس کی نگاہوں کی پیش سے نابیہ کے رخسار سرخ
ہوئے۔

”اس کا مطلب ہے کہ مجھے اپنے مستقبل کے
بارے میں کچھ سوچنا چاہیے۔“ راس کا معنی خیز
انداز نابیہ کے ہاتھ پیر پھلایا۔

”پانی داؤے راس صاحب! آپ اگر کسی
انکیشن ٹیم کے میڈ کی طرح ہمارے سروں پر سوار
رہے تو آج کاؤنر آپ کو کل ہی ملے گا۔“ ثنائکہ نے

اسے مصنوعی خلقی سے گھورا تو وہ اپنے بالوں میں ہاتھ پھیر کر رہ گیا۔
 ”کتنی ظالم دنیا ہے۔ ان کا بس بھی ہم جیسے غریبوں پر ہی چلتا ہے۔“ اس نے فرضی دکھ کے زیر اثر ایک لمبی آہ بھری۔ ”حالانکہ بندہ پوچھے کہ میں نے کہا کیا ہے۔“ راس کی شوخی عروج پر تھی۔ وہ مسلسل تابیہ پر نظریں جمائے اسے زبردست کر رہا تھا۔
 ”بھئی! یہ جو آپ ظالم نظروں کے وار کر رہے ہیں نا عوام الناس پر، اس کی وجہ سے ہمارا مسلاہ خاصا لٹ ہو رہا ہے۔“ ثنائیہ نے بڑی صفائی سے چھری تابیہ کے ہاتھ سے پکڑ لی۔
 ”اُدھر دیکھیں! کس طرح انگلیاں نہ کاٹ بیٹھنا، آج کل تو بے بھی رشتوں کا بڑا مسئلہ ہے بغیر انگلیوں والی لڑکی کو کون اپنائے گا۔“ ثنائیہ نے ہنسنے ہوئے تابیہ کو چھیڑا۔
 ”کچھ لوگ بڑے دل جگرے والے ہوتے ہیں۔ وہ گوئی، بھری، اندھی کافی حتیٰ کہ خاصی زبان ورا زلڑکیوں کو بھی اپنانے کے لیے تیار ہو جاتے ہیں۔“ راس کی بات پر ثنائیہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ جبکہ تابیہ نے اسے گھور کر دیکھا جس کی زبان والی کے جوہر آج کھل کر سامنے آ رہے تھے۔

”مجھے تو پہلی دفعہ احساس ہوا کہ آپ دوسروں سے بدلہ لینے کی بھرپور صلاحیت رکھتی ہیں۔“ ڈاکٹر خاور علی نے آج پھر اسے پارک میں پکڑ لیا تھا۔ وہ چوبیس تنگ بنانے کے لیے اپنا کیونو سیٹ کر رہی تھی ان کی بات سمجھ کر مسکرا دی۔ اسے بخوبی اندازہ تھا کہ ان کا اشارہ اس دن والی ملاقات کی طرف تھا جہاں عائشہ نے ان کے جھکے چھڑا دیے تھے۔

”بلیو می“ میں نے ایسا جان بوجھ کر نہیں کیا، بس ایسے ہی زبان پھسل گئی۔ ”عائشہ نے مسکراتے ہوئے انہیں یقین دلایا۔ گھرے سبز رنگ میں وہ اس خوب صورت صبح کا ایک دلکش اور دلفریب سارنگ لگ رہی

تھی۔

”آپ کی زبان نے تو جھپٹتا“ میرے جھکے اڑا دیے، مجھے تو موجد کا ڈر تھا کہ وہ کیا سوچے گا۔“ ڈاکٹر خاور نے خوشگوار انداز میں بتایا تو وہ ہنس دی۔
 ”میرا بھائی ماشاء اللہ بہت اچھا ہے، وہ ایسی فضول باتوں پر دھیان نہیں دیتا۔“ عائشہ کے لہجے میں یقین تھا۔

”پھر بھی ایک دفعہ تو آپ نے میرے حواس ہی م کر دیے۔“ وہ بے تکلفی سے بتاتے ہوئے سامنے رکھے بڑے سے پتھر بیٹھ گئے۔

”آپ نے مجھے بتایا کیوں نہیں کہ آپ ڈاکٹر ہیں؟“ اس نے گھر کیا۔

”آپ نے کبھی پوچھا ہی نہیں۔“ انہوں نے سادگی سے جواب دیا۔

”میری سمجھ میں نہیں آتا کہ آپ اپنے اتنے بڑی شیڈول سے اتنا ٹائم نکال کر ایگزیشن وغیرہ میں کیے چلے آتے تھے۔“ عائشہ بھی ان کے مقابل ایک پتھر پر آن بیٹھی۔

”بھئی، جس چیز کا انسان کو شوق ہو، وہ اس کے لیے ٹائم کیس نہ کہیں سے نکال ہی لیتا ہے۔“ خاور علی نے اسے بغور دیکھتے ہوئے جواب دیا۔

”ٹھیک کہتے ہیں۔“ عائشہ مسکرائی۔ ”یہ راس کہاں بڑی ہے آج کل۔“ اسے اچانک ہی یاد آیا۔

”وہ آج کل ماما کا رات پینڈ بنا ہوا ہے۔ ان کے کاموں کو جہٹا رہا ہے۔“

ڈاکٹر خاور کی بات پر وہ جو کل۔ ”کیسے کام۔“

”بھئی۔ میرے گئے کسی اچھی سی لڑکی کی تلاش میں ہیں دونوں۔“ خاور کی بات پر عائشہ کا دل بے چین انداز سے دھڑکا۔ اس نے جھکے سے سر اٹھا کر خاور کی

کو دیکھا۔ ”کوئی اچھی لڑکی ہو نظر میں تو بتائیے گا۔“ خاور نے

چھیڑنے پر وہ بڑی طرح تی۔

”ہاں ہے۔“ اس نے بڑی سرعت سے کہا۔ ”کون۔“ خاور نے اس کا تپا سا چوہا دیکھ

سے دیکھا۔

”آپ کی دوست ماہم۔“ وہ اب غصے سے اپنے بیگ سے رنگ اور برش نکالنے لگی۔

”ہوں۔ ماہم بھی اچھی جوانس ہے۔“ ڈاکٹر خاور کی آنکھوں میں شرارت رقصاں تھی۔ جب کہ عائشہ کے چہرے پر ناراضی تھی۔

”وہ بے پانی داؤد! آپ کی ماہم سے کوئی ناراضی چل رہی ہے کیا؟“ انہوں نے ایک دم ہی پوچھا۔

”نہیں تو۔ آپ کو کس نے کہا؟“ اس نے چونک کر خاور کا سنجیدہ چہرہ دیکھا۔

”مجھے ایسا لگا۔ اللہ جانے کیوں۔“ وہ تھوڑا سا الجھے۔

”کیسا لگا تھا۔؟“ وہ ساری ناراضی بھول بھال کر ان کے قریب آ کر کھڑی ہو گئی۔ خاور علی اس کے اس انداز پر مسکرا دیے۔ وہ اب دل ہی دل میں سوچ رہے تھے کہ عائشہ کو کس طرح ٹالنا ہے کہ اس کو برا بھی نہ لگے۔

”ماما! ہائیت دیکھی ہے آپ نے اس بندے کی؟“ میرے کندھوں تک بھی بھٹک ائے گا۔“ ماہم نے بے زاری سے ہاتھ میں پڑی تصویر صوفے پر اچھالی اور زبردستی وی کی طرف متوجہ ہوئی جہاں ثمن آپی کا مارننگ نشتر مگر آ رہا تھا۔

”بزنس کی دنیا میں ایک نام ہے اس کا می اے کیا ہوا ہے۔ کروڑوں کی جائیداد کا تباہ وارث ہے۔“ مسز منصور نے اسے اس پروپونل کی خصوصیات بتائیں جو ان کی نظر میں خاصی پرکشش تھیں۔

”ماما! کیا فائدہ۔“ وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔ چہرے پر دنیا بھری بے زاری اور کوفت تھی۔ ”جب ایک بندہ آپ کے ساتھ چلتا ہو، ای اچھا نہیں لگ رہا تو ایسی

دونوں کی جائیداد کو چاہنا ہے کیا۔“ اسے غصہ ہی آیا۔

”پھر مسز گیلانی کے بیٹے میں کیا برائی تھی؟ اچھا خاصا

چھوٹا سا بچہ تھا۔“

”ہاں! داغ ٹھیک ہے شہیر کا۔ آخر وہ کس منہ سے

چھوٹا سا بچہ تھا۔“ ان کو اس کا ایک اور مسٹر کیا پروپونل عین وقت پر یاد آیا۔

”رنگ دیکھا تھا آپ نے مسز گیلانی کے بیٹے کا۔“

ماہم سلگ کر بولی۔ ”بلیک پینٹ کوٹ میں پتا ہی نہیں چل رہا تھا کہ کہاں سے شروع ہو رہا ہے اور کہاں ختم۔“ اس کے کھل کر مذاق اڑانے پر مسز منصور نے

تاسف سے اسے دیکھا۔

”ماہم! کچھ خدا کا خوف کرو“ اچھی خاصی گندی رنگت تھی اس کی، جیسے ستر فیصد ہمارے ملک کے مردوں کی ہوتی ہے۔“

”رہے دیں ماما! آپ کو تو ہر راہ چلنا لڑکا پسند آ جاتا ہے اپنی بیٹیوں کے لیے۔“ ماہم نے نظریہ نگاہوں سے انہیں دیکھا۔

”پھر اس کا ایک ہی حل ہے میرے پاس۔“ وہ تپ کر کھڑی ہوئیں۔

”وہ کیا۔“ ”کی وی اسکرین پر نظریں جمائے بیٹھی

ماہم نے بے زاری سے ماما کو دیکھا جس پر آج کل ماہم کی شاہی کروانے کا بھوت سوار تھا۔

”تم اللہ سے کہہ کر خاص طور پر ہی اپنے لیے کوئی لڑکا تیار کرو، ورنہ جیسی تمہاری ڈیمانڈ ہے۔ کوئی نہیں

کئے والے۔“ ماما شعلہ پر سائی نگاہوں سے اسے دیکھتے ہوئے کمرے سے نکل گئیں اور ماہم لاپرواہی سے اپنے

کندھے جھٹک کر دوبارہ وی کی طرف متوجہ ہو گئی۔

”یہ ثمن آپی بھی اپنے شو میں کبھی ضرورت سے زیادہ ہی اوور ہو جاتی ہیں۔“ اس نے کوفت سے

چہین بدلا جہاں کوئی فیشن شو آ رہا تھا۔ وہ کچھ دیر پہلے کی کوفت بھلائے دلچسپی سے وی دیکھنے لگی۔ جب

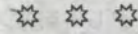
سیل فون کی متر غم نہی تھنی نے اسے اپنی طرف متوجہ کیا۔ سامنے ”علی کانگ“ کے الفاظ بڑھ کر اسے اپنی

ساری ناراضی یاد آئی۔ اس نے بہت غصے سے اس کی کال کاٹ دی اور صوفے کے ساتھ ٹیک لگا کر بیٹھ گئی۔

اس کا سارا ذہن ایک لمحے میں عارت ہو گیا۔

آپ سے تائبہ کے رشتے کے لیے کہہ رہا ہے۔ ”ثنا نملہ کا دل بھک کر کے اڑا۔ جب اس نے اپنی والدہ کے منہ سے صبح صبح یہ عجیب بات سنی۔
 ”وہ تو تم ٹھیک کہہ رہی ہو بیٹا! مسز زبیر نے دانستہ لگاؤں چراتے ہوئے کہا۔ ”لیکن اس کی ضد ہے کہ میں اس کا رشتہ مانگنے جاؤں ورنہ وہ واپس کویت چلا جائے گا۔“ انہوں نے اپنی مجبوری بیان کی تو ثنا نملہ کو ٹھیک ٹھاک قسم کاغصہ آگیا۔
 ”جانا ہے تو ہزار دفعہ جائے ہمیں بلیک میل کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ پہلے بھی وہ ہماری مرضی کے بغیر ہی گیا تھا۔ جو کچھ اس نے کیا اپنی سالیوں کی شادیوں پر لگایا۔“ ثنا نملہ نے غصے سے ہاتھ میں پکڑا چائے کا کپ میز پر پٹا۔ تھوڑی سی چائے چھلک کر سفید میز پوش پر داغ ڈال گئی۔
 ”پھر مجھے بتاؤ میں کیا کروں۔“ ان کے بے بس انداز پر ثنا نملہ کا سارا غصہ بھک کر کے اڑا۔ وہ تھوڑا نرم انداز میں بولی۔
 ”دیکھیں ای! ثنا نملہ کے گھر والوں سے ہمارے بہت اچھے تعلقات ہیں۔ وہ ہمارے دکھ سکھ کے ساتھی ہیں۔ آپ خود سوچیں کہ وہ اپنی اچھی خاصی بیٹی کا رشتہ کیوں شیر کو دیں گے۔ جس کے بارے میں سب کو بتا ہے کہ وہ ایک شادی کر چکا ہے۔“
 ”لیکن بیٹا! بات کرنے میں تو کوئی ہرج نہیں۔ شیر مطمئن ہو جائے گا۔“ امی کی بات پر ایک مسکراہٹ ثنا نملہ کے لبوں پر ابھری۔
 ”ہو نہ! اپنے بیٹے کو مطمئن کرنے کے لیے آپ دوسروں کا سکون غارت کریں گی؟“ وہ خود کو بولنے سے روک نہ پائی۔
 ”کیا کروں! اپنے بیٹے کی محبت کے ہاتھوں مجبور ہوں۔“ وہ رنجیدگی سے بولیں۔
 ”تائبہ کے گھر کے علاوہ کوئی ایسا گھر نہیں جو مشکل وقت میں ہمارے کام آسکے۔ ایسا نہ ہو بیٹے کی محبت کے ہاتھوں مجبور ہو کر آپ اپنے تعلقات خراب کر بیٹھیں۔“ ثنا نملہ نے ان کو تصویر کا دوسرا رخ دکھایا۔

جب کہ اس سے زیادہ سنا شیر کی برواشت سے باہر تھا۔ وہ جو سمجھ رہی تھی کہ وہ کبھی شہد میں ہے اسے پتا ہی نہیں چلا کہ وہ کب اس کے سر پر آن کھڑا ہوا۔ مسز زبیر کا رنگ فق ہوا۔
 ”اپنی! آپ کے ساتھ مسئلہ کیا ہے۔ آپ کیل ہاتھ منہ دھو کر میرے پیچھے پڑ گئی ہیں؟“ وہ طنزیہ لہجے میں بولتا ہوا اس کے بالکل سامنے آن کھڑا ہوا۔
 ”اس لیے کیونکہ تم ہمارا ذہنی سکون برباد کرنے کی باتیں کر رہے ہو۔“ ثنا نملہ نے اس کے رعب میں آئے بغیر دوبارہ جواب دیا۔
 ”میں نے کون سا آپ کا سکون برباد کیا ہے؟“ وہ سلگ کر بولا۔
 ”کبھی تمہیں لگتا ہے کہ ہم نے اس گھر پر پیسہ لگا کر ساری جمع پونجی داؤ پر لگادی ہے اور کبھی تمہیں یہ خوش فہمی ہونے لگتی ہے کہ تائبہ کے لیے تمہارا پروپوزل اب بھی ہاتھوں ہاتھ لیا جائے گا۔“ ثنا نملہ نے طنزیہ نگاہوں سے اپنے چھوٹے بھائی کو دیکھا جس کی خود غرضی پر اب اسے کوئی شبہ نہیں رہا تھا۔
 ”ہاں تو اس میں غلط کیا ہے۔“ شیر کی غلط فہمی عود پر تھی۔
 ”تو ٹھیک ہے بھجوا کر دیکھ لو اپنا پروپوزل منہ کی کھاؤ گے۔“ ثنا نملہ ایک جھٹکے سے کھڑی ہوئی۔
 ”یہ آپ کی بھول ہے۔“ وہ استہزائیہ انداز سے ہنسا۔ ”تائبہ مجھ سے محبت کرتی ہے۔“
 ”صحیح کرو وہ تم سے محبت کرتی تھی۔“ ثنا نملہ نے لفظ ”تھی“ پر زور دیتے ہوئے کہا اور اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔ مسز زبیر نے سر اٹھایا، نگاہوں سے اپنے بچوں کو دیکھا۔ جو ایک دوسرے کو کچھ دیر پہلے کھا جانے والی نظروں سے دیکھ رہے تھے۔



”تھینکس گاڈ بھائی! آپ کے چرے پر بھی مجھے مسکراہٹ نظر آئی۔“ عاتشہ نے ناشتی کی میز پر بلا دج مسکراتے موحد کو دیکھ کر چھیڑا۔ جب کہ ماما نے بھی

چوک کر اپنے دونوں بچوں کے تروتازہ چرے دیکھے اور دل ہی دل میں دونوں پر آیت الکرسی پڑھ کر بھونکی۔
 ”میں نے سوچا آج کل تم ہر وقت مسکراہٹوں کے پھول کھینچتی رہتی ہو تو میں کیوں پیچھے رہوں۔“ موحد نے مسلا س پر جیم لگاتے ہوئے اسے چھیڑا۔
 ”ہوں۔ مجھے تو آج کل دعفران کے کھیت نظر آ رہے ہیں۔ آپ کی طرف کیا مازا ہے۔“ اس نے اور بچوں کا گلاس بولوں سے لگایا۔
 ”بس۔ بھوکہ میری طرف بھی کچھ ایسا ہی معاملہ ہے۔“ ایک مدنی سی مسکراہٹ موحد کے چہرے پر ابھری۔
 ”یہ تم دونوں آپس میں کون سے کوڈروڈ میں باتیں کر رہے ہو۔“ ماما نے جھنجھلا کر دونوں کو دیکھا۔
 ”یہ تو آپ بھائی سے ہی پوچھیں۔“ عاتشہ مسکرائی تو ہموار کر رہ گیا۔
 ”میں سوچ رہا ہوں ماما! عاتشہ کی شادی داوی کا کچھ کریں۔ لڑکیوں کی عمر لگنے کا پتا تھوڑی چلتا ہے۔“ موحد نے موقع پر ہی حساب برابر کیا۔ عاتشہ اس کی شرارت سمجھ کر مسکرائی۔
 ”میں تو خود اس سلسلے میں خاصی اپ سیٹ ہوں۔“ کل ہی مجھے مسز کارمن نے ایک پروپوزل کے بارے میں بتایا ہے۔“ ماما کی بات پر عاتشہ چوٹی۔
 ”وہ بتا رہی تھیں کہ لڑکے کی والدہ نے عاتشہ کو کسی فنکشن میں دیکھا ہے اور پسند بھی کر لیا ہے۔“ ماما کے پرہوش انداز پر عاتشہ کا رنگ اڑا۔
 ”جیسا! کیا کرتا ہے وہ۔“ موحد نے فوراً دلچسپی ظاہر کی۔
 ”آری میں مجبڑ ہے۔“ ماما کے جواب پر موحد کے چہرے پر ایک تاریک ساسیہ دوڑا۔ وہ آج بھی آری کا نام ان کے جذباتی ہوجاتا تھا۔
 ”پروپوزل فوراً بلا لیں انہیں۔“ موحد کی دلچسپی ماما کے موبل سپورٹ کا باعث بنی۔
 ”کون سی فون کرنی ہوں انہیں۔“
 ”کوئی ضرورت نہیں ہے ماما! مجھے آری لائف پسند

نہیں۔“ عاتشہ ایک جھٹکے سے کھڑی ہوئی۔ اس کا چہرہ شدید تناؤ کا شکار لگ رہا تھا۔ اس کی بات پر ماما نے ناگواری سے اسے دیکھا اور موحد کو نظروں ہی نظروں میں کوئی اشارہ کیا۔
 ”کیا بات ہے عاتشہ! ایسے ٹینس کیوں ہو رہی ہو۔“ موحد کی بات پر عاتشہ نے اسے شکوہ کنال نگاہوں سے دیکھا جیسے کہہ رہی ہو کہ مجھے آپ سے اس بات کی توقع نہیں تھی۔ اس نے ہاتھ میں پکڑا آؤٹا ٹوٹ پلیٹ میں رکھا اور ڈائننگ روم سے ہی نکل گئی۔
 ”دیکھا۔ دیکھا تم نے اس لڑکی نے مجھے کتنا رنج کر رکھا ہے۔“ ماما کو ایک دم ہی غصہ آیا۔
 ”ڈونٹ بی بی! ماما! میں بات کروں گا عاتشہ سے۔“ موحد نے انہیں تسلی دینے کی کوشش کی لیکن وہ بجائے مطمئن ہونے کے بھڑک اٹھیں۔
 ”دل خراب ہو گیا ہے اس کا“ اور کچھ نہیں۔ تم صاف صاف پوچھو اس سے اگر کوئی پسند ہے تو بتائے ورنہ اس دفعہ میں اس کی کچھ نہیں سننے والی۔“ ماما نے بھی دو ٹوک دھمکی دی اور کمرے سے نکل گئیں۔
 ”موحد سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔ سیل فون کی گھنٹی نے اسے اپنی طرف متوجہ کیا۔ دوسری جانب ثنا نملہ تھی۔
 ”کیا ہوا موحد؟“ وہ اس کا لہجہ سنتے ہی پریشان ہوئی۔
 ”کچھ نہیں یا! ماما اور عاتشہ کے درمیان سینڈوچ بنا ہوا ہوں۔“ اس نے اپنی انجھن اس کے ساتھ شیر کی۔
 ”کیا مطلب؟“
 ”بھئی عاتشہ کے لیے کوئی پروپوزل آیا ہے مگر اس نے صاف انکار کر دیا اور ماما سخت غصے میں ہیں۔“ اس نے مختصراً بتایا۔
 ”جیسا! عاتشہ تو مجھے بہت سادہ اور دوستانہ مزاج کی لگی ہے۔“ ثنا نملہ کی بات پر وہ بری طرح چونکا۔
 ”تمہیں کیسے پتا؟“
 ”اس نے مجھے کال کی تھی۔“ ثنا نملہ کی بات پر

مودھ کو جھٹکا سا لگا۔

”کب...؟“ وہ بے تابی سے بولا۔

”گمانی دن ہو گئے اب تو...“ ثنا مکہ کی بات پر اسے غصہ آگیا۔ ”تم نے مجھے بتایا کیوں نہیں؟“

”سوری ذہن ہی سے نکل گیا تھا اور پھر میرا خیال تھا کہ اس نے آپ سے ہی نمبر لیا ہوگا۔ اس لیے آپ کے علم میں ہوگا۔“ ثنا مکہ نے گھبرا کر اسے وضاحت دی۔

”یہ کوئی اتنی عام سی بات تو نہیں تھی کہ ہمارے ذہن سے نکل جائے۔“ دوسری جانب مودھ کا موڈ خراب ہو چکا تھا۔ اچانک ہی اس کے ذہن میں ایک بات آئی۔

”کیسے تم عاشقہ کے کہنے پر تو مجھ سے ملنے نہیں آئی تھیں؟“ اس کے لہجے میں چھپی بدگمانی ثنا مکہ کا دل خراب کر گئی۔

”آپ کی بدگمانی کبھی کبھی میرے دل کو اتنے برے طریقے سے منکسلی ہے کہ میں اسے لفظوں میں بیان نہیں سکتی۔“ ثنا مکہ کا رخ بھر انداز مودھ کو بے چین کر گیا۔ جب کہ دوسری جانب وہ ناراض ہو کر فون بند کر چکی تھی۔

”آپ مجھ سے ناراض ہیں نا؟“ وہ اس دن اچانک ہی ماہم کے کلینک میں چلا آیا۔ علی کو اپنے سامنے دیکھ کر بھی ماہم بدستور اپنے کام میں مگن رہی جو اس کی ناراضی کا بھرپور اظہار تھا۔ اس نے بس ایک نگاہ اٹھا کر ہی علی کو دیکھا تھا۔

”میٹھنے کے لیے نہیں کہیں گی آپ؟“ علی نے دونوں ہاتھ میز پر رکھ کر تھوڑا سا جھک کر اس ادا سے ماہم کی طرف دیکھا کہ اس کے لیے اپنے دل کی اتھل پتھل کیفیت کو سنبھالنا مشکل ہو گیا۔ اس نے آنکھ کے اشارے سے اسے میٹھنے کے لیے کہا۔ علی کے لبوں پر ایک مبہم سی مسکراہٹ ابھری۔

”آئی ایم سوری! میں پچھلے دنوں اپنے اسپتال اور

پرائیوٹ کلینک میں بہت بڑی رپا اور آپ سے ملنا کون جان سکتا ہے کہ ڈاکٹر ذکی لائف کتنی بڑی ہوش ہے۔“ علی کی بات پر ماہم نے جھٹکے سے سر اٹھا کر سامنے بیٹھے علی کو غور سے دیکھا۔

”آپ ڈاکٹر ہیں؟“ اس کے چہرے کے تاثرات بڑی سرعت سے تبدیل ہوئے۔ ”آپ نے کبھی ہمارا ہی نہیں کہ آپ ڈاکٹر ہیں؟“ ماہم کی ساری ناراضی بھک کر کے اڑ گئی۔ وہ اب توصیفی نگاہوں سے اسے دیکھ رہی تھی۔

”سپیشلائزیشن کس میں ہے آپ کی؟“ ”اسپتال سرجری میں یو کے سے۔“ علی نے بھی آج ماہم کو متاثر کرنے میں کوئی کمی نہیں چھوڑی تھی۔

”اور کتنے بہن بھائی ہیں آپ۔“ ”صرف دو بھائی ہیں۔ فادر کی ڈیوٹی ہو چکی ہے۔ صرف ماہم ہیں۔“ علی کے بتائے ہوئے سارے ہی کو لائف متاثر کن تھے۔

”کچھ نہیں۔ بس آج کل ماہم میری شادی کا بھوت سوار ہے۔ اس سلسلے میں چھانچ رہی ہوں کہ ماہم کی خود پسندی کو باہر نکلنے کے لیے کسی خاص موقع کی ضرورت نہیں ہوتی تھی اور آج تو اس کے ہاتھ میں اچھا خاصا موقع تھا۔

”ہوں۔ اس کا مطلب ہے کہ امیدواران کی لسٹ خاصی لمبی ہے۔“ علی نے ہلکے پھلکے انداز میں کہا۔

”جی ہاں۔“ ماہم نے اپنی راج ہنس جیسی خوب صورت گردن اٹھا کر دیکھا۔ ”مجھے تو شارٹ لسٹنگ ہونی ہے۔“ وہ بڑی ادا سے مسکرائی۔

”انف! میرے جیسے غریب لوگ تو مارے جائیں گے پھر۔“ علی کے شرارتی انداز پر وہ مکھلا کر ہنسی۔

”غریبوں پر ہم خصوصی نگاہ کرم کرتے ہیں۔“ ماہم کے فو معنی انداز پر علی نے مسکراتے ہوئے اپنے ہاتھوں میں ہاتھ پھیرا۔

”آپ کی دوست کرائیو جمنڈت ہو گئی؟“ علی کے اہانک موضوع تبدیل کرنے پر وہ جی بھر کبڑ مڑھوئی۔ ”جی سننے میں تو یہی آ رہا ہے۔“ اس نے گول مول جواب دیا۔

”اسی راس کے ساتھ؟“ ”جی جی، وہ ہی جو میرا شیفٹ تھا۔“ ماہم نے بڑی مغالطی سے جھوٹ بولا۔ علی نے اب اس کے چہرے کو انور دیکھا۔

”کی کوئی محبت و محبت کا چکر تھا۔“

”جی لگتا تو بظاہر یہی ہے۔“ ماہم نے اپنے کندھے

اچکائے۔ ”جلیں! اچھی بات ہے۔ اللہ ان دونوں کو خوش رکھے۔“ علی کی بات پر ماہم کے لبوں پر بڑی پرسکون سی سانس خارج ہوئی۔ وہ اب بڑی مطمئن سی نظر آ رہی تھی۔

”آپ کا فائزر رنگ پروگرام کہاں تک پہنچا؟“ علی کی بات پر ماہم نے ایک دفعہ پھر کوفت بھرے انداز سے ہلکے بولا۔

”میں نے شمن آپلی سے بات کی تھی۔ ان کا آج کل بڑا بڑی شینڈول ہے۔ تھوڑی سی فراغت مل جائے تو ان شاء اللہ کچھ نہ کچھ کرتے ہیں۔“ اس نے بڑی عمدگی سے خود کو سنبھالتے ہوئے اسے مطمئن کرنے کی کوشش کی۔ اس دفعہ علی کے چہرے پر پھینکنے والی مسکراہٹ بڑی عجیب سی تھی۔

”جیسے بہت دکھ، افسوس اور حیرت ہو رہی ہے ثنا مکہ نے۔“ ”ناہیہ بہت افسردگی سے ثنا مکہ کو دیکھا تو ایک لمحے کے ساتھ زمین پر بے معنی سی لکیریں کھینچ رہی تھی۔

”کیا تم گمان بھی کر سکتی ہو کہ میں ایسا کچھ کر سکتی ہوں۔“ ثنا مکہ کے رنجیدہ لہجے پر ناہیہ ایک لمحے میں

”آئی ایم سوری یار!“ وہ اب اس کے ساتھ ہی

باور پی خانے کی دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئی۔ ”میں بھی حیران تھی کہ تمہیں تو ہر بات کا پتا تھا، پھر تم نے شیر کے پرو پونڈل کے لیے خالہ جان کو کیوں بھیجا۔“

”میں نے اس بات کے خلاف اسٹینڈ لیا اور اسی وجہ سے میری شیر کے ساتھ بول چال بند ہے۔“

”ثنا مکہ بڑے دھیسے سے انداز سے گویا ہوئی۔

”شیر کی اتنی جرات کیسے ہوئی۔ مجھے تو یہی سمجھ میں نہیں آ رہا۔“ ناہیہ کا غصہ کسی طور بھی کم نہیں ہوا رہا تھا۔

”موصوف کو لگتا ہے کہ میرے دل میں ابھی بھی اس کے لیے کوئی سو ف کار نہ ہے۔“ ناہیہ بے یقین ہوئی۔

”اس کو لگتا نہیں، بلکہ بھرپور قسم کا یقین ہے۔“ ثنا مکہ مسکرائی تو ناہیہ کی تیوری کے بل گھرے ہو گئے۔

”دفع کو اسے تم یہ بتاؤ کہ تمہارے ہیرو صاحب کا کیا حال ہے؟ کب بھیجیں گے وہ اپنے گھر والوں کو۔“

ناہیہ نے خود کو سنبھالتے ہوئے موضوع تبدیل کیا۔ اس کی بات پر ثنا مکہ کے لبوں پر ایک تلخی مسکراہٹ ابھری۔

”یہاں تک آنے سے پہلے ہی بات بگڑ جاتی ہے۔“ اس کی آنکھوں میں نمی اٹرائی۔

”مائی گاڈ! کیا پھر لڑائی ہو گئی؟“ ناہیہ نے دونوں ہاتھوں سے اپنا سر تھام لیا۔

”میں کیا کروں نہ چاہتے ہوئے بھی کوئی نہ کوئی ایسی بات ہو جاتی ہے۔“ ثنا مکہ کا دل بھر آیا۔

”آپ خبردار! ایک بھی آنسو بہایا تو۔ میں ٹھیک کرتی ہوں تمہارے ہیرو کو۔“ ناہیہ کو ایک دم ہی غصہ آیا۔ ”ویسے یار ہے تو وہ روڈ سائینڈ یا د نہیں اس دن ہم لوگ آئے تو تو اس نے اٹھ کر استقبال کیا اور نہ ہی دروازے تک چھوڑنے آیا۔ کم از کم اتنی اخلاقیات تو سکھا دو اس کو۔“

ناہیہ کو فوراً اس دن والی ملاقات یاد آئی۔ اس کی بات پر ثنا مکہ نے بے ساختہ نظریں چرا لیں۔

”آئی ایم سوری ناہیہ! میں نے تمہیں ایک بات

پیارے بچوں کے لئے پیاری پیاری کہانیاں



بچوں کے مشہور مصنف

محمود خاور

کی لکھی ہوئی بہترین کہانیوں
پر مشتمل ایک ایسی خوبصورت کتاب جسے
آپ اپنے بچوں کو تحفہ دینا چاہیں گے۔

ہر کتاب کے ساتھ 2 ماسک مفت

قیمت -/300 روپے
ڈاک خرچ -/50 روپے

بذریعہ ڈاک منگوانے کے لئے

مکتبہ عمران ڈائجسٹ

37 اردو بازار، کراچی۔ فون: 32216361

نہیں بتائی۔ ”ثنا مکہ آہستہ سے بولی۔
”تم نے میرا وہ ناول پڑھا تھا نا جس میں سکندر شاہ
ایک ایکسپڈیشن میں معذور ہو جاتا ہے۔“ اس کی
بات پر تابیہ کے چہرے پر ابھرنے کے تاثرات نمودار
ہوئے۔
”ہاں یار! وہ بھی کوئی بھولنے والا ناول ہے۔“ اس
نے فوراً ہی کہا۔
”بس سمجھو کہ میرے ساتھ بھی حقیقت میں ایسا
ہی ہوا ہے۔“
تابیہ نے سوالیہ نگاہوں سے اپنی دوست کی طرف
دیکھا۔
”میری حقیقی زندگی کا سکندر شاہ بھی سوات
آریشن میں اپنی ٹانگیں کھوجکا ہے۔“ ثنا مکہ کی بات پر
تابیہ کو یوں لگا جیسے باد چلی خانے کی چھت اس کے سر
پر آن گری ہو۔
”واٹ۔“ وہ بولی نہیں بلکہ باقاعدہ چیخی۔ اس کی
آنکھوں میں فطری سی برہمی تھی۔ ”وہ موجد رحیم
معذور ہے اور تم ایک معذور شخص کے پیچھے پائل ہو
ثنا مکہ؟“ وہ ایسے ثنا مکہ کو دیکھ رہی تھی جیسے اس کے
سامنے دنیا کا آسمان عجوبہ بٹھا ہو۔
”موجد رحیم معذور ہے لیکن میری محبت تو معذور
نہیں۔“ وہ اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولی۔
”شیر اور خالہ جان کیا اس کے پروپوزل کے لیے
مان جائیں گے۔“ اس نے فوراً ہی اپنا خدشہ بیان
کیا۔
”ان کو ماننا ہو گا تاہم یہ میری زندگی ہے اور میں بہتر
طور پر جانتی ہوں کہ مجھے اسے کیسے بسر کرنا ہے۔“
ثنا مکہ نے ہنوز سابقہ لہجے میں کہا۔
”تم بہت عجیب ہو یار! تابیہ کچھ لمحوں کے توقف
کے بعد اتنا ہی بولی۔
”میں نہیں بلکہ محبت ہی ایک عجیب جذبہ ہے کہ
اس کا سودا جس سر میں سما جائے وہ اپنے نقص نقصان
اور زمانے کی مصیحتوں سے بے نیاز ہو جاتا ہے۔“
ثنا مکہ اتنے دھیمے سے بولی کہ تابیہ نے بمشکل ہی اس کی

بات کو سنا۔
”بیٹا! شیر سے کہہ کر بازار سے کچھ چیزیں منگوا
تمہاری ممائی جان کا فون آیا ہے۔ وہ آ رہی ہیں۔“
اس کی امی نے بچن میں جھانکا۔ ان دونوں نے
چونک کر امی کا خوشی سے جھگڑا چہرہ دیکھا۔ وہ خاص
پر جوش لگ رہی تھیں۔
”خیریت تو ہے امی!“ اسے حیرت ہوئی۔ کیونکہ
ابھی دو دن پہلے تو ممائی جان ان کے گھر سے ہو کر
گئی تھیں۔
”مجھے لگتا ہے کہ وہ تمہارے رشتے کے لیے آ رہی
ہیں۔“ امی جان کی بات پر دونوں سیلیول کو کرنٹ مار
لگا۔
”میرے رشتے کے لیے آپ سے کس نے
کہا۔“ ثنا مکہ نے غلج بھرے انداز سے انہیں
دیکھا۔
”بھئی! ڈائریکٹ تو نہیں کہا لیکن یہ کہہ رہی تھیں
کہ آپ سے ایک خاص چیز مانگنے آ رہی ہوں اپنے
بیٹے رامس کے لیے۔“ انہوں نے اپنی طرف سے
دھماکائی ٹوکیا۔
”میرا رشتہ رامس کے لیے۔“ ثنا مکہ کے منہ
سے نکلنے والے الفاظ نے تابیہ کو کسی گہری کھائی میں
دھکا دیا۔ اس کا رنگ فق ہو گیا۔ وہ خوف زدہ نگاہوں
سے ثنا مکہ اور اس کی امی کو دیکھنے لگی۔

”عائشہ! تم نے ثنا مکہ کا نمبر کہاں سے لیا؟“ وہ بڑی
ڈھکی لاؤنچ میں کسی ٹاک شو کو دیکھنے میں مگن تھی۔
موجد کے سنجیدہ سے لہجے پر حیران ہوئی۔
”کون ثنا مکہ؟“ عائشہ نے بے دھیانی میں پوچھا۔
”کہا یہ بھی مجھے ہی بتانا ہو گا۔“ موجد نے
سے چھلکتی خوشی پر وہ مکمل طور پر اس کی طرف متوجہ
ہوئی جو چہرے کے تاثرات سے کچھ خفا خفا سا لگا رہا
تھا۔
”چھال۔ اس کا نام ثنا مکہ ہے۔ میں نے پوچھا ہی

”عائشہ! تم نے ثنا مکہ کا نمبر کہاں سے لیا؟“ وہ بڑی
ڈھکی لاؤنچ میں کسی ٹاک شو کو دیکھنے میں مگن تھی۔
موجد کے سنجیدہ سے لہجے پر حیران ہوئی۔
”کون ثنا مکہ؟“ عائشہ نے بے دھیانی میں پوچھا۔
”کہا یہ بھی مجھے ہی بتانا ہو گا۔“ موجد نے
سے چھلکتی خوشی پر وہ مکمل طور پر اس کی طرف متوجہ
ہوئی جو چہرے کے تاثرات سے کچھ خفا خفا سا لگا رہا
تھا۔
”چھال۔ اس کا نام ثنا مکہ ہے۔ میں نے پوچھا ہی

”عائشہ! تم نے ثنا مکہ کا نمبر کہاں سے لیا؟“ وہ بڑی
ڈھکی لاؤنچ میں کسی ٹاک شو کو دیکھنے میں مگن تھی۔
موجد کے سنجیدہ سے لہجے پر حیران ہوئی۔
”کون ثنا مکہ؟“ عائشہ نے بے دھیانی میں پوچھا۔
”کہا یہ بھی مجھے ہی بتانا ہو گا۔“ موجد نے
سے چھلکتی خوشی پر وہ مکمل طور پر اس کی طرف متوجہ
ہوئی جو چہرے کے تاثرات سے کچھ خفا خفا سا لگا رہا
تھا۔
”چھال۔ اس کا نام ثنا مکہ ہے۔ میں نے پوچھا ہی

بھری نگاہ اس پر ڈالی۔

”بس میں نے فیصلہ کر لیا ہے بھائی! عائشہ اچانک کھڑی ہوئی۔ ”آپ لوگوں نے سوائے لڑنے جھگڑنے کے کچھ نہیں کرنا میں ماما کو لے کر ان کے گھر جاتی ہوں۔ پھر ایک ہی گھر میں ایک ہی روم میں آنے سامنے بیٹھ کر جتنا مرضی لڑتے رہیں۔“ اس کے ہلکے پھلکے انداز پر موحد زبردستی مسکرایا۔

”وہ لوگ ایک ادھر سے شخص کے ہاتھ میں اپنی بیٹی کا ہاتھ تھام دیں گے کیا؟“ موحد کا دل اندیشوں سے لبرز تھا۔

”مگر آپ کا اور شائلہ کا ساتھ اللہ سات آسمانوں کے اوپر لکھ چکا ہے تو دنیا کی کوئی طاقت اس کو ختم نہیں کر سکتی۔“ عائشہ کے پر اعتماد انداز نے موحد کو کچھ مطمئن کیا۔

”پھر کب جاؤ گے تم لوگ۔“ اس کے منہ سے بے اختیار پھسلا اگلے ہی لمحے وہ ساکسا جھینپا اور عائشہ اس کی بات پر کھلکھلا کر ہنسی چلی گئی۔



وہ ایک جس بھری سی شام تھی۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے ہوا کا دم گھٹ کر رہ گیا ہو۔ فضاؤں میں عجیب سی اداسی تھی۔ سیکینے نے کھڑکی کھولی تو اسی لمحے بجلی کے ایک تار پر کرنٹ لگنے سے ایک معصوم فاختہ زمین پر گری اور اس نے تڑپ تڑپ کر جان دے دی۔ سیکینہ کو ایسے لگا جیسے کسی نے اس کا دل مٹھی میں پکڑ کر مسل دیا ہو۔ اسی لمحے ڈاکٹر خاور اس کے کمرے کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہوئے۔

”کیا ہوا سیکینہ۔ طبیعت ٹھیک ہے۔“ انہوں نے اس کا سینے سے شرابور چہرہ دیکھا۔

”ڈاکٹر صاحب! وہ فاختہ مر گئی۔“ اس نے ہاتھ کی انگلی سے باہر کی جانب اشارہ کیا۔ ڈاکٹر خاور نے اس کی نظروں کے تعاقب میں دیکھا۔

”اوہ سوسائڈ! انہوں نے آگے بڑھ کر ہمدردی سے اس کے کندھے کو سہلایا۔ سیکینہ کی بے ربط

دھڑکنوں کو تھوڑا سا سکون میسر آیا۔

”نروس کیوں ہو سیکینہ! اللہ بہت بہتر کرے گا۔“ ڈاکٹر خاور آج خصوصی طور پر وقت نکال کر اس کے پاس آئے تھے تاکہ اس کا حوصلہ بڑھا سکیں۔ سات بجے اسے آپریشن ٹیبل پر لیٹا جانا تھا۔ ”پتا نہیں۔“ اس کی اواس آنکھوں میں عجیب سی وحشت ابھری۔

انہوں نے مسکرا کر اس کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔ سیکینہ کے دل کی دھڑکن ایک لمحے ٹوٹ کر سی گئی۔ ”مجھے معلوم ہے کہ یہ جسمانی بیماری میرا کچھ نہیں بگاڑے گی لیکن میری بد قسمتی کے جالے میں پھنسی میری محبت کسی مٹکی کی طرح زیادہ دیر سانس نہیں لے سکے گی۔ جس کے موسم بھلا کب کسی کو اس آتے ہیں۔“ وہ پھر ہلکے سے انداز سے مسکرائی۔ ڈاکٹر خاور کو پہلی دفعہ اس کی آنکھوں سے چھلکتے جذبوں سے خوف آیا۔

”پتا ہے ڈاکٹر خاور! مجھے آپ کی سچائی سے کوئی گلہ نہیں۔ آپ نے میرا اس وقت ساتھ دیا۔ جب ساری دنیا مجھے دھتکار چکی تھی۔ آپ نے اس وقت مجھے عزت و احترام بخشا۔ جب سب کی آنکھوں میں میرے لیے تمسخر چھلکتا تھا۔ آپ نے اس وقت میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ کے پھول کھلائے۔ جب میری زندگی میں ہر طرف خزاں ڈیرے ڈالے ہوئے تھے۔ میں ٹھیک ہوئی ہوں یا نہیں مجھے ساری زندگی اس کوہان کے ساتھ رہنا ہو گا یا نہیں؟ میرا دل ان تمام چیزوں سے بے نیاز ہو چکا ہے۔ مجھے بس اس چیز پر فخر ہے کہ آپ نے مجھے بھی مایوسی کے سمندر میں دھلنے کی کوشش نہیں کی۔ دوسرے میچاؤں کی طرح مجھے کبھی نہیں کہا کہ۔۔۔ سیکینہ تمہارا مرض لا علاج ہے۔ میں آپ کا احسان زندگی بھر نہیں اتار سکتی گی۔“ سیکینہ کی آنکھوں میں آنسو ایک لڑی کی صورت میں بہہ نکلے۔

”دیکھو سیکینہ! میری پروفیشنل زندگی کے بارے میں لوگ کہتے ہیں کہ ڈاکٹر خاور کے لیے ہر مریض وہی تھا

لی ہوتا ہے۔ اس لیے کہ میں اپنی ملازمت کو ہمیشہ غلبت سمجھ کر ادا کرتا ہوں۔ مجھے اپنے پروفیشن سے محبت نہیں، عشق ہے۔ میں آخری لمحے تک جدوجہد کرنے کا قائل ہوں۔ نیتوں کا حال اللہ جانتا ہے لیکن آپ میرے لیے ہمیشہ اہم رہی ہیں۔“ اس نے ”بس عائشہ سے ملنا چاہتی ہوں دوبارہ۔“ اس نے کچھ لمحے خاموش رہنے کے بعد بالکل عجیب سی زبانی کی ڈاکٹر خاور حیران ہوئے۔

”کیوں۔“ انہوں نے تعجب سے اسے دیکھا۔ ”میں ان کے خوب صورت چہرے کو دوبارہ دیکھنا چاہتی ہوں۔ جسے آپ اس دن بہت پیار سے دیکھ رہے تھے۔“ سیکینہ کے منہ سے لفظ ٹوٹ ٹوٹ کر نکلے۔ ڈاکٹر خاور کو لگا کہ جیسے کسی نے انہیں اچانک زمین پر دھکا دے دیا ہو۔

”کیا وہ چہرہ تمہیں اچھا نہیں لگا سیکینہ! انہوں نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔ ”نہ کیسے ہو سکتا ہے ڈاکٹر صاحب! کہ جو چیز آپ کو اچھی لگے، وہ مجھے بری لگے۔“ سیکینہ نے نظر اٹھا کر ڈاکٹر خاور کی طرف دیکھا۔ اس ایک نظر میں کچھ تھا کہ ڈاکٹر خاور کے دل کی دھڑکنیں پہلی دفعہ بے ربط ہو گئیں۔ انہیں لگا کہ اگر کچھ لمحے بھی یہاں ٹھہرے تو کوئی انہوں کو ہوا چائے گی۔ وہ مضطرب ہو کر اٹھے اور سیکینہ کی طرف دیکھے بغیر بہت تیزی سے باہر نکل گئے۔ ”تم اپنے آپ کو مجھتی کیا ہو۔“ ڈاکٹر خاور کے کمرے سے نکلتے ہی ڈاکٹر زویا بڑی تیزی سے اندر داخل ہو گئیں۔ ان کی آنکھوں سے نفرت کے شعلے نکل رہے تھے۔

”تم نے کبھی اپنے میں اپنی بد صورت شکل دیکھی ہے۔ نہیں پتا ہے، تمہیں دیکھ کر کراہیت کا احساس ہوتا ہے۔ تم نے کبھی اپنی کمر پر اونٹ کی طرح کوہان دیکھا ہے۔ تم اس سے ساری زندگی چھٹکارا نہیں کر سکتی۔“ ڈاکٹر زویا ایک قدم اور آگے بڑھ کر بولیں۔ سیکینہ نے خوف زدہ نگاہوں سے ڈاکٹر زویا کی طرف دیکھا۔

”تم جو ڈاکٹر خاور کو پانے کے لیے اونچے اونچے

خواب دیکھ رہی ہو۔ اپنی اوقات دیکھی ہے تم نے۔“ ڈاکٹر زویا کے زہر آلود لہجے نے سیکینہ کو کسی اندھے کنوئیں میں گرایا۔

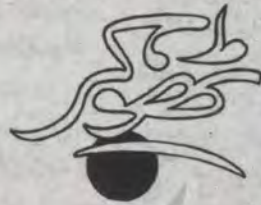
”اللہ جانے کون سے تعویذ گھول کر ڈاکٹر خاور کو پیلا دیے ہیں جو وہ اپنی بصارت سے محروم ہو گئے ہیں اور انہیں تمہارا اتنا بڑا کب نظر نہیں آتا اور وہ پاگلوں کی طرح تمہارے کمرے کا طواف کرتے رہتے ہیں۔ ان کی ساری توانائیاں تمہارے آپریشن کی کامیابی کے لیے خرچ ہو رہی ہیں۔“ ڈاکٹر زویا نے انگلی کے اشارے سے اس کو دھکی دی۔ ”میرے اور ان کے درمیان آنے کی کوشش کرو گی تو میں تمہارا جینا حرام کر دوں گی یاد رکھنا! ڈاکٹر خاور جیسے شخص سے محبت کرنے سے پہلے ایک دفعہ غور سے آئینہ دیکھ لیتیں تو ساری زندگی سرائیگران کی طرف دیکھنے کی جرأت نہ ہوتی نہیں مگر۔“ ڈاکٹر زویا کا زہر آلود لہجہ سیکینہ کے دماغ پر کسی ہتھوڑے کی طرح برس رہا تھا۔ وہ کسی وحشت زدہ ہرنی کی طرح آنکھیں کھولے ڈاکٹر زویا کی طرف دیکھ رہی تھی جو اپنی ساری بھڑاس نکال رہی تھیں۔

”ہر روز اس اسپتال میں بے شمار لوگ مرتے ہیں۔ لیکن تم اتنی بد صورت ہو کہ موت بھی تم سے گھبراتی ہے۔ تم جیسے لوگ ہمیشہ دوسروں کی قوت برداشت کا امتحان لے رہے ہیں۔“ ڈاکٹر زویا نے ایک نفرت انگیز نگاہ سیکینہ پر ڈالی اور جانے کے لیے مڑیں مگر سامنے کھڑی سسٹرناریہ کو دیکھ کر تھوڑا سا کڑوا میں اور اگلی لمحے تیزی سے کمرے سے نکل گئیں۔

سسٹرناریہ نے سیکینہ کا سفید ہونا چہرہ دیکھا۔ وہ پر اسال نگاہوں سے اس دروازے کی طرف دیکھ رہی تھی جہاں سے ڈاکٹر زویا باہر نکلی تھیں۔

سیکینہ کے منہ سے ایک لفظ بھی نہیں نکلا۔ اس نے سسٹرناریہ کے کمرے سے نکلتے ہی اپنا سر تکیے پر گرا لیا۔ اس کا دماغ ماؤف ہو رہا تھا۔ ڈاکٹر زویا کے زہر پلے جیلے کمرے میں گونج رہے تھے۔ سیکینہ نے کھڑکی سے باہر گری فاختہ پر ایک نگاہ ڈالی اور اس کا ذہن اندھیوں میں ڈوبتا چلا گیا۔

(آخری قسط آئندہ صفحہ 186)



میں زبیدہ خالہ کے گھر سے واپس آئی تو امی بازار گئی ہوئی تھیں۔ وہ کافی دیر بعد لوٹیں تو میرے چہرے پر آزدگی کی گہری چھاپ تھی۔
”کیا ہوا۔ مل آئیں سفینہ سے۔ آپا زبیدہ تو ٹھیک ہیں نا!“

وہ ٹھٹک گئی تھیں اور میری مشکل یہ تھی کہ ان سے کچھ چھپانہ پاتی۔

”سفینہ کو انہوں نے ایک بار پھر آپا تو قس کے گھر چھوڑ دیا ہے۔ اپنے رشتے کی آس میں۔ خود گھرواری کے دھندے بھگنانے میں لگا کر بیٹھیں۔“

”جئے۔ جئے۔ کہاں آپا زبیدہ کی دھان پان جان اور کہاں گھرواری کے بکھیرے۔ میں تو کہوں ان کی عقل پر پتھر بڑ گئے ہیں۔ ایک بار ٹھوکر کھا کر بھی عقل نہ آئی۔ کیسی موہنی صورت ہے سفینہ کی۔ مگر آپا زبیدہ کی بلند پروازی اپنے ہاتھوں سے مقدر پھوڑے ہیں۔ پہلے کیا کم بھداڑی ہے مگر۔“

انہوں نے افسوس سے سر ہلایا۔ خالہ زبیدہ اپنی ہٹ کی پکی تھیں۔ وہ شادی بیاہ کے معاملے میں اولاد کو کیش کروانے کی قائل تھیں۔ خصوصاً ”سفینہ کے لیے تو ان کا نظریہ تھا کہ بیٹی لاکھوں میں ایک ہے تو بیاہ کر اونچے بڑھیا گھرانے میں جائے۔ معمولی رشتوں کو خاطر میں نہ لائیں۔ رشتہ داری میں تو خیر مجبوری تھی۔ ورنہ وہ متوسط طبقے کے لوگوں کو تو منہ لگانے کی بھی قائل نہ تھیں۔

”ن کا تو وہ معاملہ ہے کہ رسی جل گئی مگر مل نہ

گئے۔ ہاتھ تلے کچھ نہیں اور مزاج آسمانوں کی پیر کرتے ہیں۔ مرحوم میاں کی پشش بر گھر چلتا ہے مگر باتیں بڑی بڑی۔ لڑکیوں کے معاملے میں مزاج اور معیار پست ہی رکھنا چاہیے۔ بڑے بول نہیں بولنے چاہئیں۔“

”امی! بڑے بول تو خیر کسی معاملے میں نہیں بولنے چاہئیں۔ یوں کہیے کہ بے چاری سفینہ پر ان کا پس چلتا ہے۔ لڑکے تو ہاتھ آئے نہیں۔“

”سچ کہتی ہو۔ لڑکے مزاجاً سرکش ہوتے ہیں یا آپا زبیدہ جیسی ماؤں کے سامنے بڑ جاتے ہیں۔ اور بھوویں ان سے چار ہاتھ آگے۔ ان کی زبان کی تیزی سے اللہ بچائے۔ کسی سے بقی بھی تو نہیں۔ خیر سے دو بھوویں ہیں مگر ان کی نکتہ چینی، تیزی، طراری۔ اللہ کی پناہ! ورنہ کاغے کو اس بڑھاپے میں صفائیوں دھلائیوں میں بلکان رہیں۔ چین سے چارپائی پر بیٹھ کر اپنا بڑھاپا کاٹیں۔“

امی ٹھیک کہتی تھیں۔ انہیں صفائی کا خط تھا مگر بھوویں سے ان کی ایک پل نہ بنتی۔ اب یہ کہاں ممکن تھا کہ چار لوگوں میں ہر چیز دوہلی منجھی ٹھکانے پر نظر آئے۔ وہ دونوں بھوویں سے خار کھاتی تھیں۔ منٹوں میں انہیں بے عزت کر دیا کرتیں سفینہ کی طرح۔ دونوں بھائیوں کے لیے بھی آپا تو قس نے بہترے ہاتھ پیر مارے کہ کسی بڑے گھرانے میں ان کا رشتہ ہو جائے۔ خیر ایہ ایسا ناممکن بھی نہ تھا۔ بیٹے قابل کماؤ تھے مگر بڑے بیٹے کو ان کی مال دار پھوپھی کو ٹٹے کا

ہی کچھ نہ آیا تھا۔
دوسرے بیٹے کو اپنی کولیگ بھاگئی۔ وہ اس کے لیے ماں کے منہ کو آگیا۔ خالہ پھر ہار گئیں۔ پھر ان کے مزاج کے سامنے کوئی کہاں ٹکاتا تھا۔ بڑے بیٹے بھونے اپنی دنیا گھر کے اوپر پورشن میں بسا لی۔ وہ پلٹ کر ساس کو نہ پوچھتی۔ وہ بھی بری تھی۔ جو۔ نہیں پوچھتی تھی وہ



لو کی سی بری۔ جسے پیسہ کی پسند جو کی۔ دوسروں کو ان کی خامیوں سمیت دیکھنے کے لیے برا بھلا کر رہا ہوتا ہے وہ خالہ زیدہ کے پاس کہاں تھا۔

”جائے بھی دیجئے۔ خالہ زیدہ جیسے لوگوں کا بدلنا ناممکن ہوتا ہے۔ وہ جو سوچتی ہیں کھٹ سے کہہ بھی دیتی ہیں۔ اس بار بھی سفینہ کے لیے آپا توفیق کا سارا ہے، کہ بری بہن پوش علاقے میں رہتی ہے۔

باجائیت لوگوں سے میل جول ہے، عین کوئی بڑی ہی جائے گا۔ ماضی کے تجربے سے خاک نہ سبق سیکھا۔ اب بھی پرواز بلند ہے۔“ امی توبہ تھلا کرنے لگیں۔ پھر چونکیں۔

”چوہے پر کچھ جل رہا ہے کیا؟“

”ہاں۔ ابھی قیمہ دھوکے چڑھایا تھا۔“ مجھے اچانک یاد آیا۔

”ہائیں۔ وہ قیمہ کیا آج پکانے کے لیے رکھا تھا؟ وہ دوسری وال کیا ہوئی؟“

”ڈال کم تھی۔ تین افراد میں تو پوری ہونے سے رہی۔“

”مے تو پانی بڑھا کے پھر سے بگھار لگا دیتیں۔“ انہیں ہنسنے لگ گئے۔

”ڈرا اس لڑکی کو پروا نہیں۔ پیسے درختوں پر اگتے ہیں کیا؟“

باپ منہ لگا لے پا جوان کڑل بھائی کما کما کے لارہے ہیں۔ ایک کمانی میں گھر کیسے چلائی ہوں کوئی مجھ سے پوچھے۔ ابھی تو تیرا من بھر کا بوجھ ڈھونڈنا ہی باقی ہے۔“

امی بھی آخر خالہ زیدہ کی بہن تھیں۔ جن کی زبان کی تیزی سے زمانہ کالوں کو ہاتھ لگا تھا تھا۔ وہ دیر تک بڑبڑاتی رہیں۔ میں کان دبائے سنی رہی۔



سفینہ کی زندگی برباد کرنے میں آپا توفیق کا بڑا ہاتھ تھا۔ خالہ زیدہ کی یہ بیٹی خیر سے مال دار آدمی سے بیانی تھی۔ میکے کو خوب بھرتی۔ کوئی پوچھنے پھنسنے والا تھا

میں۔ میاں کاٹھ کا الو۔ بیوی کی خوبصورتی کا ایسا ہر معاملے میں ماں بہن کو ساتھ رکھتی۔ ہولڈنگ، شاپنگ، تفریح۔ خالہ زیدہ کی آنکھوں پر چلی تھی گئی۔ سفینہ کا جیون سا بھی ایسا ہی ہو۔ زندگی مزے میں گزرے۔ وہ کئی کئی دن سفینہ کو بہن کے گھر چھوڑتیں۔ بیٹی چندے آفتاب چندے ماہتاب ہے۔ کوئی اونچا برجڑ جائے۔

اور پھر ایسا ہی ہوا۔ آپا توفیق کے توسط سے سفینہ کا رشتہ ان کے بڑوں میں طے ہو گیا۔ خالہ زیدہ نے زمین و آسمان ایک کر دیے۔

”بڑا گھرانا ہے۔ لاکھوں کے مالک ہیں۔ میری سفینہ عیش کرنے کی۔ سارا گھر جگر جگر چمک جائے گا۔ ان کی ایک بھی ہو سفینہ جیسی حسین صورت نہیں ہے۔ ڈیڑھ لاکھ مہر بند ہوا ہوا ہے اور چھ تو لے سونا پیسے والوں کے لیے کیا مشکل۔“

ایسے میں کوئی انہیں ان کی اوقات یاد دلانا تو چمک اٹھتیں۔

”مے لو۔ لاکھوں میں ایک حسین صورت مل رہی ہے۔ یہ کیا کم ہے۔ ہم نے تو حیثیت دیکھی ہے۔ ورنہ وہ گراڈیل کوئی سفینہ کے جوڑ کا ہے؟ ایسے ہی تھوڑی سفینہ کے رشتے کے لیے پاؤں پڑ گئے۔ ویسے جو بڑا دلانا ہے، توفیق ہی کرے گی۔ اس کے پاس کوئی کم پیسہ ہے۔ میری بیٹی نے اس کی خدمت کم کی ہے۔“

میں جانتی تھی۔ وہ آپا توفیق کا سارا گھر سنبھالتی تھی۔ وہ بڑے بڑے حکم چلایا کرتیں۔ شروع سے آپا توفیق کے گھر میں اس کا بڑا عمل دخل تھا۔

شادی ہو گئی۔ کچھ دن سکھ میں بھی گزرے پھر کیرے پڑ گئے۔ آپا توفیق سفینہ پر اپنا پورا حق تصور کرتیں۔ اس کی زندگی میں بے جا مداخلت پر سفینہ کے سرسرا والوں نے اس کی ملک توڑنے کو آپا توفیق کا بائیکاٹ کیا اور یہیں سے خرابی کا آغاز ہوا۔ آپا توفیق کی انا پر شدید ضرب بڑی۔ انہوں نے ماں کے کان بھرے کہ سفینہ پر حکم کے پہاڑ توڑے جا رہے ہیں۔ خالہ زیدہ بلبل اٹھیں اور سفینہ کو دو بوج کے پیکے لا

بلا۔ پھر کو تو یوں کامنہ کھل گیا۔ برابر کی گولہ باری کا تار ہوا۔ سفینہ کی معصومیت پر کچھ اچھلا گئی۔ آپا کا بڑوں کے معاملے کا چشم دید گواہ تھا۔ بہن بہن کے ساتھ کھوٹا، پھرنا، شاپنگ، تفریح، خوب بھلائی۔ معاملہ طلاق پر نمٹا۔

جب اختلاف جنم لیتے ہیں تو خوبیاں بھی خامیاں مان جاتی ہیں۔ سفینہ کے معاملے میں بھی ایسا ہی ہوا۔ جیسے تہہ میں بڑے پتھر اوپر آگئے۔ بلاوجہ اسے بہنوئی سے نفرت کروا گیا۔ سفینہ کا پڑاؤ مینے میں میں دن بہن کے گھر چور ہا کر تھا۔ اس میں خالہ زیدہ کی غرض تھی اور آپا توفیق کی بھی۔ مگر زیر غتاب اس کی معصوم ذات اُٹتی۔

وہ مجھ سے دل کی ہر بات کہہ لیا کرتی تھی۔ مجھے لگتا اس کے ساتھ ظلم ہوا ہے۔ بہت سے اپنے دوست نما دشمن ہوتے ہیں۔ ان کے اپنے نظریات اپنے وضع کردہ اصول ہوتے ہیں جن پر وہ دوسروں کو بھی نبھاتے ہیں۔ یعنی دوستی کی آڑ میں کھلی دشمنی بعض رشتوں میں انسان زہر ہو ہی جاتا ہے۔ مگر کچھ لوگ ٹھوکر کھا کر بھی نہیں سمجھتے۔ خالہ زیدہ بھی ان لوگوں میں سے تھیں جن کے خارے ان کے اپنے خریدے ہوئے ہوتے ہیں۔



واقعی سفینہ کا رشتہ ایک بار پھر کسی بڑے گھر میں ہو گیا مگر اس بار رشتہ زیدہ خالہ کی کسی واقف کار کے توسط سے طے ہوا تھا جو کسی زمانے میں ان کے گھر کے لپری پورشن میں کرائے پر رہ چکی تھیں۔ خالہ زیدہ اس بار بھی بڑی بڑی باتیں کرتی نظر آئیں۔

”لڑکے کا اپنا کاروبار ہے ساؤتھ افریقہ میں۔ نکاح کر کے چلا جائے گا، کچھ عرصہ بعد سفینہ کو بھی وہیں بلائے گا۔ میری سفینہ تو شہزادی ہے راج کرے گی۔ لڑکا کو تو دل کا مالک ہے۔“

امی نے ٹوک دیا۔ ”آپا! ہاتھی بالو تو دروازے بھی لپٹے رکھنے پڑتے ہیں۔ لو کیوں کو بیابانے کے لیے

صرف حیثیت ہی تو نہیں دیکھی جاتی۔“

”مے لو۔ تو کیا آٹھ دس ہزار ہیرے مگانے والے کے ہاتھ میں تھا ہوا۔ انسان کی زندگی میں سارے مسائل پیسے کی کمی کی وجہ سے ہوتے ہیں۔ غربت کی چکی میں پس کر اچھی اچھی رنگ روپ والی بھی چڑ جاتی ہیں۔ اپنی توفیق کو دکھا ہے۔ بیٹی بیابانے کے قابل ہوئی۔ ابھی تک لڑکی سی نظر آتی ہے۔ پیسے کی تنگی جو نہیں۔ اللہ ہونے والوں سے بچائے۔“

امی کے کلیجے پر ہاتھ پڑا۔ خالہ زیدہ سمجھیں کہ بہن اپنی محرومی کے سبب جل گئی ہے۔ ان کے جانے کے بعد بڑبڑاتی پھریں۔

”خاک پڑے ہونے والوں یہ۔ ہم اپنی بیٹی کے لیے بلند پرواز نہیں رکھتے۔ شریف، نیک، مقبول رشتے کی تلاش ہے۔ ان کی طرح بھگتے نہیں کہ اونچی اونچی بیٹھیں ہیں اور دھڑام سے نیچے۔ دیکھوں کی ہنس محل میں بیابا ہے سفینہ کو۔ پہلے بھی بونی بڑے بڑے بول بولے تھے۔ چار روز میں سارے کس بل نکل گئے۔ اونچے گھروں والے ایسے ہی ہم جیسوں کی بیٹیاں بیابانے نہیں آجاتے۔ ان کے لیے ان جیسے بہتر ہے۔“

مگر ایسی باتیں خالہ زیدہ کہاں سمجھتی تھیں۔ وہ معیار سے کم پر سمجھو تا کرنے والوں میں سے نہ تھیں۔

اور شادی والے روز وہ لہا کو دیکھ کر میری تو طبیعت ہی مکدر ہو گئی۔ سفینہ سے دگنی عمر تھی۔ کنپٹیاں سفید۔ نظریں خونخوار۔ ہاں مگر مالدار تھا ایک بار پھر نکاح لگ گیا تھا۔ امی نے خالہ زیدہ کی واقف کار امینہ کو جالیا۔ میرے لیے بھی کوئی اچھا رشتہ نظریں رکھنے کی تاکید کی۔ مگر ان کا کام رشتے کروانا نہیں تھا۔ صرف تعارف کروایا تھا۔ مانو سفینہ کی قسمت زور کر رہی تھی، انہوں نے پھر بھی وعدہ کر لیا۔ پھر خالہ زیدہ کی شکایتوں کا پٹارہ کھول کے بیٹھ گئیں۔ انہوں نے چار روز کے لیے مکان کیا کرائے کر لیا، خالہ زیدہ نے ان کی زندگی اجیون کر دی تھی۔ نکلے نکلے کا حساب رکھتیں۔ بات

بے بات جان کو آجائیں۔ لحاظ موت نام کو نہ تھی۔
امینہ کے زخم آج بھی رستے تھے۔ مگر انہیں بھی سفینہ
پر رحم آیا تھا۔ سفینہ نے ایک بار ان پر اپنی گزشتہ زندگی
کے باب کھولے تھے۔ امینہ مجھے بھی گھیر کے بیٹھ
گئیں۔ اپنے تئیس بڑھاپا مشوروں سے نوازا۔
”بال اتنے ہی ہیں یا تم بڑھاپی نہیں ہو۔“ شادیوں
میں جج سنور کے چایا کرو تاکہ لوگوں کی نظروں میں
آؤ۔ رنگ صاف کرنے کے لیے کوئی اچھی سی کریم
استعمال کرو۔ یہ۔“

امی لب سے سستی رہیں۔ پھر امید باندھ کے بیٹھ
گئیں۔ کم رو بیٹیوں کے والدین امید پر ہی توجیتے
ہیں۔

اگلے روز ولیمہ تھا۔ ولیمہ کیا تھا کہ اعلیٰ دستور ان
میں کچھ نشیتیں بک کروانی تھیں۔ گنے چنے لوگ
تھے۔ ولیمہ بھگتا کے بالا ہی بالا روانہ کر دیا گیا۔ امی بہت
جسٹا میں انہیں وہ گھردیکنے کا چاؤ تھا جہاں سفینہ بیاہ
کے گئی تھی مگر خالہ زبیدہ نے سب کو پرے پرے ہی
رکھا۔

بعد میں بھی سفینہ سے کئی بار ملاقات ہوئی۔ وہ آئی
گئی مگر مجال ہے جو بھی پھوٹے منہ بھی آنے کو کہا
ہو۔ امی کہتیں۔

”مال دار گھر میں بیاہ کر سفینہ کی بھی آنکھوں پر چربی
چڑھ گئی ہے۔“

مگر میں سمجھتی تھی۔ دودھ کا جلا چھانچھ میں بھی
پھونکیں مارتا ہے۔ سفینہ کا پہلا گھرا جائے میں کان
بھرنے والوں کا بھی بڑا ہاتھ رہا تھا۔
پھر سنا سفینہ ساؤتھ افریقہ چلی گئی۔

جانے کتنے دن گزر گئے۔ ایک روز خالہ زبیدہ کے گھر
جانا ہوا تو خالہ زبیدہ بڑی خوش و شادمان تھیں۔ سفینہ
کچھ دن پہلے لوٹی تھی۔ وہ ماں کے لیے جو سوغاتیں لائی
تھیں۔ ان کی بھرپور نمائش کی گئی۔ ”وڑکے“ کے
والدین تو تھے ہی نہیں۔ ایک بیانی بہن کی فیملی کے
ساتھ رہنا بسا ہے۔ نارتھ ناظم آباد میں بڑا شان دار

بنگلا ہے۔ لاکھوں کی کمائی ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔
میں لوٹنے لگی تو صدر دروازے پر ان کی اوپر والی در

نے بوجھ لیا۔
”دیکھ آئیں افریقہ سے آئی سوغاتیں۔ ہزار جھوٹ
بول کے ماں کی آنکھوں پر پٹی باندھی ہے۔ ورنہ ہڈی
یہاں بھی نہ بیٹے دیتیں۔ جڑ سے اکھاڑ لاتیں ہڈی کی۔
مجھ سے پوچھو چار روز ساؤتھ افریقہ میں رہ کر لوٹا۔
وہاں دوسری جو بیٹی ہے۔ اب یہ ہمیں منہ کے کنبے کی
خدمت کرے گی اور روٹی کھائے گی۔ تم نے وہ مثل
سنی ہے نا ہاتھ تو آیا منہ نہ تھا۔“

میرے دل کو دھکا سا لگا۔ اگر ایسا تھا بھی تو کچھ
پھرنے کی کیا تنگ ہوتی ہے۔ مگر ان رشتوں میں بونہی
کیونگی دکھا کر خار نکلی جاتی ہے۔ میں خوب جھجھکی
تھی۔

اگلی بار وہ مجھے پبلک ٹرانسپورٹ میں ملی۔ کورنگی
سے نارتھ ناظم آباد جانے والی بس میں۔
مجھے حیرت ہوئی۔ خالہ زبیدہ کتنی تھیں۔ سفینہ
کے بنگلے میں چار گاڑیاں کھڑی ہیں۔ اور سفینہ نے کہا
کہ اتنی دور سے ٹیکسی کا کرایہ لگ بھگ ہزار بنتا
ہے۔ میری حیرت کو زبان مل گئی۔

”کہاں کہیں وہ گاڑیاں بنگلے؟“

”وہ گئے چنے پیسے سمجھتے ہیں اور یہاں ہر چیز میں
ساجھا ہے۔ بس مختلف بہانوں سے۔ بڑی رقم لٹھ
لیتی ہے۔ مکان کے کرائے میں ساجھا۔ نوکروں کی
تخوواہ میں ساجھا۔ بلوں میں ساجھا۔ بڑے گھروں
میں زندگی اتنی آسان کہاں ہوتی ہے۔ بڑے گھروں
میں رہنے والے کبھی چھوٹے دلوں کے بھی تو نقل
آتے ہیں۔“

اس کا انداز پر سکون تھا۔ شاید یوں کہ اس نے
زندگی کو جو ہے اور بیسی ہے، کی بنیاد پر جھیلنا نہ لیا
تھا۔

پھر اس کا شاپ آگیا۔ وہ اتر گئی۔



”پچھلی بار اس کے سامان نے حیران کیا تھا۔ اتنا کم اور اس بار اتنا زیادہ۔ اللہ جانے کیا کیا اٹھا کر لے آئی تھی۔ چھوٹے بڑے بیگ، ٹیبلے، کارٹن۔ وہ نانو اور خالہ کی حیرت بھانپ گئی۔ کھانا کھا رہی تھی خواہ نگلا۔ ”میں واپسی کے تمام راستے بند کر کے آگئی ہوں نانو۔ یعنی تمام کشتیاں جلاؤ ایلس۔ یعنی جینا مرنا سب ہمیں اس در پر۔“

جملہ بے حد متنی خیز اور ڈراتا ہوا تھا۔ مگر لہجہ کی مصنوعی بے بسی اور ناکامی اور آنکھوں میں ناچتی شرارت۔

”اللہ نہ کرے کیسی باتیں کرتی ہو بیٹا! نانو ہول ہی تو گئی تھیں مگر توہین نے شرارت بھانپ لی۔ اسے مزہ آیا سو پوچھنے لگی۔“

”طارق بن زیاد نے تو کشتیاں جلا کر ہار حیرت کا فیصلہ

کیا تھا۔ مرجائیں گے۔ یا مار دیں گے۔ تمہارے کیا ارادے ہیں؟“

”نیک ہی ہیں۔“ آپ پریشان نہ ہوں نوال بھی کوئی غلط کام نہیں کرتی۔ کیونکہ۔“ اس نے قصداً جملہ اوصو را پچھوڑا۔ وہ اگلا جملہ ان ہی کے منہ سے سنا چاہتی تھی۔

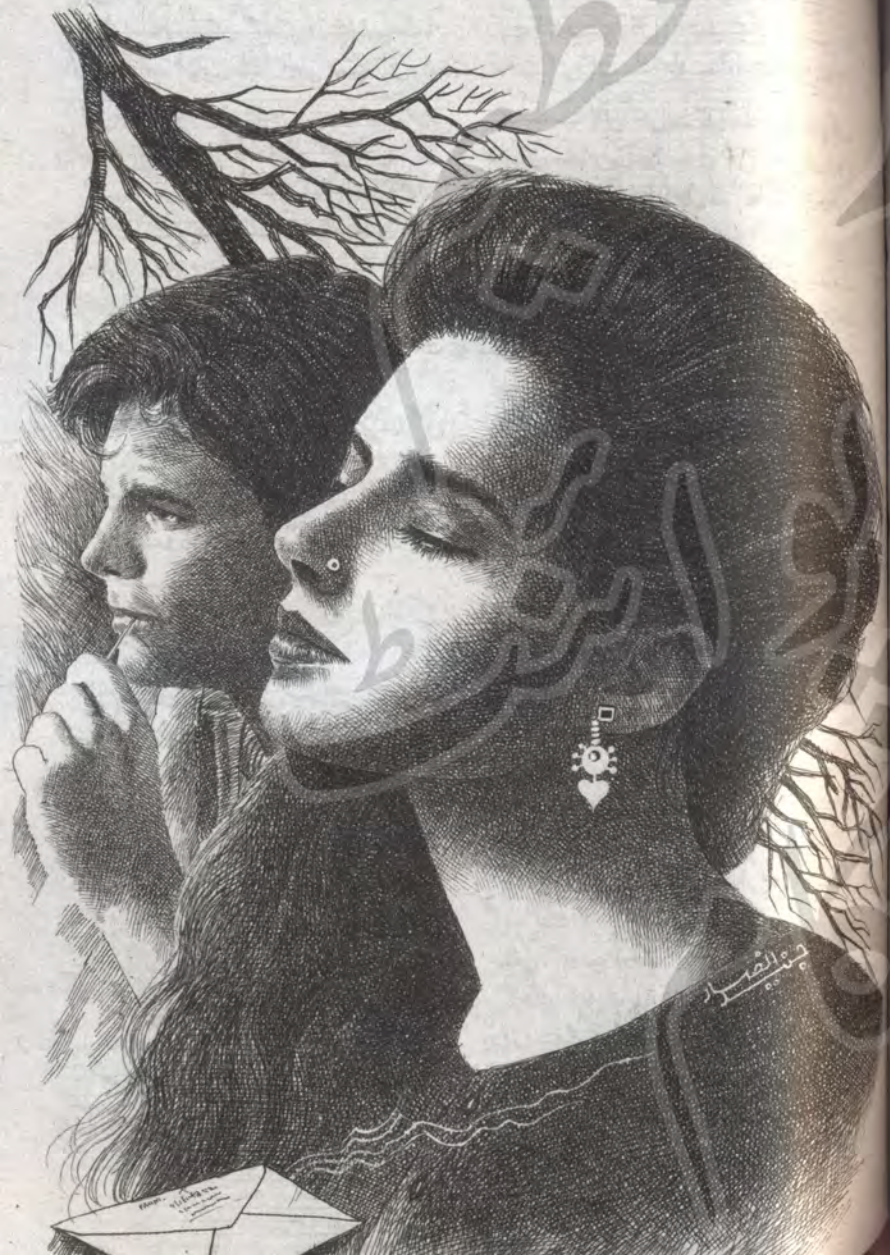
”کیونکہ نوال کا ضمیر ابھی زندہ ہے۔“ توہین نے شوخی سے اسی کا سالنڈا زاپایا تھا۔

”اور یہ جملہ میں نے۔“ نوال نے انہیں مزید آگے کچھ کہنے پر اکسایا۔ توہین کو مزید مزہ آیا۔

”اور یہ جملہ تم نے اپنے باپ کے لیے کہا ہے۔“

”اوہو۔“ نوال ہلکی ہلکی۔ ”بہی بہت وقت

لگے گا آپ کو نوال ضمیر کو سمجھنے میں۔ یہ والا جملہ میں نے اپنے آپ کے لیے کہا ہے ضمیر مطلب۔ میری



سوچ میرا راہ میرے خیال۔ آپ سے کس نے کہہ دیا خالہ کہ صحیح یا غلط کام کرنے کے لیے باپ سے یا باپ کے نام سے ڈرنا چاہیے یا پاس رکھنا چاہیے۔ اچھا اور برائی اندر سے پھوٹی ہے۔

”میں نے زندگی میں بھی کسی کو اپنے باپ کے نام کو ایسے مختلف طریقوں سے استعمال کرتے نہیں دیکھا“

نون نے تائید طلب نگاہوں سے زینت بیگم کو دیکھا۔ جن کی آنکھیں جھلملاسی گئی تھیں۔

”اب آنکھوں میں یہ جھلملاہٹ سی کیوں؟“ نوال نے حیرت سے پوچھا۔ زینت بیگم نے جواب نہیں دیا۔ ساری کے پلو سے آنکھیں رگڑ لیں۔

”مجھے لگتا تم نہیں آؤ گی۔“

وہ جملہ ادھورا چھوڑ کر کمرے کی دیواریں اور پھٹ کر دیکھنے لگیں۔

”مجھے اپنا گھر قبرستان لگنے لگا تھا اور ہم جیسے دو بھٹی روہیں۔“

”مجھے آتا ہی تھا نا تو۔۔۔ وہ تو بس شادی آگئی بیچ میں اور ابھی آپ رو رہی ہیں۔“ نون تو ایک بار بھی نہ کیا کہ آجاکہ انتظار۔۔۔

وہ سجدگی سے کہتی آخر میں گنگنائی۔ نون کے چہرے پر مسکراہٹ آگئی۔

”ہم نے فون اس لیے نہیں کیا کہ کہیں تمہیں یہ نہ لگے ہم تمہیں پریشاں کر رہے ہیں۔“

”واہ! آپ اور آپ کے ارفع خیالات۔۔۔ اللہ نے زبان اور کان کہنے سننے کو دیے ہیں۔ آپ بس اندر ہی اندر سوال جواب کھیتی رہا کریں۔ خواجواہ۔“

نون جو اب ”پچھ نہ بول۔“ اسے نوال کا جلدی جلدی نوالے بھرنا اور تیز تیز بولنا بولتے ہوئے سر کی جنبش سے ملتی پونی سب بے حد اچھا لگ رہا تھا۔

”اب اتنی فیٹھی میٹھی نظروں سے مجھے گھورے کیوں جا رہی ہیں؟“

”گھور نہیں رہی بے وقوف! پیار سے دیکھ رہی ہوں۔“ نون نے پر سکون سانس بھری۔ ”میا لگ رہا ہے۔۔۔ جیسے۔۔۔ جیسے دیرانے میں چپکے سے بہار

آجائے۔“

”ہی ہی ہی۔۔۔ بہت خوب میری شاعرہ خالہ۔ کیا مثال دی ہے۔ جی خوش ہوا۔“ نوال کو برا مزہ آیا۔

”اور جہاں تک ویرانے میں بہار کے چپکے سے آنے کا تذکرہ ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ آپ نے آجائے تھا اپنے اس چہیتے کے ہمراہ۔۔۔ خود سے گاڑی ٹکانا تو آپ کے لیے ممکن نہیں۔۔۔ میں نے سوچا کہ اچانک جا کر اس کے سر پر ہتھوڑے کی طرح برسوں اور اس کے چہرے کے تاثرات دیکھوں۔۔۔ وہ انفخ انعام کو جان ہی چکی تھی۔

”اسے کیسے لے کر آتی۔ بانیٹک کے ایکسیڈنٹ میں بازو فریکچر ہو گیا اور ٹانگ پر الگ بلاسٹر چڑھا ہے۔“ نون کا لہجہ اور زینت بیگم کا چہرہ دکھ کی تصویر بن گیا۔

”ارے وہ کیسے؟“ سب خیریت ہی ٹال زیادہ گہری چوٹیں تو نہیں آئیں؟“

نوال کا نوالہ چپاٹا منہ رک گیا۔ اس نے بے حد تشویش سے دریافت کیا۔

☆ ☆ ☆

بے خود خان کو اسکول سے واپسی پر نوال کی آمد کی خبر ہوئی۔ اوچی آواز میں ڈیک چل رہا تھا۔

”بد تمیز دل بد تمیز دل جانے ناں۔۔۔“

اس گھر میں کوئی ایسا تھا ہی نہیں جو دل کی کیفیت بیان کرے اور وہ بھی ایسی اطلاع کہ دل بد تمیز ہے اور بے حد نا فرمان بھی۔۔۔ تو بے۔

”نوال پانی۔۔۔!“ خوشی سے آواز پھٹ جانے کو تھی۔ ”مجھے لگا کہ جھوٹا وعدہ کر کے گئی۔ اور نہیں آئے گی؟“ وہ بے خود تھا۔

”مجھے آتا ہی تھا بے خود!“ نوال کی آنکھیں بھی جذبوں سے بھر گئی تھیں گویا۔

”جاؤ جا کر پونی فارم چیلنج کرو۔“ نوال اب یہیں ہے۔ کھانا وغیرہ کھاؤ تو پھر آنا۔ یہ خالی بیسکون اور کارڈز اسٹور میں رکھے ہوں گے۔“ نون نے نوال۔

”یہ سارا آپ کا سامان ہے نا۔“ بے خود نے اس ڈھیر سے اس کے قیام کی مدت کا اندازہ لگایا۔ چہرہ چمکنے لگا تھا۔

”بی بی نے مجھے آپ سے فون پر بات بھی نہیں کروایا۔ بولتی تھی کہ ام کسی کو مجبور نہیں کر سکتے اور یہاں آنے کا تو بالکل نہیں کہہ سکتے۔ اور۔“

”جاؤ بے خود۔۔۔!“ نون نے ذرا سختی سے اسے نواک۔

”کیوں خالہ؟“ نوال نے اس کے جانے کے بعد نون کو کسی قدر افسوس سے دیکھا۔

”دلی جذبات بھی پچھانے میں آپ اتنی روک کر کرتی ہیں۔ اب دل اچانک چاہنے لگا کہ آپ نے ایک پارہی کال کر کے کہا تو ہوتا“ نوال اب تک آپ کیوں نہیں۔۔۔ یا تک آپ آ رہی ہو؟“ نون کا سر جھک گیا۔

”تاہم بعض باتیں کہہ دینے سے سننے والے کو تو خوشی ملتی ہے ہی۔ مگر کہہ دینے سے کہنے والے کو جو سکون ملتا ہے وہ۔۔۔ کبھی کہیں گی تو پتا لگے گا۔ سمجھیں!“

”کوئی پھل نہیں ہے فرت میں۔۔۔ یہ سڑے ہوئے تین کیلے لنگے ہیں بس۔“ نوال نے جنھلاہٹ سے کیلوں کو بغور دیکھا اور پھر ناٹا اور نون کہ۔

”انفخ کے ایکسیڈنٹ کے دن پریشانی میں گزرے۔ باریک تک جانا ہی نہیں ہوا۔“

زینت بیگم اور نون کے چہرے پر تاسف سا پھیل گیا۔

”چھوڑو ناں! آپ لوگ نہیں سدھر سکتیں۔“

نوال نے نفی میں سر ہلایا۔ ”ایکسیڈنٹ اس انفخ کا ہوا ہے اور مفقوع زندگی اب آپ لوگوں نے گزاری ہے۔“ مجھے تو لگتا ہے آپ دونوں دعا کے لیے ہاتھ اٹھاتے وقت اپنے لیے خیر و تندرستی نہیں مانگتی ہوں گی بلکہ درد کرتی ہوں گی۔ اللہ انفخ کو زندگی صحت دے۔۔۔ ہاں!“

انور! میرا مطلب تھا کہ۔۔۔ ایک ایمر جنسی سی نافذ

ہو گئی تھی گھر میں ابھی بے زار لالا اور بے خود کو کوسٹ بنا کر دیتی ہوں تو سب آجائے۔“

”نہیں! ہم خود ہی چلیں گے سپر اسٹور تک۔۔۔“

نوال نے کہا۔

نون نے زینت بیگم کو دیکھا اور ہتھیار ڈال دیے ”اوکے چلیں گے۔۔۔ لیکن کیا ہی اچھا ہوتا کہ تم انفخ کی خیریت معلوم کرنے چلی جاتیں۔ بہت سیریس ایکسیڈنٹ ہوا۔ کہ۔“ نون موزوں جملہ سوچنے لگی۔ نوال کا موزا اور خراب ہو گیا۔

”خیر اب اتنا سیریس نہ ہوا ہو گا جتنا بدشت ناک منہ آپ بنا رہی ہیں۔“

نون جھمنہ ہی ہنسی ہنسی دی۔ واقعی ایکسیڈنٹ کا ذکر کرتے ہوئے اس کی آواز سر اسیمبلی آنکھیں حلقوں سے ابلی اور چہرہ سسنی سے بھر جاتا تھا۔ دوسری طرف زینت بیگم تاسف آمیز سر اسیمبلی سے نون کو دیکھتیں اور رواں رواں ہاں ہاں میں ہاں ملاتا۔

”نوال کڑی ہو گئی۔“ جارہی ہوں آپ کے چہیتے کی خیریت کی طلبی کے لیے۔

”بے خود۔۔۔ بے خود!“ اس نے بلند آواز سے پکارا تو وہ جیسے کہیں پاس ہی کھڑا تھا۔ جھٹ حاضر۔ ”آؤ ذرا خیریت معلوم کر کے آتے ہیں۔“

”کوئی مزہ نہیں آئے گا تھوڑا ہی لگی ہے۔ زیادہ وہ بچ گیا ہے۔“ پٹھان خون تھا۔ دامن ہے تو رعایت کیسی۔

”تو یہی تو دیکھنے جائیں گے اور کہاں کہاں لازمی چوٹیں لگتی چاہیے تھیں۔“ اس نے تسلی کروائی۔

☆ ☆ ☆

اشتیاق احمد نے بے حد اچھے نا سمجھی کے عالم میں اسے دکھا۔ پھر بے حد زار چہرے والے بے خود خان کو جو سلام جھڑکریوں کھڑا تھا جیسے جانتا ہی نہیں۔ گھٹکھریالے بال پونی میں سر کے عین اوپر جکڑے ہوئے تھے۔ دھلا دھلایا گلابی چہرہ سنہری آنکھیں دھلا پتلا سرایا۔۔۔ بلیک جینز پر اوچی گول دامن والی پیلی

شرٹ، مولویوں کی طرح شانوں پر نکوناس کا راف دھرا تھا آگے لاکر گانٹھ دی گئی تھی بائیں ہاتھ مسکراتا بے فکر سا چہرہ۔

اشتیاق صاحب نے کسی کے بتائے بنا پہچان کا مرحلہ خود سے ہی طے کیا اور مارے اشتیاق کے باچیس چر گئیں۔

”ہیلو نوال۔۔۔!“

”اوبائے۔۔۔ ہیلو!“ نوال کا مسکرا تا چہرہ حیرت کی تصویر بن گیا۔ اس نے ذرا سی گردن موڑ کر بے خود کو دیکھا جو بے فکر سا کھڑا تھا۔ ہاں ایک لاپرواہ سی خشکی نمایاں تھی۔ بے خود کی طرف سے کوئی تعارفی جملہ یا اشارہ نہ پا کر نوال بے حد خوش میزبان کی جانب متوجہ ہوئی۔

سامنے موجود شخصیت کی پہلی قابل دید چیز تھی موٹاپا۔ موٹاپا اور بے حد موٹاپا۔ گہرے اور بے فکر کا ٹریک سوٹ اس پر گلابی رنگ بے حد گلابی اتنا کہ آتش گلابی ہی لگنے لگے۔ آڈی ٹانگ نکال کر سرمئی پال جمائے گئے تھے۔ سب سے حیران کن چیز جو نوال نے اپنی زندگی میں کبھی نہیں دیکھی تھی۔ وہ تھا آنکھوں کا سرمہ۔ اتنا آ آ سرمہ۔ اتنا سرمہ تو قبائلی عورتیں نوازائیدہ بچے کی پلکیں اور بھومیں بنانے پر بھی خرچ نہ کرتی ہوں گی۔

اس نے جائزہ پورا ہونے پر اشتیاق احمد کو پندیدگی کی سند عطا کی اور دل سے مسکرائی۔

”یہ داوا جان ہیں۔ انھیں بھائی کے“ بے خود نے جیسے سنا چاہتے ہوئے کہا۔

نوال کو بے ساختہ یاد آیا۔ نوین نے کہا تھا ”انھیں انھیں کے دادا ایک بالکل ہی الگ انسان ہیں۔ ان سے مل کر مزہ آجاتا ہے۔“

نوال کو یقین آیا۔ ابھی تو صرف دیکھا تھا اور واقعی مزہ آگیا تھا۔

”میں تو کب سے تمہارا منتظر تھا۔ تم نے اتنے دن لگا دیے نوال!“ وہ بچپن کے پچھڑے دوستوں کی طرح شکوہ کنال لہجے میں بولے۔

”نادر چلو ناں! ادھر ہی کیوں کھڑی ہو۔ صوفیہ بھی تمہیں یاد کر رہی تھی۔“

”اب یہ صوفیہ کون؟“ نوال نے بے خود کو دیکھا۔

”داوی جان کا نام ہے؟“ بے خود نے بلی لبان سے کہا۔

بے حد خوب صورت، سچے بنے صاف تھکے کامن میں ایک دہلی قہقہہ خاتون دھیل چیر بر راجن بی دی دیکھ رہی تھیں۔ بہت ہلکے لیسن کلر کے سوٹ میں وہ بے حد باوقار اور حسین تھیں۔

آہٹ پر چونکیں۔ نگاہ اٹھا کر نوال کو دیکھا اور پھر اپنے مجازی خدا کو جو نوال کی کلائیوں دوپے کھڑے تھے جیسے وہ بھاگ جانے والی ہو۔ یا وہ اسے بھاگنے سے پکڑ لائے ہوں اور اب اپنے کارنامے کی داد چاہتے ہوں (کو بیگم کیسا؟)

”نوال۔۔۔“ وہ جوشیلی آواز میں بولی تھیں راتھ ہی یا نہیں وا کر دیں۔ ”آؤ ادھر میرے پاس۔“

اشتیاق احمد نے بھی دوپے کلائی چھوڑتے ہوئے اسے کھلی یا نہوں میں سما جانے کے لیے کھلی چھوٹ دے دی۔

وہ آگے بڑھ کر سرسی سامنے لگی تھی۔ مگر صوفیہ بیگم نے گرجوٹی سے اسے خود میں بھیج لیا۔ پھر چہرہ ہاتھوں کے کنوڑے میں بھر کے پیچ پیشانی چوم لی۔ ماشاء اللہ۔

نوال ایسے والمانہ استقبال پر حق دق تھی۔ وہ تو انھیں ہی جیسے بے حد سڑے پورنگ اور اکڑے لوگوں اور ماحول کا سوچ کر آئی تھی۔ مگر یہاں تو۔۔۔

”بھئی بیوین کو آواز دو۔ اس سے کوہمہمان آئے ہیں بلکہ مہمان کیا۔ کوہمارے گھر لڑکی آئی ہے ذرا مزے داری ٹیبل تو سجادے۔“

اشتیاق احمد نے بیگم سے کہا مگر آواز اتنی بلند تھی کہ بیوین تک سارا پیام پہنچا۔ وہ کہیں دور سے چلائی ”جی اجھا۔“

”یاں تو بیٹا۔۔۔ کیسی ہو۔ اور تمہارا باپ کیسا ہے؟“ وہ نسلی سے نرم صوفیہ میں دھتے ہوئے بولے۔

”ڈیڈ! جیسے۔۔۔ میں بھی اچھی۔“ چونکہ یہاں

استقبال بالکل ہی سوچ سے الگ ہوا تھا تو نوال کچھ انکی تھی۔

”اور بیٹا! تمہاری امی۔۔۔ کیا حال ہیں ان کے؟“

صوفیہ بیگم کو دھیان آیا۔ ”مشعل کیسی ہیں؟“

”آپ جانتی ہیں امی کو؟“

”ارے! انہیں کیسے نہ جانوں گی۔ ابھی منیر بھائی کے انتقال پر تو ملے تھے سال ہو چکا مگر ابھی کل ہی کی بات لگتی ہے۔“

”اوبہ! آئی سی“ نوال کو سب سمجھ میں آگیا۔

”کل تو تھکاؤ اور سلمان کھولے میں ٹائم لگا۔“

آج میں نے سوچا ذرا انھیں کی خیریت معلوم کر آؤں تو ویسے کہاں ہے وہ؟“

”اوہو! بس یور آدمی کا ذکر لے بیٹھی ہو۔۔۔ بلکہ لونی شیطان کا نام لیا اور موصوف حاضر۔۔۔“ تینوں نے ان کی نگاہوں کے تعاقب میں دیکھا تو سامنے سے وہی آ رہا تھا۔ بائیں ٹانگ پر پلاسٹر چھاتھا اور دایاں بازو ہلٹ کے سہارے گردن میں لٹکا تھا۔ وہ لنگڑا کر بہت دیر سے دھیرے قدم اٹھا تا آ رہا تھا۔

اس کے چہرے سے کمزوری اور بے زاری مشرع تھی جس میں اب شدید ترین بے یقینی کا رنگ غالب آگیا۔

”السلام علیکم کیسے ہو؟ میں تمہاری ہی طبیعت معلوم کرنے آئی تھی۔ کیا بہت زیادہ لگ گئی؟“ نوال نے عیادت کے اصولوں کے عین مطابق لہجہ اور چہرہ بہت درود مندانہ اور متفکرانہ بنا کر پوچھا۔

انھیں کی حیرت کے کیا کہنے وہ کوئی بھی جملہ کہنے سے گویا قاصر تھا۔ قوت گویائی سلب ہو گئی تھی شاید ”تم۔۔۔ اس کے منہ سے بمشکل نکلا۔“ تم پھر آ گئیں؟“ اب سچی بات ہے کہ یہ جملہ کہنے پڑھنے اور سننے میں انتہائی بے مروت اور انسلٹنگ تھا اور اس پر ہرے کے کسی قدر متوحش تاثرات ناگواری والے اشتیاق صاحب کا سر پیٹ لینے کو دل چاہا جبکہ صوفیہ بیگم ”ارے! یہی کرتی رہ گئیں۔“

”مجھے تو آتا ہی تھا۔ میں نے کب کہا تھا کہ میں وقت ہوں ہاتھ سے پھسل گیا تو پھسل گیا۔ ریت کی طرح۔۔۔“

”اتنی ڈاؤن ٹواریتھ ہو گئی ہو کہ خود کو ریت مٹی کہنے لگیں۔ چٹنی مٹی کو جو چپک ہی جاتی ہے۔ اتارے نہیں اترتی۔“

اس نے دہرد جواب دیا۔

”چٹنی مٹی کی جگہ مجھے خوشبو بھی کہہ سکتے تھے۔ انمول، ایک دائمی احساس۔ مگر جملے سوچ کے اور سوچ شخصیت کی آئینہ دار ہوتی ہے اور تم۔۔۔ اس نے قصداً ”جملہ ادھر اور اچھوڑا مگر تاک تاک کر پوائنٹ مارنے کے بعد۔۔۔“

”بڑی خوش فہمی ہے۔“ وہ اب قاعدہ گھور رہا تھا۔

”نہیں۔۔۔ خود شناسی کیسے۔“

”اونہ۔۔۔! ذرا سی کراہ کے ساتھ وہ صوفیہ پر براجمان ہو گیا۔ بے خود کو جملوں کی گرائی، کٹ اور معنی تو بالکل سمجھ میں نہ آئے۔ مگر نوال کے چہرے کی مسکان اور انھیں کے جوالی وار کی جگہ اونہ نے اسے بتلایا جیت ان ہی کے حصے تھی۔ وہ کسی قدر شامنے اکثر کر بیٹھا تھا۔

دوسری جانب صوفیہ بیگم بارہی ڈول نظر آتی نوال کے جملے سن کر ششدر تھیں۔ بس ایک اشتیاق احمد تھے جن کی آنکھیں دھک رہی تھیں چہرہ چمک رہا تھا۔

”میں بھی اتنی دیر سے سوچ رہا تھا یا تو لڑکی غلط ہے یا پھیلانی ہوئی یا بائیں غلط۔ مگر اب یقین آگیا دونوں چیزیں درست ہیں۔“ اشتیاق احمد نے اپنی بیگم کو مخاطب کرتے ہوئے نوال کو سنایا۔ تو وہ کسی قدر نا سنجی سے دونوں کو دیکھنے لگی۔ انھیں نے ایک اور ”ہونہ“ کہہ منہ موڑا تھا۔

”در اصل بیٹی! تمہارے بارے میں بہت کچھ سنا تھا۔ یہ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ تم جب سے آئی تھیں خاموش بنا تلا بول رہی تھیں۔ مجھے بھی لگا کہ وہ سب جھوٹ تھا لیکن اب یقین آگیا۔ تمہارے بارے میں بتائی گئی باتیں درست ہی تھیں۔“

نوال چوگی۔
 ”کون سی باتیں۔۔۔ اور کس نے کیں باتیں۔۔۔؟“
 اس نے تینوں کو گھورا۔
 ”میں نے بتایا سب کو؟“ بے خود نے فخر سے سینہ
 تانا ”نوال باجی! سب کچھ کر سکتی ہے وہ بجلی ٹھیک کرتی
 ہے موبائل اور چارجر بھی اور واشنگ مشین اور
 گاڑی بھی چلاتا آتی ہے اور بندوق بھی۔۔۔ اور وہ کسی
 سے نہیں ڈرتی اور اس کو بکرے خریدنے بھی آتے
 ہیں اور۔۔۔“
 ”اوہو۔۔۔!“ نوال کے چہرے پر اطمینان آگیا۔
 انھیں نے پہلو بدل کر رامنہ بنایا۔
 ”بس آئی! دراصل مجھے شروع ہی سے کچھ الگ
 کرنے کا شوق ہے مگر نئی روایات آج کی عورت کو
 روایتوں کا پس دار تو ہونا چاہیے یہ وسیع بسیدہ آسان
 ہے پرواز کے لیے۔۔۔ عورت کو بھی سننے جہاں
 تلاش ہے ہوں گے پر پھیلا کر۔۔۔“
 ”انھیں کے دل میں ایک خواہش اتری
 جس نے ہونٹوں پر مسکان پھیلا دی۔ نکل پھر کسی دن تم
 پر پھیلا کر۔۔۔ دادا جی کے زمانے کی بندوق ویسے ہی
 رنگ کھا رہی ہے۔ لگاؤں پھر میں زمین سے نشانے
 ۔۔۔ شاہ شاہ شاہ۔۔۔“
 تقریر کرتی نوال نے انھیں کے چہرے کو دیکھا۔ وہ
 اس کے خیالات سے اتنا متاثر تھا، مسکرا رہا تھا نوال
 نے سلسلہ کلام جاری رکھا۔
 ”اللہ نے مرد کو برتر مقام دیا ہے میں اس بات کو
 تسلیم کرتی ہوں۔ لیکن یہ کیا؟؟؟ کہ میلے کپڑوں کا ڈھیر
 لے کر بیچی رہے کہ شام کو وہ آئیں گے تو سوچ جو خود کر
 دس گے۔ یا شدید گرمی میں ان کے انتظار میں لکڑیوں
 جھپتی رہے، گرم از کم ایک فیوژ تو لگا لیتا چاہیے۔۔۔ ورنہ
 دراصل۔۔۔“
 وہ سانس لینے کو رکھی۔ جب سامع اتنے ذوق و شوق
 سے ہمہ تن گوش ہوں تو کون بے وقوف خاموش رہ
 سکتا ہے۔ لیکن دانت پیٹے انھیں کو اسی بل بھر کے
 وقفے کا انتظار تھا۔
 اس نے بڑی متاثر ہوتی مسکراہٹ سجائی۔ جیسے

حرف بہ حرف قائل ہوا ہے۔
 ”تم تم ایسا کیوں نہیں کرتیں کہ W.W.F میں جاؤ
 اور عورتوں کی ریسنگ میں حصہ لو۔“
 ”ہائیں!“
 ”اس کے علاوہ تمہارے ڈفرنٹ آنوکے اچھے
 شوق پورے کرنے کے لیے میرا سب سے اہم کام
 یہ ہے کہ امریکہ جاؤ اور تانسا والوں سے اس خلائی نسل
 کا ٹکٹ لے لو جو صرف لے کر جائیں گے۔ واپسی
 آپ کی اپنی ذمہ داری۔۔۔“
 حاضرین کے چہروں کے تاثرات سے بے نیاز
 انھیں نے دوبارہ منہ کھولا۔
 ”اب اتنی ٹیلنٹڈ تو تم ہو کہ واپسی کا کوئی نہ کوئی
 راست ڈھونڈ لوگی۔ یہ کام کرنا جانتی ہو۔۔۔ میرا مطلب
 کر سکتی ہو تو خلا سے واپسی تو تمہارے لیے یوں چمکی
 بجائے کا کام ہو گا بے ناں؟“
 صوفیہ بیگم کے چہرے پر ہلکی سی مسکان آرکی تھی۔
 جبکہ اشتیاق صاحب کے قہقہے کی گڑ گڑاہٹ نے
 دیواروں پر لگی آرائشی اشیاء کو بھی ایک بل کے لیے ہلا
 دیا۔ بے خود کو جملے تو تعریفی لگے تھے۔ مگر انھیں کے
 چہرے کی چمک اور آنکھوں میں مزہ چھانے کی کیفیت
 اس پر نوال کا شدید حیرت سے کھلا منہ۔
 اور یہ نوال باجی جواب کیوں نہیں دیتی۔
 چوتیس انھیں انعام کے جسم پر آئی تھیں نہ کہ
 زبان پر۔۔۔ وہ ویسے ہی تیز دھار تھی کہ اگر چاقو نہ ہو تو
 مسواک اتارنے کے لیے شان کو موصوف زبان سے
 بس ایک بار چاٹ لیں۔
 نوال کو فوری طور پر کچھ نہ سوچھا حملہ ہی اتنا اچانک
 تھا۔
 اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتی، السلام علیکم کی پکار
 سب کے ساتھ وہ بھی چوگی۔
 ”ارے۔۔۔!“
 نوال نے فقط تصاویر ہی دیکھی تھیں۔ مگر وہ بیان
 گئی۔ وہ تصاویر ہی میں اس شخص پر غذا ہوئی تھی۔
 سامنے سے۔۔۔
 تصاویر میں دل موہ لینے والا۔ سامنے سے کیا

نوال جیسے گرد و پیش کو بھول گئی۔ خوب صورتی
 زبان کھول دیتی ہے۔ چاہتے نہ چاہتے منہ سے واہ واہ
 جہاں اللہ نکل جاتا ہے۔
 لیکن اگر خوب صورتی، دکشی کسی مرد کی شخصیت
 میں ہو۔۔۔ قد کاٹھ، آنکھوں کا تھپہ، ہر گزے بالوں۔۔۔ اور
 دل کی خفجاری طرح وار کر دینے والی مسکراہٹ میں۔
 تو مشنری لڑکیاں زبان و انتوں تلے ہی داب لیں۔
 لگاؤں چرائیں۔ اسی میں بہتری ہے۔
 نوال بھی تو مشنری لڑکی۔۔۔ مسکراتی ہی نوال ضمیر بھی
 تھی۔ وہ مسکوری بس دیکھے چلے جا رہی تھی۔
 ☆ ☆ ☆
 یونیورسٹی شروع ہوئی تو وہ ہر لحاظ سے بے پناہ
 مصروف ہو گئی۔ نیا ماحول نئے راستے، نئی پرکھائی۔
 جاتی بھی بس میں تھی۔ پیدل اسٹاپ تک پھر بس بے
 پناہ مصروفیت میں وہ اپنے مقاصد کو بھولی تو نہیں۔ مگر
 کسی قدر فراموش ضرور کر گئی تھی۔
 لیکن
 اس دن یونیورسٹی سے واپسی پر جب موسم نے حد
 فرما دیا تھا اور اس کی چال ایسی تھی کہ رات تک گھر
 پہنچ ہی جائے گی۔ تب ہی سیاہ گاڑی کے نائز اس کے
 قریب چرچرائے۔ اس نے اچھل کے پیچھے ہو کر
 ڈرائیور کو گھورا تو جیسے دل پکڑ کے رہ گئی۔ انھیں
 اشتیاق کا گلاب کو ناک کی نوک پر لگا کر اب نگاہیں اٹھا کر
 اسے دیکھ رہے تھے۔ ساتھ بیٹھے انھیں نے البتہ کوئی
 تاثر نہ دیا۔
 ”ہیلو۔۔۔!“ اس نے دل کو دھیرے دھیرے گرفت
 سے آزاد کیا۔
 ”کیا طبیعت ٹھیک ہے جو اتنا دھیمے دھیمے چل رہی
 ہو؟“
 ”ہاں بالکل۔۔۔ بس یہ موسم۔۔۔“ اس نے گھٹاؤں
 کو دیکھا اور ہوا سے اڑتے بال ایک ہاتھ سے اوپر
 پڑھانے کی کوشش کی جو دوبارہ نیچے۔
 ”تو کیسے چلے چلتے ہیں۔ یہ تو عام گزر گاہ ہے۔“

مشہور و مزاح نگار اور شاعر
 انشاء جی کی خوبصورت تحریریں،

کارنوں سے مزین
 آفٹ طباعت، مضبوط جلد، خوبصورت گرد پوش

کتاب کا نام	قیمت
آوارہ گرد کی ڈائری	450/-
دنیا گول ہے	450/-
ابن بطوطہ کے تعاقب میں	450/-
چلے ہو چین کو پیچھے	275/-
میری مری پھر اسافر	225/-
خمار گندم	225/-
اردو کی آخری کتاب	225/-
اس ہفتی کے کوپے میں	300/-
چاندنگر	225/-
مجموعہ کلام	225/-
دل دہشتی	225/-
ایڈ گرائیو پوائین انشاء	200/-
لاکھوں کا شہر	120/-
باتیں انشاء جی کی	400/-
آپ سے کیا پودہ	400/-

مکتبہ عمران ڈائجسٹ
 37، اردو بازار، کراچی

”کہاں لے کر چلیں گے؟“
 ”کیس بھی۔۔۔ سی سائڈ پر یا جہاں تم کہو۔۔۔“
 ”نانو سے پوچھ لوں۔۔۔“ انہوں نے پہلو بدلا۔
 ”بڑی آئی فرماں بردار۔۔۔“
 ”خالہ کو بھی لے لیں گے ناں۔۔۔“
 ”اخطب نے گہری سانس لی۔۔۔“ پھر تو تم گھوم آئیں۔۔۔ وہ کبھی نہیں جانتی گی۔۔۔“
 ”خالہ میری کوئی بات نہیں مانتی ہیں۔۔۔“ اس نے پچکانہ یقین سے کہا۔
 اخطب کے چہرے پر ایک عجیب سی مسکراہٹ آ گئی۔۔۔
 ”تم ابھی اپنی خالہ کو جانتی نہیں ہوئے۔۔۔!“ ان کے لیے میں دکھ تھا۔ تکلیف اور ناکامی سی۔
 نوال ڈھیلے پن سے کھڑی تھی۔ چونک کر کسی فوجی کی طرح سیدھی ہوئی اور تن کر کھڑی ہو گئی۔
 ”اور آپ ابھی مجھے نہیں جانتے۔۔۔ میں اپنی بات منوانے کے لیے۔۔۔ فرس پر پتھوں و بیچ پر پھیلا کر بیٹھ جایا کرتی ہوں اور جہاں بھال کر کے روتی ہوں۔ منہ سر پیت لیتی ہوں۔۔۔ بلکہ بالوں میں خاک ڈال لیتی ہوں اور۔۔۔“
 ”آپ واقعی اپنی خالہ کو نہیں جانتیں۔“ اخطب نے قہقہہ لگایا اور تاند کے لیے ساتھ سوجے منہ والے بھتیجے کو دیکھا جو گالگڑ سے آنکھیں چھپائے یوں بیٹھا تھا جسے خلائی شٹل کی سیٹ پر براجمان ہو۔۔۔ تن تھما۔۔۔ اور گونگا تو ہو ہی سماعت بھی چل گئی ہو۔
 انہوں نے گالگڑ ماتھے پر چڑھا کر اسے دیکھا اور چاچو سے مخاطب ہوا۔
 ”یہ بڑے بڑے دعوے کر کے گئی تھیں اور بڑے بڑے ارادوں سے آئی ہیں۔ اب تو بس یہ دیکھنا ہے نتیجہ کیا نکلے گا۔“ نوال سادہ سے جملوں کے اندر چھپے بھید تک پہنچی۔
 ”میں کبھی غلط بات نہیں کہتی اور عنقریب تم کو دیکھ لو گے۔“
 ”اب تم گاڑی میں آ رہی ہو یا ابھی مزید انجوائے

کرو گی۔“ اخطب بولے۔
 ”کئی نے دیکھ لیا تو تمہیں لگ پتا جائے گا۔“
 ”پھر تو میں ضرور بیٹھوں گی۔“ وہ ضدی لہجے میں بولی تھی۔
 باہر گھنٹائیں غائب ہو گئی تھیں اور سورج یوں چمک رہا تھا جیسے کہیں گہائی نہیں۔
 ”ایک تو میں کراچی کے اس موسم سے بہت پریشان ہوں۔۔۔ ٹھکانی نہیں۔۔۔“ وہ کینہ توڑ لگا ہوں سے دھوپ کو دیکھتے ہوئے بڑبڑاتی تھی۔
 ”ابھی آپ نے کراچی میں اور بھی بہت کچھ نہیں دیکھا۔“ اخطب بولے۔
 ”اور دعوے آسمانوں تک۔۔۔“ انہوں نے ٹکڑا لگایا۔
 نوال نے جواب نہ دیا۔ وہ گہری سوچ میں ڈوب رہی تھی۔
 * * *
 نون اور نانو کی زندگی کو بدل دینا نئے رخ پر ڈال دینے کا پلان اتنا مشکل قطعی نہیں تھا۔ لیکن جب وہ دونوں ایسا جہاں بھی نال تو۔۔۔ جو جیسا کی بنیاد پر بیج سے شام۔ کوئی ارادہ نہیں۔۔۔ خواب نہیں۔۔۔ خواہشوں سے دستبردار۔۔۔
 ہٹ دھرمی، ناکامی، بے بسی کو قناعت کا نام دے کر خود کو ستائش سے نوازنا اپنے لیے خود ہی میڈل لڑچن لینا۔
 جبکہ میڈل تو وہ ہوتا ہے جو دوسرے دیتے ہیں۔
 اور نوال کے حساب سے ایوارڈ تو دوسرے۔۔۔ وہ کسی ایوارڈ شو میں شرکت کے قائل بھی نہیں تھیں خصوصاً ”نونین منیر خان۔۔۔“
 وہ دونوں نوال کے چمپائے ہنگامے میں خوش رہتی تھیں۔ اس کی حرکتوں اور باتوں پر ہنستی تھیں۔ مگر بل بھر کے لیے۔ نوال کی غیر موجودگی۔
 نوال نے اکثر خاموشی سے انہیں دیکھا تھا۔ نہنت

نہ خانی دی چلاتی تھیں۔ مگر فقط نونوز چھین۔۔۔ وہ ہی آواز بند کر کے نیچے چلتی پھریاں رہتی رہتیں، کبھی کوئی پرانی فلم لگا لیتیں۔ کوئی گانا تو۔۔۔ خصوصاً ”مکیش ورتا کے پرانے گانے۔۔۔ وہ محض ایک جھلک دکھ کر گانا بنا دیتی تھیں۔ بے ساختہ آواز بڑھا بھی لیتیں۔ مگر ایک مصرع پورا ہونے سے پہلے ہی آواز بند کر دیتیں شاید منیر خان مرجانے کے بعد بھی ان کے اعصاب پر سوار تھے۔
 لی وی بند ہوتا تو یونہی درازیں کھول کر بیٹس دیکھ لیتیں بھی یونہی الماریاں درست کرنے لگ جاتیں۔ خاموش خالی دیر ان۔
 اچھا چلو۔۔۔ وہ تو عمر کے اس دور میں تھیں۔ جب یونہی بوٹیاں کھول کے دیکھنا چکا تھیں لگانا اور پرانی چیزوں کا ہاتھ میں پکڑ کر ان سے وابستہ یادوں کو تازہ کرنا وقت کا سترن مصرف ہو جاتا ہے۔
 مگر نونین کے ساتھ کیا مسئلہ تھا۔ وہ جو نسخہ برس کی نہیں تھی۔ وہ بیس تیس برس کی بیک لڑی تھی۔ اس کے ساتھ کی لڑکیاں شوخ و شنگ تھیں۔ زندگی کے جام سے قطرہ قطرہ رس بھرنے والی۔
 زور سے ہنسنے والی، بازاروں میں من پسند چیزوں کی خریداری میں تجلجٹ دکھانے والی، ریموٹ ہاتھ میں لے کر چھینٹو بدل کر لطف اٹھاتی تھیں۔
 جن کی موجودگی درود پوار سے جھلکتی تھی۔ جاگتی 400 واٹ کے بلب کی طرح روشن لڑکیاں۔
 اور نون۔۔۔ نونین منیر خان۔۔۔
 خاموش۔۔۔ گرد و پیش سے انجان بھی ہوئی موم بنی جیسی لڑکی۔
 روشنی تو لرزہ بر اندام۔۔۔ وجود تو پچھلتا ہوا۔۔۔ دل بدن گھٹا ہوا۔۔۔ ڈھیلے ڈھالے لباس میں۔۔۔ سیدھی چوٹی گوندھے بے آواز قدموں سے اندر باہر گھومتی لڑکی۔
 نہ کوئی رنگ نہ ترنگ لڑکیاں کوئی ایسی ہوتی ہیں۔ دفع۔۔۔ نوال نے سوچا اس نے نونین کے معمولات کو نوٹ کیا تھا۔

نوال کے جی، زمری کی چھوٹی بیٹی نہیں تھی مگر دونوں ماں بیٹی صبح اہتمام سے اٹھ جاتیں جیسے نوال کو تیار کروائے بھیجنا ان کا اولین فرض ہو۔
 نونین اس کا بیک چیک کرتی اور فائل کو سامنے رکھتی۔
 نانو کا دل چاہتا وہ انداز اٹھا اپنے ہاتھوں سے اس کے منہ میں ڈالیں۔ (بلکہ اگر ہو سکے تو بچ بکس بھی بنا دیں) پونیاں کس دیں۔
 وہ نماز کے بعد اہتمام سے پکچن میں جا کھڑی ہوتیں۔
 دیر ان زندگی میں نوال نام کی ہلچل نے رنگ ہی رنگ بھر دیے تھے۔
 نوال بظاہر ایک لاپالی، لڑکی دکھائی دیتی تھی خود میں مگن اپنے دل کی کتبی۔ جبکہ درحقیقت وہ بے حد حساس، نرم دل، لڑکی بھی مگر اس کی اضافی خدا داد خوبی یہ تھی کہ وہ کھول پر تکیوں میں منہ دے کر روتی نہیں تھی۔ ہار تسلیم نہیں کرتی تھی۔
 آج چھٹی تھی۔ نہنت بیگم نے نہاری بنائی تو ایک ڈونگا انہیں لے لیے بھی بھر لیا۔ وہ بے خود کو بھیج رہی تھیں کہ آج چھٹی ہے۔ اخطب بھی گھر میں ہو گا اور چھٹی کے دن دیر سے اٹھنے کے باعث یہ ان کے ناشتے کا وقت ہو گا۔
 ”انہیں یہیں بلا لیں نانو۔۔۔ سب مل کر کر لیں گے۔“ نوال صوفے پر اوڑھ لی پڑی تھی۔
 ”نہیں۔ بس بیچ رہے ہیں۔ ہم مل کر کریں گے۔“ نونین نے قطعیت سے کہا۔
 نوال کی سوال یہ ناگہاں نانو پر نکلیں۔
 ”وہ دراصل تمہارے تانا کے انتقال کے بعد بھائی صاحب اور اخطب نے بھی ادھر اندر آنا بالکل چھوڑ دیا ہے۔ بہت مجبوری ہو تو۔۔۔“ نہنت بیگم نے ذرا اٹک کر کہا۔
 ”وہ انہیں تو ہر وقت گھسارتا ہے۔“ نوال کو آگ لگی۔
 ”بیٹا! وہ بچہ ہے تو اسوں پوتوں کی عمر کا ہے گھر کا فرد

ہی لگتا ہے جبکہ۔۔۔ زینت بیگم نے جملہ ادھورا چھوڑا۔

”جبکہ۔۔۔؟“ نوال نے سوالیہ نگاہیں ماں بیٹی پر جمادیں جو ایک دوسرے کو دیکھ کر خاموش تھیں۔

”بیٹا۔۔۔ زینت بیگم نے حلق تڑکیا۔ اشتیاق بھائی میرے ہم عمر ہیں۔ سالوں کا ناتا ہے مگر دنیا۔۔۔ وہ تھوڑا سار لکیں۔

”مگر ناتا! بندے کا دل صاف ہونا چاہیے نا۔۔۔ میں اپنے اعمال کی خود ذمہ دار ہوں۔ میں دنیا سے کبھی نہیں ڈرتی نا تو۔۔۔ کیا نعمان بھائی آپ کی اس مشکل سے واقف ہیں؟“ سے دھیان آیا۔

”جب کوئی دور ہو جاتا ہے وہ واقف رہ جاتی ہے نہ مشکل کشائی۔“ توین کا جملہ سرگوشی نما تھا۔

”اور اخطب اس لیے نہیں آتے ہیں کہ وہ نوین خالہ کے ہم عمر ہیں۔“ نوال نے جیسے سراپکڑ لیا (سو طے ہوا کہ نہاری اسے ہی وہاں لے کر جانا ہوگی)

”نہیں۔۔۔ زینت بیگم کے منہ سے گراہ آمیز اختلاف ابھرا۔“ اسے نوین نے آنے سے منع کر دیا۔

”مگر کیوں۔۔۔؟“ اس نے باری باری دونوں کا چہرہ دیکھا۔ مگر زینت بیگم جیسے اب کچھ اور بولنا نہیں چاہتی تھیں۔ یہ فالٹو کا جملہ بھی بس یونی منہ سے نکل گیا تھا جیسے۔ نوین کڑے تیوروں سے ماں کو گھور رہی تھی۔ اس نے پچھلی بار وقت رخصت اخفش انعام کے ایک انکشاف پر اپنی ازلی دعویدار فطرت کے پیش نظر کچھ دعوے کیے تھے۔

”ارے سنو! اتنا ہنڈ سم بندہ اور ابھی تک شادی نہیں کی۔ کمال ہے کیوں نہیں کی؟“ اس نے اخطب اشتیاق کی سحر انگیز تصویر دیکھ کر بڑے دھڑلے سے پوچھا تھا۔

اور جواب میں اخفش انعام نے کتے دل جلے انداز میں انسا سوال جڑ دیا تھا۔

”تمہاری خالہ بھی تو اتنی خوب صورت امارت ہیں۔ انہوں نے اب تک شادی کیوں نہ کی؟“

اور اس نے کہا تھا کہ، کیا ان دونوں باتوں کا آپس

میں کچھ تعلق ہے؟“

تو اخفش نے سر زور زور سے اثبات میں ہلایا تھا۔ ”میں اصل بات معلوم کر سکتی ہوں اخفش۔“ وہ کوئی مشکل کام نہیں ہے۔ مگر کیا تم انجام تک پہنچا سکو گی؟“

اور نوال ضمیر نے سر زور سے ہاں میں ہلایا تھا۔ اور اسے یاد تھا کہ اس نے یہ کام کرنا ہے۔ باقاعدہ پلان نہیں تھا۔ کب کیسے اور کیوں؟ لیکن۔۔۔

”اب وہ وقت آچکا ہے نوال!“ اس نے خود کو مخاطب کیا۔

وہ جن حالات و واقعات سے اس نے آگاہی حاصل کی تھی وہ بے حد روایتی اور عام سے پھٹ پھرتے مگر ناتو کا یہ جملہ۔

کہ اخطب اشتیاق کو خود نوین نے اپنے گھر آنے سے منع کر دیا۔ اپنے اندر بہت اسرار معنی کمانی لیے ہوئے تھا۔

”تو چلو نوال ضمیر۔۔۔ آج سے یہ کام شروع کیا جائے۔“ اس نے نہاری کا ڈونگا اٹھا لے ہوئے خود کلاہی کی۔

بیخبر انجام کی طرف پہلا قدم۔

بڑی ادھیڑ بن کے عالم میں اس نے اخفش کے گھر میں قدم رکھا تھا۔

اسے مسلسل یہ احساس ہو رہا تھا کہ وہ کچھ دیر کر چکی ہے۔ اپنے دعووں کی تکمیل کے لیے۔ لیکن خیر اتنی دیر بھی نہیں۔ جس وقت جو کام شروع کر دیا جائے وہی اس کا اصل وقت ہوتا ہے اور یہاں تک میرا خیال ہے سب سے باخبر شخص اور کام کا بندہ اخفش انعام ہے اور ضرورت کے وقت گھر سے بھی باپ بنالینا پڑنا ہے۔ خود کو عقل دیتے ہوئے اس نے سامنے گدھے کو بھی دیکھا جو معذور ہاتھ کے باعث

الے ہاتھ سے ساس پین میں پانی بھر رہا تھا چائے بنانے کی کوشش۔ صوفیہ اشتیاق اخبار دیکھ رہی تھیں اور

اخطب اشتیاق صوفیہ پر بند آنکھوں کے ساتھ

بٹھ کر پوچھ رہے تھے۔

”بس وہ مصوفیت۔“ نوال جی گڑ بڑا گئی۔

”آپ پر یہ رنگ بہت سوٹ کر رہا ہے۔“ اس نے تیزی سے کہا۔

تیز پیلے رنگ کا ٹراؤزر شرٹ۔ سرے والی کالی

تک سے بیگم کی وہیل چیز کے برابر کرسی جمار بیٹھے

بیٹھے تھے۔ چائے ملتی تو آنکھ کھلتی ناں۔۔۔ اور ٹڈے ہاتھ کی چائے۔۔۔ آہ

”خفش سے دوستانہ تعلقات وقت کی اہم ضرورت ہیں نوال۔!“ اس نے سوچا۔ ابھی وہ آگے بڑھے گی اور اس کے ہاتھ سے برتن لے کر

چائے بنائے گی۔ ایک احسان اس پر اور ایک ان پر جو اونگھ رہے ہیں وہ دے قدموں اخفش کے سین سر پر پہنچنے والی تھی۔ چونکا کے لیے مگر۔۔۔ ہائے

خود بری طرح چونکی بلکہ ڈونگا کرنے سے بڑی مشکل سے بچا لی۔

”تم تو ملتی ہی نہیں۔“ بسورے لہجے کا زبردست شکوہ اشتیاق احمد اس کے سر پر کھڑے تھے اور اس کی چیخ نہا پائے پر تینوں افراد ہی متوجہ ہو گئے۔ صوفیہ بیگم نے اخبار رکھ کے بھرپور خیر مقدمی مسکراہٹ سے اسے دیکھا۔

اخطب کی نیندا اڑ گئی۔ اب وہ بیدار تھے۔

خفش نے ساس پین واپس رکھ دیا۔ اس کی کوئی بھی جی جھوٹی کمزوری نوال کے سامنے کیوں عیاں ہو۔

خوامخواہ۔

”یہ۔۔۔ یہ۔“ نوال نے ڈونگا ان کی جانب بڑھا دیا۔

”آپ کے لیے۔“

”ہاں ٹھیک ہے۔“ انہوں نے ڈسکن اٹھا کر ایک لمبا سس پھیچا۔ ”نوین نے بنائی ہے۔“

وہ خوشبو ہی سے بنانے والی کو پہچان گئے۔ سب کو مطلع کیا۔

”اتنے دنوں سے آئیں کیوں نہیں۔۔۔؟“ اب وہ ڈبٹ کر پوچھ رہے تھے۔

”بس وہ مصوفیت۔“ نوال جی گڑ بڑا گئی۔

”آپ پر یہ رنگ بہت سوٹ کر رہا ہے۔“ اس نے تیزی سے کہا۔

تیز پیلے رنگ کا ٹراؤزر شرٹ۔ سرے والی کالی

تک سے بیگم کی وہیل چیز کے برابر کرسی جمار بیٹھے

تک سے بیگم کی وہیل چیز کے برابر کرسی جمار بیٹھے

اور اسے بھی بیٹھے کا اشارہ کیا۔

”تم نے بھی مجھے۔۔۔ بے بی پنک کلر کے ٹریک سوٹ میں نہیں دیکھا۔ اس میں تو میری اسکن ایسے شان کرتی ہے کہ کیا بتاؤں۔۔۔ پتا نہیں لگتا۔ اسکن کون سی ہے اور ڈریس کہاں ہے۔ کل آنا میں وہی پہنوں گا۔“

نوال کی آنکھیں پھیلیں۔ اس نے تینوں کو دیکھا جو ہمہ تن گوش تھے۔

”آپ روز جاگنگ پر جاتے ہیں جب ہی آپ کی فٹنس بہت خوب ہے۔“ گڑ بڑاتی نوال نے ٹاپک بدلنے کی غرض سے کہا۔

”فٹنس۔۔۔ حق ہا۔“ ایک لفظ کہہ کر وہ صدقاتی مراقبے میں چلے گئے۔

”یہ تو کچھ بھی نہیں۔۔۔ تم کبھی بیس سال پہلے مجھ سے ملتیں۔ پھر دیکھیں میری فٹنس کا عالم۔“

”بیس سال۔۔۔ پہلے۔۔۔ میں پیدا نہیں ہوئی تھی۔۔۔ انکل!“

”کیا۔۔۔؟ تم نے مجھے انکل کہا۔!“ وہ شدید صدمے میں آگئے جیسے۔

”جی۔۔۔ اس نے نا سبھی میں اقرار کیا۔

”سب کچھ کہنا مگر۔۔۔ انہوں نے شعوری وقفہ دیا مجھے انکل مت کہنا۔“ وہ بالکل خفا ہو گئے تھے۔

”ت۔۔۔ ت۔۔۔ ت۔۔۔ تو پھر میں آپ کو کیا پکاروں گی؟“ اس نے انہیں دیکھا اور پھر سب کو۔

”آپ‘ یہ‘ میں‘ وہ‘ یہ‘ سب کیا ہے تم میرا نام کیوں نہیں لیتیں؟“

اشتیاق احمد نے بڑے شکوہ کنال انداز میں پوچھا آخری لفظ تک پہنچتے انداز ڈپٹے جیسا ہو گیا۔ بہت دیر سے خاموش مدہم مسکراہٹ چہرے پر سجائے بیٹھی صوفیہ بیگم نے پکلی بار رد عمل ظاہر کیا۔

آسمان کی طرف مدد طلب نگاہوں سے دیکھا اور سر ہاتھوں پر گر لیا۔

اس کے چہرے کا زلزلہ۔۔۔

اشتیاق احمد نے قہقہہ لگایا اور پھر لوٹ پوٹ ہو

گئے۔

”مذاق کر رہا تھا یار۔ تم انکل شکل کا مٹنا پٹاؤ۔“
سیدھے سیدھے ادا واجان کھوا بخش کی طرح یا پھر
تانا جی!“

سرے سے لدی شریر آنکھیں۔۔۔ شریر انداز
نوال کھکھلا کر ہنس دی۔

”یہ آپ اتنا سرمہ کیوں لگاتے ہیں؟ یہاں کراپی
میں بسوں میں آواز لگا کر سرمہ بیچنے والے بھی اس سے
کم ہی لگاتے ہوں گے۔“ اس نے جوانی حبلہ کیا۔

”یہ سرمہ۔۔۔ ہلکا تو کچھ بھی نہیں۔ تم کبھی مجھے
جوانی میں ملتیں جب میں کالج میں تھا۔ پختاب
یونیورسٹی کے ہاسٹل میں میرے فیلو مجھے تاکا سری کہتے
تھے۔ اب تو وہ آنکھ ہی نہ رہی۔ جس کی حاشیہ آرائی
تھی۔ آہ۔۔۔!“

ان کے پر ملال انداز اور غم زدہ چہرے نے تو اس بار
نوال کا منہ کھول دیا تھا۔ حاضریں اشتیاق صاحب کے
جملے سے زیادہ نوال کے چہرے سے لطف اندوز ہو رہے
تھے۔

نانو کے کمرے سے تیز اور اونچا بولنے کی آوازیں آ
رہی تھیں۔

اوپٹی اور تیز آواز نوین کی تھی اور چونکہ نوال نے
کبھی اسے اس طرح بولتے سنا نہیں تھا۔ سو ذرا
متذہب ہو کر وہ آواز کے تعاقب میں نانو کے کمرے
تک پہنچی تھی۔

نہت بیگم کی نگاہوں میں بے چارگی، دل گرفتگی،
چراغی اور افسوس تھا۔ وہ خاموشی نوین کو تک رہی
تھیں پھر نگاہیں جھکا لیں۔

دوسری جانب نورین کا چہرہ تمہارا تھا۔ خفا، بے زار،
جارجیت کا ایک رنگ بھی چھبنا تھا۔ وہ ہلا دہی ہی
سیٹ کمرے کو دوبارہ سے سیٹ کر رہی تھی۔ نیکیے
چھاؤٹی، بیڈیٹ کو جاتی۔۔۔ وہ کچھ بول بھی رہی
تھی۔

”جب میں ایسا کچھ چاہتی ہی نہیں ہوں تو پھر کپ
کیوں ہر مہینہ یہ اہتمام کر کے بیٹھ جاتی ہیں۔“
”زندگی اکیلے نہیں گزرتی۔“

”گزار تو رہے ہیں نا۔۔۔ اور اکیلے کب نہیں اور
آپ ہیں اور اب تو نوال بھی ہے اور۔“

”تم ہو یہی سب سے بڑی فکر ہے۔ نوال ہے۔
دو چار سال تک کا تعلق اور میں۔۔۔ مجھے تو اپنی عمر کا
یقین بھی نہیں کہ رات دیکھوں گی بھی کہ نہیں۔“

نہت بیگم نے حقیقت بیانی کی حد کر دی۔
نوین کے تیزی سے چلتے ہاتھ ٹھکے تھے۔ مگر پھر مجھے
اس نے آنے والے کسی محسوس خیال کو تیزی سے
جھٹکا اور ساتھ ہی تکیے پر بھی زور کا ہاتھ جھپایا۔

”شادی کرنی ہی پڑتی ہے نوین۔۔۔!“ نہت بیگم کا
لہجہ شکست خورہ ہو گیا۔

”اور۔۔۔ کئی لوگوں کی شادی ہوتی ہی نہیں۔“ وہ
ترنٹ بولی تھی۔

”میں نہیں چاہتی کہ تم ان کئی لوگوں میں شامل ہو
۔۔۔ خدا نخواستہ۔“ نہت بیگم دلی ہی گئیں۔

”ہمارے چاہنے نہ چاہنے کی جیسے بڑی اہمیت ہے
نا۔۔۔ توین کالج زخمی ساتھ۔“

”ہے نا اہمیت۔۔۔ نہت بیگم ایک نئے وارے
سے اٹھی تھیں۔

”مگر تم تو وہ بھی نہیں مانتیں۔“ وہ دھیمی ہو گئیں۔
ناکام۔

”وہ باب ختم ہو چکا نا۔۔۔!“
”مگر یہ وہ اب بھی زندگی کی کتاب کا ایک حصہ
۔۔۔ نہت بیگم نے برجستگی سے کہا تھا۔

نوین کو چپ لگی۔ وہ اسی کی ماں تھیں خاموش،
بوڑھی بے بس مگر۔

”اکثر کتابوں میں کچھ باب غیر ضروری ہوتے ہیں۔
انہیں روٹی و بے دھیانی میں اگر پڑھ بھی لیا جائے تو
کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ وہ امتحان میں آنے ہی نہیں
ہوتے تو پھر مزید وقت کا ضیاع کیوں؟“

”کتاب کا حق ہے کہ اس کے ہر باب کو عزت دی

جائے غیر ضروری اور ناق کو پھاڑ کر الگ تو نہیں
کرتے وہ ہمیشہ جڑے رہتے ہیں۔“

”میں نے کب کہا کہ میں پھاڑ چکی ہوں یا پھاڑوں
گی۔ بس میں ان صفحات سے بہت آگے نکل آئی امی
۔۔۔ لکھا پڑھا سب بھول گئی۔ مجھے اب کوئی امتحان
پاس نہیں کرنا۔ کوئی میڈل نہیں جیتنا۔ مجھے بس
زندگی کے دن چاہیے ہیں۔ آپ۔۔۔“

”یہاں کون حج بیٹھا ہے نوین؟“ نہت بیگم کی
آواز بھرا گئی۔ شکست خورگی نے چہرے کو تاریک کر
دیا تھا۔ جو اچھے جملوں پر داد دے گا۔ میں جملے بازی میں
تم سے مقابلہ نہیں کر سکتی۔ تم زیادہ پڑھی لکھی اور
قابل ہو۔ میرا تو بس ایک سوال ہے۔ ضد چھوڑ کر اپنا
گھر سالو۔ مجھے سکون کی نیند سونا ہے۔ بس ایک انکار
کے علاوہ کچھ بولتیں نہیں نہ وجہ۔۔۔ نہ اعتراض۔۔۔

کچھ تو کہہ دو۔۔۔“ ان کی آنکھیں بھیگ گئیں تو۔۔۔
نوین بھی ہاری ہاری سی بیڑر تک گئی۔

خاموشی سے سب منتقلی نوال کے لیے قدم اٹھانا
دوبارہ ہو گیا۔ کیا وہ واپس پلٹ جائے۔ اس کی کچھ سمجھ
میں نہیں آتا تھا۔ نہیں نوال ضمیر پلٹنے کا نام نہیں۔

”آج حج میں کچھ خاص اہتمام ہونا چاہیے
مہدولت بڑے دنوں بعد گھر میں ہوں گے۔“ وہ شہانہ
لہجے میں کہتی کمرے میں یوں داخل ہوئی کہ جیسے
چھت سے ٹپکی ہو۔۔۔ دونوں بڑی طرح چو گئیں۔

نہت بیگم کے چہرے پر لمبی سی مسکراہٹ لہرائی۔
جبکہ نوین نے تیزی سے چہرے پر ”سب اچھا ہے“ کا
وانہو پھیرا باش نظر آنے کی بھڑکی تو بخش۔

”واؤ۔۔۔ پکچر۔۔۔!“ نعرے کے ساتھ ہی اس نے
درمیانی تپائی پر بڑی چند تصاویر اٹھائیں۔

”اچھا آ آ۔۔۔“ اس نے تصویر پٹی تو پیچھے درج
بایوڈٹا سامنے آگیا۔

”تو یہ وہ تصاویر ہیں جو رشتے کرانے والی آئینوں
کے پرس میں ہوتی ہیں۔ لیکن یہ یہاں ہمارے گھر
میں کیا کر رہی ہیں؟“ اس نے خود ہی بولتے بولتے آخر
پوچھ ہی لیا۔ پھر دوبارہ جواب کا انتظار کیے بغیر شروع

ہوئی۔

”اب یقیناً“ چوائس کا مشکل مرحلہ ہو گا۔
تصویریں ماشاء اللہ ہیں لپٹیں ہی اتنی اچھی۔۔۔“ اس
نے تصویر کو الگ کیا اور ٹیبل پر سجایا۔

”دیکھئے۔۔۔ ان تینوں کے یہ جو فارغ البال ہیں ان
کے ان چٹیل میدانوں پر اعتراض کرنا بے وقوفی ہے
جب حورم سلطان کچے سکیمان پر اور خزینہ پھینکی،
ابراریم پر دل و جان سے فدا ہو سکتی ہیں کہ مرنے مارنے
پر آجائیں تو آپ اور میں کون ہوتے ہیں اعتراض
کرنے والے۔۔۔“ میرا سلطان۔۔۔“ انہوں نے لیے امید
صبح ہے ایک نئی زندگی۔ لڑکیاں بھول گئی ہیں باہر علی،
دھتک روشن، رنویر نگہ کے بالوں کو۔۔۔ کچے فیشن
میں ان ہیں۔“

نہت بیگم اس کی فراٹے سے چلتی زبان سن کر
گنگ تھیں جبکہ طرز بیان نے نوین کے چہرے پر
مسکان بکھیر دی تھی۔

اس کے انداز سے اس کا فطری لا باہی پان۔ جھلک رہا
تھا۔ لیکن درحقیقت وہ بڑی گہری نگاہ سے ہر چیز کو دیکھ
رہی تھی۔

سب سے پہلا لفظ ذات تھا جو سب کی وہی تھی جو
تانا جان کی تھی۔ کئی عمروں کے حرم۔ خزانہ۔۔۔
تھری پین پن کر جا کر بنائے گئے ہال فوٹو اسٹوڈیو کے
بیک گراؤنڈ والی پکچر۔ جن پر پہلی نگاہ ڈالنا ہی دل
گردے کا کام تھا۔

ایک صاحب نے توحہ کر دی۔ رینڈوے تھے اور
ایسی تصویر بھیجی تھی جس میں مسکین ہو جانے والے
دونے کچے بھی ہمراہ کھڑے تھے صاحب حیثیت تھے اور
سچائی کے علمبردار بھی۔ جلی حروف میں درج تھا۔

”کوئی ڈیمانڈ نہیں۔۔۔ بس ایک نیک درازند“ عمر
35 سے زیادہ نہ ہوا مگر تعلیم یافتہ، گھریلو سلیقہ شعار،
صوم صلوتہ کی باند کو توری دو مینہ کار شہرہ در کار ہے جو
بچوں کو ماں کا حقیقی پیار دے سکے۔ (شادی بچوں کے
لیے ہی کی جارہی ہے)۔

”میرے خیال میں آپ کو اتنی ہی قانع رشتے کی

ضرورت تھی۔“ اس نے چہا چاکر دونوں کو دیکھا۔
”پھر کون سا فاسل کرنے کا ارادہ ہے؟“
”یہ مانتی ہی نہیں۔“ زینت بیگم نے مجھے لمحے میں
کہا۔

”واحد صحیح کام جو یہ کر رہی ہیں۔“ وہ تاسف آمیز
لمحے میں کہتے ہوئے کھڑی ہو گئی۔ ”ان کے علاوہ اور
کوئی پرنسپل نہیں ہے؟“

”ہیں تو مگر۔۔۔ کاسٹ (ذات) الگ ہے اور
تمہارے نانا جان کی پہلی شرط کاسٹ ہوتی ہے۔“
”نانا جان؟“ وہ ہلکا سا چلائی۔ ”وہ یہاں کہاں سے آ
گئے۔ وہ فوت ہو چکے ہیں ناؤ؟“

اس نے ان کی پیٹے جبری پر سر پٹیا تھا۔ وہ دونوں کو
باری باری گھور رہی تھی۔ جنہوں نے ایک دوسرے کو
دیکھا اور پھر نظریں چرائی تھیں۔

”اور کیا اب اس قسم کے رشتے فاسل کیے جائیں
گے۔ خالہ کیا ایسے پائوٹرز روکتی ہیں اور دوسرے۔“
اس نے زار رک کر دونوں کو گھورا۔ ”جتنا میں نانا جان

کو جان چکی ہوں اس حساب سے تو خالہ کی شادی کم از
کم پندرہ برس پیشتر کر دی جانی چاہیے تھی۔ پھر اتنی دیر
کس لیے۔ پہلے کیا سب سو رہے تھے؟“

نوبین کے چہرے پر عجیب سا اثر آرکا۔ نوال منہ
پھٹت تو تھی۔ مگر وہ اتنا تھیر مار کہ سوال بھی کر سکتی تھی
کہ۔۔۔

دونوں کی خاموشی نے نوال کے غصے کو بھر دیا۔

”اب جواب کیوں نہیں دیتیں؟“

”پہلے تو یہ بہت چھوٹی لگتی تھی۔ اس طرف
دھیان نہ گیا۔ پھر تمہارے نانا ذات برادری کو بہت
اہمیت دیتے تھے تو۔“

”اوہ شٹ! نوال نے بھنکارا پنا ہاتھ سر پر مارا تھا۔

”پہلے تو خاندان ہی سے باہر نکلنے کو تیار نہیں تھے۔
پھر کئی سالوں میں اس بات پر قائل ہوئے کہ چلو باہر
ہی کرتے ہیں لیکن ذات برادری میں سوہ تھے تو مجھے

بھی احساس نہ ہوا اور اب لوگ کہتے ہیں۔ کچھ بچائی
نہیں۔ سارے رشتے ایسے ہی آتے ہیں۔ ایک تو
رشتوں کا ویسے ہی کال پڑا ہے اور پھر اگر اس پر اثر
باندھ دی جائیں تو سمجھو۔ جس کے ڈھیر سے سوئی
ڈوٹو۔“

زینت بیگم کا لہجہ اتنا مدہم تھا جیسے وہ تنہا بیٹی خود
کلامی کر رہی ہوں۔ یادداشت نفل رہی ہوں۔
”ایسا کیسے ہو سکتا ہے ناؤ۔ خالہ میں کس چیز کی
کی ہے؟“ وہ تھیر کے باعث انک انک کر بول رہی
تھی۔ ”زیادتی ہی زیادتی کہہیے۔ شکل صورت

رنگ روپ، تعلیم، خاندان، شرافت، نجابت۔“
نوبین کی نظریں سامنے دیوار پر لگی تھیں اور چہرہ
یوں بے تاثر تھا جیسے کچھ سنائی نہ دے رہا ہو۔

”رستے تو۔۔۔ اور ہیں بھی مگر وہی ذات برادری اور
تمہارے نانا کی شرائط۔“

”نانا اب نہیں رہے ناؤ۔!“ نوال نے سر بیٹ
لیا۔

”تو۔۔۔؟“ نوبین نے یکدم سر اٹھا کر سوال جڑ دیا اور
اس کے ”تو“ کے اندر بہت کچھ تھا جتنا پوچھتا، ”نانا“
دھمکا تا۔

”تو یہ کہ آپ اپنے حساب سے چیزوں کو فاسل
کریں جو آپ کو مناسب لگے۔“ نوال کے آگے کھینچی
سلینج لگی تھی۔

نوبین نے نگاہیں اس کے چہرے پر نکادیں۔ ”تم پہلی
ہو نوال!“ ذرا توقف سے بولی۔

نوال نے سینے پر ہاتھ لیپے۔ وہ عین سامنے جا کھڑی
ہوئی۔

”اور آپ بے وقوف ہیں خالہ!“ اس نے اسی کے
لمحے میں مگر جارحانہ انداز میں جواب دیا۔
”مجھے اپنی بے وقوفی عزیز ہے۔ تم اس معاملے

میں مت آؤ۔“ وہ دھشتی سے کہتی باہر نکلی تھی۔
”ہائیں!“ نوال نے ہلکے پورے کو دیکھا اور پھر آندہ
پوچھتی ناؤ کو۔

رات گرم اور یو جھل تھی یو پی ایس سے چلتا پکھا
دم توڑنے کو تھا۔ نوال کو گھری لگی۔ جاس لگی اور پھر
بھوک۔ وہ ذوقی جھوٹی پکچر تک اتنی۔ فریق سے
انگور کی پلیٹ اٹھا کر ڈاسٹ بکٹ میں پڑا۔
کامن کی کھلی کھڑکی سے ہوا آ رہی تھی۔

چپ چاپ بیٹے شری رات۔ اس نے رات کو نام
دیا۔ لیکن نہیں کہیں بہت جلد سرنج رہے تھے۔ اس
کا سونا ذہن پوری طرح بیدار ہو گیا۔ واقعی بڑی ہی
مدہم آواز گونج رہی تھی۔

”لو آگئی۔ ان کی یاد وہ نہیں آئے۔“
وہ آواز کے تعاقب میں گئی تو لان میں نکلی۔ آواز
نہایاں ہوتی جا رہی تھی۔

”ہیں۔!“ وہ چونک کر پوری طرح بیدار ہو گئی۔
کین کی کرسی پر نوبین براجمان تھی۔ رات کے اس
پہرہ ہی دل بہلا رہی تھی۔ آنکھیں بند تھیں اور سینے

پر ایک ڈائری دھری تھی۔ وہ دبے قدموں نوبین کے
پچھے جا کھڑی ہوئی۔ نوال نے دیکھا وہ سوچتی تھی۔
چاندنی رات میں اتنی روشنی تھی کہ وہ قیاس کر

سکتی۔ نوبین کچھ لکھ رہی تھی۔ کیونکہ ایک غزل کے
مصرعے کا دھور اپن نہایا تھا۔

”واؤ۔ چاندنی رات۔ اولڈ غمگین ساگ۔“
اور غزل کتنی ایک لڑکی واہ کیا میں ہے۔
اس نے احتیاط سے ڈائری اس کے ہاتھ کے نیچے

سے نکالی۔

اعصاب کو شل کرنے والی موسیقی کا گلا گھونٹا اور
موبائل ماریج کھلے ورق پر ڈالی اور بدھتی چلی گئی۔
”ہائے!“ اتنی آواز۔ خشک۔ مرنے کے بعد بھی بندہ

لم از کم اس سے زیادہ زندہ غزل کہے۔ آف اس نے
دل کر سوچا۔
ڈائری کے ورق پھوٹنے کے دیکھے تو اکثر میں کچھ نہ

کچھ لکھا نظر آیا۔ نوال نے ایک اور نظم جیتی۔
ایسی نظم جو سی این جی پب پر ساری رات کھڑے
رہنے کے بعد باری آنے پر پتا لگے جی کیس ختم ہو گئی
نہ بھر بھی اس نظم سے اچھا ہی سوچے۔

گواہتا موبے میں خالہ کی غزلیں سنوا کر قبول جرم
کروایا جاسکتا ہے۔
چودہ سالہ قید کے بجائے۔ یہ نظمیں ہی صبح شام
پڑھنے کو دی جائیں تو۔۔۔

دفعتا! اسے ایک سایہ سا محسوس ہوا۔ اخفش کی
گیلری سے نظر آتا ایک وجود۔ نوال جہاں کھڑی تھی
وہاں سے وہ گیلری میں کھڑے شخص کو نظر نہیں آ سکتی
تھی۔ مگر کین کی کرسی پر بیٹھا شخص اس سائے کو بغور

دیکھ سکتا تھا۔
یہ کراہ اخفش کا تھا۔ مگر سایہ اخفش کا نہیں تھا۔
ریٹک پر دونوں ہاتھ جما کر ساکت ہو جاتا۔ پھر
سگریٹ کے شیش لیتا ہوا یہ اخطب کے علاوہ اور کوئی

نہیں تھا۔
تنبذب کا شکار نوال بری طرح چوکی۔
مرہ خانے میں رکھی جانے والی وہ نظم جسے نوال نے
ابھی پڑھا تھا۔ اس کا عنوان تھا۔ ”سایہ“

یعنی مائی گاڈ اس نے خالہ کو گھورا تھا۔
☆☆☆

”میں سوچ رہی ہوں خالہ۔ یہ لوگ اپنی کتابوں کا
انتساب کس سوچ کے تحت۔۔۔ لوگوں کے نام کرتے
ہیں؟“ نوال بڑے اچھے موڈ میں نوبین کے بیڈ پر

اونڈھی لیٹی کتابوں کے انتساب پڑھ رہی تھی۔
”کوئی بھی سوچ جو ان کے دل میں اس وقت آتی
ہو۔ یا جو حق دار ہوں۔“

”حق دار۔۔۔ حق دار سے تو یوں لگتا ہے جیسے
چندے کی تقسیم ہو۔ لیکن پھر بھی۔ اب دیکھیں یہ
ایک امریکن عورت نے کتاب لکھی اور انتساب کر دیا

اپنے کتے کے نام۔“
”ارے!“ نوبین حیرت زدہ رہ گئی۔ ”ان خاتون سے
ملنا پڑے گا۔“

”الٹی باتیں ہیں آپ کی۔“ نوال کا موڈ آف ہوا۔
”اس کتے سے ملنا پڑے گا خالہ!“ نوبین زور سے
ہنس دی۔

”اچھا اگر آپ کبھی کوئی کتاب لکھیں تو انتساب کس کے نام کریں گی؟“ وہ گھبر گھار کے نوین کو مطلب پر لائی۔

”میں۔۔۔ میں نے کبھی سوچا نہیں۔“
”یہ خالہ بھی ناں آسانی سے ہاتھ نہیں آتیں۔“

نوال نے دانت پیسے
”اچھا اگر تم کبھی کتاب لکھو تو کس کے نام کرو گی؟“

”نوجی یہ کوئی سوال ہے اگر کیوں؟ میں عنقریب ایک کتاب لکھنے والی ہوں۔“ اس نے مضبوط لہجے میں کہا۔

”کس موضوع پر۔۔۔؟“ نوین نے دلچسپی سے پوچھا۔

”نوال ضمیر کے لیے موضوعات کی کیا کمی میں ہر موضوع پر سیر حاصل تبصرہ کر سکتی ہوں مگر خیر آپ کی معلومات کے لیے۔۔۔“

فی الوقت پیش نظر دو موضوعات ہیں بس یہ دن کرنا باقی ہے کہ پہلے کون سا چنوں۔۔۔“ اس نے ادبانہ توقف کیا۔

”گھریلو آلات کی مرمت خواتین خود کریں۔“ نوین کے چہرے پر ستائش ابھری نوال سے اچھی کتاب اس موضوع پر اور کوئی نہیں لکھ سکتا تھا۔

”اور دوسری کتاب تخریبی نوعیت کی ہے مگر۔۔۔ خیر مردوں پر گھریلو تشدد کے طریقے بہت متاثر ہو کر سختی نوین بھونچکی رہ گئی۔

”یہ کیسی کتاب ہوگی؟“ نوین کی آواز میں ہکا بھٹا آئی۔

”اس میں یہ ہو گا کہ کیسے خواتین ذرا سی بھی حکم عدولی پر مردوں سے باز پرس کر سکتی ہیں۔ انہیں دھمکا سکتی ہیں اور سدھار سکتی ہیں۔“

”وہ کیسے؟“ نوین کا تعلق خشک ہونے لگا۔

”دیکھئے! پہلا اصول تو یونیورسل ہے کہ پہلے پیار سے اور بعد میں مار سے لیکن مرد ذات آغاز پر نہیں انجام پر تین رکھتی ہے لہذا۔“ وہ ٹھہری۔

”عورتیں مارنے کے لیے کچھ بھی استعمال کر سکتی ہیں جو انہیں میسر ہو۔ لیکن کب اور کہاں مارنا ہے یہ کتاب سے پتا لگے گا۔ دو باتیں پیش لفظ میں لکھوں گی۔“

”جرم کر کے جانے وقوع سے ترنت غائب ہونا۔“
اور دوسرے جرم کا نشان نہ چھوڑنا۔ یونو سیف سائیڈ۔“ نوال خاموش ہوئی۔

”اور ان کتابوں کا انتساب کس کے نام ہو گا؟“
”پہلی والی کا تو ظاہر ہے اپنے ڈیڈ ضمیر خان کے نام اور دوسری کا میں اپنے ہی نام کروں گی۔“

”بہت اچھا کرو گی۔۔۔ اور تمہاری ہی ہمت ہے جو اپنے نام کر لو گی جبکہ ایسی کتاب بے نام ہو تو زیادہ اچھا ہے۔“

”انفخش کی جلی کٹی آواز پروں چو نکلیں۔ نوین کی آنکھوں میں پانی تھا اور جڑے دکھ رہے تھے۔

”نہیں۔ میں اتنی بھی سیلفش نہیں۔ اگر تم کو تو تمہارے نام بھی کر سکتی ہوں۔ کیونکہ؟“ نوال بڑے محبوبانہ انداز میں مسکرائی۔ ”ایک انسپکشن تو تم بھی ہوتا ہے۔“

”مجھے تو تم معاف رکھو۔“ انفخش نے ہاتھ جوڑ دیے۔

”اور تم چھپ کر ہماری باتیں سن رہے تھے۔“
نوال کو دھیان آیا ”چھپنے کی کیا ضرورت تھی۔ تم آکر بیٹھ بھی سکتے تھے۔ میں کوئی منع کرتی۔ یونو علم بانٹنے سے بڑھتا ہے۔“

”رہنے دو لی جیو ہالڈور ابی بھلا۔“ انفخش نے جل کر دونوں ہاتھ جوڑنے کی سعی کی (پلستر جو بند تھا)

نوال نے فلک شکاف ققمہ لگایا۔ نوین بھی سمجھ کر ہنس دی انفخش نے بے خیالی میں خود کو چو کہہ دیا تھا۔

”چھت پر کیبل والا کھڑا ہے۔ آپ دیکھیں۔ اب چینلز صاف آرہے ہیں یا نہیں؟“ انفخش نے اپنی آمد کا مقصد بھی بتایا۔

”ارے ہاں۔۔۔“ نوین اچھل کر ٹی وی کی سمت بڑھی۔

”تو خالہ! آپ نے بتایا نہیں کہ آپ اپنی کتاب کا انتساب کس کے نام کریں گی؟“ انخفش نے بیٹھ کر ساتھ لگا تو اسے اس ساری کن ترانی کے اندر چھپا اصل مقصد یاد آیا۔

نوبین نے چونک کر اسے دیکھا۔ اس کا چہرہ کھلا ہوا تھا۔ اتنے دنوں بعد وہ دل سے ہنسی تھی۔ اسے بھانجی پر ٹوٹ کر ہنسا رہا تھا۔

”تمہارے نام کروں گی۔“ نوبین نے اس کے گال پر ہاتھ پھیرا اس کا چہرہ سچائی بیان کر رہا تھا۔

”واہ جی! نوال کا مقصد پورا ہو گیا تھا۔“

☆☆☆

”واقعی بعض لوگ اُلٹے ہاتھ سے بھی ہانڈی میں ڈوٹی گھما دیں تو ذائقہ آجاتا ہے۔“

نوال کی شوخ جاتی سرابھی آواز پر انخفش بدک کر چولے سے دور ہوا سیدھا ہاتھ تو پلاسٹر کے باعث گردن میں اٹکا ہوا تھا۔ وہ ڈھیروں سامان سلیب پر پھیلائے اُلٹے ہاتھ سے ڈوٹی گھما رہا تھا۔

صوفیہ بیگم اپنی وہیل چیسر سمیت کچن میں تھیں اور گود میں شیٹ چھڑا کر نماز کاٹ رہی تھیں۔ نوال کے سلام کا جواب اشارے سے دیا۔

”خوشبو خوشن دار ہے کیا بن رہا ہے؟“

”برائی!۔۔۔ اخطب کے دو تین دوست آرہے ہیں ڈنر پر۔“ صوفیہ بیگم نے بتایا۔

”تو وہ آپ کی پروین!۔۔۔ فرین! شرمین کہاں ہے؟“ اس نے اوپر اٹھ کر دیکھا۔

”وہ آج نہیں آئی ہے جب ہی تو۔۔۔ فون بھی کیا تو۔۔۔ فون بند جا رہا ہے۔“

”تو بازار سے منگوا لیتیں نال سب کچھ۔۔۔ اب دعوت کا اہتمام کسے ہو گا؟“

”ہاں اور دوا مل کر کر لیں گے۔ تمہیں فکر کرنے کی ضرورت نہیں۔“ انخفش پہلی بار بولا۔

”تو تمہاری فکر کروں رہا ہے۔ لیکن میں اس طرح کے تجرباتی کھانے نہیں کھا سکتی۔“

”تو تمہیں تکلیف کرنے کو کہہ کون رہا ہے۔“ اسے غصہ ہی آیا۔

”تو دادو! وہ معصوم و مظلوم چہرے لے کر صوفیہ بیگم کی سمت گھومی ”کیا میں چلی جاؤں۔“

”ارے کیوں کیوں!۔۔۔ تم بیٹھو بیٹھا!“ ساتھ ہی انخفش کو گھور آؤر تمہارا ہاتھ کیوں رک گیا ہے۔ نماز ڈال دو اندر۔۔۔“ انخفش متذبذب تھا۔ سر پر ہنری پلا جواری پر گھوم رہی تھی۔ سرخ سرخ نماز کھارہی تھی۔

انخفش نے اسے گھور کر دیکھا اور چولے کی سمت گھوم گیا۔ نوال کا بظاہر وہ بیان اوپر اوپر تھا مگر اس نے دیکھا۔ انخفش کام تو کر رہا تھا مگر کافی سستی اور تکلیف سے۔ وہ یقیناً ”اچھا کاتا ہو گا“ اس کے ہاتھ کے نکلے، سچ بولی تو وہ کھانسی چلی تھی۔

جب پوچھ پوچھ کر ہی پکارتا ہے تو۔۔۔ یہ کام تو وہ بھی کر سکتی ہے۔

”ہٹ جاؤ تم۔ میں کرتی ہوں۔“ اس نے یکدم ڈوٹی ہی اچکی۔

”خراب کرو گی تم سب کچھ۔“ وہ چلایا اور مدد طلب لگا ہوں سے دادی کو دیکھا۔

”کچھ خراب نہیں ہو گا۔ جو کام تم کر رہے ہو وہی میں بھی کر لوں گی۔ دادو سے پوچھ پوچھ کر ہی تو کرتا ہے

نال، کیوں دادو؟“ صوفیہ مسکرائیں۔ وہ انخفش کی تکلیف دیکھ ہی رہی تھیں۔

”پہلے بھی بتائی ہے برائی تم نے؟“ وہ حواس باختہ ہی ہو گیا۔

”تو کیا ہوا۔۔۔ کھاتی تو ہے نال۔“ وہ لا پرواہی سے بولی اور ساتھ ہی ڈوٹی گھمائی اور ہدایت بموجب آؤ

دھیمی کر کے ڈھکن رکھ دیا۔ اب گوشت دھونا تھا اور بھیکے چاول ابلنے تھے۔ صوفیہ کی ہدایات کے ساتھ ساتھ انخفش کی سہمی اور کبھی چلائی ہدایت بھی کانوں

پر تھی۔

”اب چاولوں کی گلدی نہ بنا دینا۔۔۔ کھلے کھلے ڈانگ الگ ہو۔“ انخفش نے سب سے مشکل مرحلے

کے آغاز میں کہا۔

”ارے واہ!“ اس نے ہاتھ نچلیا۔ ”تم کیا جانتے نہیں آج چاول بھی نوال ضمیر خان کے ہاتھوں میں اپنی خوش قسمتی پر نازاں ہیں۔ وہ تو پٹنے سے پہلے ہی کھل کر

گلاب ہو چکے ہیں کہ کہاں ہم اور کہاں یہ مقام اللہ اللہ“

صوفیہ بیگم کاتھ اور انخفش کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔

ایک سیدھی سادھی تنبیہ کا اتنا پلو دار جواب ”بھئی! بیگم! تمہارے صاحبزادے فرماتے ہیں

کوفتوں میں ابلے ہوئے انڈے بھی ڈال لیتا۔“

اشتیاق احمد کے کان سے فون لگا تھا۔ وہ بولتے بولتے اندر داخل ہوئے۔

”لیکن ہم تو کو فتنے بنا ہی نہیں رہے۔“ صوفیہ بیگم اور انخفش ہم آواز ہو کر بولے۔

”وہ جو پرسوں پروین نے بنا کر فریز کیے تھے۔ وہ ختم ہو گئے کیا۔“

”ختم تو نہیں ہوئے مگر کوفتوں کو ہینڈل کرنا بہت مشکل ہے۔“ صوفیہ نے کہا۔

”اور وہ مجھے بھی نہیں آتا۔“ انخفش کی گھبرائی آواز ابھری۔

”اور مجھے تو انہیں کھانا بھی نہیں آتا۔ پھسل پھسل جاتے ہیں نوال کے نیچے رکھے ہیں نہیں۔“ نوال کا

اپنی ہی طرز کا جواب تھا۔

”نوبین کو کال کرتا ہوں وہ بنا دے گی۔“ اشتیاق احمد نے ہلانے لگے۔

”وہ کبھی نہیں آئے گی۔“ صوفیہ نے ہولے سے کہا۔

”کہہ دیجئے گا۔۔۔ اخطب نہیں ہے گھر میں، شام کو آئے گا۔ دوڑی چلی آئیں گی۔“ انخفش نے جلے بننے لے جس اصل بات اور اصل ترکیب بتائی۔

نوال کے کان کھڑے ہو گئے۔

یہ انخفش اور دادو جان اور دادو یہاں تک سے تو

واقف ہیں کہ وہ اخطب کی موجودگی میں نہیں آئیں گی۔ تو پھر یہ۔۔۔ یہ بھی جانتے ہوں گے کہ کیوں نہیں آئیں گی۔ یہ خود ساختہ ہندی ہے یا؟

جب تک اس بات کا پتا نہ لگے تب تک کچھ بھی نہیں ہو سکتا۔

تو سب سے صحیح بندہ کون ہو گا۔ اندر کی باتیں اگلوں میں۔۔۔ دادو جان۔۔۔ جن سے نوال کی ضرورت دوستی ہو گئی تھی۔

ابھی برسوں ہی تو اسے لے کر گفٹ سینٹر گئے تھے۔ دو فریڈ شپ بینڈ دو فریڈ شپ کارڈ مانگے۔ نوال کے استغفار پر بتایا۔

”ایک میری طرف سے تمہارے لیے۔۔۔ اور ایک تمہاری طرف سے میرے لیے۔“

”اس نئی دوستی سے فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے نوال۔۔۔ وہ کس کی دوستی میں راز نہیں رکھے جاتے فقط شیرنگ۔۔۔ بس۔“

وہ ایک نیچے پر پہنچ کر بے فکری سے مسکرائی۔ وہ اب اشتیاق احمد کو سن رہی تھی۔

”کتنے دن ہو گئے مزے کے کھانے کھائے ہوئے۔ آج اس گدھے نے اپنے دوستوں کی دعوت کی تو سوچا ہمارے نصیب بھی کھلیں گے۔ مگر وہ پروین قاتب ہے۔ آج آؤ۔۔۔ وہ سب تو رات گئے آئیں گے۔ تب تک ہم کچھ انجوائے ہی کر لیں گے۔ برائی کا سالہ اور چاول بواکل تو نوال نے کر لیے ہیں کس تو مہمان آنے کے بعد ہی کے جائیں گے۔ ہاں ہاں نوال نے۔ اب تم خود سوچو ہمیں کس قسم کے کھانے کھانے پڑیں گے۔ ہاں وہ سب تو شام کو اخطب کے ساتھ ہی آئیں گے۔ تو پھر تم آرہی ہو ناں؟“

وہاں سے جواب اثبات میں تھا۔ جس کا گمان پا کر صوفیہ بیگم انخفش اور اشتیاق صاحب کا چہرہ کھل گیا۔

”تجئے عرصے بعد آج نوبین اوپر آئے گی؟“ وہ بیگم سے پوچھ رہے تھے۔

”شاید۔۔۔ چھ ماہ بعد۔۔۔ وہ حج کی خوشی میں دی جانے والی دعوت میں بھی نہیں آئی تھی اگلے روز صبح آئی

تھی جب اخطب آفس جا چکا تھا۔ ”صوفیہ کی آواز حسب معمول مدھم تھی۔ انھیں کے چہرے پر سوچ کی لکیریں تھیں۔ وہ غیر محسوس انداز میں سر ہلا رہا تھا۔ سب کی نگاہیں دروازے پر تھیں۔

”کل ایک تاریخ ساز فیصلہ کن دن تھا۔“ نوال صوفیہ پر پیر اوپر رکھ کے بیٹھی تھی اور بریانی کے نوالے ہاتھوں سے بنا کر کھا رہی تھی۔ نوین اور زینت بیگم اس کے بولنے کی منتظر تھیں۔

”پہلا تو یہ کہ میں نے باقاعدہ کوکنگ کا آغاز کر دیا اور بے حد لذیذ بریانی بنائی۔“

نوین نے سر جھکا کر مسکراہٹ چھپائی۔ اس نے جس طرح اس سالے اور چاولوں کو سنبھالا تھا وہی جانتی تھی۔

”یعنی میرے ہاتھ میں قدرتی ذائقہ ہے۔“ اس نے چٹکارا بھرا۔

”دوم میں نے یہ سیکھا کہ میرے لیے ضروری ہے کہ میں بچن کے کاموں میں بھی مہارت حاصل کر لوں۔ ویسے تو اپنی بات پر قائم ہوں کہ پیٹ بھرنے کے لیے ایک نوڈلز کا پیک اور چند پھل کافی ہوتے ہیں لیکن اگر مہمان رات کی طرح پیڑے ہوں تو۔۔۔ لہذا اب نوال ضمیر خان کوکنگ سیکھیں گی۔“

نوین نے مسکرا کر سر ہلایا جبکہ زینت بیگم بہت ہی خوش ہوئیں۔ وہ لڑکیوں کے شہروں میں اول درجہ بچن کے امور میں طاق ہونے کو دیتی تھیں۔

”اب یہ تو ہوا میرے حوالے سے فیصلہ۔ کل ہی ایک اور فیصلہ ہوا لیکن اس کی جب تاریخ طے ہوگی تب اسے تاریخ ساز کہا جائے گا۔ ابھی میں نے یہاں کراچی میں یہی دو گھر ذرا تفصیل سے دیکھے ہیں اور انہی دو گھروں میں صحیح طلب کام ہیں۔ لیکن آغاز ہمیشہ گھر سے کرنا چاہیے۔ خالہ اور نانوی کی زندگی بدل دینے کا پلان تو میں ترتیب دے چکی ہوں لیکن ادھر اس موٹے آلو کے گھر میں بھی سب پاگل ہیں۔“ اس نے

تاسف سے سر ہلایا۔ ”داوا جان بوڑھے،“ انہی نوالوں سے وہیل چیر کر انہیں تو بیٹے کی مسکراہٹیں ہی بارات چڑھا دینی چاہیے تھی مگر نال جی وہ انھیں خڈے ہاتھوں سے ہانڈی بھجوتا ہے۔۔۔ صاف کہہ دیا میں نے۔ اس خڈے آلو کو تو لڑکی ملتی مشکل ہے۔ آپ اپنے گھر میں بھولائیں، پہلے ہی دیر کر دی۔ انہی جی نے ہاں میں سر ہلایا کہ وہ تو خود بھی چاہتی ہیں مگر عزیز اخطب نہیں مانتے۔۔۔ کہنے ہیں کہ نفی نہیں۔ شاید کسی کے عشق میں گرفتار ہیں۔ اچھا خاصا عاقل بالغ آدمی ہے۔ بالکل نہیں اچھا لگا اس کے حوالے سے یہ جملہ سن کر۔“

اس نے تائید طلب نظروں سے سامعین کو دیکھا۔ جو فیچر سے ترتر زبان کو سن رہی تھیں۔

”بس جی یہ اہم گفتگو چل رہی تھی کہ جناب خود تشریف لے آئے۔ وامن چھڑا کر جانا چاہتے تھے۔ مگر آگے کون تھا میں۔۔۔ بقلم خود کھینٹ لیا ساتھ، سائیس چار باتیں کہ آج کل کے زمانے میں کون ذی ہوش زندہ عشق میں مبتلا ہوتا ہے پھر اس پر دنیا تیاگ دینے کا عزم۔۔۔ بوڑھے والدین پر ترس نہیں آتا۔ خالی یہاں بھال کر ناگھر۔ ایک صوفیہ داوی ہیں مجھ گھنے کی نشست میں تین جملے بولیں گی اور چھ سو بار کی اسائن۔۔۔ انکل اپنا دل خود ہی بھلائے رکھتے ہیں اور وہ گھر کا سب سے اسارت گائے۔“

”آ۔۔۔ آگے کیا ہوا فف۔۔۔ فیصلہ کیا ہوا؟“ نوین کی دہلی آواز نکلی۔

”آپ اتنی جلدی آگئیں فیصلے تک۔ ابھی تو میرے شہری الفاظ کا محض پیش لفظ آپ نے سنا ہے۔“ پھر میں نے ایک تنقیدی مکالمہ ان محترمہ کے لیے بیان کیا۔ جس میں ان کی کم عقلی اور بدفہمی کو موضوع بنایا۔ جو اتنے شان دار آدمی کو ٹھکرا رہی ہے اور۔۔۔

”کیا کیا۔۔۔ لڑکی کا نام بھی بتایا؟“ نوین کی ہتھیلیوں سے پینہ پھوٹا۔ نوال کا کیا بھروسہ۔ وہ جبراً نکاح پر دھاویئے والے کسی فیوڈل لاارڈ کی روح رکھتی تھی۔

”نہیں بتایا۔۔۔ نہ ہی میں سننے میں انٹرسٹ تھی۔“ بڑی کوئی احمق بے وقوف پاگل ہونے۔۔۔“ اس نے غصے سے کہا۔

”میرا ٹارگٹ اخطب اور ان کا بڑا بڑا جڑا گھر تھا۔“ لڑکی پھر میں نے ہاں کروا کے دم لیا۔

”مطلب۔۔۔؟“ زینت بیگم کے اڑے چہرے پر پہلا ہار اخطراب آن رکا۔

”مطلب یہ کہ۔۔۔ میں جس کام میں ہاتھ ڈالوں اور وہاں پہنچیں۔۔۔ ایسا کبھی ہوا تو نہیں۔“ وہ راد طلب نگاہوں سے انہیں دیکھنے لگی۔ جو دھک دھک کرتے دل اور فح چروں کے ساتھ جیسے ہوش کوئے والی تھیں۔

”منو آکر دم لیا۔“

”کون مان۔۔۔ کیا؟“ نوین کی آواز میں شرعاً سا آیا، جیسے اس نے سب کچھ سننے کے لیے خود کو تیار کر لیا ہو اور اسے پتا ہو کہ وہ اشتیاق احمد اور صوفیہ کی کانام لے گی۔

”کے ماننا تھا؟“ نوال نے لاپرواہی سے انگلیاں چاٹیں۔ ”داوا جان اور داوادی تو میرے جلوں کا وارنہ رہ گئے۔“ ہاں تھوڑی محنت اخطب صاحب پر کرنی پڑی مگر نتیجے کے لیے محنت ضروری ہے۔

”منوالیا ڈش اٹ۔“ وہ برتن رکھنے کے لیے بچن کی جانب بڑھنے لگی۔

”نہیں بتایا۔۔۔ نہ ہی میں سننے میں انٹرسٹ تھی۔“ بڑی کوئی احمق بے وقوف پاگل ہونے۔۔۔“ اس نے غصے سے کہا۔

”میرا ٹارگٹ اخطب اور ان کا بڑا بڑا جڑا گھر تھا۔“ لڑکی پھر میں نے ہاں کروا کے دم لیا۔

”مطلب یہ کہ۔۔۔ میں جس کام میں ہاتھ ڈالوں اور وہاں پہنچیں۔۔۔ ایسا کبھی ہوا تو نہیں۔“ وہ راد طلب نگاہوں سے انہیں دیکھنے لگی۔ جو دھک دھک کرتے دل اور فح چروں کے ساتھ جیسے ہوش کوئے والی تھیں۔

”منو آکر دم لیا۔“

”کون مان۔۔۔ کیا؟“ نوین کی آواز میں شرعاً سا آیا، جیسے اس نے سب کچھ سننے کے لیے خود کو تیار کر لیا ہو اور اسے پتا ہو کہ وہ اشتیاق احمد اور صوفیہ کی کانام لے گی۔

”کے ماننا تھا؟“ نوال نے لاپرواہی سے انگلیاں چاٹیں۔ ”داوا جان اور داوادی تو میرے جلوں کا وارنہ رہ گئے۔“ ہاں تھوڑی محنت اخطب صاحب پر کرنی پڑی مگر نتیجے کے لیے محنت ضروری ہے۔

”منوالیا ڈش اٹ۔“ وہ برتن رکھنے کے لیے بچن کی جانب بڑھنے لگی۔

”نہیں بتایا۔۔۔ نہ ہی میں سننے میں انٹرسٹ تھی۔“ بڑی کوئی احمق بے وقوف پاگل ہونے۔۔۔“ اس نے غصے سے کہا۔

نے تو اپنے جذبات پہ پہر بٹھا رکھا ہے۔ وہ مصنوعی حسرت سے شروع ہوئے۔ نوال نے سر ہلا کر تائید کی۔
 ”ایک بول میں دو اسٹرا ڈال کر۔۔۔“ انہوں نے قصداً جملہ ادھورا چھوڑا نوال کی پھیلی آنکھیں دیکھ لی تھیں ”بلبلے بنانے کا جو مزہ ہے۔ وہ کسی اور میں کہاں؟
 نوال کی ہنسی دور تک پھیل گئی جس میں اشتیاق احمد کا مشفق توجہ بھی شامل ہو گیا۔

”تم بہت اچھی بیٹی ہو۔“ اشتیاق احمد نے اپنا ہاتھ دھیرے سے اس کے سر پر رکھا۔ ”کیسی بیٹی جو رحمت لفظ کی عملی تصویر ہو۔“ منیر بہت خوش قسمت ہے۔“
 ان کا وجہ جذبے سے بھرپور تھا۔ نوال کا چہرہ کھل گیا۔
 ”حادثاتی معذوری کے بعد ضمیر خان خود کو دنیا کا بد قسمت انسان کہتے تھے۔ کتنی مشقوں سے وہ اس ٹراما سے نکلے تھے۔ اس میں سب کا ہاتھ تھا مگر امی کا۔“
 ”مشغال امی کا کھانا کا۔۔۔ لیکن سب سے آگے نوال تھی۔ اس کی محبت توجہ یقین نے ٹوٹے ٹکست خورہ روئے خود کو بد نصیب کہتے ضمیر خان کو اس بات پر مجبور کر دیا تھا کہ وہ ایک روز بے ساختہ کہہ اٹھے وہ دنیا کے خوش قسمت انسان ہیں“ ظاہری معذوری کوئی معنی نہیں رکھتی۔

نوال جیسے کھو گئی۔ سوچ چہرے سے جھلکنے لگی تھی۔
 اشتیاق احمد چہرہ پڑھ رہے تھے۔

”لیکن میں سوچ رہا ہوں۔۔۔ میں اپنے بڑے سے اہل خانہ کے ساتھ رہتے رہتے بچہ جاؤں گا۔ اور تم ان ڈل بے رنگ عورتوں کے ساتھ رہ رہ کر اگر خدا نخواستہ ان جیسی ہو گئیں تو؟“ انہوں نے جیسے جھڑپ کر لی۔

”ارے واہ خواجواہ۔“ نوال اپنی جون میں واپس لوٹی۔

”ہم تو وہ ہیں جو بانیوں کا رخ بدل دیں۔ لال جوڑا پہن لیں تو ہر طرف سرنخی چھا جائے۔ سفید لبادہ ہو تو ہر جگہ نور برے اور آپ کہتے ہیں۔ بی بی پروادا جان۔۔۔ ہم ان بڑھی روحوں جیسے نہیں ہوں گے۔ بلکہ وہ ہم جیسی ہوں گی۔ بدلنا ہمیں نہیں انہیں ہے۔ اور وہ بھی

عقرب۔۔۔“
 اس کے جملے میں اتار چڑھاؤ میں یقین اور قطعیت تھی۔
 اشتیاق احمد نے اس کا شانہ چھتپتپایا تھا۔

”بالکل الگ فطرت کے تھے ہم دونوں۔ میں ویسا ہی جیسا تمہیں آج نظر آتا ہوں اور وہ ویسا ہی جیسا تم بن چکی ہو یا سمجھ چکی ہو۔ ہم دونوں ایک دوسرے کا الٹ تھے۔ مگر کلاس فیلو ہونے کے بعد جب روم میں بھی بن گئے تو لاکھ مختلف ہونے کا درجہ ایک دوسرے سے جڑ گئے جیسے صبح اور شام ایک دوسرے کا الٹ ہوتے ہیں مگر آگے پیچھے چلتے ہیں جدا نہیں ہوتے۔ ایک دوسرے کی سوچ کا احترام کرنے لگے۔ میں نے اسے اس کی تنگ ذہنی پر نہیں ٹوکا اور اس نے مجھے میری عادات سمیت قبول کر لیا۔ ہاں یہ تھا کہ ہم دونوں ایک دوسرے کی حد تک بھی نہیں آئے۔

میری حرکتیں شرارت کے زمرے میں آتی تھیں اور اس کی عادات پرورش کا نتیجہ تھیں۔ وہ سخت پختون خاندان کی روایتوں میں پلا بڑھا تھا۔ اس کے دماغ میں ہر شے طے شدہ تھی اور ترمیم کی گنجائش نہشتہ۔۔۔ اور دوستی کے رشتے میں ایک دوسرے کو بدلا نہیں جاتا قبول کیا جاتا ہے۔“

ساحل کی مت ہواؤں سے لطف اندوز ہوتے اشتیاق احمد اور نوال ہاتھوں سے ریت میں چھپی سیپاں چن رہے تھے اور ساتھ ہی ماضی کے خوش کن لمحے بھی۔

”یونیورسٹی ختم ہوئی تو سب نے حسب روایت ایک دوسرے سے کبھی بھی تعلق نہ توڑنے کے عہد کے خط و کتابت کے لیے پتے اکٹھے ہوئے۔ مگر اور محلے بھی ڈائری میں۔ نوٹ کیے گئے مگر کون کی سی ملتا ہے۔ سب غم روزگار میں غرق ہو جائیں تو یاد اتنی بھی باقی نہیں رہتی۔

میرے معاملے میں بھی یہی ہوا۔ لیکن جب میں

بچہ ڈانسفر کراچی شفت ہوا تو میرا بڑی منیر خان تھا۔ عجیب حسن اتفاق تھا۔ ہم دونوں بہت خوش ہوئے۔ غم اس نے۔ واضح کر دیا کہ وہ اپنی سوچ اور عاداتوں میں ویسا کا ویسا ہی ہے۔ مجھے اس سے کوئی فرق نہیں رہا۔ جلد ہی صوفیہ اور بھابھی بیگم میں دوستی کا انوث رشتہ تشکیل پا گیا۔ جو اور خوشی کی بات تھی۔ دونوں ایک دوسرے سے گھنٹوں باتیں کرتیں اور یہاں وہاں پائی جاتیں۔ میری جانب سے صوفیہ پر کوئی پابندی نہیں تھی۔ منیر بھی میرے گھر کسی بھی وقت آ سکتا تھا۔ جہاں دل چاہے بیٹھ سکتا تھا۔ مگر میرے لیے اس کے گھر میں مہمان خانہ تھا۔ جہاں مجھے دستک دے کر باقاعدہ آواز لگا کر جانا ہوتا اور مجھے کبھی برا نہیں لگانا۔ صوفیہ کو۔۔۔ پھر بتا نہیں کیے ایک دن خود ہی بھابھی بیگم کو الگ دسترخوان چننے کے بجائے مشترکہ ہی کہہ دیا۔ اتنا عرصہ لگایا اس نے مجھ پر اعتماد کرنے میں یا۔۔۔ بہر حال اس کی سوچ تھی۔ گھر اور خواتین کے حوالے سے اس کی مخصوص سوچ تھی۔ جس میں وہ ذرا ترمیم کرنے کو تیار نہیں تھا اور ضرورت بھی نہیں تھی کہ بھابھی بیگم جو ایک لبل فوجی بیگم گروئنڈ والے گھر سے آئی تھیں۔ ایک ماڈرن پڑھا لکھا مہکمہ وہ بھی شوہر کی خوشنودی کے لیے بلا چوں و چراں اس کے رنگ میں رنگ لگیں۔ میرے لیے دسترخوان ایک ہوا تھا۔ کاسن روم کا دروازہ کھلا تھا لیکن میں نے پھر بھی ہمیشہ ایک ان دیسی صحنہ بندی کپاس کیا۔

ہاں نوین کے معاملے میں، میں نے اس کی کسی روایت کا پاس نہیں کیا۔ انعام اور اخطب کی دفعہ مجھے بیٹی کی خواہش تھی۔ یہ آگے پیچھے پیدا ہوئے تھے۔ مجھے لگتا میری بیٹی اللہ نے منیر خان کو دے دی ہے۔ اس کا نام بھی میں نے ہی رکھا۔ وہ مجھے اتنی پیاری تھی اتنی پیاری کہ رات کو اگر اس کے رونے کی آواز سنائی دے جاتی تو میں بلا جھجک آواز لگا کر پوچھ لیتا کہ وہ کیوں رورہی ہے۔

میری بے لوث شدید محبت کے آگے وہ ہار مان گیا۔ میرے اور نوین کے بیچ سے نکل گیا۔ میں تینوں

کے سامنے ہنستا صوفیہ اور بھابھی بیگم اور نوین کے آگے۔ ”اچھا ہے، صبح وقت پر عقل کے ساتھ باز آ گیا اور نہ ایک دن اسے درمیان سے ہٹا ہی تھا۔“

اور وہ دن میرے خیالوں میں آباد تھا۔ جب میں اسے اپنے گھر لے آیا بیشک کے لیے انکس کی ماں کی حادثاتی موت اور۔۔۔ انعام کا امریکہ جا کر اپنا جہاں بنا لیتا۔ انعام کی نئی دنیا میں ہمارا کوئی حصہ تھا ہی نہیں۔ میں اور منیر خان جگہ کی دوست تھے۔ اپنی سوچ و عادات سے قطع نظر ہماری بہت سی عادات ایک جیسی تھیں۔ پسند ناپسند۔ اکثر ہم دونوں ایک دوسرے کے لیے ایک جیسے گفت اٹھالتے۔ رنگ تو رنگ کمپنی بھی ایک۔۔۔

دونوں چلتے ہوئے بہت دور نکل آئے تھے۔ اشتیاق احمد ماضی میں کھوئے ہوئے تھے۔ چہرہ کبھی مسکرا ہٹ دیتا۔ کبھی اواسی کبھی خوشی بعض اوقات لگتا وہ خود کلامی کر رہے ہیں۔ کھو جاتے۔ فیسے میں بے ربطی آجاتی۔

”بچوں کے معاملے میں سخت مزاج تھا قطعی۔۔۔ اور روایتی مرد تھا سو زیادہ توجہ اور دلچسپی نعمان خان کی جانب تھی۔ وہ کئی سال لاڈلا اکلوتا رہا تھا۔ وہ خود پسند بھی ہو گیا تھا۔ اسکول، گھر پڑھائی۔۔۔ ماں بہن کے ساتھ گھٹنے ٹیٹنے والی فطرت نہیں تھی اس کی۔ اور ری نوین۔۔۔ بھولی بھالی سیدھی سادی بیٹی۔ گھر میں منیر کا رعب و دبہہ تھا۔ نعمان کی ضدی طبیعت اور ان کے پیچھے ہلکان ہوتی بھابھی بیگم۔

نوین جیسے دب گئی تھی۔ وہ گھر میں ہوتے ہوئے بھی نظر نہیں آتی تھی۔ گھڑی کی ٹک ٹک کی طرح اسے دائرے میں گھومتی لڑکی۔۔۔ بے ضرر دیوار پر تنگی تصور لیکن وہ تھی تو ناں۔۔۔ ایک جیتا جاگتا زنی شعور انسان جس کی اپنی شخصیت تھی اپنی دلچسپیاں اپنی دنیا۔ وہ اچھا پڑھتی۔ اچھا لکھتی، نظمیں کہتی۔ ہر نظم پر انعام لاتی۔

منیر کے سامنے بچنے والی کی طرح سر لائی کی ڈو ٹوک لہجے میں بولا۔

”میں اسے اسکول لکھنے پڑھنے، علم حاصل کرنے بھیجتا ہوں۔ آپ اسے کس راستے پر لے جا رہی ہیں۔“ بچی وہیں کی وہیں دب گئی۔ کہاں تو بچہ اس کی نظائیں پھپھوانے لگی تھیں۔ ”نظائیں اور شعر وغیرہ تو وہ اب بھی کہتی ہیں۔ چھپا کر کہتی ہیں۔ مگر میں اب انہیں چھپوا کر ہوں گی۔“ خاموشی سے سنتی نوال نے تیزی سے کہا تھا۔

”جیسے وہ تو بڑا دے ہی دے گی۔“ وہ نوین کو جانتے تھے۔

”تو ان سے مانگ کون رہا ہے۔“ اس نے بے فکری سے ایک پتھر پاؤں سے اڑایا۔ ”جو چیز مانگے سے نہ ملے اسے ہم چھین لیا کرتے ہیں۔“ اس نے رعب وار سا ہوجا پٹایا۔

اشتیاق احمد نے اس کی بے فکری اور یقین کو دلچسپی سے دیکھا۔ یہ خود اعتمادی کہاں سے آئی ہوگی۔ وہ ذرا سا سوچنے لگے۔ جواب نہ ملتا تو پچھ ہی لیا۔ نوال نے اچھے سے ان کی صورت دیکھی۔

”آسان سی بات ہے دادا جان! گھر کے مرد یعنی باپ بھائیوں نے اعتبار کیا ہو۔ اعتماد دیا ہو اور کبھی کسی دوسرے کی عزت پر ہاتھ نہ ڈالا ہو تو نتیجہ نوال ضمیر جیسی بیٹی کی صورت نکلتا ہے۔“

”یعنی اعتبار ضروری ہے؟“

”زندگی کے ہر معاملے میں اعتبار پہلی شرط ہے۔ باقی صفحے تو یونہی کالے کیے جاتے ہیں دفتری اندراج کے لیے۔“ وہ ہنس دی۔

”آپ وہ رشتے والی بات بتائیے۔ مجھے صرف یہ معلوم ہوا ہے کہ ناتاناجان نے صاف انکار کر دیا تھا غلطی انکار بکس میں گنجائش نام کو نہیں تھی۔ وہ زندگانی ہوئے گھر کے اندر گھوم رہے تھے اور کبھی پشتوں میں اور کبھی اردو میں تیز لہجے میں کچھ کہتے تھے۔ جس کا ایک حرف کسی کے لیے نہیں پڑا تھا۔“

”وہ۔“ اشتیاق احمد نے لمبا سانس لیا۔ تمہیں بتا رہا ہوں۔ یعنی تم وہ تھوڑے مین ہوگی جو اس اندر کی بات کو جاننے کی۔ اب پتا نہیں صحیح کروں گا یا غلط۔“

”آپ تھوڑا سا بڑا کر اہمیت سے انکار نہیں کر سکتے۔ جب سب اپنا اپنا راگ سنا کر دعوے دار ہو جاتے ہیں کہ میں سچا۔ اور تو جھوٹا۔ تب تھوڑے مین کا کام یہاں حرف آخر ہوتا ہے۔ آپ بس بتاتے جائیے۔“ نوال مسکرائی۔ ”اخطاب ان لوگوں میں سے تھا جو جملہ ہوتے ہیں وہاں چھا جاتے ہیں۔ نوین نے یونیورسٹی ختم کر لی تھی اور اب وہ گھر میں رہتی تھی۔ اخطاب بھی فراغت کے بعد اب غم روزگار کی تلاش میں۔ اخطاب کے باہر جانے کا معاملہ اٹھا تو مجھے خیال آیا۔ رشتہ دے کر اس کی موجودگی میں ہی یہ کام ہو جائے۔ میں اتنا یا اعتماد اور بے فکر تھا کہ جیسے بس تاریخ نکلتی ہو اور میرج لان ڈیٹا سڈ کرنا ہو۔ باقی کسی بھی شرط یا فارمیلٹی کی کوئی ضرورت ہی نہیں تھی۔ میرے دل میں ہم گھر کے افراد میں بغیر کسی سنے طے تھا کہ نوین ہی کو ادھر آنا ہے۔“

”تمہیں اس ظالم جادوگر کی قید سے چھڑانے کے لیے شہزادے کا والد آج آئی کیا؟“ میں نے گھر میں داخل ہو کر سلام کے جواب میں کہا تھا۔ وہ پہلے کچھ سمجھی نہیں پھر شرمیلی مسکان لبوں پر بکھر گئی۔

”شیر کی پھار میں شہزادے خود منہ دیا کرتے ہیں۔ والد کو تو میں نے آج تک جانتے نہیں سنا۔“ اس کے مزاج میں شوخی و برکت تھی۔ جو ماحول کے باعث دلی ہوئی رہتی۔

”شہزادہ روایتوں کا پاس دار ہے لڑکی۔ وہ تو سچی تلوار لیے آ رہا تھا۔ میں نے ہی اپنے اربابوں کا واسطہ دیا۔ تمہارے ساتھ مل کر ہی تو آج آج آئے والی ساری کہانیاں اس نے پڑھی تھیں۔ کیا بھول گئیں۔“

اور وہ ہنستے ہوئے کچھ شرماتے ہوئے چلی گئی۔ مگر وہ کمرے کی کسی کھڑکی سے لگی کھڑی تھی۔ مجھے معلوم تھا۔ اور منیر نے۔ وہ خوشگوار موڈ میں تھا اور مجھے دوستوں کے ایک پرانے گروپ کے بارے میں بتا رہا تھا اور پھر ان کے حوالے سے یادوں پر قہقہے لگا رہا تھا جب بدعائن کر۔“ اشتیاق احمد رک سے گئے۔

”میں بھونکا رہ گیا تھا نوال۔ وہ یوں کھڑا ہوا جیسے اسے بچو نے ڈنک مار دیا ہو۔ اس کی سانس بھڑک اٹھی۔ تنہے پھولنے پھٹنے لگے۔ آنکھوں میں خون اتر آیا۔ اور اس نے میرا گریبان پکڑ لیا۔ وہ بتا نہیں کیا کہہ رہا تھا میں سن کم رہا تھا اور دیکھنے اور سمجھنے کی کوشش زیادہ کر رہا تھا۔ وہ مجھے نقب زن کہہ رہا تھا اور یہ کہ میں نے سوچ بھی کیسے لیا کہ ایک غیرت مند پختون کی بیٹی ایک سراسر غیر رادری میں دی جائے گی۔ غیر زبان غیر لوگ اور میں جو اسے ہمیشہ سے جانتا ہوں میں نے اس کا ذرا اڑانے کے لیے یہ شوشہ چھوڑا اور اس نے گھر میں گھسا کر بہت غلطی کی۔“

”ہم سب کی خوشی ہے منیر! بھک مت مار۔ ٹھنڈے دل سے سوچ تجھے ہو کیا گیا ہے۔ دوست ہے اس لیے دوستی کے نام پر اطلاع دینا چاہتا تھا۔ تیری بھابی پورے چاچو چچے عزت احترام کے ساتھ آئے گی جیسے کسی کی بیٹی کا ہاتھ مانگا جا رہی ہے اس طور طریقے سے جھولی پھیلا کر گزرا کر مانگے۔“

”روک کر رکھ اپنی بیوی کو۔ دوستی کے نام پر میرے منہ پر طمانچہ مارا۔ ایک پختون کے لیے بیٹی بہت بڑی گال ہے کہ اس کی بیٹی کے لیے غیر جگہ سے رشتہ ہی کیوں آیا۔ اگر جو کوئی سنے تو تھو کے میرے منہ پر۔ اور یہ میں ہی ہوں جس نے صرف گریبان پکڑا ہے۔ یہی اگر میرے دادا پر دادا ہوتے تو دونوں اب تک دیوار پر نہ لٹکی ہوتی، سمجھے! ہم بیٹیاں گھر میں بٹھا کر رکھ لیتے ہیں مگر کبھی بیروں کو نہیں دیتے۔“

بہت لمبی کہانی ہے بچے۔ وہ نہ تھا تھا اور میں حق دق نہ تھا تھا۔

وہ وہی تھا روایتی قبائلی پختون علم اور ڈگری اور شرمی بود و باش نے صرف اس کے ظاہر کو بدلا تھا۔“

اشتیاق احمد کا لہجہ ہم اور دکھ سے بوجھل ہو گیا۔ ”پھر اس نے نوین کے لیے دھڑواہڑ رشتے دیکھنے شروع کیے۔ مگر ناکامی ہوئی۔ میں نے گریبان پکڑنے سے لے کر لغت ملامت کے حصے تک حذف کر کے باقی تعذبات اخطاب اور صوفیہ کو بتا دلائیں اور کہا کہ

”تھوڑے کے کو بہت جانیں۔ یہ بھی ایک لمبی مصیبت رہی۔ حقیقت بتائے بنا انہیں باز رکھنے کی کوشش۔ کہ بس یہ قصہ ختم۔ اخطاب نے ناکام ہو کر اعلان کر دیا۔“ اسے شادی نوین ہی سے کرنا ہے۔ وہ نہیں تو کسی اور کا نام نہ لیا جائے۔“ اور وہ اپنے عہد پر قائم ہے۔“

”لیکن اب تو ناتاناجان نہیں رہے۔ راستہ صاف ہے۔“ نوال کی آواز کسی کنویں سے برآمد ہوئی۔ وہ ششدر تھی۔

”ہاں اب وہ نہیں رہا۔“ اشتیاق احمد۔ زہر خند نہی ہنس دیے۔ ”مگر نوین ہے ناں؟“

”کیا مطلب؟“

”اسی کی بیٹی ہے ناں۔“ کہتی ہے جب ایک چیز کو میرے باپ نے پسند نہ کیا تو میں اب ان کے نہ ہونے پر اسے گیسے اپنا سکتی ہوں اور دنیا کی کوئی مثال۔ کوئی نقص۔ کوئی راہ اسے ضد کی اس راہ سے پلٹا نہیں سکتی۔ اسے شادی ہی نہیں کرنی۔ باپ کی روح کو شرمندہ نہیں کر سکتی۔ ادھر اخطاب بیٹھا ہے اس کی ضد اور انکار کے پیر کو تادور دیکھنے کے لیے۔“

”پھر کیا ناتاناجان آپ سے کبھی نہیں ملے؟“

”نہیں وہ میرے گھر نہیں آیا اور نوین اور بھابی بیکم نے بھی اتنا چھوڑ دیا اور اخطاب نے بھی۔ صوفیہ آتی جاتی تھی مگر منیر اس کا سامنا بھی نہ کرتا۔ سلام بھی نہ کرتا۔ نگاہ مالے بغیر جواب دیتا تھا۔ ہم سات سال ایک دوسرے سے نہیں ملے۔“

”سات سال۔“ نوال نے دہرایا۔ ”لیکن وہ افسوس تو آتا جا تا رہا ناں؟“

”ہاں وہ بچہ تھا اور منیر کا لاڈلا بھی۔“

”پتا ہے نعمان تک نے خالص امر کی انگش میں نوین اور منیر خان کے فیصلے کو ریش قرار دیا تمہارے خاندان کی لکھی ہی لڑکیاں۔ اعلیٰ تعلیم کے بعد اعلیٰ عہدوں پر فائز ہیں اور اپنے من پسند پانٹر کے ساتھ کامیاب زندگیاں گزار رہی ہیں۔ مگر نوین کے لیے کوئی مثال قابل تقلید نہیں۔ وہ ضد میں باپ سے بھی آگے

ہے۔

اشتیاق احمد اور نوال چلتے چلتے گاڑی تک آ گئے تھے۔ نوال قہقہے کی تفصیل سن کر گنگ تھی۔ وہ سو دلائل دے سکتی تھی۔ معرکہ کر سکتی تھی مگر ابھی نہیں ”تمہیں ایک سیات تھانوں نوال!“

گاڑی گھر کے گیٹ پر روکتے ہوئے کھوئے سے لہجے میں اسے پکارا۔

”جس رات منیر موت و حیات کی کشمکش میں تھا۔ اس نے مجھے بلا کر کہا تھا۔

”یہ میری زندگی کی آخری شام ہے اشتیاق! اتم سے معافی نہیں مانگوں گا، کیونکہ جانتا ہوں تم عذاب پالنے والے شخص ہو ہی نہیں۔ تمہیں لوگوں کو رویوں کو وجوہات کو انڈر اسٹینڈ کرنا آتا ہے بس۔ میرے بعد۔۔۔ نون کا دھیان رکھنا۔۔۔ تم سے اچھی اور کوئی اس کی دیکھ بھال نہیں کر سکتا۔ میں نے کوشش تو کی مگر وہ مجھ سے پوری نہ ہو سکی۔ تم سمجھ رہے ہو ناں۔ وہ۔۔۔ واقعی تمہاری بیٹی ہی تھی۔ میرے گھر غلطی سے آگئی تم اپنی بیٹی واپس لے لو۔“

نوال کا منہ کھلا کھلا رہ گیا۔

”نت۔۔۔ تو یہ تو واضح پیغام تھا اقرار کا۔ تو پھر آپ کس چیز کا انتظار کر رہے ہیں؟“ وہ چلائی۔ ”جائیے اور ہاتھ پکڑ کر خالہ کو باہر لے آئیں۔“

نوال کے تو جسم میں چونٹیاں رنگنے لگیں کوئی گھڑی جاتی کہ وہ خود بہ کام کر گزرتی۔ اشتیاق احمد کے لبوں پر زخمی مسکان آکر دم توڑ گئی۔ انہوں نے ٹھنڈی سانس بھری۔

”یہ اقرار اس نے صرف میرے سامنے کیا تھا۔ نون وہاں موجود نہیں تھی۔ اسے صرف انکار یاد ہے اور وہ ہر شے بھلا چکا ہے۔“

☆☆

”آئی ایم ان لو۔۔۔ خالہ۔“ بہت جھجکے، مدہم لہجے میں نگاہیں چرا کر یہ نوال ضمیر خان کا سانداز تو نہیں تھا۔

”جس رات منیر موت و حیات کی کشمکش میں تھا۔ اس نے مجھے بلا کر کہا تھا۔

”یہ میری زندگی کی آخری شام ہے اشتیاق! اتم سے معافی نہیں مانگوں گا، کیونکہ جانتا ہوں تم عذاب پالنے والے شخص ہو ہی نہیں۔ تمہیں لوگوں کو رویوں کو وجوہات کو انڈر اسٹینڈ کرنا آتا ہے بس۔ میرے بعد۔۔۔ نون کا دھیان رکھنا۔۔۔ تم سے اچھی اور کوئی اس کی دیکھ بھال نہیں کر سکتا۔ میں نے کوشش تو کی مگر وہ مجھ سے پوری نہ ہو سکی۔ تم سمجھ رہے ہو ناں۔ وہ۔۔۔ واقعی تمہاری بیٹی ہی تھی۔ میرے گھر غلطی سے آگئی تم اپنی بیٹی واپس لے لو۔“

نوال نے کوشش تو کی مگر وہ مجھ سے پوری نہ ہو سکی۔ تم سمجھ رہے ہو ناں۔ وہ۔۔۔ واقعی تمہاری بیٹی ہی تھی۔ میرے گھر غلطی سے آگئی تم اپنی بیٹی واپس لے لو۔“

نوال نے کوشش تو کی مگر وہ مجھ سے پوری نہ ہو سکی۔ تم سمجھ رہے ہو ناں۔ وہ۔۔۔ واقعی تمہاری بیٹی ہی تھی۔ میرے گھر غلطی سے آگئی تم اپنی بیٹی واپس لے لو۔“

وہ پڑھائی میں بے حد مصروف رہتی تھی۔ سب شوخیوں شرارتوں کے ساتھ۔

سجیدہ ہو یا لاہور، مگر اس کی موجودگی گھر کے ہر حصے پر چھاپ چھوڑی تھی۔ وہ گھر میں نہ ہوتی تو خالہ۔۔۔ چل جاتا۔۔۔ گھر میں اگر کمرہ بند کر کے سوچ بھی رہی ہو تو ایک خوش کن احساس ہمراہ رہتا کہ ہمیں یہیں ہیں نوال ضمیر خان۔

مگر پچھلے کچھ دنوں سے بظاہر وہ سب کے درمیان تھی۔ وہی اس کے روزمرہ کے اعمال ٹھیک ٹھیک ایک عجیب سا احساس کہ نوال نہیں ہے گم ہے نون کو مجبور کر دیا کہ وہ بے ساختہ پوچھ بیٹھی۔

”تمہیں کیا ہو گیا ہے نوال۔۔۔ تم میں کچھ تبدیلی سی محسوس کر رہی ہوں۔ بہت چپ چپ ہو کھوئی ہو تیں۔“

”آں۔۔۔ ہاں۔۔۔ نہیں خالہ! وہم ہے آپ کا۔“ وہ چونکی ٹھنکی اور ٹھنکی۔

”اول ہوں۔۔۔ نہ نظر کم ہے نہ عقل۔۔۔ صاف دکھ رہا ہے۔ لونورسٹی میں کوئی پرائیلم ہے۔ گھر یاد آ رہا ہے؟ کسی نے کچھ کہا؟“

نوال نے ہونٹ جھنجھک کر نفی میں زور زور سے سر ہلا دیا۔

”بتانا نہیں چاہتیں۔ لیکن شاید کہہ دینے سے مسئلہ حل ہو جاتا۔“

نوال نے چونک کر سر اٹھایا اور اس کی آنکھوں میں جھانکتے رہنے کے بعد ایک بار پھر نفی میں سر ہلا دیا۔

”منہ سے بول دو نوال۔۔۔ کسی نے کچھ کہہ دیا ہے۔ ہماری کوئی بات بری لگی۔“ انھیں نے کچھ کہا۔ لیکن تم انھیں کے کہنے سننے کو کب خاطر میں لاتی ہو۔

بلکہ موقع ڈھونڈتی ہو۔ وہ کچھ کے اور تم بچے جھاڑ کر اس کے پیچھے پڑ جاؤ۔ سچی بات ہے کہ وہ تم سے بچا کر چلتا ہے۔“ نون کے جملے کا اختتام مسکراہٹ پر ہوا۔

نوال نے مزید حد کر دی۔ جواب کے بجائے چہرے پر زخمی مسکان بکھیر دی کہ مقابل کا دل اٹھل چھل ہو

جائے۔ نون کا بھی یہی حال ہو ہاتھ پیر پھول گئے۔

”آپ نے کسی سے بھی پیار کیا خالہ۔۔۔ میرا مطلب آپ کو کوئی اچھا لگا بھی؟“ اس نے ہونٹ مزید لٹکا کر جواب کے بجائے سوال جڑ دیا۔ اور نون کے اڑتے رنگ سے نگاہیں چرا کر کہہ دیا۔

”اتنی ایم ان۔۔۔ لو خالہ۔“

نون کے دیو تا کو بچ کر گئے۔ اسے اپنی سماعتوں پر شک ہو۔

”کک۔۔۔ کک کون ہے۔ وہ وہاں۔۔۔ یونیورسٹی میں۔۔۔ اس کا فوری دھیان ممکنہ جگہ پر کیا۔“ نکلاس فیلڈ۔

”لو خواہزہ۔۔۔“ اس دل گرفتہ تہجیکی نوال بھڑکی۔ چمک کر یونیورسٹی وہاں ہے ہی کون۔۔۔ میرے نکلاس فیلڈ۔۔۔ ہنہ سات لڑکے ٹوٹے۔ جو صرف نام کو لڑکے ہیں۔ ایک انکل ہیں جو ڈگری لے کر سروس بک میں لگائیں گے تو تیسری بڑھے گی۔

جائے۔ نون کا بھی یہی حال ہو ہاتھ پیر پھول گئے۔

”آپ نے کسی سے بھی پیار کیا خالہ۔۔۔ میرا مطلب آپ کو کوئی اچھا لگا بھی؟“ اس نے ہونٹ مزید لٹکا کر جواب کے بجائے سوال جڑ دیا۔ اور نون کے اڑتے رنگ سے نگاہیں چرا کر کہہ دیا۔

”اتنی ایم ان۔۔۔ لو خالہ۔“

نون کے دیو تا کو بچ کر گئے۔ اسے اپنی سماعتوں پر شک ہو۔

”کک۔۔۔ کک کون ہے۔ وہ وہاں۔۔۔ یونیورسٹی میں۔۔۔ اس کا فوری دھیان ممکنہ جگہ پر کیا۔“ نکلاس فیلڈ۔

”لو خواہزہ۔۔۔“ اس دل گرفتہ تہجیکی نوال بھڑکی۔ چمک کر یونیورسٹی وہاں ہے ہی کون۔۔۔ میرے نکلاس فیلڈ۔۔۔ ہنہ سات لڑکے ٹوٹے۔ جو صرف نام کو لڑکے ہیں۔ ایک انکل ہیں جو ڈگری لے کر سروس بک میں لگائیں گے تو تیسری بڑھے گی۔

اسے آگ ہی لگ گئی۔

”ایک وکیل صاحب کو جر ٹلزم میں اسکوپ نظر آ رہا ہے۔ ایک اور انکل ہیں جو کراچی کے خراب حالات کے باعث بڑھاپے کی انکوٹی اولاد کو اکیلے یونیورسٹی بھیجنے سے گھبراتے ہیں۔ سوانہوں نے ساتھ ہی ایڈمیشن لے لیا۔ اور جنہیں لینے اکثر آئی آتی ہیں۔

بائی رہ گئے دو رتدوے۔ ایک لڑکا ہے، وہ اپنی بہن کے ساتھ آتا ہے تو سب کو بہن ہی سمجھتا ہے۔“

اس نے سب کے نیچے اوڑھ لیا۔

”نت۔۔۔ تو پھر کون؟“ نون ہٹائی۔

”کون ہو گا۔“ نوال نے پچلی بھری۔ ”خطبہ چاچا۔۔۔ اوہ۔“ وہ گزربائی ”میرا مطلب ہے اس پورے محلے بلکہ اس شہر میں ان کے علاوہ اور کوئی ہے جس کے لیے لڑکی اپنے منہ سے کہہ دے کہ میں۔“

اس نے قصداً ”جملہ ادھورا چھوڑا“ ان کہتے ہوئے لہجے میں مٹھاس بھی کھل گئی تھی اور آنکھیں پٹپٹاتے ہوئے وہ واقعتاً پابلی ڈول ہی لگی تھی۔

”نت۔۔۔ تو اب تم کیا کرو گی؟“

”کرنا کیا ہے۔ ایسی ہی دو چار علامتیں اور ظاہر ہو

نون کا دل رکاوٹ پھراتی زور سے دھڑکا کہ اس نے نیچے پر ہاتھ رکھ لیا۔

”نت۔۔۔ تو اب؟“ وہ بہت دیر بعد لب کھول سکی۔ ”تو کیا۔“ نوال کہہ دینے کے بعد گویا اب شانت تھی۔ اپنے فطری جارحانہ انداز میں شانے اچکائے ”وہ مجھے پہلی نظر میں اچھے لگے۔ پھر بہت اچھے لگنے لگے اور اب دنیا کی ہر شے زہر لگنے لگی ہے ساموائے ان کے۔“ صبح دوپہر شام ہر جگہ وہی نظر آتے ہیں اور سچ فلموں میں جو کچھ ہوتا ہے ناں۔۔۔ وہ حقیقت میں بھی ہو جاتا ہے اگر آپ کو سچا پار ہو۔“ میں نے اس محبت کے کارن۔۔۔ اس نے پچلی لی اور پلکیں زور زور سے جھپکیں۔ ”ٹریفک سارجنٹ کو محبت پائس نظروں سے دیکھا کیونکہ وہ بھی سفید پیٹ میں تھا اور اس دن خطبہ نے بھی سفید پیٹ پہنی تھی۔

مجھے زندگی میں پہلی بار جیتندرا اچھا لگنے لگا۔ سفید وردی پہنا ہوا۔۔۔ آہ۔۔۔ اسے جیسے خود پر افسوس تھا ”مگر محبت کی مجبوریاں۔۔۔ محبت کی دی گئی ذلالت۔۔۔ آہ۔

نون کا دل رکاوٹ پھراتی زور سے دھڑکا کہ اس نے نیچے پر ہاتھ رکھ لیا۔

”نت۔۔۔ تو اب؟“ وہ بہت دیر بعد لب کھول سکی۔ ”تو کیا۔“ نوال کہہ دینے کے بعد گویا اب شانت تھی۔ اپنے فطری جارحانہ انداز میں شانے اچکائے ”وہ مجھے پہلی نظر میں اچھے لگے۔ پھر بہت اچھے لگنے لگے اور اب دنیا کی ہر شے زہر لگنے لگی ہے ساموائے ان کے۔“ صبح دوپہر شام ہر جگہ وہی نظر آتے ہیں اور سچ فلموں میں جو کچھ ہوتا ہے ناں۔۔۔ وہ حقیقت میں بھی ہو جاتا ہے اگر آپ کو سچا پار ہو۔“ میں نے اس محبت کے کارن۔۔۔ اس نے پچلی لی اور پلکیں زور زور سے جھپکیں۔ ”ٹریفک سارجنٹ کو محبت پائس نظروں سے دیکھا کیونکہ وہ بھی سفید پیٹ میں تھا اور اس دن خطبہ نے بھی سفید پیٹ پہنی تھی۔

مجھے زندگی میں پہلی بار جیتندرا اچھا لگنے لگا۔ سفید وردی پہنا ہوا۔۔۔ آہ۔۔۔ اسے جیسے خود پر افسوس تھا ”مگر محبت کی مجبوریاں۔۔۔ محبت کی دی گئی ذلالت۔۔۔ آہ۔

میں نے پروفیسر غائب دماغ کا پونے دو گھنٹے کا لیکچر پلکیں جھکائے بناس لیا۔ جو ”جینلز کی بھرمار اور“

اواکاروں کا فقدان جیسے اہم ٹاپک کو ڈسکس کرتے کرتے دینا ملک کی جامہ زخمی و خوش زوئی۔ و سیم اکریم کی شادی اور مارننگ ہوٹ میں طلاقیں کی بڑھتی شرح کی وجوہات پر سیر حاصل گفتگو کر رہے تھے اور آپ کو بتا رہے، وہ لیکچر بے دیتے ہیں۔ جیسے خود کا می کر رہے ہوں مگر میں نے انہیں سنا ہے صرف اس لیے کہ ان کے پاس گاڑی کا وہی میک ہے ”جونان“ کے پاس ہے یہ سب محبت نہیں ہے تو اور کیا ہے خالہ۔“

اس نے دونوں ہاتھوں سے نون کے شانے جھنجھوڑ دیے جو سکتے کی سی کیفیت میں تھی۔ اس نے آئی ایم ان لو اور خطبہ لفظ کے علاوہ جیسے اور کچھ سنا ہی نہیں تھا۔

”نت۔۔۔ تو اب تم کیا کرو گی؟“

”کرنا کیا ہے۔ ایسی ہی دو چار علامتیں اور ظاہر ہو

نون کا دل رکاوٹ پھراتی زور سے دھڑکا کہ اس نے نیچے پر ہاتھ رکھ لیا۔

”نت۔۔۔ تو اب؟“ وہ بہت دیر بعد لب کھول سکی۔ ”تو کیا۔“ نوال کہہ دینے کے بعد گویا اب شانت تھی۔ اپنے فطری جارحانہ انداز میں شانے اچکائے ”وہ مجھے پہلی نظر میں اچھے لگے۔ پھر بہت اچھے لگنے لگے اور اب دنیا کی ہر شے زہر لگنے لگی ہے ساموائے ان کے۔“ صبح دوپہر شام ہر جگہ وہی نظر آتے ہیں اور سچ فلموں میں جو کچھ ہوتا ہے ناں۔۔۔ وہ حقیقت میں بھی ہو جاتا ہے اگر آپ کو سچا پار ہو۔“ میں نے اس محبت کے کارن۔۔۔ اس نے پچلی لی اور پلکیں زور زور سے جھپکیں۔ ”ٹریفک سارجنٹ کو محبت پائس نظروں سے دیکھا کیونکہ وہ بھی سفید پیٹ میں تھا اور اس دن خطبہ نے بھی سفید پیٹ پہنی تھی۔

مجھے زندگی میں پہلی بار جیتندرا اچھا لگنے لگا۔ سفید وردی پہنا ہوا۔۔۔ آہ۔۔۔ اسے جیسے خود پر افسوس تھا ”مگر محبت کی مجبوریاں۔۔۔ محبت کی دی گئی ذلالت۔۔۔ آہ۔

میں نے پروفیسر غائب دماغ کا پونے دو گھنٹے کا لیکچر پلکیں جھکائے بناس لیا۔ جو ”جینلز کی بھرمار اور“

اواکاروں کا فقدان جیسے اہم ٹاپک کو ڈسکس کرتے کرتے دینا ملک کی جامہ زخمی و خوش زوئی۔ و سیم اکریم کی شادی اور مارننگ ہوٹ میں طلاقیں کی بڑھتی شرح کی وجوہات پر سیر حاصل گفتگو کر رہے تھے اور آپ کو بتا رہے، وہ لیکچر بے دیتے ہیں۔ جیسے خود کا می کر رہے ہوں مگر میں نے انہیں سنا ہے صرف اس لیے کہ ان کے پاس گاڑی کا وہی میک ہے ”جونان“ کے پاس ہے یہ سب محبت نہیں ہے تو اور کیا ہے خالہ۔“

اس نے دونوں ہاتھوں سے نون کے شانے جھنجھوڑ دیے جو سکتے کی سی کیفیت میں تھی۔ اس نے آئی ایم ان لو اور خطبہ لفظ کے علاوہ جیسے اور کچھ سنا ہی نہیں تھا۔

”نت۔۔۔ تو اب تم کیا کرو گی؟“

”کرنا کیا ہے۔ ایسی ہی دو چار علامتیں اور ظاہر ہو

نون کا دل رکاوٹ پھراتی زور سے دھڑکا کہ اس نے نیچے پر ہاتھ رکھ لیا۔

”نت۔۔۔ تو اب؟“ وہ بہت دیر بعد لب کھول سکی۔ ”تو کیا۔“ نوال کہہ دینے کے بعد گویا اب شانت تھی۔ اپنے فطری جارحانہ انداز میں شانے اچکائے ”وہ مجھے پہلی نظر میں اچھے لگے۔ پھر بہت اچھے لگنے لگے اور اب دنیا کی ہر شے زہر لگنے لگی ہے ساموائے ان کے۔“ صبح دوپہر شام ہر جگہ وہی نظر آتے ہیں اور سچ فلموں میں جو کچھ ہوتا ہے ناں۔۔۔ وہ حقیقت میں بھی ہو جاتا ہے اگر آپ کو سچا پار ہو۔“ میں نے اس محبت کے کارن۔۔۔ اس نے پچلی لی اور پلکیں زور زور سے جھپکیں۔ ”ٹریفک سارجنٹ کو محبت پائس نظروں سے دیکھا کیونکہ وہ بھی سفید پیٹ میں تھا اور اس دن خطبہ نے بھی سفید پیٹ پہنی تھی۔

لکھنؤ تو صاف صاف جا کر کہوں کی کہ۔ ”اب وہ زندگی میں پہلی بار شرمیلی۔ زبان جو ابلی تھی۔ خود ہی۔ کہہ دو گی؟“ توین نہیں جانتی تھی۔ وہ کیا کہہ رہی تھی۔ اس کے دل و دماغ میں جھجک چل رہے تھے۔

”ہاں تو خود ہی کہنا پڑتا ہے خالص۔ خط کا زمانہ نہیں۔ اور فون پر کہوں تو ان کا چہرہ کیسے دیکھوں۔ آپ نے تو دیکھا ہے ناں خالہ۔۔۔ وہ کتنے خوب صورت ہیں۔ زندگی کا 75 حصہ انہیں دیکھتے ہوئے گزارا جا سکتا ہے۔ میں تو پہلی نظر میں۔۔۔ مجھیں۔“ اس نے دونوں آنکھیں بند کیں اور بیڑ پر گر سی گئی۔

”فہم۔ تم سے بہت بڑے نہیں ہیں؟“

”بالکل نہیں ہیں۔“ وہ اچھل کر سیدھی ہوئی۔

”اور اگر ہوں بھی تو۔۔۔ محبت جمع نفرتیں سے الگ چیز ہوتی ہے۔“

”فہم۔ وہ مان جائیں گے؟“

”مجھے منوانا آتا ہے خالہ۔۔۔ بھلا کوئی محبت کو بھی انکار کرتا ہے۔“ اس نے جیسے اس کی کم عقلی پر حفظ اٹھایا تھا۔

”اور۔۔۔ اور ضمیر بھائی۔۔۔ اور باقی؟“ نوال کے اظہار نے توین کو زمین پر گاڑ دیا تھا۔ اس کے معصوم ارادے جیسے جملے ہریار بھی بھر کے مٹی تھے۔ جن میں توین کا وجود چھپتا ہی جا رہا تھا۔

ایسے بھی ہوتا ہے۔ ایسا کیسے ہو سکتا ہے؟

اپنے انکار کے قلعے پر ہر روز ضد کی نئی دیوار کھڑی کرتے ہوئے ہاتھ کپکپاتے نہیں تھے۔ ہاں کا منتظر ایک شخص گردن اٹھائے ہر آن بلند ہوتی دیوار کو صبر سے دیکھتا تھا۔

وہ دشمن جان تھا مگر اس کی ”نظر“ ہمت تھی کہ وہ ہے اور دیکھ رہا ہے۔

یہ تو بھی سوچا ہی نہیں کہ وہ اتنی بلندی سے جب ایک صبح نیچے جھلنے لگی تو وہاں کوئی منتظر ہو گا ہی نہیں۔

ایسا خیال تو کبھی آیا ہی نہیں ایک روز وہ شخص

نہیں ہو گیا ہو گا تو الوداعی ہاتھ ہلاتے ہوئے یا فضا جتاتے ہوئے یا سب سے دل چیر دینے والا خیال۔

”کسی اور کے ہاتھ میں ہاتھ دے کر چلتے ہوئے۔“

آہ۔۔۔

”ضمیر اپنے ضمیر کے خلاف کبھی نہیں جاتا۔ اور نوال ضمیر کبھی وہ کام کرتی نہیں جس کی ضمیر اجازت نہ دے سکے۔“

کہہ دینے سے نوال اب ہلکی ہلکی دیکھا ہی دیتی تھی۔ بڑے دنوں کی اواس کیفیت ختم ہو چکی تھی۔ اس نے اپنے مخصوص انداز میں بشاشت سے جواب دیا تھا۔ اس کی سنہری آنکھوں کی شفاف چمک عود کر آئی تھی۔ اس نے پوئی کو کسا اور جست بھر کے باہر نکل۔

توین نے بیڑے سے اٹھنے لگے۔ وہ اتنی بری طرح کپکپاتے لگی تھی کہ لگتا تھا برف کی سل پر کھڑی ہو اور پھل آنکھیں رہی ہوں۔ مکمل ہے۔

نمانے گزرے اس دشمن جان کو رو رو دیکھے۔ اپنے اوپر کڑا سپرہ لگا لیا۔ خود سے نظر اٹھا کر دیکھتا چھوڑ دیا اور ساتھ ہی اس رستے کو بھی چھوڑ دیا جہاں سے گمان بھی گزرے کو وہ اسے دیکھ لے گا۔

توین سات سال سے خود ساختہ نظر بندی کے ساتھ جی رہی تھی۔ تو اوہر بھی پاس ایسری۔ احترام ایسری کا پورا پورا خیال رکھا گیا تھا۔

رہو تم لاکھ پردوں کی اوٹ میں۔۔۔

کس نے کہا محبت چھلی آنکھوں سے دیکھنے کا تمنا ہے۔

اور محبوب کا رو رو ہونا شرط ہے۔

محبت بی بندھی آنکھوں کے ساتھ اونچے نیچے راستہ چلتیوں کانٹوں کا سفر ہے۔

نہ سمجھتے نہ گرتے ہیں نہ راہ بدلتے ہیں۔

نشان منزل ہونہ ہو۔۔۔ راہ نما کا ساتھ ملے نہ ملے۔

منزل کبھی ٹھوٹی نہیں ہوتی

اور یہاں تو بس یہ ہوا تھا کہ توین منیر خان چھپ کر بیٹھی تھی۔ مگر وہاں موجود تو تھی۔

محبت کے لیے یہ احساس کافی تھا کہ محبت دیوار کے اس پار ہے۔

اخطب کی طمانیت کی حد کوئی نہ۔۔۔

لیکن۔۔۔ توین منیر خان کا چرخن رخصت ہوا۔ قرار ختم۔

وہ وہیں ہے اور کہیں نہیں جانے والی۔ یہ اخطب اشتیاق کی بے فکری تھی۔

وہ بھی وہیں ہے۔ لیکن اب شاید وہاں نہ رہے۔

نوین منیر خان کا غم

ہاں توین منیر خان۔۔۔ تم نے قسم کھائی تھی۔ وہ نہیں ملا تو کسی اور کو بھی قبول نہیں کرو گی۔ تم نے اسے تو ایسے کسی بیان میں نہیں باندھا۔ وہ تو آزاد ہے۔

نمانے گزرے اس سے مکالمہ کے ہوئے اور جب بات ہوتی تھی تو کیا؟ آتے جاتے، جلتے پھرتے، اٹھتے بیٹھتے۔ بس ایک دوسرے کو دیکھتے ہی تھے۔

وہ کن آنکھوں سے دیکھ لیتا تھا۔ یہ جان جاتی۔

کبھی اپنے مرادہ زعم میں آنکھوں میں جھانک لیتا تو جھیل جاتی یا پلکیں گرا کر اس میں بحال کرتی۔ بس اتنی سی بھی جان پہچان کی کمائی۔

اور اس اتنی سی آشنائی نے زندگی کو اتنا مشکل بنا دیا۔

اگر جو عہد وہاں کے ہوتے تب؟

”ہاں تو پھر ٹھیک ہے۔“ رات کے سنائے میں خود شناسی کے مراحل سے گزرتے ہوئے توین نے اپنے نہ ٹھننے والے آنسوؤں کو گراڑا۔ ”جب ایسا کچھ تھا ہی نہیں۔۔۔ تو حق ہے تمہیں اپنے لیے نئے راستے تلاش کرو اور خوش رہو۔۔۔ میں خود پر جبر کر رہی ہوں۔ تمہیں کون کہتا ہے کہ تم صبر سے میری حد کا انتظار کرو۔ اچھی ہے بہت اچھی ہے نوال۔۔۔“

وہ با آواز خود سے ہکلام تھی۔ بولتے بولتے آنسو رگڑتے بیٹے تو گھٹے میں آنسوؤں کا پھندا بن جاتا، کبھی

پر کبھی۔۔۔ وہ کبھی سختی سے انگلیاں گاڑوں پر رکھتی۔۔۔ کبھی ہتھیلی کی پشت۔۔۔ کبھی ٹخنوں میں سر دے کر جیسے ہار جاتی۔

اخطب اور نوال کے چہرے گڈنڈ ہوئے۔

نوال کے رنگ ڈھنگ۔

نوال نے اپنے سارے مخصوص لباس جیسے کیس پھینک دیے تھے۔ جاگرز، بد شکل بوٹ، موٹ پٹانگ شرتس۔ ٹائٹس اور جینز۔۔۔

چوڑی دار پا جاموں کے ساتھ کرتے اور لمبی قمیص۔۔۔ بڑے دوپٹے، بڑے دوپٹے۔

زینت بیگم کی خوشی کی حد نہ رہی۔ اس نے ان سے کہا۔

”آپ ہی تو کہتی تھیں۔ ایسے رہا کروں۔۔۔“

البتہ توین کے سوالیہ استعجاب پر۔۔۔ بیٹا کماری کو مات دیتے ہوئے وہ شرمیلی۔ دوپٹے کا پلو انتھوں میں دابا (بعد میں دیکھا تو وہ جگہ جگہ سے چپا ہوا تھا۔ دراصل وہ جانتی نہیں تھی۔ شرماتے ہوئے صرف دانت میں دابنے کو شو کرنا ہوتا ہے، انتھوں سے اس کا ناٹس نہیں مارتے)

”انہیں مشرقی چلے کی لڑکیاں پسند ہیں خالہ! تو میں نے سوچا کہ۔۔۔ مجھے ایسے ہی رہنا چاہیے۔“

نوال بھڑا منہ کھول کر ہنسنے کے بجائے نظریں جھکا کر، ہونٹوں پر ہاتھ رکھ کے مسکرائی۔

”یہ تم سے اس نے کہا؟“ توین نے لہجہ سرسری



قیمت - 300/- روپے

بنایا۔

”نہیں۔ وہ منہ سے کب کچھ کہتے ہیں مگر میرے فرض ہے نال کہ میں ویسی بنوں جیسی وہ پسند کرتے ہیں۔“

”تمہارے کیمرہ کا کیا ہو گا نوال!“

”لو تو وہ کوئی مجھے پڑھنے سے روکیں گے تھوڑی۔۔۔ اب تو وہ مجھے یونیورسٹی بھی چھوڑنے کا کہہ رہے ہیں کہ میں صبح کہاں خوار ہوں وہ جاتے ہوئے چھوڑ دیں گے۔“

بڑے ہانوں سے اخطب چاچا کی باقاعدہ منت کی تھی۔ اگر آپ مجھے دو تین ہفتے چھوڑ دیں۔ دراصل مجھے تھوڑے دنوں میں جانا ہو گا اور ٹریفک کا انتشار ہو جاتا ہے بس میں لٹکنے کی جگہ بھی نہیں ملتی۔

چنگ چی بھی خالی نہیں ملے۔۔۔ چنگ چی والا کہنے لگا ”میرے موٹر سائیکل پر پیچھے میری طرح ہی بیٹھ کر چلی چلو۔“ اس نے از حد معصومیت سے پلکیں پھینٹائیں۔

اخطب سارا قصہ بھول گئے۔ وہاڑ لگائی۔

”تھا لون وہ چنگ چی والا۔۔۔؟“

نوال اپنی سرگرمیوں میں مصروف تھی۔ پڑھائی اور پھر ڈراما۔۔۔ جس کی کرتا دھرتا وہ خود بھی۔ سارے کردار ہی اسے خود بناتے تھے۔ ایکٹر۔ ڈائریکٹر۔ رائٹر۔

اسے کسی اور چیز کی ہوش ہی نہ تھی۔

بے خود کو اس سے بہت سی شکایتیں تھیں۔ موبائل لے کر دینے والا وعدہ پورا نہ کیا۔۔۔ اور سب سے بڑھ کر قمر عید سزا آگئی۔ مگر نوال کی جانب سے کوئی گرم جوشی ہی نہیں۔

”اشتیاق دادا جان لے کر آجائیں گے جانور۔“ لیکن ہم خود کیوں نہیں لائیں گے۔ جیسے پچھلی بار لائے تھے۔“ بے خود کی زندگی کا ناقابل فراموش واقعہ تھا وہ۔

”بھئی۔ اس وقت تو اس انخوش سے انتقام لینا تھا نال۔۔۔ اور پھر چائیں لگ گیا تھا۔ اب اس بار تو دادا جان ہیں نال۔۔۔ میں ان سے کہوں گی۔ تمہیں لازمی ساتھ لے کر جائیں۔“

”تو آپ بھی تو ساتھ چلنا ناں۔۔۔ وہ بھند ہوا۔

”میں مصروف ہوں بے خود۔! میں بہت بڑے بڑے کام کر رہی ہوں۔ تم سوچ بھی نہیں سکتے۔“ اس کے چہرے کے قریب منہ کر کے اس نے پراسراریت سے کہا۔

بے خود کی آنکھیں بھیلیں۔ ”تو مجھے کیوں نہیں ملایا؟“ وہ دھاڑیں مار کر رونے والا ہو گیا۔

”ابھی تمہاری باری نہیں آئی۔ تم بس دعا کرو میں کامیاب ہو جاؤں۔ پھر تمہارا نمبر آئے گا کام ہی کام۔“ دو دن بعد وہ پھر حاضر تھا۔ ”انخوش بھائی جان کے جانور آگئے ہیں۔“

”تو ہمارے کیوں نہیں آئے؟“ نوال چونکی۔

”وہ تو صرف دو بکرے ہوں گے نال دادا جان بولتے ہیں۔ دو تین روز پہلے ہی لائیں گے۔“

”تو ہاں کیا آیا ہے؟“

”دو بیلوں کی جوڑی ہے۔ ابھی باہر ٹینٹ لگے گا۔ پھر انخوش بھائی اس کی سجاوٹ کرے گا۔ دو دن بعد پھر سب کو بلا کر جانور دکھائے گا۔ ابھی تو کہیں رکھو اگر آئے ہیں۔“ بے خود بہت اداس تھا اور جانوروں کے لیے بے چین بھی۔

”پچھلی بار تو ایسے نہیں کیا تھا۔“ وہ سوچنے لگی۔

”تو وہ سب گھر والے ج ج پر گئے تھے۔ پیچھے اکیلا انخوش بھائی تھا تو اس لیے۔“

”اوہ۔“ نوال نے آنکھیں گھمائیں۔

”ٹھیک ہے۔۔۔ تم رونے والی صورت مت بناؤ۔۔۔ آج نہیں تو کل ہم جانور دیکھ ہی لیں گے۔“ اس نے پکارا۔

وہ بھی سر ہلانے لگا۔ دل البتہ بجا بجا سہا سہا تھا۔

”حملہ کرنے کے اصول ہوتے ہیں اور اگر ارادہ

جیت کا ہو۔ تو پھر چاروں جانب سے گھات لگا کر باقاعدہ منصوبہ بندی سے ہر قدم اٹھانا ہوتا ہے۔ پھر جو کتنا سے چوکنابندہ بھی دام میں آجاتا ہے اور ان کی بے خبری تو آج کل عروج پر ہے۔“ رات میں نوال گلاب سے اسکا پیر گفتگو کر رہی تھی۔

”وہ اداس ویران صورت خالی آنکھیں بے یقینی کی تصویر۔ اتنی غم زدہ ہیں کہ غم غلط کرنے کو نہ تو اولاد گانے سنتی ہیں اور نہ وہ کچھ شق کر دینے والی شاعری کر رہی ہیں۔ بھنگی روح بن کر گھومتی ہیں۔ ٹھنڈی آہیں بھرتی ہیں۔ مجھے تو بچ اوقات ترس آجاتا ہے۔

منہ سے کچھ نہیں کہتیں۔۔۔ اور ان ہی کو کیا دوش۔۔۔ وہ جو دوسرے ہیں جناب اخطب چاچا، میرے جیسی حسین۔۔۔ لڑکی کے ہمراہ بیٹھ کر بھی ناک کی سیدھ میں چلتے ہیں۔ مجھے نہیں لگتا، تم نہیں پتا ہے کہ میری آنکھیں سنہری ہیں یا بھنگی۔ ہونہ۔“ اس نے گلاب کو آنکھیں بھیجی کر کے دکھائیں۔

گلاب بھر جھری لے کر ہنس دی۔ اتنی مضحکہ خیز صورت۔

”اتنی پاکیزہ محبت تو 1616ء میں بھی نہیں کی جاتی ہوگی۔ اللہ توبہ۔“ اس نے منہ بنایا۔

”اخطب صاحب کو نہیں پتا کہ تم ان کی ناک کے نیچے کیا کھیل رہی ہو۔“

”کوئی۔۔۔ ناک کے نیچے کی کیا بات۔۔۔ میں ان کے سامنے دینا ملک کی طرح ڈانٹنگ ٹیبل پر چڑھ کر رقص بھی شروع کر دوں تو انہیں پتا نہ چلے۔۔۔ میں نے کہا ناں۔۔۔ وہ عشق کی اس منزل پر ہیں جہاں سے بس ایک صدا آتی ہے۔

مجھے دیکھا ہے۔ اب بھلے تیشہ لے کر آنکھیں پھوڑ دے۔

نوال نے جل کر کہا۔

”تم لوگ پہنچ جاؤ گے ناں۔۔۔؟“

”ہاں کل سیٹیشن کنفرم ہوں گی۔ ناٹو کو تو ہماری آمد کا سبب پتا ہے ناں؟“

”ناٹو کو پتا ہے مگر اتنا اور دیا ہی جیسا میں ضروری

سمجھوں گی۔ ہاں خالہ جاتی ہیں میرے ڈیڈ میری خاطر ”ان“ سے ملنے آرہے ہیں۔ تین دن سے بی پی لوچل رہا ہے۔“ وہ لاپرواہی سے گھبراہٹ تھی۔

نوال کے موبائل کا چارجر خراب ہو گیا تھا۔ وہ گھر بھر سے پرانے چارجرز کا ڈھیر اکٹھا کر کے بیٹھی تھی۔ ہر چارجر سے صبح اور قابل استعمال چیز نکل کر اسے فوری طور پر ایک نیا چارجر جڑنا تھا۔

ذرا فاصلے پر انخوش انعام براجمان تھا۔ کیونکہ نون اس کے گھر جاتی نہیں تھی سو وہ اپنے قدموں چل کر اپنی خیریت بتانے آیا تھا۔ ہاتھ کا پلاستر کھل گیا تھا۔ فزولوجیالٹ کے پاس جانا تھا کچھ دن تک۔۔۔ البتہ ٹانگ ہنوز پلستر میں جکڑی ہوئی تھی۔

نوال کو دھیان آیا۔ جس دن سے وہ اسی حال میں تھا۔ کھلے پانچھ کی برمودا (گھٹنوں تک کانیک) میں ملبوس ہوا کرتا تھا۔ اوپر پی شرٹ یونیورسٹی جاتے وقت بھی یہی حلیہ۔۔۔ ہاں یونیورسٹی والے برمودا کی لمبائی گھٹنوں سے نیچے ہوتی تھی۔

”کیا ضرورت ہے۔ اتنی محنت کرنے کی۔۔۔ ڈیڑھ سو روپے کا نیا چارجر ملتا ہے۔ بے خود کو بھیج کر منگوا سکتے ہیں۔ مگر نہیں جی۔ ہم نے تو اپنی مہارت دکھانی ہے۔ موقع کیسے جانے دیں۔“

یہ بات نوال بخوبی جانتی تھی۔ مگر ایک تو اس کا موبائل بند ہو گیا تھا دوسرے وہ کسی جگر میں یہاں بیٹھی تھی۔ (نعمان بھائی کی امریکہ سے کل کسی بھی وقت متوقع تھی)

”ضرورت کی بھی خوب کمی۔ انسان کب سمجھتا ہے اپنی اصل ضرورتوں کو۔ ایک تو ایکسڈنٹ کروا کے شاندار One Two five کا یہ داغرق کیا۔ دوسرے عرصہ دراز سے ناکارہ ہو کر گھر میں پڑے ہو۔ لباس کے نام پر نیا خرچ۔۔۔ ان برمودا اور شارٹس سے بھر لیں تم نے الماریاں۔ ضرورت ہی کیا تھی۔ سب پرانی شلواروں کے پانچھوں کی سلاخی گھٹنوں

تک کھول لیتے۔ یہ کڑواقت بھی گزر جاتا اور بچت کی بچت۔ اس نے حساب برابر کیا۔
 انھیں اول تو سمجھا نہیں پھر شاید تصور کی آنکھ سے خود کو دکھا اور سمجھا تو چہرہ لال، بھسکوا ہو گیا لیکن اس سے پہلے کہ منہ کھولتا نوال نے لب کھولے۔
 ”نانچہ کی سلائی کھوئی نہیں آئی تو۔۔۔ گھٹنے تک شلوار کاٹ لیتے کیوں خالہ۔۔۔ آپ نے تو اول انڈین اور پاکستانی فلموں کے ہیرو دیکھ رکھے ہوں گے۔ بس وہی حلیہ بن جانا اور تمہارے ہونٹ مارے خوشی ہی کے کپکپا رہے ہوں گے؟ ہے ناں کہاں تم۔۔۔ اور کہاں دلپ کمار اور ندیم اور علاؤ الدین جیسے جہان کلاکار ویسے وزن کم کر کے شیو بھالو اور فلمیں اٹنے والیہ نشان کی طرح رکھ لو تو تھوڑی بہت مشابہت آہی جائے۔“

وہ ہر بار اسے بولنے کا موقع دینے بغیر خود ہی شروع ہو رہی تھی اور ہر بار نئی لن ترانی۔
 وہ مٹھیاں بھینچا کھڑا ہوا ہی تھا کہ ریسور کلاں سے لگائے زینت بیگم کی ہلکی سی چیخ سنائی دی۔ ان کے ہونٹ کپکپا رہے تھے۔ ایک ہاتھ دل پر دھرا تھا۔ اور عجب شادی مرگ کے عالم میں وہ سن رہی تھیں۔ یہ تینوں ہی ان کی طرف بھاگے۔
 ”نوسہ۔۔۔ ما۔۔۔ سن۔۔۔ آ رہا ہے عید پر بیوی بچوں کے ساتھ۔“

”نعمان بھائی!“ نوین کے منہ سے جملہ اور آنکھ سے آنسو ایک ساتھ ہی برآمد ہوئے۔ وہ فرط مسرت سے ہاں سے لٹ گئی۔

انھیں کو بھی بھول گیا۔ ابھی اس کی کتنی گت بتائی تھی نوال نے۔
 نوال نے چار جگہ لگا کر دیکھا۔ ریڈ بلب آن ہو گیا تھا۔ یعنی الارٹ۔
 اوکے (سب کچھ پلان کے مطابق اب تک ٹھیک جا رہا تھا)

”کیا پہلے بھی ایسے ہی کرتا تھا؟“ نوال کا اشارہ ٹینٹ

اندر کی گئی سجاوٹ کی جانب تھا۔

”ہاں۔۔۔ مگر اس بار تو حد ہی کر دی ہے۔“ بے غور حاسد نگاہ سے ہر چیز کو دیکھتا تھا۔ ”اللہ پوچھے گا۔ قربانی کا مطلب ایسے تو نہیں ہوتا ناں۔“
 وہ انھیں کو گناہ گار ثابت کرنا چاہتا تھا۔ نوال نے سر زور زور سے ہلا کر تائید کی۔ بے خود کے چہرے کی حد تک سکون پھیلا۔

”تم۔۔۔ تم بھی اندر جا کر بیٹھ جاؤ ناں۔“ (دونوں ایک جھری سے اندر دیکھ رہے تھے)
 ”وہ نہیں بیٹھنے دے گا۔“ بے خود بولا۔

بے حد خوب صورت، سفید براق، مستدرست ہونا بیلوں کی جوڑی۔ اتنے خوب صورت جانور تھے کہ نظر ثنی شکل تھی۔ ان کی سب سے نمایاں خوبی ان کا ہم شکل ہونا تھا۔ دونوں کے چاروں پاؤں اکھر سے ایک باشت اوپر تک سیاہ تھے۔

بڑی بڑی آنکھیں اور حد سے زیادہ معصوم چہرے۔ ان کے قد چھوٹے تھے اور جسم بے حد توانا۔
 چلو یہ تو اللہ کی صنائی تھی۔

اب آگے انھیں صاحب کی کار کریگی۔ اس نے شامیانے کے اندر کرسیاں لگوا رکھی تھیں۔ درمیان میں ریڈ کاربٹ بچھا تھا۔ جس پر تیل کوواک بھی کراوائی جاتی تھی۔ بیلوں کو چٹا دیکھنا بہت دلچسپ تھا۔ ان سے اپنا بوجھ اٹھانا مشکل تھا۔ وہ یوں چلتے تھے جیسے منوں بوجھ لدا ہو۔ مشور۔۔۔ اور گرد سے بے نیاز۔۔۔ دھرتی کا بوجھ سائلتے تھے۔

ٹھنڈے پانی کے کور۔۔۔ پکھے اور لمبھوں کی سجاوٹ بہت اعلیٰ۔

فونو سیشن، ہوجا تھا۔ بے زار لالا اور اخطاب نے دو سیکورٹی گارڈز کا بندوبست بھی کر دیا۔ بیلوں کی نمائش صرف چار سے سات بجے ہوتی۔ وہ بھی انھیں کے زیر نگرانی۔۔۔ وہ دونوں بیلوں کے درمیان ان ہی جیسی مغرور، مخفا، خاسی چال چلتا ہوا ان ہی کا تیسرا بھائی معلوم ہوتا۔

اگر جو ماتھے پر ستاروں سے بھی سرخ مکتونی بی بائندہ

بیلوں کی سجاوٹ اور انداز کے مغرور تاثر سے یوں لگتا جیسے تک چڑھا دو لہا، شیخ پر ہرجان ہو اور سالیوں کے کسی مذاق پر بھی اسے ہنسی نہ آئی ہو۔ دفع۔
 ”تم کیا چاہتے ہو بے خود؟“ اس نے سید حاسواں

پوچھا۔
 ”میں۔۔۔ میں بس یہ چاہتا ہوں، ہر وقت ان بیلوں کے ساتھ بیٹھا رہوں۔ مگر وہ سیکورٹی گارڈ مجھے گھٹنے بھی نہیں دیتا۔ دادا (بے زار خان) بھی نہیں جانے دیتے۔“
 وہ روٹنا ہو گیا۔

”مچھا میں کھوں گی انھیں سے۔“ نوال نے تشفی کراوائی۔

”ہمارے بکرے بھی نہیں آئے۔“ وہ رونے ہی لگا۔ ”کب آئیں گے؟“
 ”اب نعمان بھائی ہی لائیں گے۔ وہ آ رہے ہیں۔“

پوچھا۔
 ”مجھے بھی ساتھ لے کر جائیں گے؟ اور آپ بھی ملیں گی؟“

”ہمیں لازمی لے کر جائیں گے۔۔۔ میرا البتہ مشکل ہے میں بہت ضروری شے پر ہوں بے خود۔۔۔ زیادہ ضروری ہے۔“
 اس نے اس کے کندھے پر تھکی دی۔ وہ اس کا اترا ہوا دور ست نہ ہوا مگر سہلائے لگا۔

ڈرائنگ روم کی رونق عروج پر تھی۔ خلابی گھر بھر چکا تھا۔
 ضمیر خان، محمد اہل و اعیال۔
 نعمان خان۔۔۔ امریکی بیوی بچوں کے ہمراہ۔
 اور ابھی ابھی آکر بیٹھے اشتیاق احمد مصوفیہ اور ان کے ہمراہ ڈھیروں مٹھائی اور فروٹس کے گرسے تھے۔ کچھ گفت و گو بھی ہو رہی تھی۔

اس نے نعمان خان کو سب کچھ تفصیل سے بتادیا اور سمجھا دیا تھا۔ گلاب بھی واقف حال تھی۔

نعمان نے آج صبح لان میں ٹوٹھ برش کرتے ہوئے جب وہ صبح سے لطف اندوز ہو رہے تھے پاکستانی اور قبائلی روایات کو بھی اسی گھاس کی طرح روند دیا جس پر وہ چل رہے تھے۔ بڑے مزے سے اشتیاق انگل کو مخاطب کیا اور پوچھا۔

”وہ چڑپوئلے کر شام ہی کو کیوں نہیں آجاتے۔۔۔ اور انہیں کوئی اعتراض نہیں۔۔۔ پہلے ہی دیوہو گئی ہے۔“

زینت بیگم کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔ ”کوئی اپنے منہ سے بھی ایسے کہتا ہے۔“

مگر نوال کو برا مزہ آیا۔ بعض معاملات میں امر کی ہونا زبردست ہوتا ہے یہاں سب یہ جانتے تھے کہ آج اخطاب اور نوین کا نکاح کر دیا جائے گا۔ سوالے نوین کے۔

(آج اخطاب اور نوال کا رشتہ طے ہونا ہے۔ نوین کی خبر یہ تھی)

وہ دل پر مہر کا پتھر رکھے۔ ہونٹوں پر ایثار پرستانہ مسکان لیے خود کو کاموں میں الجھائے ہوئے تھی۔ یہاں کسی کو اس کی پرواہ نہیں تھی۔ ہر جگہ نوال ہی کا ذکر تھا۔ جو شام ہی سے لال سرخ جوڑا چھاکر بیٹھ گئی تھی۔ لال سرخی بھی لگلی۔

ایک دو سیرانہ بھی نوال سے زیادہ ایکسائٹڈ اور تیار شیر تھا۔ وہ بھی نعمان کی امریکی موٹی بیوی۔۔۔ وہ پہلی بار پاکستان آئی تھی اور اس نے خود ہی سے فرض کر لیا تھا کہ اسے دلہن کی طرح رہنا ہے۔

اس نے کسی برائینڈل شاپ سے پانچ سات بھاری کا در جوڑے خرید لیے تھے۔ جنہیں وہ صبح اٹھ کر نہاتے ہی پہن لیتی۔ اپنے دس دس سال کے بیٹوں کا بھی کوئی خیال نہیں۔

زینت بیگم کے دیے زیور بھی تن پر سجے ہوتے۔ جس میں ہاتھائی، گلوبند اور جھمکے سب شامل تھے۔

اس وقت بھی وہ میوون لینگے میں سارے زیورات کے ساتھ سب کی توجہ کا مرکز تھی۔ نیلی سمندر آنکھوں کے پپوٹوں پر ڈارک میوون آئی طر

تھا۔ گال اور ہونٹ بھی۔
 دونوں نیچے ماں کے دائیں بائیں پٹھ جاتے اور
 چہرے کے تاثرات یوں ہوتے جیسے یہ فخریہ پیش کش
 ہماری طرف سے ہے۔
 نوال نے نوین کو بھی اپنے جیسا سحر کلام وار سوٹ
 پہنا دیا تھا۔
 ”میری خوشی کے لیے خالہ۔۔۔ بس مجھے اچھا لگ
 گیا۔ اور آپ کون سی ابھی بوڑھی ہیں۔ کیا آپ
 میری خاطر یہ بھی نہیں کر سکتیں۔“
 اور نوین نے عمد کیا تھا وہ اپنے کسی بھی عمل سے
 بھٹک بھی نہیں پڑنے دے گی کہ۔۔۔ اور پھر اس وقت
 نوال کی خاطر وہ بہت کچھ پننے بیٹھی تھی۔
 نوال کا پلان بے عیب تھا۔ لیکن نوین جیتا جاگتا
 انسان تھی اور نکاح کے وقت وہ اس کے منہ پر پی تو
 پاندھ نہیں سکتی۔ جب ماں راضی۔۔۔ بھائی راضی۔
 گرد پیش کا ہر بندہ راضی۔۔۔ اور راضی لڑکی بھی تھی
 مگر فضول کی ضد۔ بلاوجہ کی بحث۔۔۔ زندگی برباد کرنے
 کا عزم۔۔۔
 آخری بل میں نوال کے ہاتھ پیر پھولنے لگے۔
 ٹینشن کے عالم میں ہر بندے کو اپنا باپ ہی یاد آتا
 ہے۔ نوال کا دل کر لایا۔
 ”ڈیڈ!“ اگلے ہی بل وہ ڈیڈ کے روبرو تھی اور پھر
 منہ کاٹیپ ریکارڈ تیز تر بزنز رہا تھا
 مٹی اور ڈیڈ کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔
 ”وہ جیتا جاگتا انسان ہے نوال۔۔۔ تم نے اسے پرزہ
 سمجھ لیا۔ غلط تار جوڑنے سے تو ویسے ہی دھماکا ہو جاتا
 ہے تم۔“
 ”میں صحیح تار جوڑ رہی ہوں ڈیڈ!“
 ”مگر طریقہ غلط ہے۔“ وہ تیزی سے بولے۔
 ”اور اب ہمیں یہ سب بتا رہی ہو۔ غضب خدا کا
 لڑکی کو خبر تک نہیں کہ آج اس کا نکاح ہے۔“ مٹی کو
 ہول اٹھنے لگے۔
 ”ایک تو مجھے یہ عورتوں کی ہائے وائے بہت آگ
 لگتی ہے۔“ اس نے یوں کہا جیسے خود مرد ہو۔

”دیکھیے!“ ذرا توقف کے بعد وہ قتل سے گیا ہوں۔
 ”غور سے سنئے اور سمجھئے میرے دائیں بائیں۔۔۔ اور
 جان اور اخطاب چاہا ہوں گے۔ آپ خالہ کے
 دائیں بائیں جا کر بیٹھ جائیے گا۔ جب ہاں کا مرحلہ
 آئے تو۔۔۔ ایک ہاتھ شانوں پر رکھ دیجیے گا اور
 دوسرے سے ان کا ہاتھ دبا لے گا اور کہئے گا یوں دینا قبول
 ہے پویشن ایسی ہے کہ انہیں ہاں کہہ ہی ہوگی۔
 ”وہ ناں کہہ کر کھو گھٹ پلٹ بھی سکتی ہے۔“ مٹی
 کی آواز پھٹ جانے والی تھی۔
 ”نہیں کہیں گی۔۔۔ میں نے کمانا وہ پور مشرق لڑکی
 ہیں۔ جان جائے پر آن نہ جائے۔ اور۔۔۔ اور نعمان
 بھائی اور نالو (نہت نیگم) فقط یہ جانتی ہیں کہ نوین کا
 رشتہ ہو رہا ہے اور ان کے لیے یہی کافی ہے۔ نعمان
 بھائی کو البتہ سب علم ہے۔ وہ ہاں لے بغیر انھیں گے
 نہ اٹھتے دیں گے۔“
 ”نوال! اپنا گل ہو چکا ہو۔“ مٹی ہر اس بات پر
 ”ہاگل میں نہیں خالہ ہیں۔“ وہ ذرا اونچی بولی۔
 ”ایک شخص اگر کتوں میں گر رہا ہے تو کیا ہم اسے
 گرنے دیں گے۔ نہیں ناں۔۔۔ بس۔“ وہ ہاتھ اٹھا کر
 قطعیت سے بولی۔
 ”اور اگر بالفرض وہ مشرق لڑکی نہ ہیں اور پھر بھی
 اڑی کی کوشش کی تو؟“
 ”نعمان بھائی ہاتھ دیا کر آنکھ کے اشارے سے
 سامنے پڑی بندوق کو دیکھیں گے اور ویسے بھی جتنا
 مرضی لبل بن جائیں۔ امریکن فیشنلٹی ہو لڈ۔۔۔
 چرا“ نکاح پر بھانے کے خیال سے ان کی قبائلی انا کو جو
 تسکین ملتی ہے ناں وہ اس کے لیے سب کچھ کر
 گزریں گے۔“
 ”اور اگر وہ پھر بھی نہ مانی۔ تو کیا رہتی دنیا کے لیے
 تماشا چھوڑ جاؤ گی۔ نکاح کا مولوی بھی سامنے ہو گا۔
 زبان زد عام ہو جائے گا قصہ۔“ مٹی کو دنیا کی سب
 نزاکتوں کی خبر تھی۔
 نوال خاموش ہو گئی۔ ہاں یوں بھی ہو سکتا ہے لیکن

”اور یہ جو نوین ہے۔ مجھے تو اب بھی لگتا ہے نہیں
 مانی ہے۔ کیا تم لوگ جبراً نکاح پر بھار ہے ہو۔“ کتابے
 رنگ چڑھ رہے۔ ویران اجڑی بھڑی۔ مجھے تو روٹی
 روٹی لگتی ہے۔“
 اب وہ نوین کو دیکھتے ہوئے نوال کے کان میں گھسے
 تھے۔ نوال ان کے تجزیے پر عرش عرش کرا بھی مگر بولی
 کچھ نہیں۔
 سب کچھ ٹھیک چل رہا تھا۔ مگر اسے کچھ گھبراہٹ
 ہونے لگی تھی۔ اگر ایک جانب ڈیڈ کا ہمت دلاتا چہرہ تھا
 اور نعمان کا قطعیت سے بھرپور انداز تو دوسری جانب
 مٹی نے آنکھیں اس حد تک پھیلا رکھی تھیں کہ اب
 مزید گنجائش نہیں تھی۔
 نوال نے پہلے بار سوچا۔ اگر وہ سب ویسا نہ ہو جیسا
 کہ اس نے سوچ رکھا ہے تو۔۔۔ پہلی بار اس کی
 ہتھیلیوں اور ماتھے سے پسینہ پھوٹا اور ایک فن تاثر چہرہ
 پر آن رکھا۔
 ”اور تم اتنا تیار کیوں ہو؟ دلن ہی لگ رہی ہو اور وہ
 نوین تو بالکل دلن نہیں لگ رہی۔“ اشتیاق احمد نے
 اب اسے جانچا تھا۔
 ”سبح کلام راجوڑے کا کلام سے جو جھل دو بٹا اس نے
 سر سے گزار کر نوین پلو سیدھے سامنے ہی پھوڑ دیے
 تھے۔ ٹیکہ تک لگایا ہوا تھا۔ مندی چوڑیاں۔
 ”نکاح سے پہلے لو لکیاں ایسی ہی ہو جاتی ہیں۔
 او اس“ مولل بے رنگ اور۔۔۔ آخر آپ ایک لڑکی پر
 کنسنٹریٹ کیوں نہیں کرتے۔“
 اس نے جل کر ٹوک دیا مگر اشتیاق احمد پر ذرا ہوا اثر
 ہوا ہو۔
 ”کیسے کروں۔ اتنے رنگ تو گرگٹ نہیں بدلتا،
 جتنے تم لوگ بدل رہی ہو اور سب ایسے چپ ہیں جیسے
 کوئی جرم ہو رہا ہو۔“
 ”یا اللہ! انہیں بھی پلان میں شامل کر لیتی، آخر یہ
 کیسے چپ ہوں گے؟“ نوال نے سوچا۔
 اس نے گھبراہٹ کے عالم میں دو بٹا کانوں کے پیچھے
 اڑس لیا تھا اور بہت عجیب دکھائی دیتی تھی۔

”اور یہ جو نوین جانتی تھی۔
 ”نوال پھر کیا۔۔۔ میں ہوں ناں۔۔۔ میرا نکاح پر بھار
 ہے گا۔“
 اس نے ہونٹ لٹکا کر آخری حل پیش کیا۔ مگر
 کے پسٹا کر دیکھنے پر تیری طرح سیدھی ہوئی۔
 ”میرا مطلب ہے فیکسٹ اینڈ لاسٹ آپشن۔۔۔
 آخر خاندان کی عزت کسی نے تو سنھائی ہے ناں۔
 قانونی و فوجداری زبان میں اس عمل کو کہتے ہیں
 فورس پیش ہو کر۔ اقبال جرم کرنا وغیرہ وغیرہ۔“
 ڈیڈ زور سے ہنس دیے۔ مٹی کا سر ہاتھوں پر گر ا تھا۔
 ☆ ☆ ☆
 نہت نیگم نوال کی مٹی اور گھال کے ساتھ صوفے
 پر بیٹھی تھیں۔ ان پر شادی مرگ طاری تھی۔ بیٹے
 نے بتایا تھا۔ ”پہلے تو صرف یہ خیال تھا کہ رشتہ قبول
 جائے مگر میں نے ابھی ابھی فیصلہ کیا ہے۔ نکاح
 کر کے پکا بندوبست کر دیتا ہوں۔“
 ”ن۔۔۔ نوین مان جائے گی؟“ وہ اڑی رنگت والی
 مٹی کو دیکھ رہی تھیں۔
 ”اوہاں۔“ وہ لاپرواہی سے ہاتھ ہلا کر چلے گئے۔
 دائیں جانب دلن کی طرح تیار امریکی مٹی نے
 پاکستانی ہونے کے لیے اڑی چولی کا زور لگا رکھا تھا۔
 بائیں جانب اشتیاق احمد کے ساتھ نوال براجمان
 تھی۔
 ”تمہاری کئی باتوں کے زیر اثر ہم آگئے ہیں۔ صبح
 اس نعمان نے بھی یہی ٹائم دیا تھا۔ مولوی بھی لائے
 ہیں لیکن یہاں کیا نعمان کی چوتھی کی رسم بھی ہو رہی
 ہے؟“ وہ امریکی ہو کر دیکھ رہے تھے۔
 ”ہم تو ایسے ہی سادہ چلے میں آگئے۔“ ان کے لہجے
 میں قلق تھا۔
 سفید شلوار۔۔۔ تیلے والا کھس۔۔۔ پیلا کرتا جس کی
 پٹا پر سنہری باریک کام تھا۔ سرے سے کالی
 مٹی۔۔۔ نوال نے چونک کر اور پھر جل کر ان کی
 مٹی کو دیکھا۔

تب اخطب اور انحضرت ہمارے مولوی اندر تشریف لے آئے نوین نے کتنے عرصے بعد اس شخص کو دیکھا تھا۔ وہ وہاں ہی ساحت تھا۔ مگر وہ کتنا خوش لگ رہا تھا۔ اس نے قسم کھائی تھی کہ وہ اسے دوبارہ کبھی دیکھے گی۔ نہ ہی اپنی صورت دکھائے گی۔

وہ اس کے لیے تو نہیں آیا تھا۔ نہ اسے دیکھنے۔ نہ دکھانے۔ وہ تو اب کسی اور کے لیے یہاں تھا اور اسی کو مسکرا کر دیکھ رہا تھا۔ مگر دل میں اتنا شدید درد کیوں۔ یہ آنکھوں کے آگے دھند کیسی؟

ضمیر بھائی کا ہاتھ اس کے شانے کے گرد نرمی سے کسا تھا اور نعمان بھائی نے اس کا ہاتھ تھام کے دیا اور صوفیہ بیگم کی وہیل چیز اس کے عین سامنے آ کر کی تھی۔

کیا دکھ اور کشمکش! احساسِ زباں اتنا حاوی ہو گیا کہ سب اپنے اپنے طور لے لے دیتے آگے بڑھ آئے تھے۔ ”کو بیٹا! قبول ہے؟“ اس کی آنکھیں بند تھیں۔ اس کی سماعتوں سے جملہ ٹھہرا گیا۔

توپوں لگا کسی نے دل میں دودھاری خنجر اتار دیا ہو۔ ”کو نوین۔۔۔ صرف ہاں بول دو۔“ یہ صوفیہ بیگم کی آواز تھی۔

”نوں! مولانا صاحب منظر ہیں۔“ یہ نعمان بھائی کی دو ٹوک آواز تھی۔ ساتھ ہی ہاتھ کی گرفت پر سختی کا سا احساس۔ اس نے چونک کر آنکھیں کھولیں اور سر اٹھا دیا۔

نوال شدید اضطراب کے عالم میں ہاتھ مسلح کھڑی ہو چکی تھی۔ نہ منت بیگم بھی کھڑی تھیں۔ نوال کی مٹی درگاہ لگنے والے وقت کے خوف سے لرزہ برپا نہ تھیں۔

امریکی بھابھی اور بچے پہلی بار پاکستانی نکاح دیکھنے کے اشتیاق میں اس کے سر پر ہی چڑھے آ رہے تھے۔ دائرہ اتنا تنگ ہو گیا تھا کہ مولوی صاحب اسٹول سے گرنے والے ہو رہے تھے۔ ضمیر خان کا سہلانا ہوا ہاتھ اور نعمان بھائی کی گرفت۔

صوفیہ بیگم کی آنکھ سے گرتے آنسو۔ سب کی

سانس رکی ہوئی تھی۔ ”کوہاں۔۔۔! نعمان خان کی آواز بلند ہوئی۔ وہ سب بھول گئی۔ سینکڑوں کاوقف۔ بس منہ نہ نکلیا۔

”ہاں۔۔۔!“

”یا ہوس۔“ سب سے بلند آواز نوال کی تھی۔ اور پھر مبارک سلامت کا شور۔ نعمان خان کے کرخت چہرے پر نرمی اور پرانے جذبات اٹھ کر آئے تھے۔ انہوں نے لڑکھائی نازک نوین کو اپنے بازوؤں میں یوں سمویا کہ وہ دکھائی ہی نہ دیتی تھی۔ سب اپنی اپنی بولیاں بول رہے تھے۔ آنسوؤں کی زبان۔۔۔ خوشی کا اظہار۔

”آپ کی جگہ میں ہوتی تا تو اب تک بھگتوے ڈال ڈال نشن چلی کر دیتی۔ ارے آپ کو تو یہ بھی نہیں پتا کہ یہاں ہو گیا ہے۔“ وہ سنجیدہ و متین اخطب کے سر پر پختی۔ اخطب نے ایک گہری سنجیدہ نگاہ اس پر ڈالی۔

”تو در کس بات کی۔“ کلاہ صوفیہ پر غنا۔ ”شروع ہو جاؤ۔“ نعرے کے ساتھ ہی وہ اندھا دھند ناچنا شروع ہو چکے تھے۔

”باہ! نوال نے منہ پر ہاتھ رکھا۔

اتنا بڑا۔ اتنا مشکل کام۔ اتنی آسانی (حال بازی) سے ہو گیا۔ دنیا میں کبھی ایسا بھی ہوا ہے؟ لیکن ہو گیا تھا۔

نوال نے سر پر جھانڈا تو بچ کر کندھے پر نکلیا اور دھپ سے صوفیہ پر گر گئی۔ اسے نوین نظر نہیں آ رہی تھی۔ کیونکہ میز پر کھکا کر انحضرت صاحب کا ڈانس اخطب صاحب بے خود ڈانس اور اشتیاق انکل ٹنگ ڈانس کے اسٹیمپ لے رہے تھے۔

ایک ہلکا کار میں امریکی بچے فیوژن پیش کر رہے تھے۔ لگتا تھا ان کے جسم میں ہڈی ہی نہیں ہے۔ امریکی ہوتا یاں بیٹ رہی تھی۔

ایک ہنسی کا طوفان تھا۔ تب ہی گلال نے نوال سے کہا۔ ”یہ شو ساری شام چلے گا۔ ایسا نہ ہو نوین گھونگھٹ الٹ کر دھاڑ مارے اور ہر بندہ اسٹاپ ہو جائے۔ انہیں تو اندر لے کر چلو! اب اللہ جانے گھونگھٹ کے اندر خوشی کے مارے ہانپ رہی ہیں یا غصے کے مارے کانپ رہی ہیں۔“

”ہاں نہیں یا کانپیں۔ اب یہ ہمارا درد سر نہیں۔ اور میں نہیں لے کر جاری اندر۔ ایسی لائیو رفا رمنس کوئی روز، روز دیکھنے کو ملتی ہے؟“ نوال کی نظریں پر فارمز پر تھیں۔ صفا جواب دے دیا۔

”نوں! ابھی اس وقت میں ان کے سوالوں کے جواب نہیں دے سکتی۔ اتنے دن کی ٹینشن کے بعد ابھی تو ملا ہے ریلیکس۔۔۔ آپ ہی لے جائیے۔ آپ کے سامنے کچھ نہیں کہہ سکیں گی۔“

نوال کو پتا نہیں کس چیز نے روک رکھا تھا ناپنے سے، مگر وہ بیٹھے بیٹھے ہی ڈانس کے وہ وہ اسٹیمپ لے رہی تھی کہ کیا کہنے۔

گلال مایوس اٹھی اور اپنی مٹی کے کانوں میں گھس گئی۔

اگلے منٹ میں مٹی اور گلال نوین کو سہارا دیے اندر کی جانب پڑھ رہی تھیں۔ جو بچ لاش کی طرح کھٹکتی جاری تھیں۔

”کیا پچھو کو کوئی میڈیکل برائیم ہو گیا ابھی ابھی جو انہیں سب سہارا دے کر لے جا رہے ہیں۔“

امریکی بھائی نے دفعتاً ”اپنے دوسرے امریکی بھائی سے امریکی پر تشویش لہجے میں دریافت کیا۔ دوسرا بھائی بھی حیرت سے کمرے سے نکلتی پچھو کو دیکھ کر شانے اچکا گیا۔ مگر سب متوجہ ہو گئے تھے۔ لہذا نوال کو ایک بار پھر میدان میں کودنا پڑا۔

”بے وقوفو! پاکستانی دلہن دھڑ دھڑ کرتی فلا نہیں نہیں بھرتی۔ اسے ایسے ہی فریڈ ز نکاح کے بعد سہارا اسے لے کر جاتی ہیں۔“

”کیوں۔۔۔ نکاح کے بعد کیا اسے کوئی میڈیکل

برائیم ہو جاتا ہے؟ اور ہمارے ہاں تو برائیز خوب ہنستی ہیں اور ڈانس کرتی ہیں۔ پچھو نے تو ڈانس بھی نہیں کیا۔ کیا وہ خوش نہیں ہیں؟“

”ہائے یہ امریکی بچے۔“ نوال نے مدد طلب نظروں سے سب کو دیکھا، کوئی تو ہو جو۔ مگر سب ہی انگشت بدنداں تھے۔ بچے دو ٹوک تھے اور اس شرمیلی صورت حال کو ہضم نہیں کر پا رہے تھے۔

”بیٹا! ایڈیشن برائیز کے دل میں لٹو پھوٹے ہیں۔ وہ بند کمرے میں بھگتوے ڈالتی ہے۔“ صوفیہ بیگم نے دریا کو کوزے میں بند کر دیا۔ سب کے ہونٹوں پر مسکان آ گئی۔

”لٹو۔۔۔ دو نوں بچوں نے حیرت سے لفظ دہرایا۔ ایک دوسرے کو دیکھا۔ ”واٹ۔۔۔ لٹو۔۔۔“

ضمیر خان اور نعمان خان نے بلند آہنگ قہقہہ لگایا۔

”اب لٹو دکھایا بھی جائے اور کھلایا بھی جائے۔ اور چلو یہ تو پابل ہے۔ گراس چیز کو کیسے ایکسپلین کیا جائے لٹو پھوٹا۔“ نپٹے اب نوال ہی۔۔۔ ”مگر بچوں کی رواں گلی جملے نے پلٹ دی۔

”یو مین! پچھو اس وقت بند کمرے میں بھگتو ڈال رہی ہیں“ واٹ۔۔۔ ”دونوں نے شریر انداز میں ایک دوسرے کو دیکھا۔ ”لٹو گس۔“ وہ سرپٹ دوڑے۔ بند کمرے میں سرخ جوڑے میں ملبوس پچھو ناچ رہی ہوں گی۔

ان کے بھائے قدرتوں کو گلال اور مٹی نے روکا۔ وہ نوین کو پچھو ڈر آ رہی تھیں۔

”اے خبروا۔۔۔ وہ پڑے چیخ کر رہی ہیں۔“ ”نہیں۔۔۔ اونٹ۔“ بچے اور اخطب اشتیاق ایک ساتھ ہی چونکے۔

”مٹی تو فوٹو سیشن بھی نہیں ہوا۔“ وہ انحضرت کے کان میں بریز پڑے تھے۔

دونوں کی نظریں گلال اور نوال کی سمت گھومیں۔ ”آپ دونوں اپنی ڈانس پر فارمنس پر ہی دھیان دیں تو بہتر ہو گا۔ کہیں فوٹو سیشن کے شوق میں فٹ

سیشن (اؤس) کنہ شروع ہو جائے ہو نہ۔
 ”لیکن وہ میری بیوی ہے۔“ اخطب کو کچھ سمجھ
 میں نہ آیا تھا مگر سینہ ٹھونک کر حق ملکیت دائر کرنے
 میں بد اطفا ملا۔
 نوال اور گلال نے ان کی خود اعتمادی اور بے خبری کو
 گھور کر دیکھا تھا مگر اگلے ہی پل دونوں بری طرح ہنس
 دیں۔
 نوین سے ملاقات اس نے سب کے جانے کے بعد
 باقاعدہ تیاری سے کرنا تھی۔

لیکن نوال کا یہ انداز غلط ثابت ہوا کہ اسے نوین کو
 اکیلے ہی جھیلنا ہو گا۔ نکاح کے بعد کھانا اور کھانے کے
 بعد جیسے برائیاں گھر جانا بھول گئے۔ ہنس مذاق، قہقہے،
 رات ڈھائی بجے ان کے رخصت ہونے کے بعد سب
 جہاں کہیں لڑھکنے کے مصداق پڑ گئے تھے۔ بے ہوشی
 کی نیند مگر۔

بہلی بچکیاں، دلی سکیاں۔ جو شور و غوغا میں کسی
 کے کان نہ پڑی تھیں۔ سناٹے میں سب کو بیدار
 کر گئیں۔ مندی آنکھوں چکرائے سروں اور
 لڑکھائے قدموں سب آوازوں کے تعاقب میں جب
 نوین کے کمرے تک پہنچے تو منظر حیران کن تھا۔ وہ اسی
 سرخ سوٹ میں لمبوس تھی۔ دوپٹا پیروں پہ پڑا تھا اور
 گھٹنوں میں منہ کر کے روئے چلی جاتی تھی۔

اس کے رونے کی وجہ سے سب واقف ہی تھے۔
 2013ء میں ایک بڑھی لکھی لڑکی کی زندگی کا اتنا
 اہم ترین فیصلہ ایسے طریقے سے کیا جانا تو نہیں چاہیے
 تھا، مگر سب جانتے تھے وہ راضی تھی۔ منہ سے بس لگی
 نکلتی تھی۔

ضمیر خان اور می کے مطابق نوین کو سمجھایا جاسکتا
 تھا۔

نعمان خان کے پاس وقت نہیں تھا۔ وہ نوین کے
 فرض سے فارغ ہو کر ماں کو ساتھ لے جانا چاہتے تھے۔
 اگر کچھ اور عرصے یہ کشش جاری رہتی تو صوفیہ اپنی

معذوری و بدھائی کے واسطے دے کر بیٹے کو اپنے
 راستے کی نشان دہی کر دیتیں اور ماؤں کو آخر تک تنگ
 ٹالا جاسکتا ہے۔

رہی نوال ضمیر خان۔ اس کی زندگی میں کامیابی
 تکمیل تک پہنچاؤ تا سب سے اہم مشق تھا۔ جو پہلے
 جب، کب۔ کس نتیجہ حسب نفاذ ہونا چاہیے سو
 اس کی عقل اور فیصلہ۔ کچھ دیر تک حیرت سے
 کھڑے سب لوگ اسے دیکھتے رہے۔ زینت منیر خان
 اب تک کچھ نہ سمجھی تھیں وہ بس خوش تھیں۔ بیٹی گھر
 کی ہو گئی اور گھر والا بھی پسندیدہ۔ لڑکیاں ایسے سطحوں
 پر رونے ہی ہیں مگر نعمان خان نے ایک کرسی صوفیہ اور
 نوین کے عین سامنے بیٹھ گئے۔

”سب جانتے ہیں نوین۔ تمہیں اس رشتے پر کوئی
 اعتراض نہیں تھا۔ نہیں ہے۔“ ان کی آواز واضح
 دونوں اور بے لچک تھی۔ وہ وہی ہوا جو تم چاہتی تھیں
 جس کے پیچھے تم کسی بھی اور راستے کی چاہ نہ کر سکیں
 اور۔ اور۔

”لیکن بابا کو اعتراض تھا بلکہ شدید اعتراضات۔“
 اس کا جواب ترنت اور نعمان خان سے زیادہ قطعی
 تھا۔

”تو تمہارے خیال میں ایک بے وقوفی بابا کر گئے اور
 ایک بے وقوفی کرنے کے لیے تمہیں آزاد چھوڑ دیا
 جاتا۔“ نعمان خان ناؤ کھا گئے۔

”مجھے اس سے کوئی غرض نہیں کہ وہ بے وقوفی تھی
 یا کیا؟ مجھے صرف بابا کے فیصلے کا احترام کرنا تھا۔“ وہ اپنی
 سوچ میں پختہ تھی۔

”میرے بابا کی خواہش کا اتنا احترام۔ اور زندہ مال
 کی فکر و پریشانی کا کوئی احساس نہیں۔ تمہیں احساس
 ہے تمہاری بے جا زندگی کیسے ان کے پیاروں
 بوڑھے جسم اور لڑکھڑاتے اعصاب کو ختم کیا ہے؟“ وہ

بلند آواز میں بولے تھے۔ ”ہر روز۔ ہر مل۔ تمہیں
 زندہ مال کی ذرا پروا نہیں اگر ہوتی تو کب کی گھر باکر
 انہیں سکون سے مرنے کی اجازت ہی دے دیتیں۔
 تمہارا رونا تب سمجھ میں آتا جب ہم واقعی جبر کرتے اور

کسی بھی بندے کو پکڑ لاتے مگر ہم نے وہی کیا جو
 تمہاری بھی خواہش تھا۔“

نوین نے پہلی بار ظاہری و باطنی دونوں آنکھیں
 کھول کر بھائی اور ماں کو دیکھا۔

زینت منیر خان جو اس باختہ تھیں اور نا سنجی
 میں آنسو بہا رہی تھیں۔ اور نعمان خان جو سخت درمزد
 تھے۔ حاضرین کے چہرے نعمان خان کی تائید پر مائل
 تھے۔

”لیکن۔ بابا کی خواہش۔“

”بابا مر چکے ہیں نوین۔ اپنی سوچ اپنے وقت
 اپنے مزاج، اپنی خودی کے سارے روپ ان کے ساتھ
 دفن ہو چکے تھے۔ زندہ انسانوں کو زندگی اپنے حساب
 سے گزارنی ہوتی ہے۔ بزرگوں کی خواہشات و خواہوں
 کا احترام واجب ہو تا ہے مگر اس وقت جب وہ شریعت
 اللہ رسول کے فیصلوں سے منکر ہیں۔“

بابا کا فیصلہ اپنے وقت کے حساب سے تھا۔ صحیح یا
 غلط لیکن اب وقت بدل چکا ہے۔“

”تو۔ تو کیا بابا غلط تھے؟“ وہ ان کی بات کاٹ کر
 تیزی سے بولی تھی۔

”نہیں۔ مگر جو آج ہم نے کیا، وہ بھی غلط نہیں۔“

نعمان خان نے جمائی لی۔ انہیں اب اور کچھ نہیں
 کہنا تھا۔ سننا بھی نہیں تھا۔

نوین کا چہرہ متزلزل تھا۔ وہ صحیح اور غلط کا فرق نہیں
 کیا رہی تھی۔

ضمیر خان کو اس پر ترس آیا۔ پیار آیا۔ اپنی وہیل
 چیئر کو ذرا سی حرکت دے کر وہ نعمان خان کے برابر
 آگے مرنے والے کی خواہش سے زیادہ زندہ رہنے
 والے اہم ہوتے ہیں نوین! امیرا کہنے کا مقصد فقط یہ
 ہے کہ زندہ انسانوں کو زندہ قید کر کے چائیں جو زندگی
 کے لیے ضروری ہوں۔“

سب کان کھول کر سن رہے تھے اور نوال منہ کھول
 کر۔

”مگر یہ نوال تو کچھ اور کہہ رہی تھی۔“ نوین نے
 یکدم اپنی آوازیں کہا اور نوال کو بغور دیکھا۔ نوال

پری طرح سپٹائی ”اب کیا۔ یہ۔ وہ سب کہہ دیں
 گی۔“

”نوین۔ میرے کے پر کان دھریے آپ نے۔
 میرے کے کو بھی اہمیت نہ دیں۔ بس میرے کے پر
 دھیان دیں اور میں تو کچھ بھی کہتی رہتی ہوں۔ ہے نا
 گلال۔ ہے ناؤ؟“

ضمیر خان کچھ نہ بولے۔ بیگم نے ان کی وہیل چیئر
 کو سارا دیا۔ باہر نکلے تو سب ہی باہر کو نکلے۔ نوال
 وہیں کارپٹ پر ڈھے گئی۔ گلال بھی اب خطرہ نہیں
 تھا۔ کمرے میں ایک دم خاموشی چھا گئی نوین کا چہرہ

پر سوچ تھا۔ نوال اور گلال، جمائیاں لے رہی تھیں۔
 ”لیکن تم نے تو کہا تھا کہ تم۔“ وہ اخطب کہنے

سے جھجکی۔ ”یعنی تم ان سے۔“ نوال نے بھاڑ منہ
 کی جمائی روکی۔

”وہ تو میں آپ کو چیک کر رہی تھی کہ بیچ رہا بدل
 کر سرپٹ دوڑ پڑی ہیں یا پیچھے مڑ کر بھی دیکھتی ہیں۔ پتا
 لگا۔ آپ فقط وہ بتاتی ہیں نہ صرف سب کو۔ بلکہ اپنے
 آپ کو بھی۔“ اس نے تائید طلب نگاہوں سے گلال
 کو دیکھا جو مسکرا رہی تھی۔

”اور مجھے کیا کالے کتے نہ کاٹے کہ میں ان سے
 دفع دور لیجو بندہ پہلے ہی کسی کے عشق میں عاشق
 صادق ناگھو متا ہو اس سے دل لگا کر مجھے کیا لے گا۔“

اور رہا ان کا التفات۔ ”نوال نے سر د آہ کھینچی۔

چہرے پر افسردگی چھائی اجہ ملال سے پر۔ ”اور رہی
 میں۔ ان کی نظر میں ہاں ملتے بھی تھے باتیں بھی
 کرتے تھے۔ خیال بھی رکھتے، آؤں کریم بھی کھلائی،
 گلے بھی سنوائے مگر مثال میری وہی تھی کہ ”سنگ
 لیلی بھی پیارا ہوتا ہے“ میں تو خیر لیلی کی سگی بھانجی
 تھی۔“

نیز سے کسی قدر ڈھیلی ہوتی گلال کا روال رواں
 تن گیا وہ تنکے کو پیچھے پیچھے ہنسی سے دھری ہو گئی۔
 سانس تک رکھنے لگی۔ جبکہ نوین کی گویا قوت گویائی کھو
 گئی۔ کوئی بھلا اپنے آپ کو یوں بھی کہتا ہے وہ فقط
 لاجول کہہ پائی۔

صبح بہت دیر سے ہوئی۔ ناشتے کے بعد کا موضوع شادی کی تیاری تھا جو عید کے چوتھے روز رکھ دی گئی تھی سب کی اپنی رائے اور فیصلے۔

ایک چیز کا ذکر کرتے پھر دوسری کا۔ ضروری غیر ضروری۔ سب جان بوجھ کر موضوع کو طول دیتے بلکہ یوں لگتا جیسے چاہتے ہی نہیں کہ ٹاپک بدلا جائے۔ لیکن نوال کی ایک ہاڑ کے ساتھ سب چونکے۔ وہ نوین کو کچھ دکھا رہی تھی اور کچھ کہہ رہی تھی۔ نوین کے چہرے پر حیرت، بے یقینی نے عجیب خوف زدہ سے تاثرات پھیلادیے۔ اس کے ہاتھ میں کچھ تھا اور ایک ڈھیر سا ٹیبل پر۔ سب نے آگے بڑھ کر اس کمزور کو کھول کر ایک ایک کتاب اٹھالی۔

”سایہ“ نوین منیر خان کا شعری مجموعہ۔

انتساب ”نوال ضمیر کے نام“

”ہائے ارے۔ ہائیں۔ یہ کب ہوا؟“

”ارے نوین! تم پوٹری بھی کرتی ہو۔“ الگ الگ تبصرے اور اچھے بھرے جملے۔ نوین کیا جواب دیتی وہ خود ایک شاک کے زیر اثر تھی۔

وہ سرورق پر انگلیاں پھیر رہی تھی۔ سیاہ سرورق پر دھیرے دھیرے معدوم ہوتے سائے کا عکس تھا، مگر جہاں جا کر سایہ ختم ہوتا وہاں سے اچانک روشنی پھوٹی محسوس ہوتی تھی۔

یعنی مایوسی میں کرن یعنی خاتے کے گمان پر یقین کا آغاز۔ بہت خوب۔ نوین کو اپنی زندگی کی گہلی لگا سرورق۔

نوال شاہانہ بے فکر انداز میں یوں بیٹھی تھی جیسے اس منظر سے قطعاً دلچسپی نہ ہو۔ یا وہ کچھ جانتی ہی نہ ہو۔

نہت منیر عجیب نا سنجھی کے عالم میں کتاب کو تھامے بیٹھی تھیں۔ بیٹی کا استعجاب نگاہوں کے سامنے تھا، مگر آنکھوں سے چمکتی شادی مرگ کی سی کیفیت۔ نعمان خان نے کتاب کو کھولے بنا آگے پیچھے سے گھما کر دیکھا اور ”گند“ کہہ کر بات ختم کی۔

امرین بھابی اپنی ٹوٹی پھوٹی اردو میں یا آواز بلند

اشعار بڑھ رہی تھیں اور جواثر سننے والوں پر بڑا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلتا تھا کہ سامعین اور شاعر خود بھی کچھ بل جاتے کپڑے پھاڑا بل فوج جنگلوں میں جا نکلتے بھابی بھی ہر شعر کے اختتام پر داد طلب لگا دیا۔ سب کو دیکھتیں۔ نوال پر نگاہ پڑتی تو اسے پوری پوری داد بھی دینی پڑتی اور ساتھ کیپ اسٹاپ کا اشارہ بھی۔

”ایا کو پسند نہیں تھا یہ سب۔“ بہت دیر بعد بولی۔ ”چھوڑیں جی۔ آخر انہیں پسند تھا کیا؟“ نوال جی بھر کے بد مزہ ہوئی۔ ”اب انہیں چوڑی دار پا جائے کرنا اور چٹا ہوا دوشا ک پسند ہو گا اپنے لیے، مگر آپ سے پھرتی ہیں نا۔ خالہ! آپ سمجھ کیوں نہیں لیتیں کہ کچھ چیزیں انسان کی اپنی ذات کے لیے ہوتی ہیں۔“

نوال نے اسے انداز سے وضاحت کی۔ نعمان خان اور ضمیر خان کا مشترکہ قفقہ کمرے میں کو نجل۔ نوین کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔

”بند کریں اسے کھیاں گھسیں گی اندر۔“ اس نے ڈنٹا۔

سب ورق گردانی کر رہے تھے۔ نوین کے حیران چہرے پر اب خوشی چمک، غریب دار ہونا شروع ہوا۔ نہت بیگم اور نوال اسی کو دیکھ رہی تھیں۔

نوین کا ایک نیا دمکا چہرہ۔

نکاح جیسے اہم معاملے کو حل کر لینے کے بعد اب نوال کے پاس بظاہر کوئی کرنے والا کام نہیں تھا۔ تب ہی بے خود چلا آیا۔

”آپ مجھے بس ان بیلوں کے پاس بٹھا کر آجائیں اور انھیں بھائی جان سے کہہ دیں کہ یہ یہاں سے بے گاہی نہیں۔ قربانی کے دن تک۔“ نوال پر سستی سوار تھی۔

”وہ تو آئیں گے ہی، مگر مجھے ان بیلوں کے ساتھ رہنا ہے ہر وقت۔ اتنی شوماری ہے میں نے اپنے

اسکول کے لڑکوں کے سامنے۔ وہ سب دیکھنے کے لیے آنا چاہتے ہیں۔“

”تو نے آؤنا اس میں کیا مسئلہ ہے؟“

”مسئلہ یہ ہے کہ جب میں ان سب کو لے آؤں اور دوسرا بھائی جان نے مجھے سب کے سامنے ڈانٹ کر بھگادیا تب میری کتنی عزت خراب ہوگی۔“

”تو اتنے جھوٹ بولنے کی ضرورت کیا تھی؟“ نوال کو اس کا رونابہ چین کر گیا۔

”آپ کی وجہ سے۔“ اس نے ہنسی لی۔ ”آپ سب کر سکتی ہیں نا۔“

”چھا!“ نوال نے ہار مان لی۔ ”تو چلو آؤ پھر ابھی چلتے ہیں۔“

تیز میوزک نیٹ کے اندر سے ابھر رہا تھا۔ ایک شور کا عالم۔

”تم تو کہہ رہے تھے شام کے وقت لوگ آکر دیکھتے ہیں۔ یہاں تو صبح گیارہ بجے ہی انتشار ہے۔“

بے خود لا علم تھا اس نے کندھے اچکا کر نفی میں گردن ہلائی۔

”اوہ“ نوال کے ہونٹ سیٹی کے سے انداز میں سکڑے۔ یہ بابا کار انھیں انعام کے دوستوں نے چا رکھی تھی۔ نوال نے واپسی کا سوچا۔ اسے یاد آگیا انھیں نے پہلے اس کے دوستوں کے سامنے آجانے پر کس قدر رانا مانا تھا، پھر نا تو بھی خفا ہوئی تھیں۔

لیکن اس سے پہلے کہ وہ واپسی کے لیے قدم بڑھاتی انھیں انعام کی بوھڑا نے قدم روک دیے۔

”تم!“ نوال کو جواب نہ سوجھا۔

”تمہارے بیل دیکھنے آئے ہیں۔ تم نے تو ایک بار بھی دعوت نہ دی۔“ وہ دوستانہ انداز میں شکوہ کنال ہوئی۔

”تمہیں دعوت کی کیا ضرورت۔ چوری چھپے دیکھ تو رہی تھیں اس دن۔“ اس کے جملے میں طنز کی آمیزش تھی۔ نوال ہنسی۔

”نوال! اندر میرے دوست ہیں۔“ وہ مبالغہ انداز میں بولا۔ نوال کے عزم آخر چہرے سے جھلک رہے

تھے۔

”ہاں دوست ہی ہوں گے دشمنوں کو تو تم نے باہر کھڑا رکھا ہے۔“

”کیسی بات نہیں ہے، تم بعد میں آنا۔“ وہ اسے جلد از جلد رخصت کر دینا چاہتا تھا۔ مبادا کوئی باہر آئے جبکہ نوال کو اس کے صبر کو آزمانے میں مزہ آ رہا تھا۔

”اور تم نے اس بچے کے چارے سے کاہے کی دشمنی پال لی۔ اسے اندر کیوں نہیں آئے دیتے؟“

انھیں نے بے خود کو گھورا جو اپنی طاقت (نوال) کے سہارے بڑے انداز سے کھڑا تھا۔ وفاداریاں بدل لینے والا غدار۔ انھیں نے اسے معاف تو نہیں کیا تھا نوال کو باجی بنالینے کے بعد۔ بھائی جان والا ورق جیسے پھاڑ چکا تھا۔

”شام کو آیا کرے نا۔“

”تم بھی تو سارا دن بیٹیں ہوتے ہو۔“

”اس لیے کہ یہ میرے بیل ہیں۔“

”ایک بچہ اگر تھیں سامنے بیٹھ کر دل خوش کرے گا تو کیا تمہارا ثواب کم ہو جائے گا۔“

اندر سے انھیں کے نام کی پکار پڑی تھی۔ یہ نوال کی بچی اگر اب بھی نہ گئی اور اگر کوئی باہر آگیا تو۔

”اب تم جو بھی سمجھو۔“ وہ ہٹ دھرمی سے بولا۔

”اور پلیز جاؤ۔ خود خرید کر لاؤ بکرے اور کرواؤ اس سے چاکری۔“

”وہ تو ہم لے ہی آئیں گے۔ ہمیں کون سی نمودو نمائش کرنی ہے، ہم تو اللہ کی خوشنودی کے لیے۔“

انھیں نے چہرے پر ایسے تاثرات جمائے جیسے سن ہی نہ رہا ہو۔ نوال سب سمجھ رہی تھی وہ بس اسے وہاں سے رخصت کرنا چاہتا تھا۔

”آؤ بے خود!“ اس نے بے خود کا ہاتھ تھاما اور واپسی کی راہ لی۔

”لیکن میرے دوست!“ وہ منمنایا۔

”تم آؤ تو۔“ انھیں کو یہ حرکت بہت مہنگی پڑے گی۔ تم کل اپنے دوستوں کو بلا لینا سبکی جھ پر چھوڑو۔“

واپس گھر آکر اس نے نوین کے سامنے خوب شور مچایا۔

”بس آپ نے پہلا کام یہ کرنا ہے۔ ایک بری چاچی بن کر سب سے پہلے اس اخفش کا پتا صاف کرنا ہے نکال دینا گھر سے باہر۔ اس بن ماں کے بچے کو۔“

”اس کے دوست تھے نوال اب ہر طرح کی سوچ رکھنے والے ہو سکتے ہیں۔ کس کس کو وضاحتیں دینا کہ ایک اتنی خوب صورت لڑکی اتنے لوگوں میں۔“

”اس نے اس بار مجھ سے ڈائریکٹ پگالیا ہے نانی جان۔!“

”چھوڑو بیٹی۔ اتنا پیارا بچہ ہے پتا نہیں تم نے اول روز سے اس سے کیا پیر پاندھا۔ اسے عور میں ڈھکی چھپی پسند ہیں، لچائی شرمائی، تم اس کی سوچ کا الٹ نکلیں یا اعتماد اپنے قوت بازو پر بھروسہ کرنے والی اور۔“

”نانا! نوال حلق کے بل چلائی۔ ”زیادہ طرف داری مت کریں۔ آپ فیصلہ کر دیجئے۔ آپ نے مجھے رکھنا ہے یا اسے؟“

”دونوں کو۔“ زینت بیگم نے مسکرا کر فیصلہ سنایا۔

”ایک میان میں دو تلواریں نہیں رہ سکتیں۔“ وہ قطعی بن سے بولی۔

”تو تلوار بننے کی کیا ضرورت ہے۔ پھول بن جاؤ۔ ایک گلدان میں دو پھول تو رہ سکتے ہیں نابلکہ گلدرست۔“

نانو نے لاجواب کر دیا۔ وہ چند بل کو چپ کی چپ رہ گئی۔ پھر وہ بیان آیا۔

”میں ابھی آپ غلط ہیں۔ پھول تو میں ہوں اور وہ۔“ اس نے قصداً ”جملہ ادھورا چھوڑا اور گال پھلا لیے بساط بھر۔

”پھول ہے وہ بھی، مگر آپ نے کبھی گوبھی کے پھول کو گلدان میں جتنا دکھا ہے۔“

نانو کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔

نوین کی جلتیگ نبی نے نوال کو چونکایا۔ نبی میں ایسی کھٹک سیلے نہیں تھی زینت بیگم نے بھی اس بل پر احساس کیا تھا۔

”تمہارے دوست تو نہیں ہیں نا اندر۔ کیا ہم اب آسکتے ہیں؟“

آج پھر نوال دست سوال دراز کیے ٹینٹ کے باہر کھڑی تھی بے خود اس کے بالکل پیچھے تھا۔ ذرا سی گردن نکال کر اس امید بھری نگاہوں سے اخفش کو دیکھ لیتا جو فیصلہ اب وہ سنائے۔

دونوں کے چروں پر اتنی ساوگی، شرافت اور عاجزی تھی کہ اخفش شرم سے پانی پانی ہو گیا۔ اسے اپنے کل کے رویے کی بد صورتی کا بخوبی احساس تھا مگر اس کے دوست گنتے کینے اور ضیعت تھے۔ وہ اس بات کو بھی بخوبی جانتا تھا۔

”آئی ایم سوری۔“ اس کے منہ سے نکلا۔

”نہیں اوسے۔ میں سمجھ سکتی ہوں۔“ نوال تو مکملی جاری تھی۔

اخفش نے راستہ چھوڑ دیا۔ دونوں ریڈ کارٹ پر چلتے بیلوں کی جوڑی تک آگئے۔

جانور بے پناہ خوب صورت تھے اور ان کی قیمت لاکھوں روپوں تک تھی۔ اخفش کے پیپا سالوں سے وعدہ کر رہے تھے کہ وہ اس بار لانا ”عید اس کے ساتھ کریں گے، مگر وہاں امریکا میں ان کی پوری فیملی تھی۔

ہر بار معذرتی کل آجاتی۔ اس بار اپنی غیر حاضری کو بہت سارے نوٹ بھیج کر بھرے کی کوشش کی تھی۔ اخفش خوش تھا بہت زیادہ۔ ماں کی ابر کرکٹ میں موت۔ باپ کا نئے ملک میں نئی دنیا بسایا اور اسے بھول ہی جاتا۔ اس کے دل کے زخم تھے۔ اس کے بھاری بھر کم وجود میں ایک دل تھا جو حساس تھا نازک اور بے قرار۔

بے خود نے تو بیلوں سے لپٹ کر چوم چوم کر اپنی پسندیدگی محبت اور بے خودی کا اظہار کیا جبکہ نوال نے

ایک طویل تعریفی پیرا گراف پڑھ کر سنایا جس کے ہر جملے پر اخفش کے چہرے پر ایسے تاثرات پھیل جاتے، جسے اس کی تعریف کی جا رہی ہو۔ رنگ سرخ۔ آنکھوں میں چمک اور تائید۔ واہ۔

”تم نے آئی کو کیسے منایا نوال؟“ وہ قطعاً ”نہیں پوچھنا چاہتا تھا مگر ذہن و دل میں ٹکراتا سوال اسے سامنے دیکھ کر خود بخود منہ سے نکل گیا اور جملہ پورا ہوئے ہی اس نے خود کو لٹاؤا۔ اب نوال کے چہرے کے فخریہ تاثرات خود ستائشی والے جملے سننے پڑیں گے۔

لیکن نہیں۔ وہ نوال کو ابھی جانتا نہ تھا۔ نوال آج کی اور ہی مشن پر تھی۔

”میں نے کیا منانا۔ بس سب نے سمجھا ہی تھا۔ انکار کی بھی تو ایک حد ہوتی ہے۔ مجھے تو بس یہ خوشی ہے کہ کہانی کا اینڈ بھی ہے۔“ وہ متانت کی تصویر بنی ہوئی تھی۔

”تم آج شاپنگ پر جاؤ گے اپنے چاچو کے ساتھ۔“

اس نے جیسے یک دم یاد آنے پر پوچھا تھا۔

”جانا تو چاہتا تھا مگر یہاں بیلوں کے پاس میری زیادہ ضرورت ہے۔“ اس کے دوستانہ انداز پر اس نے بھی اپنا مسئلہ بیان کر دیا۔

”ذرا اصل میں شہ بالا بنوں گا نا۔“ وہ خوشی اور فخر سے بولا۔

نوال نے فوراً ”اگنی نگاہیں بیلوں کے گوبر پر نکادیں شہ بالا نے اخفش کو دیکھنے سے جو گدگد ہی ہوئی تھی۔ اس کے تاثرات چہرے سے نہ چھلکیں لہذا کسی الٹ شے کو دکھا جائے۔

”یہ تو بہت ہی اچھی بات ہے۔ تو تم جاؤ نا۔ یہاں سیکورٹی گاؤڈ ہیں اور بے زار لالا داوا جان کو بھی بلا لیتے ہیں۔ پھر بے خود اور میں بھی نہیں ہیں میرا تو بٹنے کو دل نہیں کر رہا۔ اتنے تو یہ پیارے ہیں۔ دل کرتا ہے بس دیکھتی ہی رہوں۔“

نوال نے لہجے میں بے حد اشتیاق محبت اور بے لگی شامل کر لی۔ وہ دونوں ہاتھ ایک دوسرے میں پھنسا

کر دہری ہی ہو گئی تھی۔

اس کی مجبوری نے اخفش کا دل موم کر دیا۔

”ہاں۔ ہاں تم تو رہو نا دھری رہو۔ دن کے وقت تو ادھر کی کو آنے کی اجازت نہیں ہے۔ شام ہی میں آتے ہیں لوگ۔“

”تو تم بھی اپنی شاپنگ کر آؤ نا۔ میں ہوں نا ادھر۔“

اخفش نے سر ہلایا نوال کی موجودگی اطمینان کا باعث تھی۔

عید کا دن واقعی عید بن کر دونوں گھروں میں اترا تھا۔ دیو دیوار تک سے خوشی کے رنگ پھوٹ رہے تھے۔ ہر چہرہ دمک رہا تھا۔ ہر دل دھڑک رہا تھا طمانیت سے۔

زینت بیگم کی خوشی کا عالم۔ پچھلے برس آنکھیں دکھ سے بہتی تھیں اس بار خوشی سے چھلکتی تھیں۔ اتنی رونق اتنی آوازیں، توتھے مینا، بو، پوتے، بھانجا، بھانجی، بھتیجی اور نوین کی صورت اس نے ایک بار بھی تھک نہیں لگایا تھا۔ نہ وہ بہت زیادہ بولی رہی تھی۔ مگر ایک خوش گواردل موم لینے والی تحریر تھی جسے سب ہی پڑھ رہے تھے۔ نوین کی نبی بے آواز تھی، آنکھوں سے چھلکی پڑتی تھی۔

اتنے بڑے جانوروں کے فنج ہونے کا منظر دیکھنے کے لیے ایک جم غفیر اکٹھا تھا۔ لڑکیاں بھی سب ٹیرس پر کھڑی تھیں۔ برو فیٹل قصائی آئے تھے، مگر اشتیاق احمد اور اخفش بھی قل فارم میں تھے۔

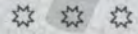
تیل بے حد تندرست اور جان دار تھے۔ چروں پر معصومیت اور شرافت تھی، مگر شرافت سے بچنے کے کرک فنج ہونے کو تیار نہیں تھے۔ اسے پاندھنے کے بعد سب نے زور بازو آزمایا، مگر گرتی ہوئی دیوار کو آخری دھکا اخفش ہی نے دیا۔

سب خواتین کی آنکھوں میں ستائش آن رہی۔

”ہو نہ ہو۔ تیل نے تیل کو گرایا۔ کون سا مکمل

دکھایا؟ "نوال کی اپنی قطعی سوچ تھی۔
نون نے اس کی پسلی میں چٹکی کاٹی۔ "میرے
جملوں پر کان کھڑے کرنے کے بجائے اپنی آنکھیں
کھول کر ادھر دیکھیں، جہاں آپ کے موصوف فوڈ
انسپکٹر بن کر محض جائزہ ہی لے رہے ہیں۔" نوال
کا اشارہ اخطب اشتیاق کی طرف تھا۔
"مجھے کیا ضرورت ہے دیکھنے کی۔" وہ مگر گئی۔
"ساری عمر جو دیکھنا ہی ہے۔" گلال نے کلوا
جوڑا۔

"وہ ملنے کو بے تاب ہیں۔" نوال نے یاد دلایا۔
"جب اتنے عرصے صبر کیا تو پچ میں چار دن ہی تو رہ
گئے ہیں۔" گلال نے کہا۔
"وہ کہتے ہیں چار دن بعد تو پھر آوازیں لگا کر سن گی۔
نون! میرے موزے لاؤ اور چائے پیو تو پھر پوچھ لو
جیسی ہی ہوگی۔ بیس سال پرانے عشق کی یاد گار ایک
جملہ تک نہیں۔"
نون نے دہل کر اس کے منہ پر ہاتھ رکھا۔



نوال نے ہانپتے ہوئے اور جھنجھلائے انداز میں آکر
نون کو پکارا۔
"میری سم نہیں مل رہی۔ اب آپ ڈھونڈ
کر دیں۔" وہ اتنی پریشان دکھائی دے رہی تھی کہ نون
فورا "مدد کو آئی۔"
"تم نے نکالی ہی کیوں تھی؟"

"پہلے چار جر خراب ہوا۔ اب فون بھی تنگ کر رہا
ہے۔ اس کو بلا جلا کر دیکھ رہی تھی۔ بیڈ پر گری یا
کارپٹ پر کچھ خیر نہیں ہوئی۔" نوال بے زار تھی۔
"تو تمہارا کمرابھی ٹوکیاؤ خانہ ہے؟ ہر چیز بے جگہ۔
سوئے وقت بستر تک تم بھاڑی نہیں عیس جہاں نیند
آئی انشا غفلت۔" نون بولتے ہوئے اندر داخل ہوئی۔
"تم بیٹھی کہاں تھیں؟ جب سم گری ہے۔"
"وہیں بیٹھی تھی جہاں اب آپ کے" وہ بیٹھے
ہیں۔ "نوال کی آوازیں غلبت تھی اور ساتھ ہی دروازہ

بولت ہو گیا۔

"نوال۔" نون نے تیزی سے مڑ کر دروازہ اپنا
جانب کھینچا اور دھڑوڑا دیا۔

"آجائوں گی پندرہ منٹ بعد۔ زیادہ شور نہ کریں
ایسا نہ ہو سارا گھر ادھر آکر پندرہ منٹ گزرنے کا
انتظار کرنے لگے۔" نوال کی آواز گم ہو رہی تھی۔
شاید پلٹ گئی تھی۔

نون کچھ نہ سمجھی اور جو سمجھ میں آیا تھا۔ اس کے
پیروں سے زمین سرکنے لگی۔ اپنی پشت پر جمی پر شوق
نگاہوں کی پیش تن من کو پھونکنے والی تھی۔ اس نے
دو سرا ہاتھ بھی لاک پر رکھ لیا۔

اخطب بیڈ پر پاؤں زمین پر جمائے بیٹھے تھے۔
دونوں کمبیاں گھٹنوں پر رکھی تھیں۔ ہاتھ ایک دوسرے
میں پھنسانے وہ ذرا سی تر بھی گردن کر کے اسے سر تپا
دیکھ رہے تھے۔

اخطب ذرا سا جھکے بیٹھے تھے اور نگاہ پیروں پر پڑتی
تھی۔

سلور انگوٹھے والی چپل۔ سلور نیل پالش۔
ہلکا گلابی چوڑی دار پاجامہ، نگاہ کا سہل پسند ستر تھیں
کے دامن پر پنچا۔ سلور نیل گلابی رنگ پر ہمار دکھا رہی
تھی۔ نازک کمر چھوٹی چوٹی چٹان کا گول سلور چوڑی
برابر کا آؤرنہ تک ساکت تھا۔ جارح کا سلور نیل لگا
دو پٹا شانے پر سمٹا تھا۔

"جتنے سال تمہاری قسم کی پاس داری میں تمہیں
نہیں دیکھا۔ اس سے ڈبل وقت میں تمہیں اسی طرح
بیٹھ کر دیکھتے ہوئے گزار سکتا ہوں نون! اگر نوال نے
صرف پندرہ منٹ پر ہیں۔"

نون کچھ نہ بولی۔ اس کا دل بہت زور سے اچھلا اور
آنکھ سے ہنسنے لگا۔ اس کے اندر رخ موڑنے کی طاقت
تھی ہی نہیں۔

"تمہیں خبر ہے، میں نے تمہارا کتنا انتظار کیا۔
یقین کے ہمراہ کسی اور جانب دھیان لگایا نہیں۔"
ہنوز خاموشی۔
"کیا اب بھی کسی قسم نے تمہیں روک رکھا ہے؟"

جنش پر بھی آمادہ نہیں۔ اگر ایسا ہے تو مجھے بتا دو
یا۔ تمہیں شاید اب تک میرے ضبط کا اندازہ نہیں
ہو۔"

اخطب کے لہجے میں افسوس گھل گیا۔
نون نے لاک کو اتنی مضبوطی سے تمام رکھا تھا کہ
نرم ہاتھوں کی رگیں تک ابھرنی لگی تھیں۔ وہ اس کا سامنا
کرنے کی خود میں ہمت نہیں پاتی تھی۔ یہ شرم "جیا"
کے خانے میں نہیں بیٹھتی تھی یہ شرم "مدامت"
کے زمرے میں آتی تھی۔

"میں جانتی تھی اخطب! آپ جے رہیں گے اور
ڈٹے ہیں گے۔ میرے قدم مضبوطی سے جے تو وہ
آپ کی موجودگی کا احساس ہی تو تھا کہ آپ ہیں اس
طرف۔" نون کی آنکھیں بہہ رہی تھیں اور دل کہہ
رہا تھا۔

"میری ضد نے آپ کو کس کس طرح آزمایا ہوگا۔
بے اندازہ مجھے۔ میں خود کو شرمسار پاتی ہوں اخطب!
آپ سے سامنا کرنے میں۔ ورنہ مجھ میں ایسا کچھ
نہیں تھا کہ میری خاطر۔"

اس کے دل سے اچھے جملے اس کے لیے تکلیف دہ
تھے۔ ایک سسکی سے ابھری اور اخطب کی سماعتوں
سے ٹکرا کر انہیں بے تاب کر گئی۔

"بہت من بایاں کر لیں تم نے نون منیر خان۔
ان آنسوؤں کو پوچھنے کے لیے اب بھی کیا میں تمہاری
اجازت کا انتظار کروں گا۔" وہ کچھ جارحانہ انداز میں
دھمک پیدا کرتے ہوئے کھڑے ہوئے تھے۔

تب ہی چارحٹ کا دھیمی حرکت سے سرکنا دوپٹا
شانے سے دامن تک پھسل گیا اور اگلے پل۔ زمین
بوس ہو گیا۔

نون نے ذرا غصیلہ لہجہ حیرت سے سنا تھا اور بیڈ
کے چرچانے کی آواز بھی وہ کرنٹ کھائے انداز میں
گھوٹی تھی۔

اخطب ایسا کیسے کر سکتے ہیں۔ اس کا دوپٹا۔
اور۔۔۔ ابھی تو اپنے صبر اور ضبط کا قصہ سن رہے
تھے اور۔۔۔ لیکن نہیں دوپٹا خود ہی سرکا تھا۔ اخطب

جارحانہ انداز میں اٹھے ضرور تھے، مگر اپنی جگہ سے ہلے
نہیں تھے۔ نون کے اندر اتنی سکت بھی نہ رہی کہ وہ
ذرا اٹھ کر دوپٹا اٹھا لے۔

وہ پورے قدم سے پوری رعنائیوں کے ساتھ عین
سامنے تھی۔

اخطب تین قدموں میں اس تک پہنچے تھے۔
نون کو سب بھول گیا۔ رات دن عہد، قسم، رشتے
ناتے، کیوں غب، کیسے کے مسائل۔

یہ اتنی بڑی زمین تھی اور آسمان۔ اور اس میں بے
بس کی دو انسان۔ باقی سب چھو متر ہو گیا تھا۔ کچھ رہا
تو صرف لفظ محبت، احساس محبت، انجام محبت۔

وہ حالت تک کو بھول گئی تھی۔ بس حال نظر آ رہا
تھا۔ جو زمین پر ذرا سا جھکا گلابی سلور پھولوں سے
بو جھل دوپٹا اٹھا رہا تھا۔

اخطب نے دوپٹا ذرا سا جھاڑا پھیلایا اور بہت لگاؤ
سے اس کے سر پر ڈال دیا۔ نون کی ٹھوڑی سینے سے
چپک گئی تھی۔

"تمہیں گمان ہوا میں نے تمہارا دوپٹا کھینچا ہے
نون! میں سارے حقوق لے کر آیا ہوں۔" نون کی
آنکھیں جھجھک رہی تھیں۔ اس نے ہونٹ کاٹتے
ہوئے لہجے میں گردن ہلائی تھی زور زور سے۔

اخطب نے اس کا بازو شانے کی پاس سے پکڑا۔
"ایک لفظ نون۔ فقط ایک لفظ۔" دوسرے ہاتھ
کی شہادت کی انگلی ہوا میں اٹھا کر لہجے میں۔ جیسے
ہار گئے تھے۔

ان کے لہجے میں کچھ تھا، نون نے نگاہیں اٹھائیں،
اس کا رونا اب آواز ہو گیا تھا۔

"ایک جملے کی گزارش ہے۔ آواز بھولا نہیں
ہوں۔ بس یاد مانہ کرنا چاہتا ہوں۔" گہری خوب
صورت آنکھیں اس کے ترتر چرے پر جمی تھیں۔

"یقین تھا آپ۔۔۔ خود سے زیادہ۔" نون کی
جھجکی ڈری مدہم ٹوٹی آواز ابھری۔ "مجمعی طرح جانتی
تھی آپ کو۔ جب ہی توانا برداؤ چیل گئی۔"
"ہاں۔ نون۔!" اخطب نے لمبا سانس لے کر

جہت کو دیکھا۔ ان پر اتنا گراں تھا۔

اعتراف کا بل۔ اظہار کا وقت۔ دیر۔ کہاں کی دیر کیسی دیر۔ محبت میں دیر نہیں ہوتی۔ اخطب کچھ کہہ رہے تھے۔ جذب دل کی شدتیں، نارسانی کا کرب، اک نگاہ کی حسرت۔ نوین کچھ نہیں کہہ رہی تھی۔

وہ محض سن رہی تھی اور اخطب مسلسل بول رہے تھے۔ نجانے کیا؟

”اگر تم پندرہ منٹ اور دو دو تو۔“ اخطب نوال سے کہہ رہے تھے۔

”نوال نے تاسف سے سر ہلایا۔ ”آپ کو پوری زندگی دے دی گئی ہے۔ اتنی چھوٹی بات مت کریں۔“

”اور باقی داوے کہنے کیا گئے تھے اور کیا سن کر آئے۔ اٹھا اٹھا تو سلامت ہے؟“

اخطب زور سے ہنس دیے اور دھیرے سے اس کے سر پر چیت لگائی۔

”تم بڑی چیز ہو نوال۔“

”آپ ابھی آدھا سچ جانتے ہیں جناب خالو صاحب۔“ نوال کو یاد آیا۔ نوین کا جبری نکاح اخطب کے علم میں اب تک نہیں تھا۔

”خالو۔“ اخطب کو انداز تھا ابھی مضحکہ خیز لگا۔

ان کی بگڑی صورت پر نوال قہقہہ لگانے والی تھی، مگر یہ۔۔۔ اخطب انعام کی دھاڑ بھی اور ساتھ بے خودی منمنائی آواز۔

وہ فتح کیے بکرے کی طرح ڈکرایا تھا اور بمشکل باریک آواز میں پکارا تھا۔

”نوال باجی۔“ دونوں آوازیں۔۔۔ اور ساتھ دیگر آوازیں کچھ غیر فطری تھیں کہ نوال سرپٹ دوڑی۔

اخطب بھی چند لمحے شرمے اور تیز قدموں سے پیچے چلے۔

نیچے کاسن کا منظر عجیب و غریب تھا۔ خود گا پھاڑ پھاڑ کر چیخ رہا تھا کیونکہ اخطب نے اسے گریبان سے پکڑ کر زمین سے کٹاؤ نچا اٹھا رکھا تھا۔

اور باقی حاضرین۔۔۔ شہر تھے۔ اتنے کہ اخطب کو منع بھی نہیں کہتے تھے۔

نوال کی صورت دیکھ بے خود کے چلانے میں اور شدت آگئی۔ وہ اخطب کے سامنے بے بس تھا، لیکن اب جیسے ہمت عود کر آئی۔ اس نے پوری طاقت لگائی اور خود کو چھڑا تا بھاگا ہوا آیا اور نوال کے پیچھے چھپ گیا۔ اخطب بھی اس قدر تیزی سے بھاگا تھا اور نوال کو دیکھ کر بمشکل رک سکا۔ اب وہ اس انتظار میں تھا کہ

نوال درمیان سے بٹے اور ایک بار پھر یہ بے خود اس کے ہاتھوں میں ہو۔

”رے کوئی بتائے ہوا کیا ہے۔ کیوں بچے کے پیچھے پڑے ہو؟“ نوال نے چیخ کر کہا۔

”بچہ۔۔۔ بچہ ہے۔۔۔ پیٹ میں واڈھی ہے اس کی۔“ وہ حلق کے بل چلایا اور مزید آگے ہوا کہ ایک بار ہاتھ آجائے۔ وہ اور بے خود زک زیک ہو رہے تھے۔

درمیان میں نوال سیسہ پلائی دیوار بھی گویا۔

”لیکن ہوا کیا ہے؟“ وہ ذرا اونچی آواز میں چلائی تھی۔ تب سب ہی اپنی اپنی بولیاں بولنے لگے۔ اوپر سے چلتی وی۔

”اسے تو بند کریں۔ مجھے کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا۔“

انہی لگاتے لمحے میں تیز تیز بولتا نیوز اینکوار سے بڑا برا لگا۔ اس نے دیکھا سب پوری طرح نیوز اینکوار کی سننے لگے۔ اخطب اور بمشکل منہ نکال کر بے خود بھی دیکھ رہا ہے۔

اخطب کی ”رے“ پر کچھ بولنے کے لیے منہ کھولتی نوال کا منہ بند ہوا اور پھر دوبارہ کھل گیا۔

”ہائیں!“ یہ تو کچھ جانا پہچانا منظر تھا۔ ”اوہ۔“ وہ سب سمجھ گئی۔ ساتھ ہی ہونٹوں پر مسکان آن رہی۔ وہ اخطب کے پیلوں کی جوڑی تھی جن کی خوب صورتی بے مثال تھی۔ لی وی کے رنگوں میں وہ اور

بارے دیکھتے تھے۔ ان کا لی وی پر آنا حیران کن نہیں تھا۔ کئی چینل والے آکر فوج بنا کر لے گئے وہ اخطب انعام جو بیلوں کی رونمائی کے بعد فلسفہ قربانی پر ایک چھوٹی سی تقریر بھی کرتا تھا۔

لیکن اس بار منظر کچھ الگ تھا۔ بیلوں کی فوج کے ہمراہ بے خود خان پر کیمرہ جاتا تھا۔

اور پھر نہ چلتی نیوز اینکوار کی زبان۔

”مگر ناظرین آپ اس بچے کو دیکھیے۔ یہ کتنی مہارت سے اندر آتے دیگر بچوں اور بڑی عمر کے لوگوں سے بیلوں کو دکھانے کے لیے۔“

بے خود خان نے اسے دیکھ کر دس اور دس اور باری ذہنیت کا اندازہ لگائے کہ دیکھنے کے دس اور ہاتھ لگانے کے پندرہ اور تصاویر بنانے کے پچاس روپے ملے کر رہے ہیں۔ اور ناظرین۔۔۔ لوگ خوشی خوشی بغیر کسی باریک بینی کے جیسے خالی کر رہے ہیں۔

ناظرین۔۔۔ ہمارا اندازہ ہے کہ اگر قربانی میں محض چند دن اور رہتے تو یہ بچہ جانور دکھا دکھا کر ان بیلوں کی قیمت جو کہ لاکھوں میں ہے جو خرید کر لیتا۔“

ایک گھنٹے میں چار بار چلنے والی یہ خبر۔ اب تک نیل کے ساحل سے لے کر تباہ خاک کا شہر تک پھیل چکی ہوگی۔

”یہ کب ہوا؟“ نوال نے دانت پیس کر بے خود سے پوچھا۔

”میرے کو نہیں پتا۔“ بے خود لا علم تھا۔

خبر بدی تو سب ایک بار پھر بے خود کی جانب متوجہ ہوئے۔ جن میں سب سے اشتعال انگیز توجہ اخطب انعام کی تھی۔

وہ کسی رسلو کی طرح اسے دونوں ہاتھوں میں اٹھا کر پٹخیاں دینا چاہتا تھا اور ایسا کوڑا کی طرح نکل کر اگلے دینا اور سر ہانہ دینا۔

مگر اب سب بڑے جو پہلے انگشت بدندان تھے دیرے دیرے بے دار ہونا شروع ہوئے۔

”میرے کو موبائل لینا تھا۔“ وہ پچھلیوں سے رو رہا۔

”تو تم کسی سے بھی کہہ دیتے۔ کون منع کرتا۔“ اخطب پر موٹی آنکھوں کے آنسوؤں کا اثر ہوا۔

سبہاں میں ہاں ملانے لگے۔

”نوال باجی نے کہا تھا کہ۔۔۔ مانگ کر چیز لینے سے عزت نفس مجروح ہوتی ہے۔“ اس نے ایک ایک کر مشکل لفظ لگا۔

”اس لیے اپنے ہاتھ کی کمانی پر بھروسہ کرنا چاہیے۔“ اس نے آستین آنکھوں پر پرکڑیں۔

”تو یہ پتھرے اپنے ہاتھ کی کمانی تھی سالے۔“ اخطب کا دماغی توازن الٹ گیا۔ ”میری ساری قربانی خراب کر دی۔ تجھے تو آج میں۔“

بے خود چچ چڑ چڑ گیا۔ اس کی گلگھی بندھ گئی۔ اس نے نوال کو دیکھا جو مزے سے کھیر کا پیالہ بھر کے بیٹھی تھی۔

”محنت کی حق حلال کی کمانی کے لیے تجھے میرے ہی تیل نظر آئے۔“

”نوال باجی۔“ بے خود کی بھینچی آواز نکلی۔

”تو اتنا تنہا سیتو برس کا بچہ اب کہاں محنت مزدوری کرنے جاتا؟ اسی لیے میں نے کہا کہ شروعات اپنے گھر سے چھوٹے پیمانے سے کرو۔“

نوال نے ایک بڑا چم منہ بھر کے بولنا شروع کیا۔

”اب کہیں باہر جاتا تو چالڈ لیبر کا کیس نہ بن جاتا۔“

اخطب غش کھائے انداز میں صوفے پر گر اٹھا۔ اخطب کے ہاتھ سے بھی بے خود کا ہاتھ چھوٹا تو وہ تیر کی طرح دوبارہ نوال کے چروں میں جا بیٹھا۔

”اب تک پورے ملک میں یہ کھانا خبر پھیل چکی ہوگی کہ اخطب انعام نے اپنے جانوروں کی قیمت رکھی ٹکٹ لگا کر۔“ وہ شدت غم و شرم سے مرجانے کو تھا۔

”تم کہو تو میں سارے ملک کی کیبل وائر ڈاؤنوں ایک بم دھماکے سے۔“

”نوال!“ ضمیر خان کی آواز گونجی۔ ”اس بار زیادہ ہو گئی کو سوری۔“

”سوری فارواٹ۔“ وہ اچھلی۔

”ڈیڈ! آپ کو پتا ہے اس نے اس دن ہماری کتنی انسٹلٹ کی تھی۔ میں تو بڑے فریڈی موڈ میں جانور دیکھنے گئی تھی۔ خود تو اسے قویٰ ہوتی نہیں کہ کہہ دیتا۔“

”میڈیا نہیں پہنچا۔ کسی نے اپنے موبائل سے ویڈیو بنا کر بھیجی ہے۔“ انکس کی دل چلی آواز گونجی۔
 ”اوہ۔“ نوال سمجھی اور ساتھ ہی زور سے ہنس دی۔ اس کی ہنسی جیسے اشارہ تھی۔ پورا کمرہ قہقہوں سے گونج اٹھا۔ ہنسی چھوٹ کی پیاری ہوئی۔ سخت سے سخت جان بندے کو بھی لگ جاتی ہے۔
 انکس پکامنے کر کے بیٹھا تھا۔ مگر ایک دو تین۔۔۔ تناؤ والا چہرہ دھیمہ ہوتے ہوئے مکان لے آیا اور پھر سب سے بلند آہنگ قہقہہ خود اسی کا تھا۔ سب نے دلچسپی سے اسے دیکھا۔

اور اس نے نوال کو۔ وہ واقعی نوال کے ذہن تک نہیں پہنچ سکتا تھا۔ اس نے سوچا تھا۔ نوال بیلوں کے ساتھ یہ وہ۔۔۔ وہ سب کر سکتی ہے، یا اس کے ساتھ (پچھلے برس کا بدلہ لینے کے لیے) لیکن جو اس نے کیا تھا۔ وہ اس کے سامنے گمان میں بھی نہیں آیا۔
 دل کو تھوڑا سا برا کر کے مسکرا دینے سے زندگی کتنی خوشگوار اور آسان ہو جاتی ہے۔

انکس نے سوچا۔ اس نے بہت طمانیت سے براجمان اپنے چچا کو دیکھا اور وہیں کوئے میں ذرا سا کٹی اپنی اتنی نوین کو۔

نوال نے خوشگوار اینڈ لکھنے کا دعویٰ کیا تھا۔ کچھ لوگ اپنے زور بازو اور قوت فیصلہ اور صبح ہونے پر ڈٹ جانے پر کس قدر نفیسن رکھتے ہیں۔
 نوال ضمیر خان ان ہی میں سے ایک تھی۔

انکس نے اسکرین پر نظر آتے بے خود خان پر نظریں جمائیں۔ جو دونوں ہاتھوں سے نوٹ بٹور رہا تھا۔

اس نے نوال کا بڑھاپا کھیر کا پالہ تمام لیا۔ دونوں کی نظریں ملیں تو چند لمحے کے توقف کے بعد ایک بے ریا ہنسی کمرے میں گونج اٹھی۔ جس میں سب کے ہنسنے بھی شامل ہو گئے۔



آؤ نوال میرے بیل دیکھو۔ اسی وقت فیصلہ کر لیا تھا اسے سبق سکھانے کا۔۔۔ نوال ضمیر خان سے پڑگا۔
 اوہ۔۔۔“ نوال نے خود ہی جھرجھری لی۔

”بے خود تو بس ایک سبب بن گیا۔ ورنہ میرے پاس تو اور بھی پلان تھے۔ سستے میں چھوٹ گئے انکس انعام! ورنہ میں بھتہ خور بن کر تم سے پیسے لوٹتی۔ یا پھر۔۔۔“

”اب بس کرو نوال۔۔۔“ ممی نے اسے ٹوکا۔ ”تم نے زیادتی کی ہے، سوری کرو۔“

”سوری کہنے سے کیا میری بے عزتی کم ہو جائے گی۔“ انکس کے لہجے میں ہار آگئی۔ وہ نوال سے نہیں جیت سکتا تھا۔

”مگر تمہاری انا کو تسکین ضرور پہنچے گی۔“ نوال نے کولڈ ڈرنک گلاس میں اینڈ لی۔

نوال کے اشارے پر بے خود دھیرے دھیرے کمرے سے سرکا۔

ٹی وی پر ایک بار پھر وہی خبر چل رہی تھی۔ سب متوجہ ہوئے اور پھر اشتیاق احمد کے فلک شگاف مسلسل قہقہے نے سب کو چونکایا اور جیسے سب کے ہنسنے کی راہ ہموار کر دی۔

”دھر آؤ ذرا تم۔“ اشتیاق احمد نے اپنے پاس جگہ بناتے ہوئے اسے پکارا۔

”یہ تمہارے پاس اس قسم کے آئیڈیاز آتے کہاں سے ہیں؟“

”کہاں سے آتے ہوں گے۔ دراصل میرے سارے ایکشن، ری ایکشنز ہوتے ہیں۔ جب اس طرف سے ایسی کیننگی آتی ہے۔“ اس نے انکس کی جانب دیکھا۔

”اور تم اس سارے عرصے میں کیا کرتی رہیں۔“ گلال نے پوچھا تھا۔

”میں نے کیا کرنا تھا۔ باہر نظر رکھ کر بیٹھی تھی۔ سیکورٹی گارڈز کو چائے، ناشتے کے بہانے باتوں میں الجھا کر رکھا۔ بس گڑبڑیہ ہوئی۔“ نوال کے چہرے پر الجھن پیدا ہوئی۔ ”یہ میڈیا والے وہاں کیسے پہنچے؟“

گیتھی شیل

عدیل اور فوزیہ نسیم بیگم کے بچے ہیں۔ بشری ان کی بہو ہے اور ذکیہ بیگم کی بیٹی ہے۔ عمران بشری کا بھائی ہے۔ مثال ذکیہ بیگم کی نواسی اور نسیم بیگم کی پوتی ہے۔ بشری اور نسیم بیگم میں روایتی ساس بہو کا تعلق ہے۔ نسیم بیگم مصلحت پر ہنس بہو سے لگاؤ دکھاتی ہیں۔ دوسری طرف ذکیہ بیگم کا کہنا ہے۔ ان کی بیٹی بشری کو سسرال میں بہت کچھ برداشت کرنا پڑا ہے۔ سناچ سال کی مسلسل کوششوں کے بعد بشری کی مندر فوزیہ کا بالا خرا یک جگہ رشتہ طے پا جاتا ہے۔ نکاح والے روز بشری دو لہا تقیر کو دیکھ کر چونک جاتی ہے۔

عدیل سے شادی سے قبل ظہیر کا بشری کے لیے بھی رشتہ آیا تھا مگر بات نہ بن سکی تھی۔ نکاح والے دن زاہدہ اور ذکیہ بیگم بھی ایک دوسرے کو پہچان لیتی ہیں۔ بشری اپنی ماں سے یہ بات چھپانے کے لیے کہتی ہے مگر عدیل کو بتا چل جاتا ہے۔ وہ ناراض ہوتا ہے مگر فوزیہ اور نسیم بیگم کو بتانے سے منع کر دیتا ہے۔ بشری اور عدیل ایک ہفتے کے لیے اسلام آباد جاتے ہیں۔ وہاں انہیں پتا چلتا ہے کہ بشری کے ہاں سات سال بعد پھر خوش خبری ہے۔

عقنان اور عاصمہ اپنے تین بچوں اور والد کے ساتھ کرائے کے گھر میں رہتے ہیں۔ عقنان کے والد فاروق صاحب سرکاری نوکری سے ریٹائر ہوئے ہیں۔ گریجویٹ اور گاؤں کی زمین فروخت کر کے وہ اپنا گھر خریدنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ ڈیڑھ کروڑیں زمین کا سودا کر کے وہ عقنان کے ساتھ خوش خوشی شہر آ رہے ہیں۔ عاصمہ کو فون کے ذریعے کوئی اطلاع ملتی ہے، جسے سن کر وہ بے ہوش ہو جاتی ہے۔

فون پر پتا چلتا ہے کہ شہر آتے ہوئے عقنان اور فاروق صاحب ذکیہ کی وادرات میں قتل ہو گئے۔ عقنان کے قریبی دوست زبیر کی مدد سے عاصمہ عقنان کے آفس سے تین لاکھ روپے اور فاروق صاحب کی گریجویٹ سے سات لاکھ روپے



وصول کپاتی ہے۔ زیر گھر خریدے میں بھی عاصمہ کی مدد کر رہا ہے۔

اسلام آباد سے واپسی پر عدیل دونوں مقننوں کو دیکھتا ہے۔ زاہد، نسیم بیگم سے بیس لاکھ روپے سے مشروط فوزیہ کی رخصتی کی بات کرتی ہیں سوہ سب پریشان ہو جاتے ہیں۔ عدیل بشری سے ذکیہ بیگم سے تین لاکھ روپے لانے کو کہتا ہے۔ حمیدہ خالہ عاصمہ کو سمجھاتی ہیں کہ عدت میں زیر کا اکیلے اس کے گھر آنا مناسب نہیں ہے۔ لوگ باتیں بنارہے ہیں جبکہ عاصمہ کی مجبوری ہے کہ گھر میں کوئی مرد نہیں۔ اس کا بیٹا ابھی چھوٹا ہے اور سارے کام اس کو خود کرنے ہیں۔ وہ جلد از جلد اپنا گھر خریدنا چاہتی ہے۔ عاصمہ کے کہنے پر زیر کسی مفتی سے فتویٰ لے کر آتا ہے کہ وہ انتہائی ضرورت کے پیش نظر گھر سے نکل سکتی ہے بشرطیکہ مغرب سے پہلے واپس گھر آجائے سو وہ عاصمہ کو مکان دکھانے لے جاتا ہے۔ رقم مہیا نہ ہونے کی صورت میں فوزیہ کو طلاق ہو جاتی ہے۔ نسیم بیگم جذباتی ہو کر سو اور اس کے گھر والوں کو کور و ازار مٹھرانے لگتی ہیں۔ اسی بات پر عدیل اور بشری کے درمیان خوب جھگڑا ہوا ہے۔ عدیل طیش میں بشری کو دھکا دیتا ہے۔ اس کا ابا رشن ہو جاتا ہے۔ عدیل شرمندہ ہو کر معافی مانگتا ہے مگر وہ نوز نارض رہتی ہے اور اپستال سے اپنی ماں کے گھر چلی جاتی ہے۔

اسی اسپتال میں عدیل عاصمہ کو دیکھتا ہے جسے بے ہوشی کی حالت میں لایا گیا ہوتا ہے۔ عاصمہ اپنے حالات سے تنگ آکر خوش نشینی کی کوشش کرتی ہے تاہم بیچ جاتی ہے۔ نوسال بعد عاصمہ کا بھائی ہاشم پریشان ہو کر پاکستان آجاتا ہے۔ عاصمہ کے سارے معاملات دیکھتے ہوئے ہاشم کو پتا چلتا ہے کہ زیر کے ہر جگہ فراڈ کر کے اس کے سارے راستے بند کر دیے ہیں اور اب مفرور ہے۔ بہت کوششوں کے بعد ہاشم عاصمہ کو ایک مکان دلا پاتا ہے۔ بشری اپنی واپسی الگ گھر سے مشروط کر دینی ہے۔ دوسری صورت میں وہ علیحدگی کے لیے تیار ہے۔ عدیل سخت پریشان ہے۔

دسویں قسط

فوزیہ نے فکر مند نظروں سے قہر مایہ نر کو دیکھا اور دوسری نظر نسیم بے ہوش سرخ چہرے کے مثال پر ڈالی۔

”کیا ہے؟“ نسیم بیگم نے ہمارے انداز میں بولیں۔
”دکھاؤ مجھے“ عدیل بڑھی ہوئی شیو کے ساتھ گم صم سا بیٹھا تھا۔ فوزیہ کو قہر مایہ شہاقتہ میں لیے دیکھ کر چونکا۔
”ایک سو تین سے تیس سو تک ہی نہیں ہو رہا۔“ فوزیہ دھلی لہجے میں بولی۔
”میرے اللہ! رحم کر معصوم اپنی پر۔“ نسیم کو ہائی دینے والے انداز میں بولیں۔
”کہا تھا میں نے؟“ کبھی اسے سال سے دور نہ کر دہشت ملی ہوئی ہے بشری سے۔ اتنی آسانی سے نہیں سنبھلے گی مگر مجھ خیطن کی ستاکو ہے اس گھر میں۔“ نسیم جلے کٹے انداز میں کہہ رہی تھیں۔

عدیل نے عجیب سی نظروں سے ماں کو دیکھا۔
”مجھی بھی آپ کو یہ لگے ہے؟“ اس کا لہجہ استہزاء تھا جیسے خودیہ زور سے ہنسا ہو۔
نسیم اور فوزیہ نے بے ساختہ ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ فوزیہ نے نظریں چرائیں۔ نسیم کو غصہ تو بہت آیا اور سخت ستانے کو بھی چاہا مگر فوزیہ نے ماں کا ارادہ بھانپتے ہوئے آنکھوں کے اشارے سے منع کر دیا۔
بھلی گھر تھی جو نسیم کو بھی یہ شبیہ سمجھ میں آگئی جواب میں وہ آہ سی بھر کر چکی رہیں۔
”ماما۔ ماما۔ ماما! مجھے ماما پاس۔ ماما!“ مثال نیند میں رک رک کر کہتا ہے ہوئے بول رہی تھی۔
نسیم نے فتح مند نظروں سے عدیل کو دیکھا۔
”دیکھا میں نہیں کہتی تھی یہ بھی یہاں نکلنے والی نہیں۔“

عدیل بے بسی سے مثال کا ہاتھ سلائے لگا۔

”اسے دوبارہ لے کر جاؤں ڈاکٹر کے پاس۔ بخار تو کسی طرح کم ہی نہیں ہو رہا اس کا۔“ وہ کس کو بھی مخاطب کیے بغیر بولا۔

”حالا نکہ میں۔ نے تو باقاعدگی سے دوا دی ہے مثال کو کم از کم بخار تو اتنا چاہیے اس کا۔“ فوزیہ نرم لہجے میں بولی۔
”ارے کم بجت لہیرے ہیں یہ آج کل کے ڈاکٹر سارے۔ اب اگر پھر سے لے کر جاؤ تو نئے سرے سے فیس لیں گے۔ انہیں کوئی خوف خدا تھوڑی آئے گا اور جی میں آیا تو چھ چار ٹیٹ بھی لکھ دالیں گے۔ اپنی کوتاہی تھوڑی بائیں گے کہ ان کی لکھی دوائے خاک اثر نہیں کیا۔“ نسیم کو فت بھرے انداز میں بولی چلی گئیں۔
یوں بھی خس کم جہاں پاک تو ہو چکا تھا مگر رات سے جو اس باشت بھر کی لڑکی نے مفت کی پریڈ کر رکھی تھی۔ اس سے جی خوب ہی بے زار تھا۔

زرا جو اس شان دار بچی کی خوش منائی جاسکی ہو سنی الحال جان بھڑانے کا اور کوئی رستہ بھی نہیں سوچ رہا تھا۔
”کیا ہوا امی!“ فوزیہ تشویش سے بولی۔

عدیل نے بھی چونک کر ماں کو دیکھا۔ روزہ بہت دیر سے ایک ٹک صرف اپنی لاڈلی کو ہی دیکھے جا رہا تھا جو رات بھر میں چکر توڑی ہوئی نہیں رہی تھی۔ گالوں کی گھلایاں پٹا ہٹ میں بدل گئی تھیں۔ آنکھوں کے گرد سیاہی ابھر آئی تھی۔ سوکھے خشک ہونٹ بکھرے بے رونق ہال اور یوں بے ہوش۔
عدیل کا دل کٹا جا رہا تھا۔

”امی! ٹھیک ہیں نا آپ؟“ پھرے پر تکلیف کے آثار لیے ہوئے ہولے بائیں طرف سے ایک سینہ اور بازو دبوا رہی تھیں۔
”امی۔ کیا بات ہے؟“ عدیل کو بھی پوچھنا پڑا۔

”ٹھیک ہوں میں۔“ نسیم جیسے کراہ کر دھکی آواز میں بولیں۔
”آپ رات بھر سو بھی نہیں سکیں۔ بے آرامی کی وجہ سے آپ کی طبیعت نہ بگڑ جائے۔ آپ جا کر آرام کر لیں۔“ فوزیہ تشویش سے بولی۔
”نہیں۔ میں ٹھیک ہوں۔ بس اللہ میری مثال کو جلدی سے اچھا کر دے پہلے کی طرح ہنستا کھلکھلاتا۔ کیسے تھکی کی طرح میری بچی اس آنگن میں اڑی پھرتی تھی۔ رات بھر میں مرجھایا پھول بن کر رہ گئی۔“ نسیم سسکی سی لے کر رندھی آواز میں بولیں۔
”فوزیہ! امی نے دوائی ہے آج؟“ عدیل ماں کو دیکھ کر فکر سے بولا۔
”جی بھائی!“ فوزیہ ایک دم سے ہی بہت سعادت مند، فکر کرنے والی خیال رکھنے والی بہن اور بیٹی بن گئی تھی بشری کے جاتے ہی۔

”امی! آپ جا کر آرام کریں۔“ عدیل نرمی سے بولا۔
”ماما!“ مثال پھر کرائی۔
”میری بچی۔ میری گڑا!“ نسیم تڑپ کر بولیں۔
”جا عدیل! اسے ڈاکٹر کے پاس لے جا۔ آنکھیں کھولے۔“ وہ زمانے بھر کی محبت تڑپ لہجے میں سمو کر بولیں۔

”مثال۔ میری بچی داوی کی جان! آنکھیں کھول کر ایک بار تو دیکھ ہم تینوں رات بھر سے تیرے لیے کتنے

پریشان ہیں۔ تیری اس سنگدل مہال کی طرح نہیں جو تجھے چھوڑ چھاڑ کر گئی تو لپٹ کر خبر بھی نہیں لی اس نے گویا ملی کے بھاگ لوں چھینکا ٹوٹا۔“ وہ مثال پہ جھکی اسے پیار کرتے ہوئے کہے جارہی تھیں۔ عدیل نے کچھ ناگواری سے اس کی طرف دیکھا۔

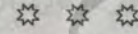
”ای! آپ کچھ دیر جا کر سو جائیں۔“ فوزیہ نے فوراً ”عدیل کے چہرے کے بگڑتے ڈاؤن لے دیکھ کر کہا۔

”میں کہاں سو سکوں گی میری شہزادی اس حال میں پڑی ہے۔“ عیم آنکھیں صاف کرتے ہوئے بولیں۔

عدیل کھڑی دیکھ کر کھڑا ہو گیا۔

”فوزیہ! میں گاڑی نکالتا ہوں۔ تم مثال کو لے کر آ جاؤ۔ ڈاکٹر ناچ بجے تک کلینک آجائے گا تو ایک بار پھر چیک اپ کروا لیتے ہیں بلکہ شاید وہ اسے ایڈمٹ کر لے۔“ کہہ کر تیزی سے باہر نکل گیا۔

فوزیہ اور عیم کو فٹ سے اسے جا نا دیکھتی رہ گئیں۔



”لیکن میڈم میں نے تو چھٹی کی درخواست بھیجی تھی۔“ عاصمہ کے چہرے پر پریشانی اور گھبراہٹ تھی۔

میڈم کے چہرے کے تاثرات اسے بہت کچھ سمجھا رہے تھے۔

”کتنی باا۔ درخواست تھی ہی آپ کی پورے مینے میں۔“ میڈم نے کرسی ذرا سی گھماتے ہوئے عاصمہ کے چہرے پر نظریں جم کر طفرے کیا۔

عاصمہ نظریں جھپکا کر اپنی سرور پتی انگلیوں کو آپس میں جکڑ کر خود کو سنبھالنے کی سعی کرنے لگی۔

”میری مجبوری تھی میڈم کہ۔“ اب کوئی تو بات کرنی تھی اسے بات کو آگے بڑھانے کے لیے۔

”اور میری مجبوری یہ ہے کہ عاصمہ! کہ مجھے اس اسکول کو چلانا ہے۔ آپ صرف مجھے جواب دہ ہیں اور میں اس اسکول میں موجود ڈھالی سو بچوں کے والدین کے سامنے جواب دہ ہوں جن کو ہفتے میں تین دن اپنے بچوں سے بہ سننے کو ملتا ہے کہ ان کی نیچر آج ایب سینٹ تھیں۔“ وہ سارا لحاظ موت اخلاق بالائے طاق رکھ کر زور سے بولیں۔

”میڈم! میری بیٹی بیمار تھی تو مجھے بہت مجبوری میں۔“ عاصمہ کی آواز کو شش کے باوجود زندہ گئی۔

”تو ایک کام کرتے ہیں میں عاصمہ! جس سے آپ کی اور میری مجبوری آرام سے ختم ہو سکتی ہے۔“ وہ آگے ہو کر سرو کچے میں بولیں۔

عاصمہ کو میڈم کی سروری مسکراہٹ جواب میں مسکرانے پر مجبور نہیں کر سکی۔

”میڈم! میں گوشت کھوں گی آئندہ چھٹی نہ ہو۔“ عاصمہ نے جلدی سے کہا۔ مبادا کوئی خوفناک بات نہ اسے سننی پڑ جائے۔

”میں جانتی ہوں آپ یہ سب کچھ اپنے شوق سے نہیں کرتیں لیکن میں بھی مجبور ہوں۔ میں اسکول شوقیہ کھول کر نہیں بیٹھی ہوں۔ میں اگر بچوں کے والدین سے میں لیتی ہوں تو مجھے انہیں مطمئن بھی کرنا ہوتا ہے۔ گزشتہ چھ ماہ میں آپ نے ہر ہفتہ ایک سے دو چھٹیاں کیں۔ چلیں میں وہ بھی برداشت کر گئی لیکن ہر ہفتے تین چھٹیاں۔“

”میڈم! میں۔“

”سوری مس عاصمہ۔ آپ جا کر کیشور سے اپنا حساب کر لیں۔ فی الحال ہمیں آپ کی ضرورت نہیں ہے۔“ وہ بے لچک لہجے میں بولیں۔

عاصمہ تو جیسے کچھ بھری پھری ہوئی۔

”میڈم۔ اس بار۔ صرف اس بار آپ معاف کر دیں۔ پراس۔“ وہ سخت پریشانی میں بے ربط ہو گئی۔ اس کی آنکھوں میں نمی بلکھوڑے لے رہی تھی۔

”میں نے کل ہی آپ کی جگہ کسی اور ٹیچر کو پلانٹ کر لیا ہے۔“ میڈم نے اس کے سامنے ایک اور دھماکا کر دیا۔

وہ سانس کی دہکتی رہ گئی۔

”اور آپ جانتی ہیں۔ میں کوئی صاحب ثروت تو ہوں نہیں کہ ایک آپ کی چھٹیوں کے لیے ایک سٹرا ٹیچر رکھ لوں۔ میرے بھی دس ہزار اخراجات ہیں پھر اس اسکول کی مینٹیننس بہت سی میری بھی مجبوریاں ہیں جنہیں یہاں دہرائیا کر رہے۔ نہ میرے پاس اتنا وقت ہے نہ آپ کو اس میں دلچسپی ہوگی۔ سو آئی ایم سوری۔“ وہ کندھے اچکا کر دو ٹوک لہجے میں بولیں۔

میڈم! آپ جانتی ہیں میرے بچوں کا آسرا یہی جاہ ہے۔“

”اگر آپ اس بات کو سمجھتیں تو اس قدر غیر ذمہ داری کا ثبوت نہیں دیتیں۔ میں نے بھی یہی کچھ سوچ کر آپ کو جاہ دی تھی۔“ وہ تباہ کر طفرے بولیں۔

میڈم! میری بچی کو ڈبل نمونہ ہو گیا تھا جس کی وجہ سے۔“

”آپ پلیراب جاسکتی ہیں۔ مجھے کچھ اہم کام پھانپے ہیں۔ آپ کیشور سے اپنا حساب لے کر جائیں۔“ وہ اپنے آگے بڑی فائل کھولتے ہوئے روکھے لہجے میں بولیں۔

”میڈم! پلیز! ایسا نہیں کریں۔ میں کیا کروں گی۔“ وہ آخر میں گڑ گڑائی بیٹھی۔

کل ہی تو اوپر سے کرائے دار بھی چلے گئے تھے۔ اس ماہ کرایہ ملنے کی بھی امید نہیں تھی۔ اگر نوکری بھی چلی جاتی۔ جو کہ جاہی چکی تھی تو وہ پورا مہینہ کیا کرے گی وہ بے اختیار رونے لگی بے بسی بے بسی تھی۔

اسے خود پر ترس آنے لگا۔ ایسا تو اس نے کچھ نہیں سوچا تھا۔ چند ہزار کی معمولی اسکول نیچر کی نوکری کے لیے اسے یوں تنہا کرنا ہوں گی۔

”میں آپ کا نام فیکسٹ کمننگ ٹیچرز میں رکھ رہی ہوں جیسے ہی ہمیں آپ کی ضرورت ہوگی۔ ان شاء اللہ میں سب سے پہلے آپ کو کال کروں گی۔ آپ بلاشبہ ایک محنتی ٹیچر ہیں اور سچے بھی آپ سے جلد مانوس ہو جاتے ہیں۔ میں ضرور آپ کو کال کروں گی۔ اب آپ جاسکتی ہیں۔“

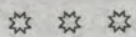
انہوں نے بہت طریقے سے بات ختم کر دی۔ وہ دہکتی رہ گئی۔

”وش! یو ایسٹ آف لک۔“ میڈم نے الوداعی مصافحے کے لیے اس کی طرف ہاتھ بڑھا دیا۔ عاصمہ نے اپنا ٹھنڈا ہاتھ ان کے ہاتھ میں ڈر اسادیا۔

”اللہ حافظ! وہ کہہ کر فون پر کوئی ممبر لا کر بات کرنے میں مصروف ہو گئیں۔

عاصمہ چند لمبے لمبے بس سی بیٹھی اپنے ہونٹ چپاتی رہی پھر آہستگی سے اٹھ کر باہر نکل گئی۔

دروازے کے پاس پہنچ کر اس نے آس بھری نظروں سے مڑ کر دیکھا اور میڈم کا منہ دوسری طرف دیکھ کر اپنا چہرہ صاف کرتی باہر نکل گئی۔



”ای! میں نے قسم کھائی ہے جب تک میری مثال مجھے نہیں مل جاتی۔ میں ایک لقمہ نہیں کھاؤں گی۔ اس دنیا کی ہر نعمت مجھ پر حرام ہے۔“

بشری نے کھانے کی ٹرے اتنی زور سے پرے کی کہ سالن ٹرے میں گر گیا اور ذکیہ تو کچھ بول ہی نہ سکیں۔
 ”تین دن ہو گئے ہیں میری بچی! تجھے آج کچھ کھائے پیے۔ ہر دو گھنٹے بعد تو بے ہوش ہو جاتی ہے ڈاکٹر ابھی کہہ کر گیا ہے۔ اگر تو نے کچھ کھایا نہیں تو۔“
 ”مرول کی پھر بھی نہیں امی! میں بہت سخت جان ہوں۔ بہت ڈھیٹ مجھے موت نہیں آنے والی۔ مجھ جیسی ماؤں کو موت آیا بھی نہیں کرتی۔ میری عطلی جوں اس رات اپنی بچی ان وحشیوں کے پاس چھوڑ کر چلی آئی۔ مثال میری بچی میری گڑیا۔ ہائے تین دن سے تین راتوں سے میں نے اسے نہیں دیکھا اسے نہیں چھوا اس کو نہیں چوا۔ مثال میری گڑیا مثال۔ مثال۔ مثال۔“ وہ پاگلوں کی طرح منہ اونچا کیے آنکھیں بند کیے گلا پھاڑے چیختے لگی۔

ذکیہ اسے سنبھالتے خود بھی بکھر نے لگیں۔
 ”مثال۔ مثال کہاں ہے مجھے کیوں نظر نہیں آتی۔ میری گڑیا۔ میری بچی۔“ وہ ارد گرد سے بیگانہ ہر احساس سے اور اصراف مثال کے لیے چیخ رہی تھی اور رہی تھی۔
 ذکیہ اسے سنبھالنے میں مدد حاصل ہو چکی تھیں۔ جب عمران کمرے میں بھاگتا ہوا آیا۔
 ”آپنی۔ آپنی خدا کے لیے ہوش کریں۔ کچھ نہیں ہوتا مثال کو۔ میں لے کر آؤں گا اسے۔ آپ ہوش کریں۔ خود کو سنبھالیں۔“ وہ اسے بازوؤں سے پکڑ کر روکنے لگا۔
 وہ بغیر دوپٹے خوں کے پھر سے گھر سے باہر بھاگ رہی تھی چیختے ہوئے بالکل کوئی پاگل دیوانی لگ رہی تھی۔
 ”مجھے صرف میری بچی لا دو۔ مجھ سے سب کچھ لے لو۔ میری مثال میری گڑیا مجھے لا دو۔ میں مرجائوں گی اس کے بغیر۔ میں خود کو ختم کر لوں گی۔“ وہ ایک دم سے لاؤنچ کے ستون سے پاگلوں کی طرح سر کمرانے لگی تھی۔
 عمران مرد ہو کر اس کی وحشت کو قابو نہیں کر پا رہا تھا۔ خون بھل بھل اس کے ماتھے اور سر سے پسنے لگا۔ ذکیہ کی چیخیں نکل گئیں۔

عمران جب تک بشری کو سنبھالتا وہ چیختی ہوئی بے ہوش ہو چکی تھی اور اب فرش پر بے دم پڑی تھی۔ بادی چکنی ٹانگوں پر اس کا سرخ خون پتلی سی لکیر بنانا ہوا جا رہا تھا۔ ذکیہ خاتون کا جیسے دل ہی پھٹنے لگا۔
 ”میری بچی! میری بشری! مرجائے گی عمران! اسے لے چل گئیں۔
 بلاؤ ڈاکٹر جلدی کر مرجائے گی۔ اسے کچھ ہو جائے گا۔“ ذکیہ نے خود ہاتھ پاؤں چھوڑ دیے تھے۔
 عمران نے بہت دقت بشری کو بازوؤں میں بھر لیا اور باہر جانے لگا۔
 ”امی! میں آپنی کو گاڑی میں ڈال رہا ہوں۔ آپ پیلز جلدی سے لاگ لگا کر آجائیں باہر۔“ وہ جاتے ہوئے پکارا۔

بشری کی ایسی حالت تو ان تین دنوں میں کبھی نہیں ہوئی تھی۔ وہ پہلے دو دن تو جیسے کتے میں رہی تھی۔
 ذکیہ اسے رلائے اور ہلانے کی کوشش کرتی رہیں۔ تیسرے دن اسے بار بار طلاق کا یاد دلا کر رلانے کے جتن کرتی رہیں۔ مگر بشری رات کے آخری پہر کہیں واپس روم گئی اور وہاں اس نے مثال کا خوب صورت سایہ پڑا اور پونی دیکھی جو اس نے اس عید پر بہت خند کر کے لیے تھے۔ بشری اس کی ساری شاپنگ پہلے ہی کر چکی تھی اس لیے یہ دونوں چیزیں لے کر دینے کے حق میں نہیں تھی مگر عدیل نے یہ دونوں چیزیں بہت آرام سے خریدیں اور آخری بار وہ یہ دونوں چیزیں نانی کے گھر بھول گئی کہ اسے ان سے اتنا لگاؤ نہیں رہا تھا۔
 اس گلابی رنگ کے سپرینڈ اور پونی کو ہاتھ میں لیے بشری ساکت سی انہیں دیکھتے ہوئے بہت کچھ یاد کرتی رہی۔
 مثال یہ پن کر کیسی لگتی تھی۔ جیتی جاتی ہستی بھیتی کو دنی بیاری سی بارہی ڈول۔

اسے بے اختیار وہ ظالم شام یاد آئی جب طلاق کے بعد مثال اس کے ساتھ جانے کے لیے تڑپ تڑپ کر پلٹ کر چنٹی ہوئی روئے جا رہی تھی۔
 ”مجھے ماما کے پاس جانا ہے۔ مجھے ماما کے ساتھ جانا۔ ماما۔ بشری کی سماعتیں اس کی معصوم فریادوں سے ہلنے لگیں۔ سب کچھ جیسے اس کی نظروں کے سامنے کسی فلم کی طرح جلنے لگا۔ عدیل کا وحشی روپ اور طلاق کے الفاظ۔ سیم اور فوزیہ کی فاختانہ نظریں اور پیروں میں بکھری رنگ برنگی مٹھائی۔
 اسے کسی بھی چیز نے اتنی اذیت اُتادہ نہیں دیا۔ رات کے اس پہر جتنی تکلیف اسے مثال کی حالت یاد کر کے ہوئی۔

”مثال۔ مثال کہاں ہے؟“ اس نے مٹھی میں دونوں چیزیں جکڑ کر یاد کرنے کی کوشش کی۔
 ”وہ تو۔ وہیں رہ گئی تھی۔“ اس ظالم انسان نے اسے بارہوہ کا دے کر مثال کو اپنے پاس اندر کھینچ لیا تھا اور وہ روئے جا رہی تھی۔ اسے پکار رہی تھی اور اب اتنے دنوں سے وہ کیسی ہوگی۔ وہ کبھی ٹھیک نہیں ہوگی۔
 ”مثال۔ مثال! اور خود سے باتیں کرتے ہوئے پتا نہیں وہ کب چیختے لگی۔
 ذکیہ جن کی وقت آنکھ لگی تھی۔ بشری کی وحشت بھری چیخ جن کر دیوانہ وار ہاتھ روم میں آئیں۔ جہاں بشری چیختے چیختے بے ہوش ہو چکی تھی۔ اور اب وہ زخمی حالت میں پتلی رنگت۔ کمزور چہرے اور لاغر جسم کے ساتھ ذکیہ کی گود میں پڑی تھی۔

اس کے سر پر دوپٹا کس کر باندھا دیا تھا مگر خون پھر بھی بسے جا رہا تھا۔ ذکیہ کے کپڑے بھی خون رنگ ہو چکے تھے۔
 وہ خود بھی بری طرح روئے جا رہی تھیں اور ان کے آنسو بے ہوش بشری کے چہرے پر گر رہے تھے۔
 ”جلدی کر عمران! خون بسے جا رہا ہے۔ اسے کچھ ہونے جائے۔“ وہ پچھی ہوئی آواز میں بولیں۔
 عمران تھکر سا بے ہوش بشری کو بیک ویو مر میں دیکھ کر اور بھی تیزی سے گاڑی چلانے لگا۔

”یہ ضروری ہے عدیل صاحب! ڈاکٹر نے سنجیدگی سے کہا۔
 ”مگر ڈاکٹر صاحب! یہ ممکن نہیں ہے میرے لیے۔“ وہ بہت دیر بعد آسکی سے بولا۔
 مثال چند ہی دنوں میں بہت بیمار اور قابل رحم نظر آنے والی بچی میں ڈھل گئی تھی۔ اس کی گلابی رنگت میں پیلاہٹ اتر چکی تھی اور خشک ہونٹ یوں ایک دوسرے میں پیوست تھے جیسے اس نے کبھی کسی سے بات نہیں کی۔ اس کی آٹھ سالہ معصوم شکل پر کیسی بوڑھوں جیسی سنجیدگی اور دکھ نظر آنے لگا تھا۔
 ”کیوں؟“ ڈاکٹر کے اس استفسار پر عدیل کو غصہ تو بہت آیا کہ یہ حق کسی ڈاکٹر کو نہیں ہے کہ وہ یوں آپ کی پرسنل لائف کے بارے میں سوال کرے۔

”میں مجبور ہوں عدیل صاحب! سوال آپ کی بچی کی زندگی کا ہے۔ خدا خواست اس کی یہ خواہش پوری نہ ہوئی تو یہ بخار اس کے دماغ کو متاثر کر سکتا ہے جس کے بعد کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ آپ پڑھے لکھے سمجھ دار ہیں اس بات کو سمجھ سکتے ہیں۔“

ڈاکٹر نے عدیل کی ناگوار نظروں پر فوری وضاحت دے ڈالی۔
 عدیل کم صم سا ہو گیا۔

مثال کا بخار صرف ایک دو درجہ کم ہو رہا تھا بہت ٹشمنٹ کے بعد مگر کچھ آٹھ گھنٹوں کے بعد وہ پھر اسی درجے پر آجاتا۔

مستقل سلگتا اس کا نصاب دن جس تکلیف اور درد سے بے حال تھا عدیل جیسے پیار کرنے والے باپ کے لیے یہ

”میں اپنی سرکودانی ورس دے چکا ہوں۔“ وہ بہت ڈوبی ہوئی آواز میں بمشکل بول سکا۔
 ”تو بھی؟“ ڈاکٹر بالکل نارمل رہا جیسے اسے معلوم تھا کہ عدیل اسے ہی وجہ بتائے گا۔
 ”تو بھی عدیل صاحب! اس بچی کا کچھ دنوں بلکہ کچھ مہینوں تک اپنی ماں کے پاس رہنا ضروری ہے۔ عدیل کچھ بولی ہی نہیں سکا۔

”جب تک یہ ذہنی بلوغت آئی میں ایجب تک یہ بچی ذہنی طور پر آپ دونوں کی اس علیحدگی کو تسلیم نہ کرے۔“
 ”میں اپنی بچی کو خود سے ایک میل کے لیے بھی الگ نہیں کر سکتا ڈاکٹر صاحب!“ وہ بہت مگر حتیٰ لہجے میں بولا۔
 ”یہ بات تو آپ کو یہ انتہائی فیصلہ کرنے سے پہلے سوچنا چاہیے تھی۔“ ڈاکٹر جتنا کر بولا۔ ”آپ اس بچی کی حالت دیکھ رہے ہیں۔ وہ آپ سے زیادہ حساس اور آپ سے زیادہ کمزور ہے۔ وہ کتنی تکلف سہہ ہی ہے آپ اندازہ نہیں کر سکتے۔ آپ اگر اس بچی کے بغیر نہیں رہ سکتے تو یہ اپنی ماں کے بغیر نہیں رہ سکتی اور بلکہ میرا تو خیال ہے اسے آپ کی جدائی بھی بہت اذیت دے گی۔ اصل میں طلاق کے بعد آپ دونوں کی زندگی میں تو شاید اتنا فرق نہ آسکے مگر اس کے ننھے دل و دماغ کے لیے آپ نے ایک مستقل جنم کا دروازہ کھول دیا ہے۔ اتنے لاڈ پیار کے بعد آپ نے ایک ہی جھگڑے میں اس کے ننھے جسم کی عمارت کو ڈنڈے کے جھکوں کی زد میں رکھ دیا ہے۔“
 ڈاکٹر ضرورت سے زیادہ بول رہا تھا عدیل کو ہی اس کی اتنی زیادہ تنقید برداشت نہیں ہو رہی تھی۔
 ”اب اسے کب تک آپ کے پاس لے کر آنا ہو گا۔“ وہ بمشکل منہ دیا کہ بات ختم کرنے کو بولا۔
 ”میرے پاس اسے لانے کا کچھ خاص فائدہ نہیں ہو گا آپ کو۔“ ڈاکٹر آگے بڑی فائل عدیل کی طرف کھسکا کر

لا تعلق سے انداز میں بولا۔

”کیا مطلب؟“ عدیل ناگوار سی سے بولا۔

یہ اس شہر کا سب سے بہترین اور مہنگا ترین چائلڈ اسپیشلسٹ تھا جب ہی عدیل اس کی اتنی تلخ باتیں سہہ گیا تھا۔
 اس ڈاکٹر کے ہاتھ میں بہت شفا بخشی اور عدیل کو وہی ہنسی کھیتی مثال چاہیے تھی۔
 اسے امید تھی یہ ڈاکٹر اس کی بچی کو بالکل ٹھیک کر دے گا وہ بالکل پہلے جیسی ہو جائے گی۔ اگرچہ یہ بھی اس کی خوش فہمی تھی کہ اب کچھ بھی پہلے جیسا نہیں ہو سکتا تھا۔
 ”اس بچی کی بیماری کا علاج صرف اس کی ماں کے پاس ہے۔ آپ اسے کچھ دنوں کے لیے ان کے پاس چھوڑ دیں۔ اسے تھوڑا نارمل ہونے دیں پھر دونوں فیملیوں میں کر بیٹھیں اور کوئی فیصلہ کر لیں مگر اسی طرح اگر آپ اپنی محبت کا فلسفہ جھاڑ کر زبردستی رکھیں گے تو یہ کبھی ٹھیک نہیں ہوگی۔ ایڈھنٹینک یویریٹی جی۔“ کہہ کر اس نے پروفیشنل انداز میں انٹرکام پر اگلے مریض کو آنے کے لیے کہا۔

عدیل کچھ دیر یونہی بیٹھا رہا۔
 مثال تو کسی بہت کی طرح سناٹ اور بے حس بیٹھی تھی جیسے اس نے ان دونوں کی گفتگو کا ایک لفظ نہیں سنا تھا۔

”شکریہ ڈاکٹر صاحب!“ عدیل نے دقت کما اور مثال کا بازو پکڑ کر شکست خوردہ سا ہا ہر نکل گیا۔
 ڈاکٹر اسے جاتے ہوئے تاسف بھری نظروں سے دیکھتا رہا۔

”اب کیسی طبیعت ہے ورہ کی؟“ وہ تھکے ہوئے انداز میں چادر اتار کر ایک طرف بیٹھے واقف سے بولی جو

اسکول کا ہوم ورک کر رہا تھا۔

”سورہی ہے؟“ اس نے وہ انگلیوں سے سر دیا یا۔

”تم نے آتے ہی ہوم ورک شروع کر دیا۔ کھانا نہیں کچھ؟“ وہ مڑھال سی اس کے پاس بیٹھ گئی۔
 واقف ماں کے لیے یہ ہاتھ روک کر جیسے غور کرنے لگا۔

”حیدرہ خالہ کب گئی تھیں؟“ وہ خود ہی سوال پر سوال کیے جاری تھی اس دلچسپی کے بغیر کہ واقف نے اسے کسی سوال کا جواب نہیں دیا۔

”آپ جلدی کیوں آگئیں اسکول سے؟“ واقف ماں کے سارے غیر ضروری سوال نظر انداز کرتے ہوئے بولا۔
 عاصمہ جیسے مشکل میں پڑی کہ وہ واقف کو کیا بتائے۔

”حساس بچہ ہے ساری مشکلیں ہی ابھی سے اس پہ ڈالے جا رہی ہوں۔ کہیں اس کا ذہن کہیں اور نہ لگ جائے۔“ وہ واقف کو دیکھتے ہوئے سوچنے لگی۔

”یونہی بس کچھ زیادہ کام نہیں تھا اسکول میں۔“ وہ نظریں چرا کر ٹالنے والے انداز میں بولی۔
 واقف ایک ٹکساں کو دیکھتا رہا۔

”کب سے اشارت ہو رہے ہیں تمہارے ایگزام؟“ وہ اس کی کتاب اٹھا کر دیکھنے لگی۔
 ”آج گلے ہفتے سے۔“ وہ مختصر ا بولا۔

دونوں خاموش ہو گئے۔

”ارہیہ اور ارہیہ کہاں ہیں؟ نظر نہیں آرہیں مجھے۔“
 ”سو گئی ہیں۔“

”کچھ کھائے بغیر؟“ عاصمہ جوگی۔ اسے فکر سی لگ گئی۔ وہ بہت دیر یونہی اسکول کے گراؤنڈ میں بیٹھی سفید دوڑھیادھوپ کو دیکھ کر سوچتی رہی کہ اب وہ کیا کرے گی۔

”نہیں! سامان گرم کر کے میں نے بازار سے انہیں روٹیاں ملا دی تھیں۔ آپ کو بھوک لگی ہوگی۔ لے آؤں کھانا آپ کے لیے بھی۔“ وہ کھڑا ہو گیا۔

”نہیں۔۔۔ واقف مجھے بھوک نہیں ہے۔ تمہیں پکا دوں روٹی۔ تمہا زار کی نہیں کھاتے ہوتا۔“ وہ کھڑی ہو گئی۔
 ”مما! اسکول میں آج کیا ہوا ہے؟“ واقف گہری بشیدگی سے بولا تو عاصمہ جیسے ہار گئی کہ وہ مزید اپنے جھوٹ کو نہیں سنبھال سکے گی۔

”جواب سے فارغ کر دیا ہے میڈم نے مجھے۔“ وہ پھر سے تھکی ہوئی بیٹھ گئی۔
 واقف گم صم سا ہو گیا۔ اس کو ماں کا چہرہ دیکھ کر کچھ انہونی کا اندازہ تو ہو گیا تھا مگر جواب سے فراغت کا اس نے نہیں سوچا تھا۔

”کیا کریں گی اب آپ؟“ وہ بہت دیر بعد بولا۔

”چتا نہیں۔“ عاصمہ کو واقعی پتا نہیں تھا کہ اب اسے کیا کرنا ہے۔ کراہ بھی اس ماہ نہیں ملنا تھا اور اسکول سے تنخواہ بھی نہیں۔ صرف تھوڑی سی ٹیوشنز تھیں جنہیں شام میں وہ اور واقف مل کر پر بھاتے تھے یا وہ تھوڑی بہت سلائی کر لیتی تھی۔ اور آج کل تو ورہ کی بیماری کی وجہ سے کچھ بھی نہیں کپا رہی تھی۔

”میرے دوست کے کاموں کا اسکول ہے۔ انہیں بھی بیچر کی ضرورت ہے۔ وہ مجھے بتا رہا تھا ممما! آپ پریشان نہ ہوں۔ میں علی سے بات کروں گا۔ آج ہی بلکہ اسے فون کر کے پوچھتا ہوں پھر ہم وہاں جا کر دیکھ لیں گے۔“

اسے بھی کبھی لگا تھا واقف کے اندر کہیں نہ کہیں فاروق صاحب چھپے بیٹھے ہیں۔ بیٹھ ہی ایسے ہوتا آیا تھا۔

جب سے وہ بیاہ کر آئی تھی۔ عفان کی نوکری کا مسئلہ ہو گیا کہ کا کوئی اور بظاہر نہ حل ہونے والا کوئی بھی گنہگار نہ تھی۔ سن کر فاروق صاحبِ بہت دیر تک یونہی خاموش ہو جاتے اور جب بولتے تو اس طرح کہ اس مسئلے کا کوئی نہ کوئی حل موجود ہو تا۔ عاصمہ حیرانی سے واقف کو دیکھنے لگی۔

”ہاں ناں ماما! آپ بھی تو کہتی ہیں ایک در بند تو سولے۔ یہ زندگی ہے اور مشکلات مسائل اس کا حصہ۔“ وہ بہت ہلکے ہلکے انداز میں بالکل دادا کی طرح بولا۔

عاصمہ بے اختیار ہنس پڑی۔ واقف حیران سامان کو دیکھنے لگا۔ کہاں تو کچھ دیر قبل جیسے رو دینے کو تھیں اور اب ایک دم سے ہنس پڑیں۔

”آپ کیوں ہنسیں۔ آپ کو میری بات کا یقین نہیں تو میں ابھی علی کو فون کرتا ہوں آپ خود اس سے بات کر لیں۔“ وہ معصوم سی خفگی سے بولا کہ ماں نے اس کی ذہانت پر شک کیا ہے۔

عاصمہ نے بے اختیار واقف کو اپنے ساتھ لگا لیا۔

”میری جان! مجھے خود پر تو شک ہو سکتا ہے مگر اپنے اس بہادر عقل مند اور بہت والے بیٹے پر ہرگز شک نہیں ہو سکتا۔“ وہ بہت حوصلہ مند آواز میں واقف کو گلے لگا کر بولی تھی۔

وہ جو کچھ کہنے پہلے تک اتنی مایوسی اور دل گرفتہ تھی صرف واقف کے ایک جملے نے اسے اپنے پورے قدر کھڑا کر دیا۔

”یہ زندگی ہے اور مشکلات مسائل اس کا حصہ۔“ اس نے واقف کو کم سکھایا تھا واقف اسے زیادہ سکھاتا ہے۔ عاصمہ کو یہی لگا۔

”ان شاء اللہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ ہم مل کر ساری مشکلوں پر قابو پالیں گے۔ مجھے پورا یقین ہے۔“ وہ واقف کا حوصلہ بڑھانے کو بڑے عزم سے بولی۔

”ان شاء اللہ امی!“ وہ معصوم مسکراہٹ کے ساتھ کھل سا گیا۔

”اے انوں کی اسے بھی تم کچھ کھاؤ۔ تمہاری طرف سے کچھ بے فکر ہوں تو ان بد بختوں سے جا کر دو دو ہاتھ لیں۔ میری جی تو خود کو سنبھالو۔“ ذکیہ نے پاس آ کر اسے ساتھ لگا کر سمجھانے کی کوشش کی۔

وہ کچھ سننے کے لیے تیار نہیں تھی۔ ”نہیں نہیں میں مثال کو دیکھوں گی تو مجھے قرار آئے گا ورنہ آپ مجھے مرانے دیں امی!“ وہ اتنی ضدی بھیجی نہیں تھی۔ آج چار دن سے اس نے کچھ نہیں کھایا تھا۔

ذکیہ کا دل سخت پریشان تھا۔ ڈاکٹر نے بھی ڈرایا تھا کہ اس کا کچھ کھانا ضروری ہے مگر بشری نے ذکیہ صدمے میں اپنی تھیں ملازمہ فرس صاف کرتے ہوئے دونوں کو دیکھ رہی تھی۔

”نہیں کھایا آپنی نے کچھ؟“ عمران دروازے کے پاس ہی رک کر کمرے کی حالت سے اندازہ لگاتے ہوئے بولا۔

ذکیہ نے لا چاری سے نفی میں سر ہلادیا۔

بشری دیوانوں کی طرح چھت سے نگاہیں نکائے خشک ہونٹوں کے ساتھ مثال مثال پکارے جا رہی تھی۔

”یہ پاگل ہو جائے گی عمران! اسے کچھ ہو جائے گا۔ خدا کے لیے کچھ کرو۔“ ذکیہ رونے لگیں۔ عمران مٹھیاں پیچھے کھڑا رہا۔ اس کے چہرے پر سخت غصہ تھا۔

”میں آتا ہوں ابھی۔“ وہ تیزی سے جانے لگا۔

”عمران! کہاں جا رہے ہو۔۔۔ مجھے کچھ بتا کر جاؤ۔“ ذکیہ کو کسی خطرے کا احساس ہوا تو اس کے پیچھے جاتے ہوئے بولیں۔

”آ رہا ہوں۔ پریشان نہ ہوں آپ آپنی سے کہہ دیں۔ میں مثال کو لے کر آ رہا ہوں۔“ وہ کہہ کر ذکیہ کے پیچھے سے پہلے گاڑی نکال لے گیا۔

”عمران! عمران! کوئی جھگڑا نہ کرنا میرے بچے! جلد بازی نہ کر۔ میں خود دیکھ لوں گی۔“ وہ بے کار میں بولتی رہیں۔ عمران جا چکا تھا۔

”ابھی دفتر سے تھکا ہارا آیا ہے۔ خدا جانے غصے اور جوش میں کیا کر ڈالے۔ وہ وحشی عدیل بھی کچھ کم نہیں۔ اس کی ذیل ماں نسیم کیڑے پڑیں قبر میں جو ظلم تو نے میری بیٹی کے ساتھ کیا ہے سیری اولاد اور تو کبھی سکھ نہ پائے۔“

ان چار دنوں میں وہ ان تینوں کو اتنی بد دعائیں دے چکی تھیں کہ اب انہیں لگتا ان کی بد دعائیں بھی کھوکھلی سی ہو گئی ہیں۔



عدیل نے گاڑی گیٹ کے آگے روکی۔

وہ خود اتر کر گیٹ کھولنے لگا مثال گاڑی میں ہی بیٹھی تھی اسی طرح ارد گرد سے بے خبر لا تعلق بخار میں سلتی، پایا چرواہے۔ عدیل کو بیٹی پر بے تحاشا ترس آیا۔

”کاش! میں نے اتنی جلد بازی نہ کی ہوتی۔“ اب تو اس کا دل کھل کر اسے ملامت کرنے لگا تھا۔ شاید یہ بہتات نے اتنی جلدی شروع نہ ہوتے اگر مثال یوں مشغل بیمار نہ پڑتی۔ میں نے صرف امی اور فوزیہ کے جذبات کا خیال کیا۔ ایک بار بھی مثال کے بارے میں نہیں سوچا۔ ضد بھی انا تھی اور غصہ تھا کہ بشری کی سب خواہشیں سب میں پوری کرتا ہوں تو اسے بھی میری ہر جاوے جا خواہش آنکھیں بند کر کے پوری کرنی ہوگی۔

”خدا! انوراود جلد بازی۔ گھر تو اجڑا ہی ڈل بھی رہا، وہ امریکی بچی اسی طرح اذیت جھیلے گی۔ میں نے ایک بار بھی اس کو سوچا۔ کاش میں صرف ایک بار سوچ لیتا۔ مجھے تو اندازہ بھی نہیں تھا کہ مثال بشری کے بغیر ہی نہیں سکتی۔

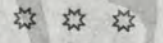
”نہیں مجھے کچھ نہیں کھانا۔ میں اسی طرح مر جاؤں گی مگر اپنی مثال کو دیکھے بغیر میں کچھ نہیں کھاؤں گی۔“ بشری نے سوپ کا بالہ سامنے دیوار پر روے مارا تھا۔

ملازمہ نے پیچھے ہٹ کر خود کو گرم سوپ سے بچایا۔

اور ذکیہ کو لگا وہ واقعی بشری کے پاگل پن کے ہاتھوں یا تو پاگل ہو جائیں گی یا دنیا سے گزر جائیں گی۔

”میری بچی نے اتنے دنوں سے معلوم نہیں کچھ کھایا یا نہیں۔ اس کی کیا حالت ہوگی میرے بغیر۔ وہ کیسے رہے گی۔ وہ اتنا رو رہی تھی۔ اس کے آنسو اس کی چیخیں میں کچھ نہیں بھول سکتی۔“ وہ تکیے پر سر پختے لگی۔

ڈاکٹر نے ایک دن رکھ کر اسے ڈسچارج کر دیا تھا۔ زخم زیادہ گہرے نہیں تھے مگر جو کھاؤ اس کے دل اور روح میں لگے تھے ان کا مرہم ذکیہ اور عمران کو نہیں سے نہیں مل رہا تھا۔



میری محبت کا فیصلہ اب تو جیسے میری پچی کا دم گھونٹ رہا ہے۔ میں اسے اپنی مرضی سے سانس بھی نہیں لینے دے رہا۔

یہ کیسی محبت ہے۔ ”وہ ساکت سا گاڑی سے ٹیک لگائے سوچتا چلا جا رہا تھا اسے پتا بھی نہیں چلا۔ کب عمران کی گاڑی اس کی گاڑی کے برابر میں آ کر رکی۔ عمران بجلی کی سی تیزی کے ساتھ اچھل کر گاڑی سے نکلنا اور دوسرے لمحے اس نے عدیل کی گاڑی سے فرٹ سیٹ پہ بیٹھی مثال کو کھینچا اور اپنی گاڑی میں بٹھانے لگا۔ عدیل جیسے کسی سحر سے جاگا۔ وہ تیزی سے عمران کی طرف لپکا۔ دوسرے لمحے دونوں ہتھم کھٹا ہو چکے تھے۔ مخالقات بکاتے دو دونوں ایک دوسرے کا شجر کھنگال رہے تھے۔

مثال سہمی ہوئی عمران کی گاڑی کے پاس کھڑی تھی پھر وہ یک دم چیخنے لگی۔ دونوں ایک دوسرے کا گریبان پھاڑ چکے تھے۔ مثال کی جینوں پر دونوں جیسے ہوش میں آ گئے۔

”تم میری پچی کو ہاتھ تو لگا کر دیکھو میں تمہارے ہاتھ تو ڈوڑوں گا۔“ وہ عمران کو پرے دھکیل کر خونخوار لبوں میں بولا۔

”یہ صرف تمہاری بیٹی نہیں بے غیرت انسان! تم میں اتنی غیرت ہوتی تو تو طلاق دینے سے پہلے سوچتے۔“ وہ بھی جواباً ”چلا کر بولا۔

”تو باب لگتا ہے میرا؟“ عدیل پہلی ڈاکڑی باتوں سے تپا ہوا تھا۔ عمران کی بات اسے اور آگ لگا گئی۔ دونوں پھر ہتھم کھٹا ہو گئے۔

فوزیہ بھاگتی ہوئی باہر آئی اور باہر کا منظر دیکھ کر سکتہ میں آ گئی دوسرے لمحے نیم بھی ہانپتی کانپتی آپہنچیں۔ اور گرد کے گھروں کے گیٹ کھلنے لگے۔

اور وہ دونوں سب سے بے خبر لڑے جارہے تھے۔ مثال اسی طرح چیخ رہی تھی۔ اس کی آنکھیں بند تھیں۔

”فوزیہ! اجلدی سے اس مثال کو تو پکڑ کر لا۔ اس نے آسمان سر پر آٹھار کھائے چیخ کر۔“ نیم گٹ سے باہر نکلتے ہوئے بولیں۔ وہ عدیل کو کھینچنے لگیں۔ دونوں غصے میں بری طرح سے پھرتے ہوئے تھے انہیں الگ کرنا آسان نہیں تھا۔ ایسے میں محلے کے دو تین لوگ آگے بڑھے اور انہیں چھڑانے کی کوشش کرنے لگے۔ یہ عدیل کو کھینچ کر دوڑے جانے لگیں۔

عمران نے عدیل کو دھکا دیا اور دوسرے لمحے مثال کی گاڑی کا دروازہ کھول کر اس نے اپنی گاڑی میں پھینکا اور خود تیزی سے ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گیا۔

عدیل اور دوسرے لوگوں کے راستہ روکنے سے پہلے وہ اندھا دھند گاڑی اڑا تا وہاں سے لے گیا۔

”میں اسے زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ آج یہ نہیں بچے گا میرے ہاتھوں سے۔“ عدیل پھٹے گریبان ”زخمی چہرے کے ساتھ منہ سے کف اڑا تا گاڑی میں بیٹھنے لگا۔

نیم چلا کر ہوائی دینے لگیں۔ اور اس کے بازو سے لپٹ گئیں۔

”نہ میرا بچہ۔ اس وقت اس کے پیچھے نہیں جا۔ تیری حالت نہیں ایسی کہ گاڑی چلائے۔ کوئی حادثہ کر بیٹھے گا۔ میں یہ وہ برباد ہو جاؤں گی۔ مثال انہیں نہیں جانے کی تھوڑا حوصلہ کر۔“

وہ اسے اپنی طرف پورا زور لگا کر کھینچنے ہوئے تھیں۔

”ای! اچھوڑ دو مجھے جانے دو اس کے پیچھے میں مثال کو لے کر آؤں گا۔“ وہ خود کو چھڑا رہا تھا۔

”چلا اندر بیٹھ کر بات کرے گاں۔ میں ابھی خود تیرے ساتھ جاؤں گی اور مثال کو لے آؤں گی۔“ نیم نے اپنے اندر لے گئیں محلے والے چہ گوئیاں کر رہے تھے جب فوزیہ نے ٹیک بند کیا۔

علی نے اسے باموں سے فوراً ہی فون پر بات کرادی۔

نیم صاحب نے عاصمہ کو لگے ہی دن آٹھ بلا لیا کہ وہ اس کا ٹارنل سا انٹرویو لیں گے اور اسے اپائنٹ کر لیں گے۔

انہوں نے یہ بھی وعدہ کیا کہ اس کی تنخواہ پہلی جانب کے مقابلے میں کافی اچھی ہوگی۔

عاصمہ کو لگا اس کے سر سے کوئی بھاری بوجھ اتر گیا ہو۔

نیم صاحب کافی خوش اخلاق اور مہربان شخص نکلتے تھے۔ عاصمہ کے حالات جان کر وہ اور بھی ہمدردی کا اظہار کرنے لگے تو عاصمہ کچھ ڈرسی گئی کہ پہلے اتنی ہمدردی اور مہربانی سے بہت بڑا نقصان اٹھا چکی تھی۔ اگلے دن آنے کا وعدہ کر کے اس نے فون رکھا ہی تھا کہ واقعہ پر اپنی ڈیڑھ الیاس اور حمیدہ خالہ کو بلا لایا۔

حمیدہ خالہ نے ہی الیاس سے بات کی کہ اب کے وہ کیسے کرانے وار لے کر آئے ”دکرایہ اچھا دس اور وقت پر ہاں۔ یہ بہت ضروری بات ہے لیکن اس سے بھی ضروری ہے کہ وہ بہت شریف لوگ ہوں۔ اپنے رستے آئیں اپنے رستے جائیں۔ بہتر ہے ہاں بچے اور فیملی ہو۔“ وہ الیاس سے خوب ٹھوک بجا کر بولیں۔

”دیں پوری کوشش کروں گا خالہ جی! کہ جلد سے جلد انتظام کر سکوں۔ کیونکہ کل مجھے ہاشم بھائی نے بھی فون کر کے تاکید کی ہے۔ میں اپنی طرف سے کوئی کسر نہیں اٹھا رکھوں گا۔“ الیاس حمیدہ کی شرطوں سے کچھ اکتا کر بولا۔

اس کے خیال میں پہلے کرانے وار بھی حمیدہ خالہ کی روز روز کی احتیاطی نصیحتوں اور سارے دن میں وقت بے وقت چھاپے مارنے سے بھاگے تھے۔

”بھابھی! آج بھی کوئی کرانے وار مجھے اچھا لگتا ہے۔ یہاں کے لیے مناسب تو میں آپ کو پیغام بھیجوا دوں گا۔“ الیاس اجازت دیں۔ دکان اکیلی چھوڑ کر آیا ہوں۔ اس سے پہلے کہ حمیدہ خالہ مزید شرطیں بیان کر تیں وہ وہاں سے بھاگا۔

”میں بشیر سے کہتی ہوں وہ ایسے کسی واقف ڈیڑھ سے بات کرے۔ مجھے تو یہ الیاس بھی ایویں سا لگتا ہے۔“

یہ خالہ بیٹے کا حوالہ دیتے ہوئے غیر مطمئن سی بولیں۔

”الیاس بھائی! جیسے ہیں۔ بھروسے کے لوگوں کو لے کر آتے ہیں خالہ۔“ عاصمہ نے آہستگی سے کہا۔ حمیدہ خالہ نے اسے فمائشی نظروں سے گھورا۔ جیسے کہہ رہی ہوں۔ ”تم پھر اندھا اعتماد کرنے لگیں؟“ عاصمہ نظریں چرا لیں۔

”اور میں نے سنا ہے عتم نے نوکری بھی چھوڑ دی اسکول کی؟“ نہیں یاد آیا تو فوراً ”بولیں۔“

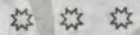
”میں نے نہیں چھوڑی۔ انہوں نے نکال دیا ہے۔“ وہ جی سے بولی۔

”ہائیں! اچھا۔ میں بات کرتی ہوں ابھی جا کر۔ کیا تکلیف ہوئی ان کو بھلا تم سے۔ اچھا بھلا تو ذمہ داری سے دیتی تھیں تم۔“ حمیدہ خالہ چیخ کر بولیں۔

”یہ بچے دیں خالہ! میں نے کافی کوشش کی۔ مگر میڈم نے معذرت کر لی۔ وردہ کی بیماری کی وجہ سے بہت چھٹیاں لگی تھیں اس لیے۔“

عاصمہ کا دل نہیں تھا کہ دوبارہ سے وہ کسی کی سفارش پہ جائے اس لیے منع کرتے ہوئے بولی۔
 ”اے لو! اس میں کیا جھوٹ ہے بھلا۔ تم کوئی جان کر چھٹیاں کر رہی تھیں؟ پکی کو خدا نے دوسری زندگی دی۔
 ایسی ٹھنڈ لگی کہ اس کے بچنے کی امید کب تھی بھلا۔“ حمیدہ خالہ اپنے انداز میں بولی چلی گئیں۔
 ”خیر! آپ پریشان نہیں ہوں۔ ایک جگہ کل جاری ہوں انٹرویو کے لیے۔ اگر خدا خواست وہاں بات سنیں سنی
 تو پھر آپ ہی سے کہوں گی۔“ عاصمہ نرمی سے منع کرتے ہوئے بولی۔
 ”مما! بچن کا تک سارا بھر گیا ہے۔ اس کا پائپ نیچے سے بندھے گا۔“ اربہ اندر آکر بولی۔
 ”فہ! ایک تو یہ آئے دن کی مصیبت ہے۔ نیچے سے پائپ اتنا چھوٹا ہے۔ ذرا سا کچرا یا چکنا چلی جائے فوراً
 بند ہو جاتا ہے۔ یہی حال غسل خانے کے پائپوں کا ہے۔“ عاصمہ کو فٹ سے بولی۔
 اسے تو پوں چند میٹروں میں اندازہ ہو گیا تھا کہ گھر چلانے کا مطلب صرف خرچ کے لیے پیسے فراہم کرنا یا ان کا
 ہونا ہی کافی نہیں۔ چھوٹے بڑے ہزاروں اتنے مسائل ہوتے کہ وہ ذہنی اور جسمانی طور پر تڑھال ہو کر رہ جاتی۔ مگر
 مسئلے کم نہ ہوتے۔

”تو کسی پبلبر کو بلا کر ٹھیک کر آؤ۔“ حمیدہ خالہ نے مفت مشورہ بھڑاڑا۔
 ”خالہ! بہت بار بلا چکی ہوں۔ وہ کہتے ہیں اندروا لے پائپ چھوٹے ہیں اور پائپ بدلوانے میں سمجھیں لاکھ کا
 خرچ ہے۔“ عاصمہ کو فٹ سے بولی۔
 ”خیر! اب تم اتنے لیے بکھیر نہیں مت الجھو۔ فی الحال گزارہ کرو اور پائپوں میں کوئی ایسی ایسی چیز نہ پھینکا
 کرو۔“ حمیدہ خالہ چادر ٹھیک کر لی جانے کو تیار تھیں۔
 ورنہ عاصمہ کا دل تھا کہ وہ ان سے کہتی کہ اچھے ٹھیکے دار سے بات کر کے اس مسئلے کا کوئی حل نکال دیتیں۔ بشر
 ان کا بیٹا یہ کام کر سکتا تھا۔ اس کے کئی ٹھیکے دار واقف تھے۔
 ”جانتی ہوں میں۔ ابھی مجھے مرغی لینے جانا ہے۔ بشر آج بریانی کی فرمائش کر کے گیا ہے۔ اور بیگم صاحبہ نے دو
 ٹوٹ میرے ہاتھ میں آتے ہوئے پکڑا دیے کہ آتے ہوئے مرغی لے کر آنا۔ ابھی ادھر جا کر کھڑا ہونا پڑے گا۔“
 وہ دروازے تک ذرا سی دیر میں پہنچ بھی گئیں۔
 ”مما! بچن بھر رہا ہے پانی سے۔“ اربہ نے پھر آکر اطلاع دی۔
 ”تو تم نے نوٹی کیوں ٹھوکی؟ داغ خراب ہے تمہارا۔“ اسے ایک دم سے شدید غصہ آگیا۔
 ”مما نوٹی تو بند ہے مکیانی۔“ اربہ ڈر گئی۔
 ”دیکھتی ہوں میں۔“ اسے معلوم تھا اب پبلبر کو بلائے بغیر گزارہ نہیں اور اس کے پاس پیسے بھی کم تھے۔



”انپکٹر طارق بات کر رہے ہیں۔ جی۔ میں عدیل ہوں۔ جی۔ جی بالکل۔ آپ پولیس اسٹیشن ہی میں
 ہیں نا۔ میں آ رہا ہوں۔ تھوڑی دیر میں۔ جی! مسئلہ ہی ہے۔ میری بیٹی کو میری سابقہ بیوی کا بیٹا یا اغوا کر کے لے
 گیا ہے۔ جی۔ تاوان کا بھی مسئلہ ہو سکتا ہے اور وہ جرمانہ ذہنیت کا شخص ہے۔ میری بیٹی کو نقصان بھی پہنچ سکتا
 ہے۔ ٹھیک ہے! میں تھوڑی دیر میں آکر تفصیل بتاتا ہوں اور ایف آئی آر کٹوانا ہوں۔ شکریہ! بس میں آ رہا
 ہوں۔“ عدیل نے بات کر کے فون بند کر دیا۔
 پیچھے کھڑی ٹیکہ دھک سے رہ گئیں۔ یہ تو ان کے گمان میں نہیں تھا کہ یہ معاملہ پولیس میں بھی جا سکتا ہے۔
 ”بس آتا ہوں امی۔ ابھی۔“ عدیل نے پڑے بدل لیے تھے۔ مگر چہرے پر سختی زخموں کی سوچن اور نشان اسی

”عدیل! بیٹا بات سن میری۔“ نسیم پریشانی سے بولیں۔
 ”امی! آپ کو جو بھی کہنا ہے۔ میں اگر بات کروں گا۔ انپکٹر صاحب چلے جائیں گے پھر۔“ وہ کہہ کر جانے لگا۔
 ”مگر یہ چلا گیا تو۔“ نسیم تیزی سے اس کے پیچھے لگیں۔
 ”عدیل! میرا بچہ۔ دو گھنٹی صرف میری بات سن لے۔ پھر چلے جانا۔“ وہ منت بھرے لہجے میں بولیں۔
 ”امی! آجائے دس بجھے۔ لیٹ ہو جاؤں گا۔“ وہ چڑ کر بولا۔
 ”دیکھو عدیل! بہتر ہے یوں معاملہ تھانے پکری میں لے جانے کی بجائے مل بیٹھ کر۔“ نسیم نے پہلی بار جیسے
 ہوش کے ناخن لیے تھے۔ تھانے پکری کا مطلب پورے محلے اور خاندان میں باتیں اور بدنامی تھی۔ پھر سب سے
 بدھ کر انہیں ابھی فوریہ کی شادی کرنی تھی اور عدیل کی بھی تھی۔
 ”دیکھو بچہ۔ اس میں نقصان۔ تمہارا۔“
 ”میں کیوں۔ میں تو برباد کروں گا ان دو لکے کے لوگوں کو۔ میری بیٹی ان لوگوں کے پاس۔“ وہ غصے میں
 بھڑک کر بولا۔

”عدیل۔ مثال کا سوچ۔“ وہ اس کا بازو زور سے ہلا کر بولیں اور یہ بات نسیم نے اس وقت نہیں کی تھی
 جب وہ مسلسل اسے بشری کو طلاق دینے کا کہہ رہی تھیں۔ عدیل بھی ٹھک کر رہ گیا۔
 ”نکیا مطلب؟“ وہ ناگوار سی سے بولا۔ مثال کے نام پر وہ ہر بات سننے کے لیے تیار تھا۔
 ”میرا بچہ! اس بچی پر اور ظلم نہ کر۔ اسے تو ماں باپ دونوں چاہئیں۔ تو اس طرح اسے تھانے پکری میں لے
 کر جائے گا۔ اس کی ساری نفسیات تباہ ہو جائے گی اور پھر اگر تو تھوڑا بہت قانون پڑھ لے تو تجھے پتا چلے گا کہ
 قانون صرف ماں کی حمایت کرے گا۔ تو عدالتوں پکری میں جائے گا۔ بچی بشری کے پاس چلی جائے گی جو سراسر
 نقصان ہی ہے۔“ وہ نرم لہجے میں اسے سمجھا رہی تھیں۔
 ”اچھا تو آپ کا مطلب ہے میں ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھا ہوں۔ وہ بد معاش میری آنکھوں کے سامنے میری بچی
 مجھ سے چھین کر لے گیا اور میں چوڑیاں پہن لوں؟“ وہ بھڑک اٹھا۔
 ”تھوڑا صبر، عقل سے کام لے۔ اگر ایسی بے صبری کرے گا تو مثال نہیں ملنے والی تھے۔ پہلا حق ماں کا ہی ہے۔
 بچی کے بالغ ہونے تک یہ تو یاد رکھ۔ دنیا کی کسی بھی عدالت میں چلا جا۔ وہ فیصلہ ماں کے حق میں ہی کرے گی۔“
 نسیم نے پہلی بار اسے ایسی حقیقتوں سے آگاہ کیا۔
 اور وہ تو جیسے ششدر سماں کو دیکھے ہی جا رہا تھا۔

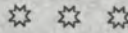
”میں جاتی ہوں۔ تو اس سے کتنی محبت کرنا ہے۔ انکو تو بیٹی ہے تیری۔ ایسا پیار ہونا بھی چاہیے اور جس طرح
 کی وہ بشری اور اس کی ماں ہے۔ مثال کو تو میں بھی ان کے نرمے میں نہیں رہنے دوں گی۔“ وہ مخصوص انداز میں
 بولیں۔
 ”تو کیا کروں پھر۔ میں اپنی بچی کے بغیر ایک منٹ نہیں رہ سکتا۔“
 ”تو یہ معاملہ مجھ پر چھوڑ دے۔ مثال کو وہ دیہاں دے کر جائیں گے۔“ نسیم عزم سے بولیں۔
 ”وہ کیسے؟“ عدیل بے ہمت سا ہو گیا۔
 ”مجھے یہ چھوڑ دے۔ یہ کھیل جوش لڑائی اور جھگڑے سے نہیں۔ طریقے سے کھیلنا ہے۔“ نسیم کے لیے پھر
 سے ایک محاذ کھل گیا تھا۔ ان کی آنکھوں میں مخصوص چمک تھی جو ایسی صورت حال میں ہوتی تھی۔ عدیل ماں کو
 کو فٹ سے دیکھنے لگا۔

”میری جان! اب تجھے کوئی باتھ بھی نہیں لگا سکتا۔ کوئی تجھے مجھ سے دور نہیں لے جاسکتا۔ میں اپنی جان کو
 نہیں نہیں جانے دوں گی۔ اب تم میرے پاس ہی رہو گی میری جان۔“
 ”ہی! بس کرونا۔ کیوں اپنی بچی کو اور پریشان کر رہی ہو؟“ عمران جواں بیٹی کی ایسی پاگلوں سی محبت کافی دیر سے
 دیکھ جارا تھا۔ اسے ٹوک کر بولا۔
 ”عمران... میرے بھائی! میں کس طرح کس زبان سے تمہارا شکریہ ادا کروں۔ تم نے میرے ساتھ جو نیکی کی
 ہے۔ میری مثال کو میرے پاس لے کر آئے۔“ بشری مغلوب سی ہو کر رونے لگی۔
 عمران اٹھ کر بس کے پاس آیا۔ ”ہی! کیوں مجھے شرمندہ کر رہی ہو؟ میرے لیے تو یہ شرمندگی کیا کم ہے کہ
 میری وجہ سے آپ کا گھر برباد ہو گیا۔“ وہ شرمندگی سے بولا۔
 ”تمہاری وجہ سے نہیں۔ اور میرا گھر تو جیسے پانی پر بٹا تھا۔ ایک نہ ایک دن اسے ٹوٹنا ہی تھا۔ بس! میری مثال
 میرے پاس رہے۔ مجھ سے دور نہ رہے اور کچھ نہیں چاہیے۔“ وہ پھر سے مثال کو پیار کرنے لگی۔
 ”مثال... جانو۔ تمہیں بخار ہے؟“ وہ چونک کر اس کی کمر پر ہاتھ پھیر کر بولی اور پھر اس کے جسم کے مختلف
 جگہوں پر چیک کرنے لگی۔
 ”کب سے بخار ہے نہیں؟“ وہ پریشان ہو اٹھی۔
 ”بہت دنوں سے ماما۔ جب سے آپ مجھے چھوڑ کر آئیں۔“ مثال رونے لگی۔
 بشری نے اسے اپنے ساتھ بھیج لیا۔
 ”دوا کھو کو نہیں دکھایا کسی نے نہیں؟“ وہ مغلوب لہجے میں بولی۔
 ”بہت پاس۔ آج بھی جب مجھے ماموں لینے گئے تو تو پیلا مجھے ڈاکٹر کے پاس لے کر آئے تھے۔ پیلا بہت پریشان
 تھے۔ وہ ساری رات میرے ساتھ جاگتے تھے۔“ وہ ایک طرف بیٹھے عمران کو کن اکھیوں سے دیکھ کر بولی۔
 ”تو پھر بخار کیوں نہیں اترتا تمہارا؟“ وہ اسے چھوٹی جارہی تھی اور پریشان ہوئی جارہی تھی۔
 ”ماما پیلا۔“ وہ ماں کی بات جیسے سن نہیں رہی تھی۔ جھجک کر بولی تو بشری نے کچھ چونک کر اسے دیکھا۔
 ”کیا۔“ وہ اتنا ہارے پیلا کو؟“ بشری نے بڑی مشکل سے ”تمہارے پیلا“ زبان سے ادا کیا۔
 ”پیلا اور ماموں... میں ابھی بہت لڑائی ہوئی تھی۔ پیلا کے چہرے پر۔ ماما پیلا مجھ سے بہت پیار کرتے ہیں۔ وہ
 بہت پریشان تھے اور۔“ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیسے اپنے احساس کو بیان کرے۔
 ”میری جان! اگر تمہارے باپ کو تم سے پیار ہوتا، تمہارا احساس ہوتا۔ تو کیا وہ یوں تمہیں مجھے خود سے کاٹ
 کر بھیج دیتا۔ ان دو کمبختی عورتوں کے کہنے پر۔“ بشری نفرت سے بولی۔
 ”بشری! بس کرو بیٹا! اب مثال کو تھوڑا آرام کرنے دو اور تم بھی آرام کرو۔ اتنا نہ تھکاؤ خود کو۔“ ذکیہ شکرانے
 کے نفل پڑھ کر اندر آئیں۔ دونوں پردم کرتے ہوئے پھونک ماری اور دونوں کو گلے لگا کر پیار کرتے ہوئے نرمی
 سے بولیں۔
 ”ہی! دیکھیں مثال کو۔ اتنا تیز بخار ہے۔ وہ بھی اتنے دنوں سے۔“ وہ روہانی ہو کر ماں سے بولی۔ ذکیہ مثال کو
 چھو کر دیکھنے لگیں۔
 ”تمہاری جدائی کا بخار ہے۔ ان شاء اللہ ابھی کچھ دیر میں اتر جائے گا۔ اس کی تم فکر نہیں کرو۔ آؤ مثال!
 تمہیں لٹاؤں میں تمہارے بستر پر۔“ ذکیہ مثال کو لے کر جانے لگیں۔
 ”نہیں امی! اسے میرے پاس رہنے دیں۔ یہ میرے پاس لیٹے گی۔ آپ اس کے کھانے کے لیے کچھ بنوادیں۔
 کیا کھانے کی میری جان؟“ وہ مثال کو اپنے ساتھ لٹا کر پیار کرتے ہوئے بولی۔

”دوست ہے میرا۔“ وہ بے زاری سے بولا۔
 ”بس! ابھر کوئی مسئلہ ہی نہیں۔ اب تو میری بات غور سے سن اور درمیان میں اچھل اچھل کر بولیو نہیں۔“ نسیم
 شاطرانہ انداز میں بولیں۔
 ”ہی... مجھے کچھ نہیں سنا۔“ وہ پھر سی تڑا کر جانے لگا۔
 ”سن لے بات۔ دل کو نہ لگے تو پھلے سے چلے جانا۔ میں نہیں روؤں گی تجھے۔ سن تو لے۔“ وہ اسے کچھ ایسے
 طریقے سے روکتے ہوئے بولیں کہ عدیل گہری سانس لے کر رہ گیا۔
 نسیم کو انسان کو راہ پر چلانا اور راہ سے بھٹکانا دونوں ہی خوب آتا تھا۔ اس نے دل میں ماں کی اس صلاحیت کا
 اعتراف کیا اور صوفے پر بیٹھ گیا۔
 ”میں فون کرتی ہوں ابھی تیری سسرال۔“
 ”نہیں سے وہ اب میری سسرال۔“ وہ تنہی سے تیز لہجے میں بولا۔ نسیم بھی لمحہ بھر کو خاموش سی ہو گئیں۔
 بات تو دکھائی تھی۔ بشری جیسی بھی سسی ان کے لیے۔ بیٹے کا گھر تو اجڑ گیا تھا۔ نسیم دکھ بھری نظروں سے دیکھ کر
 رہ گئیں۔

بشری پاگلوں کی طرح مثال کو گلے سے بھینچے اسے بار بار چومے جارہی تھی۔ ہاتھوں میں اس کا چہرہ لے کر اسے
 دیکھ جاتی اور پھر اسے چومنے لگتی اور چومتی چلی جاتی۔ اسے یقین ہی نہیں آ رہا تھا کہ مثال اس کے پاس
 ہے۔ اس کی ہانہوں میں۔ اس کے بہت قریب۔
 ”میری بچی! میری گریبا۔ میری جان! تو نہ آتی تو تیری ماں مر جاتی تیرے بغیر۔ میری مثال۔ میری جان۔“ وہ
 پھر اسے گلے لگا کر چیتے لگی۔
 ”ماما... مجھے آپ کے ساتھ رہنا ہے۔ مجھے اب واپس نہیں جانا۔ میں آپ کے پاس رہوں گی۔ مجھے
 دادو اور چچو کے پاس نہیں جانا۔“ مثال کی آنکھوں سے بہت دنوں کے بعد ایسے گرم گرم آنسو نکلے تھے بشری
 اسے چومنے لگی۔

”ہم! کسی کچھ نہیں۔ وہاں کو تو پھر دیکھ کر اس نے ہنس کر کہا۔“
 بہت دنوں بعد تو اسے ماں کی آغوش میسر آئی تھی۔ اس نے دونوں بانیس بشری کے گرد پھیلا دیں اور آنکھیں
 موند لیں۔
 ”ابھی اسے گرم دودھ دے دو۔ کچھ دیر سوئے گی تو پھر اٹھ کر کچھ کھالے گی۔“ ذکیہ کہنے لگیں اور دودھ کے لیے
 ملازمہ کو آواز دینے لگیں۔
 ”عمران! تمہیں عدیل سے جھگڑا نہیں کرنا چاہیے تھا۔“ ذکیہ نے عمران سے کہا۔
 مثال بے اختیار آنکھیں کھول کر نانی اور ماموں کو دیکھنے لگی۔
 ”امی۔۔۔ پلینز۔۔۔ بشری نے اشارے سے ماں کو اس موضوع پر بات کرنے سے منع کیا۔
 ”ہاں لودہ تو جیسے بڑے پیار۔۔۔ سے مثال کو مجھے دے رہا تھا۔ جھگڑانہ کرتا تو اور کیا کرتا۔“ عمران ہنسنے لگا اور کہا ہر نکل
 گیا۔



”کیا آپ سچ کہہ رہی ہیں؟“ نسیم فون کان سے لگائے بیاباں خوشی کا اظہار کرتے ہوئے بولیں۔ ٹی وی چینل
 بدلتی فوئیر نے چونک کر ماں کو دیکھا۔
 ”نہیں۔۔۔ نہیں۔ بالکل نہیں۔۔۔ بے یقینی کی بات نہیں۔۔۔ جی۔۔۔ آپ نے ٹھیک کہا۔ بالکل۔“ وہ ایسے
 تابع داری سے سر ہلائے جا رہی تھیں۔ جیسے دوسری طرف کوئی بادشاہ وقت ہو۔ فوئیر نے ٹی وی کی آواز کم کر دی۔
 ”جی بالکل۔۔۔ کوئی مسئلہ نہیں۔ آپ آجائیں کل کسی بھی وقت۔ نہیں، نہیں۔ مجھے کہاں جانا ہوتا ہے۔ اس
 بیماری نے تو بس گھر میں بٹھا دیا ہے۔ اللہ مجھے میری بیٹی کے فرض سے سبکدوش کرے تو پھر کوئی لاٹچ نہیں۔ بھلے
 ملک الموت آئے اور اس مٹی کے ڈھیر کو لے کر چلتا بنے۔“ وہ انتہائی عاجزی اور مسکینی سے کہہ رہی تھیں۔ فوئیر
 مسکرا کر رہ گئی۔
 ”قسم سے امی! آپ اگر ایکٹر لیں ہوتیں تو پرائیڈ آف پرفارمنس تو آپ کا پکا تھا۔“ فوئیر ہنس کر آہستہ سے

بولی۔
 ”نسیم نے اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور الوداعی کلمات بول کر فون رکھ دیا۔
 ”کیا ہوا؟ کون تھا؟“ فوئیر کو سخت بے چینی لاحق تھی۔ فوراً پوچھنے لگی۔
 ”نسیم جوش بھرے انداز میں اٹھ کر فوئیر کے پاس آئیں اور اسے گلے لگا کر خوب پیار کرنے لگیں۔
 ”امی! اس بے موقع پیار کی وجہ تو بتا دیں۔“ وہ ماں کے اس عجیب انداز پر کچھ بوکھلا کر بولی۔ وہ کب عادی تھی
 ایسے والہانہ پیار کی۔

”میرے اللہ نے میری سن لی فوئیر۔ میری بچی۔ اللہ نے ہماری سن لی۔ مجھے تو یقین ہی نہیں آ رہا۔“ وہ جوش
 سے سرخ چہرہ لیے ہوئے بے ربطی بولی۔
 ”امی! لہو اکیا ہے۔ بتاؤ دیں کچھ۔“ فوئیر کا دل عجیب سے انداز میں دھڑکنے لگا۔
 ”وہ کل خالد کی ماں اور خالہ نہیں آئی تھیں مجھے دیکھنے۔ یاد ہے نا مجھے کہ نہیں؟“ وہ خوشی کے عالم میں اوٹ
 پٹانگ بولے جا رہی تھیں۔

”امی! اکل کی بات کون بھول سکتا ہے اور کیا محسوس عورتیں تھیں وہ بھی۔ آپ نے کسی قدر دیکھی انداز میں
 میری طلاق کا قصہ سنایا اور انہوں نے نہ ہمدردی کی۔ نہ کوئی لفظ بولا۔ چائے پی اور خاموشی سے اٹھ کر چل دیں۔“

فوزیہ برے برے منہ بنا کر بولی۔

”وہ دونوں عورتیں حلیمہ اور چروں سے بس اچھے گھر کی تھیں۔ شریف، کم گو اور کچھ گھٹی سی۔“ فوزیہ نے بڑے کوفت کے عالم میں ان کی مدارات کی تھی۔ اور سچی بات، اسے وہ دونوں عورتیں کچھ اچھی بھی نہیں لگی تھیں اور کل سے ابھی تک اس نے ان کے بارے میں کچھ نہیں سوچا تھا۔

”تم انہیں پسند آگئی ہو اپنے بیٹے کے لیے۔ فوراً شادی کر لیں گی مہینے بھر کے اندر۔ کویت میں ہوتا ہے ان کا بیٹا۔ اسی ہفتے چھٹی پر آ رہا ہے۔ اس کے آتے ہی شادی کر دیں گی وہ۔ میرے اللہ! مجھے تو لگتا ہے، میرا تو دل خوشی سے بند ہو جائے گا۔“ نسیم ہوا فنی خوشی سے بے ہوش ہونے کو تھیں۔

اور شادی مرگ تو جیسے فوزیہ پر بھی ہو گیا۔ اس کے نوکمان میں بھی یہ معجزہ نہیں تھا اور طلاق کا داغ گلے کے بعد تو بالکل بھی نہیں۔ وہ یوں ماں کو دیکھتی رہ گئی۔ جیسے اسے ماں کے اس مذاق پر سخت غصہ آ رہا ہو۔

”میری بھی یہی حالت ہوئی تھی فوزیہ! جب اس غزالہ بن نے مجھ سے یہ کہا۔ نسیم سے مجھ سے تو بہت دیر تک کچھ بولا نہیں کیا۔ بول! ہے نامعجزہ؟ میری دعا میں اللہ نے سن لیں۔ آخری بیٹا ہے۔ جس کی شادی کرنی ہے اور سب سے بڑی بات وہ مجھے ساتھ لے کر جائے گا۔ ایک مہینے کی چھٹی کے بعد چلا جائے گا اور وہاں جاتے ہی مجھے بلالے گا۔ فوزیہ۔ میری بیٹی کے لیے بھاگ کھلیں گے میں نے تو کبھی سوچا نہیں تھا۔“ وہ اسے ساتھ لگا کر چٹ چٹ پکار کر نے لگیں تو فوزیہ بھی یقین کرتے ہوئے شرما سی گئی۔ اس نے بھی یہ سب کچھ سوچ کر رکھا تھا۔ اس کی آنکھیں بہت دنوں بعد نئے خواب بننے لگیں۔ نسیم کیا بول رہی ہیں اب اسے کچھ سنائی نہیں دے رہا تھا۔

مثال بشری کے ساتھ لیٹی گہری نیند سو رہی تھی۔

ذکیہ رات کے وظائف ختم کرنے کے بعد مصطفیٰ سینٹی اٹھیں اور اندر آ کر دونوں پر دم کرتے ہوئے کچھ سوچنے لگیں اور پھر جیسے دل تمام کر بیٹھ گئیں۔

”میری بشری کی عمر ہی کیا ہے۔ اس اکتوبر میں انیس کی ہوگی۔ اس عمر میں تو لڑکیاں اپنے گھروں کی ہوتی ہیں اور اس کا گھر بس کراچہ بھی گیا۔ کیا کرے گی میری بچی اب بانی کی عمر بھر۔ بچی کا ساتھ۔ میرے اللہ! رحم فرما، میری بشری پر۔“ بے اختیار ذکیہ کا دل بھر آیا۔ بہت دنوں بعد تو انہیں یوں فرصت سے اس سانچے پر رونے کا موقع ملا تھا۔

باہر ڈور بیل زور سے بجی۔

ذکیہ نے جلدی سے آنسو پونچھ لیے۔ عمران لاؤنج میں ہی لیپ ٹاپ لیے بیٹھا تھا۔ اٹھ کر دروازہ کھولنے چلا گیا۔

گنگی خیال کے تحت ذکیہ بھی اٹھ کر اس کے پیچھے چلی گئیں۔

”تو وہ تم ہو جس نے عدل صاحب کے گھر کے باہر سے ان کی کم سن بیٹی کو اغوا کیا ہے۔ گرفتار کرو اسے۔“ باہر سے آتی رعب دار آواز نے ذکیہ کے ہوش اڑا دیے۔

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

بچ بچا کر تو ہم چلے تھے بہت
پھر بھی قسمت میں حادثے تھے بہت

مرے جنوں کو کیا ہوا، وہ وحشیں کہاں گئیں
ہم اہل اضطراب کی وراثتیں کہاں گئیں

ہم تری رہ گزر پہ کیوں آئے
زندگانی کے راستے تھے بہت

دہی ہوا کی برہمی، وہی جہاں کی سرکشی
مگر وہ اپنے حوصلے، وہ جراثیم کہاں گئیں

تو نے آتے ہی ختم کر ڈالے
آرزوؤں کے سلسلے تھے بہت

دوام جن کی جستجو، قیام جن کی آرزو
وہ مے گسار کیا ہوئے، وہ حالتیں کہاں گئیں

بات کچھ خاص ہو گئی ہوگی
میری جانب وہ دیکھتے تھے بہت

کبھی تو شہر کی سٹو، کبھی تو یہ حساب دو
لگی گلی جو عام تھیں، وہ قربتیں کہاں گئیں

وقت رخصت وہ دیکھ ہی نہ سکے
میری پلکوں پہ آئے تھے بہت

پہلیں تو منظر رواں، ریکس بہار کا سماں
نہ جانے شام اس برس وہ قامتیں کہاں گئیں

ان سے ہونا پڑا جدا باقی
ان کے نزدیک آگے تھے بہت

محمود شام

باقی احمد پوری

ادیب

ایک شخص نے اپنے دوست سے پوچھا۔ ”اور سناؤ تمہارے بانی دو بھائی کیا کر رہے ہیں آج کل؟“
”میرا ایک بھائی تو ادیب ہے۔“ اس نے فوراً جواب دیا پھر گہری سانس بھر کر دوبارہ بولا۔ ”اور دوسرا بھی بے کار ہے۔“

افشاں۔ عبداللہ آباد

مورور الزام

ایک صاحب نے اپنے دفتر کے ساتھی سے پوچھا۔ ”آپ کی بیوی سے آپ کی پہلی ملاقات کس نے کروائی تھی؟“
ساتھی نے طویل آہ بھرتے ہوئے کہا۔ ”بس سمجھ لو خود ہی ہو گئی تھی۔ میں کسی کو مورور الزام نہیں بھرتا تھا۔“

شکلفہ فیاض۔ مٹی گن امریکا

اطمینان

وہ دونوں اتوار کا سارا دن ساحل سمندر پر گزار کر واپس آرہے تھے کہ لڑکے نے لڑکی سے پوچھا۔ ”تم پکک کے سارے واقعات اپنی ممی کو تو نہیں بتاؤ گی نا؟“

”ارے نہیں!“ لڑکی نے اطمینان بھرے لہجے میں کہا۔

”میری ممی تو ذرا اور ادھار نہیں کرتیں۔ وہ تو میرا شوہری ہے جسے طرح طرح کے سوال کرنے کی عادت ہے۔“
یاسمین مغل۔ کاشٹن

فی الحال

”تم بتاؤ، تم مجرم ہو یا نہیں؟“ جج نے غصے سے کہنے میں کھڑے ملزم سے دریافت کیا۔
”جناب والا! فی الحال میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔“
ملزم نے عاجزی سے جواب دیا۔ ”ابھی میں نے نو کیلوں کے دلاسل نہیں سنے۔“

صائمہ عمران۔ لاہور

رہنمائی

ایک فوجی محفل کے اختتام پر ایک صاحب جاگے کے لیے اٹھے تو میزبان انہیں چھوڑنے دروازے تک آیا۔ وہ صاحب لڑکھڑاتے ہوئے دروازے سے نکلے گئے تو میزبان نے کہا۔

”جب تم قریبی چوراہے پر پہنچو گے تو تمہیں دو ٹیکسیاں نظر آئیں گی۔ جو تمہارے بالکل قریب ہو اس میں بیٹھ جانا۔ اس کے برابر والی میں بیٹھنے کی ہرگز کوشش مت کرنا کیونکہ وہ وہاں موجود ہی نہیں ہوگی۔“

شہلا اظہر۔ سیٹھانی

بوجھ

بیٹی کی پچیسویں سالگرہ پر باپ نے اس سے کہا۔ ”بیٹا! اب تم جوان ہو گئے ہو میں چاہتا ہوں کہ اب تم میرا کچھ بوجھ اٹھاؤ۔“
”ضرور ابا جان! آپ بتائیے میں کیا کروں۔“ بیٹی نے سعادت مندی سے کہا۔

”بیٹا! تمہاری پیدائش کے وقت اسپتال کے

اغراجات کے لیے ہم نے بینک سے کچھ قرضہ لیا تھا۔ میں چاہتا ہوں کہ اس کی آخری تین قسطیں تم ادا کر دو۔“

عائشہ غلام۔ سرجانی ٹاؤن

احترام

ایک اطالوی موسیقار کے بارے میں دو باتیں مشہور تھیں۔ ایک اس کی بد صورتی اور دوسرے خواتین کے لیے اس کا محترم رویہ۔ ایک مرتبہ وہ اویسٹرا کے لیے ریسرسل کروا رہا تھا جس میں اطالوی جوان ساز بجا رہا تھا اور ایک امریکی لڑکی گارہی تھی۔ وہ بار بار بے شری ہو جاتی تھی۔ موسیقار کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا مگر وہ اپنی عادت سے مجبور صنف نازک کے لیے سخت کلمہ نہیں کہہ سکتا تھا۔ چنانچہ وہ زیر لب بڑبڑایا۔ ”کرسٹوفر کولمبس پر لعنت ہو، جس نے امریکہ دریافت کیا۔“

ارم کمال۔ فیصل آباد

اسم گنگ

ایک پولیس مین نے ٹرک والے کو روکا اور تلاشی لی مگر کچھ نہیں ملا۔ پولیس والے نے پوچھا۔ ”میں حیران ہوں۔ تم روزانہ گزرتے ہو اور ٹرک میں کچھ نہیں ہوتا۔ کیا وجہ ہے آخر تم کیا کرتے ہو۔“
ٹرک والے نے جواب دیا۔ ”اسم گنگ۔“

پولیس والے نے زچ ہو کر پوچھا۔ ”جگر مجھے تو کوئی ایسی چیز نہیں ملتی۔“
ٹرک والے نے پولیس والے کو ایک پرچی دی اور کہا۔

”اس میرے جانے کے بعد کھولنا۔“
پولیس والے نے اس کے جانے کے بعد پرچی کھولی تو اس میں لکھا تھا۔ ”میں ٹرک اسمگل کرتا ہوں۔“

مسرت الطاف احمد۔ کراچی

نسلی برتری

ایک سفید فام سیاح گھومتا گھامتا ایک ایسے گاؤں میں جا نکلا جہاں تمام تر آبادی سیاہ فاموں پر مشتمل تھی۔ وہ شراب خانے میں داخل ہوا تو سیاہ فام بارمین نے اسے دیکھا اور پوچھا۔ ”کیا نسلی برتری پر یقین رکھتے ہو؟“

”ہرگز نہیں!“ سیاح نے جواب دیا۔
”مگر ہم یقین رکھتے ہیں۔“ سیاہ فام بارمین چلایا۔ ”یہاں سے فوراً دفعان ہو جاؤ۔“

جیا ممتاز۔ گلستان جوہر

سادگی

کھلاڑی ریس میں دوڑ رہے تھے۔ ریس دیکھتے ہوئے سردار صاحب نے پاس کھڑے ہوئے آدمی سے پوچھا۔

”انعام کس کو ملے گا؟“
”سب سے آگے والے کو۔“ آدمی نے جواب دیا۔
”تو پھر پیچھے والے کیوں بھاگ رہے ہیں؟“ سردار نے حیرت سے پوچھا۔

آمنہ اجالا ڈھری

ایڈیٹر

ایک اخبار کے مالک نے ایڈیٹر کے منصب کے لیے آئے ہوئے امیدوار سے کہا۔

”ہوں تو آپ بڑھے لکھے اور قابل آدمی لگتے ہیں لیکن مجھے اپنے اخبار کے لیے ایک بے حد ذمہ دار ایڈیٹر کی ضرورت ہے۔ کیا آپ کامیابی سے اخبار چلا سکیں گے؟“

”بالکل جناب!“ امیدوار نے اعتماد سے کہا۔
”یہاں آنے سے پہلے میں اپنے مالک کی پندرہ لاکھ کی کار چلاتا تھا تو کیا آپ کا پندرہ روپے کا اخبار میں چلا سکوں گا۔“

صائمہ عمران۔ سرجانی ٹاؤن

اولیٰ کا صلہ

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا،

حضرت عبداللہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

”جو شخص کسی کی موت پر اپنے رخسار پیٹے، مگر بیان پھاڑے اور عہد جہالت کی سی باتیں کرے، وہ ہم میں سے نہیں ہے۔“

تشریح:- اس میں نوحہ کی حرمت بیان کی گئی ہے یعنی نوحہ کرنے کا عمل ان لوگوں کے لیے جو غیر مسلم ہیں یا یہ کہ وہ ہماری امت سے خارج ہے۔

(ابن ماجہ)

ظرف

ایک نوجوان یرود شلم کی ایک گلی سے گزر رہا تھا، اچانک ایک شخص نے اس کی راہ روک کر اسے برا بھلا کہنا شروع کر دیا۔

”اے بے دین و گمراہ! تو ہمیں اپنے آباؤ اجداد سے مخوف کرنا چاہتا ہے۔ اللہ تجھے ذلیل و خوار کرے“ نوجوان نے مسکرا کر اسے دعائیں دینا شروع کر دیں وہاں موجود ایک شخص نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا اور بولا۔

”یہ شریر شخص تمہیں برا بھلا کہہ رہا ہے، گالیاں دے رہا ہے اور تم اسے دعائیں دے رہے ہو۔ آخر تم اسے جواب کیوں نہیں دیتے؟“

شریف نوجوان نے جواب دیا۔ ”جس کے پاس دینے کے لیے جو کچھ ہوتا ہے، وہ دوسروں کو وہی کچھ دیتا ہے۔ اس کے پاس گالیاں تھیں، لہذا اس نے مجھے گالیاں دیں اور میں نے دعا دی۔“

یہ شریف نوجوان حضرت عیسیٰ علیہ السلام تھے۔

حضرت علیؓ نے فرمایا،

”جاہل کے سامنے عقل کی بات مت کرو کیونکہ پہلے وہ بحث کرے گا اور پھر اپنی ہار دیکھ کر آپ کا دشمن بن جائے گا۔“

دعوت امام حسینؓ

سیدنا امام حسینؓ ایک مرتبہ کچھ مسالکین کے پاس سے گزرے جو ان کے زمین پر بیٹھے کھانا کھا رہے تھے۔ نواسہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا تو لجاجت سے عرض کی۔

”حضرت! تشریف لائیے، ہمارے ساتھ کھانے میں شرکت فرمائیے۔“

سیدنا حسینؓ سواری سے نیچے اترے، ان کے ہمراہ زمین پر بیٹھے اور یہ کہتے ہوئے ان کے ساتھ کھانے میں شریک ہو گئے۔

”اللہ تبارک کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔“ ان کے ساتھ کھانا کھا کر فارغ ہوئے تو نواسہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے ساتھ اظہارِ محبت کرتے ہوئے فرمایا۔

”میں تو آپ لوگوں کی دعوت قبول کر چکا آپ لوگ بھی میری دعوت قبول کریں۔“

ان کے لیے اس سے بڑھ کر اعزاز و اکرام کی کیا بات ہو سکتی تھی۔ ایک زبان ہو کر بولے۔

”ہاں ہاں، ہم آپ کی دعوت قبول کرتے ہیں۔“ سیدنا حسینؓ ان کو ہمراہ لیے ہوئے گھر تشریف لائے اور پھر تازہ نے آپ کے یہ الفاظ اپنے سینے میں محفوظ کر لیے۔ آپ نے اپنی زوجہ محترمہ ”وبابا“

سے فرمایا۔

”اپنی جمع شدہ پونجی نکال لاؤ۔“

پھر اس مال کو مسالکین میں تقسیم کر دیا۔

مسئلہ کامل

امام ابوحنیفہؒ کے بارے میں آیا ہے کہ جب کسی مسئلے کا حل انہیں نہیں ملتا تھا تو وہ دو تین قرآن ختم کر دلتے اور مسئلہ کامل انہیں سمجھ جاتا تھا۔ (شاہنواز فاروقی - امانت)

اولیٰ کا احترام

سلطان المشائخ حضرت نظام الدین اولیاءؒ کی خدمت میں حضرت مولانا ضیاء الدین سناری کی عیادت کو گئے جو سخت بیمار تھے اور اطلاع کرائی۔

مولانا نے فرمایا۔ ”میں دین میں نئی بات نکالنے والوں سے نہیں ملتا ہوں۔“

نظام الدین کبھی کبھی سماع میں شریک رہتے اور مولانا اس کو بدعت اور ناجائز سمجھتے تھے۔

حضرت نظام الدین نے کہا۔ ”مولانا سماع کرو، میں نے سماع سے تو یہ کر لی ہے۔“

یہ سنتے ہی مولانا نے فرمایا۔

”میرے سر کا عامر اتار کر پچھا دو اور سلطان المشائخ سے کہو کہ اس پر پاؤں رکھتے ہوئے تشریف لائیں۔“

اپنی قوم سے دشمنی

ایک مرتبہ مولانا اشرف علی تھانویؒ سے کچھ لڑکوں نے سوال کیا کہ کتنے کو ناپاک قرار دیا گیا ہے حالانکہ یہ بڑا وفادار اور فاضل ہے۔ رات کو چوکیدار کا کام سرانجام دیتا ہے۔ شکر ادا میں مدد دیتا ہے۔

مولانا نے جواب دیا۔ ”مکتے میں بہت سی خوبیاں ہیں لیکن ایک عادت بڑی خراب ہے کہ اپنی ہی قوم کا دشمن ہے اپنی ہی قوم سے لڑتا ہے۔“

پیٹ بھر کر کھانا

حضرت یحییٰ بن زکریاؒ نے شیطان کو بہت سے

پھندے اٹھائے ہوئے دیکھا۔ آپ نے پوچھا۔

”یہ کیا ہے؟“

شیطان بولا۔ ”یہ شہوات ہیں۔ ان سے ابن آدم کو قید کرتا ہوں۔“

آپ نے دریافت کیا۔ ”کیا میرے لیے بھی کوئی ہے؟“ شیطان نے کہا۔ ”ایک رات آپ نے پیٹ بھر کر کھانا کھا لیا جس سے نماز میں سستی پیدا ہو گئی۔“ آپ نے فرمایا۔ ”میں آئندہ کبھی پیٹ بھر کر نہیں کھاؤں گا۔“

شیطان نے جواب کہا۔ ”میں آئندہ کسی کو نصیحت نہیں کروں گا۔“

قافی

ایک دن خلیفہ سلمان بن عبدالملک نے سز و خلعت اور سبز عمامہ پہنا اور آئینہ دیکھا۔ اسے اپنی وجاہت بہت پسند معلوم ہوئی کہنے لگا۔

”میں کیا خوب رو اور نوجوان بادشاہ ہوں۔“ پاس ہی کسی کی خادمہ کھڑی تھی۔ خلیفہ نے دیکھا کہ اس کی بات پر لونڈی کے ہونٹ بلے ہیں۔ وہ پوچھنے لگا۔

”بتاؤ تم نے کیا کہا ہے؟“

وہ بولی۔ ”اچھی بات ہی کہی ہے۔“

سلمان نے اصرار کیا۔ ”ان الفاظ کو ذرا زور سے ادا کرو۔“

خادمہ نے چند اشعار پڑھے جن کا مفہوم یہ تھا۔

”تو بہتر ترین انسان ہے، کاٹی باقی رہتا مگر کوئی انسان باقی نہیں رہ سکتا۔ جہاں تک میں جانتی ہوں تجھ میں کوئی عیب نہیں سولے اس کے کہ تو قافی ہے۔“ اس واقعے کے بعد سلمان صرف ایک ہفتہ زندہ رہا۔ بخار آیا اور یہی بخار اس کی موت کا سبب بنا۔

ملیخہ صدیقی - کراچی

حادثے

حادثے زندگی میں بڑی آہستگی، بڑی خاموشی سے دیے پاؤں اکر چپ چاپ گزر جاتے ہیں جلتے جلتے مرکز کو بھی نہیں دیکھتے، دم بھرنے کے لیے پھرتے بھی

ہیں یہ دیکھنے کے لیے جس کی زندگی میں اگر وہ وہیں جا رہے ہیں۔ اس کے دل کی دنیا میں کتنی پھل چمک رہی ہے۔ اس کی روح کو وہ کس طرح سکھاتا ہوا چھوڑ کر آگے بڑھ گئے ہیں۔

مسترت الطاف احمد - کراچی

اثاثہ

○ مسلمان جہاں بھی گئے یہ اثاثہ اُن کے ہمراہ تھا۔ ایک روشن اور سیدھا سادا دین، جس کی ہر ہدایت کا لازمی نتیجہ فلاح، سعادت اور کامرانی تھا۔

○ ایک عادلانہ نظام حکومت جو شاہ و گدا میں کوئی امتیاز نہیں رکھتا تھا اور جو ہر قسم کے استحصال سے پاک تھا۔

○ ایک ایسا پیغام جو اُن کی اخلاقی اور روحانی زندگی کا ضامن تھا۔

○ ایک ایسا علم جس کی روشنی سے زندگی کی شاہراہ چمک اُٹھی تھی اور اجالے حدامکان تک پھیل گئے تھے۔

○ ایک ایسی تہذیب جس کی بنیاد طہارت و تقدس پر ڈالی گئی تھی۔

○ ایک ایسا نظام عبادت جس نے بندوں میں ذوق خدائی پیدا کر دیا تھا اور اُن کے دست بازو میں بجلی جیسی قوت پھردی تھی۔

(ڈاکٹر غلام جمیل لانی برق)

صومیہ نذیر، شہناز نذیر - سری پور دہرا

شجرہ نسب

○ ایک بار کسی نے حضرت سلمان فارسیؓ سے اُن کے خاندان کے بارے میں پوچھا تو انہوں نے فرمایا۔

”مسلمان ابن اسلام“
نمرہ، اقرارہ - کراچی



انمول موتی

○ ہر جہاں ہونے والا شخص بے وفا نہیں ہوتا۔ اسی طرح ہر قریب رہنے والا شخص اپنا نہیں ہوتا۔ ہر اعتبار کی مثال کو بھی تو نے دست دو کر اس انمول مالاکے موتی بکھر جائیں تو تلاش کے باوجود دوبارہ نہیں ملتے۔

○ کسی سے تلخ ہوتے ہوئے اتنی گنجائش ضرور رکھو کہ اگر واپس آنا پڑے تو راستہ کھنٹ ثابت نہ ہو۔

○ شگ ایک آگ کی طرح ہے۔ جو اچھی سے اچھی چیز کو جلا کر رکھ کر دیتا ہے۔

○ بعض رشتوں کو برقرار رکھنا، اُن کو توڑ دینے سے زیادہ اذیت ناک ہوتا ہے۔

نازیہ رئیس - نواب شاہ

عورت

○ عورت کا مطلب ہے ”چھٹی ہوئی چیز“، لہذا جتنا چھپ کر رہے گی اتنی ہی ”اسم باسما“ ہوگی۔

ادبیات

○ ”بھدر چھوڑی عورت کا مرد کے پاس سے گزر کر جانا یا اس کے ساتھ کام کرنا ادبیات ہے۔ اس کی صحبت اختیار کرنے کے لیے ایسا کرنا دوسری بات۔“

○ ایک نظر دیکھ کر باضوری سوال و جواب کر کے جیون ساتھی منتخب کرنا ادبیات ہے۔ محبت کا دھونگ رہا نا دوسری بات۔

○ کسی کے قول پر بڑھ کر عمل کرنا ادبیات ہے، اپنے

خدا کی کون سی باتیں

قرۃ العین طاہرہ
کہاں جاؤ گے مجھے چھوڑ کے میں یہ پوچھ پوچھ تک گیا
وہ جواب مجھ کو نہ دے سکا، وہ تو خود میرا پرانا تھا
وہ ملا تو صدیوں کے بعد بھی میرے لب پہ کوئی گونہ تھا
اُسے میری چپ نے زلادیا جسے گفتگو میں کمال تھا
فرحت اشرف جٹ
وہ دل کی بازی جہاں مجھ سے جیتنا چاہے
میں مان لوں گا وہیں مات اس سے کہہ دینا
وفا کی راہ میں، میں آج بھی اکسلا ہوں
کوئی نہیں ہے میرے پاس اُس سے کہہ دینا
ثرین اکرام
آج یوں موسم نے دی جتن جنت کی خیر
پھوٹ کر دوڑنے لگے ہیں میں محبت اور تم
ہم نے جو نبی کر لیا محسوس منزل ہے قریب
راستے کھولنے لگے ہیں میں محبت اور تم
ارم کمال
اس شخص کی جاہت بھی عجیب ہے کہ ہمیشہ
خاطر میں نہ لانا، مدارت میں رہنا
حزق قریشی
شام سفر کا اور اٹا نہ ہی کچھ نہیں
اک تیری بے چراغ، بقیہ ہے ایک تو
رمشا و عظمت
شکستہ آئینوں کی کرجاں اچھی نہیں لگتیں
مجھے وعدوں کی غالی سپیال اچھی نہیں لگتیں
گزشتہ رات کے رنگوں کا آئروڈھو کا بچھو کو
کھلے آنکھ میں اُڑتی جلیاں اچھی نہیں لگتیں
خاسم اعوان
گناہوں آخون باندی
ایساں منظر سے پس منظر تک جراتی ہی جراتی ہے
کسمی اصل کا عید نہیں لھکتا، بھی سچا خواب نہیں ہوتا

کنزئی شاہن اعوان
چندر خوابوں کے عطار کے ابلے عجم کو
کر دیا دُنیا نے وقت کے حوالے مجھ کو
جن کو سورج میری چوٹ سے ملا کر لٹا تھا
اب وہ خیالات میں دیتے ہیں ابلے عجم کو
صومیہ نذیر
بات بٹھری جو عدل پہ واعظ
پھر یہ منت، یہ التجا کیا ہے
انہیں چاند ساجب کہا تو کہنے لگے
چاند کہتے نا، یہ چاند سا، کیا ہے
سمیعہ احسان
یہ تم سے کہہ دیا۔ کس نے کہ بازی ہار بیٹھے ہیں
ابھی تم پہ لٹانے کو ہماری جان باقی ہے
نوشاہ منظور
مجھے ہر کیفیت میں کیوں نہ سمجھے
وہ میرے سب حوالے جانتا ہے
میں اس کی دسترس میں ہوں مگر وہ
مجھے میسری رضا سے مانگتا ہے
سدرہ وزیر
اک بار وہ ملا تھا مجھے بے رنجی کے ساتھ
اس دن سے دل کا شہر برابر اُداس ہے
دیکھی ہے اس کی آنکھ میں پہلی دفعہ غمی
یوں لگ رہا ہے جیسے سمندر اُداس ہے
توبہ نذیر
ہم بھی تو قرار و قول بھولے
کون اپنا کہا نہا ہوتا ہے
اب یاد نہ آکر کچھ دلوں سے
دل کسی اور کو چاہتا ہے

ہاشم آزاد
کرو پھر سے کوئی وعدہ کہیں نہ بھرنے کا
تھیں کیا فرق پر تہا ہے پھرے میں بھرنے میں
نورہ افتخار
بہت اسرار پوشیدہ ہیں اس تنہا لندی میں
ممت سو جو کہ دیوانے جہان دیدہ نہیں ہوتے
تعجب کیا اگر اقبال دُنیا مجھ سے ناخوش ہے
بہت سے لوگ دُنیا میں پسندیدہ نہیں ہوتے
شبنم شمشاد
کیٹل کالج یزمان
زندگی تو کب کی ہو گئی خاموش
دل تو بس عادتاً دھڑکتا ہے
ثمینہ احمد شہناز گل
زندگی اب کے میرا نام نہ خال کرنا
مگر یہ طے ہے کہ یہی کیل دوبارہ ہو گا
سونا حسن
جو آنا چاہو رستے ہزار نہ آنا چاہو عدد ہزاروں
مزارج برہم طویل راستہ برستی بارش خواب موسم
افرا اکرم
سکاوں سیلاں شریف
اب کہاں ایسی طبیعت والے
چوٹ کھا کر جو دعا کرتے تھے
ترک احساس محبت مشکل
ہاں مگر اہل وفا کرتے تھے
انفقاتا
شاید اسے عشق بھی نہ سمجھے
جس کرب میں عقل مبتلا ہے
ماریر چودھری
آپنی کاوش بھی نہ کر میری اینری کے لیے
تو کہیں میسر اگر فساد نہ سمجھا جائے
بونیا ربانی
تافنیاں محک بالا
تمہارے ذہن میں جو بھی ہے صاف صاف کہو
منافقت کا نشان ہے اگر مگر کرنا
ہنا مغل
معرکہ اب کے ہوا بھی تو پھر ایسا ہو گا
تیرے دیا پہ میسری سیاں کا پہرہ ہو گا
باسمائی اُسے بھول گئی ہے محبت
یا پھر ایسا ہے میسر از تم ہی ہلکا ہو گا

ساجی عامر
میری آوارگی میں کچھ دخل تمہارا بھی ہے محبت
جب یاد تمہاری آتی ہے تو کھراچھا نہیں لگتا
کوثر خالد
بچن والو خدا حافظ تعض میں لے چل کر دوش
وطن میں گرانڈھیرا ہو تو کھر میرا جلا دینا
نیل شہزادی
لوڑ دے ہیں میں نے گھر کے سب ہی آئیے
پیادیں ہارے ہوئے لوگ مجھ سے دیکھتے نہیں طے
مبین اختر
اس سے جدا تو ہو گیا پر یوں لگا مجھے
جیسے جہاں میں کوئی دوسرا نہیں رہا
وہ بے وفا نہیں مگر اتنا ضرور ہے
پہلے وہ جس طرح کا تھا ویسا نہیں رہا
غنی اکرم
فقط باتیں اندھیروں کی فقط قصے آجائوں کے
چراغ آرزو لے کر تم نکلا، نہ ہم نکلے
عابدہ غوری
کسی بھی درد کی حد سے دلا گزرنے تک
میں خود کو جوڑتا دھتا ہوں پھر بھرتے تک
نیلم ظفر چوہدری
خواب، خواہش، واہمہ بے زندگی
ایک بھانک حادثہ ہے زندگی
آج تک یہ مسئلہ سلجھا نہیں
میں حفا ہوں کہ حفا ہے زندگی
عائشہ خان
یہ تمہارا ہی حوصلہ محبت
حال کو حسب حال رہنے دیا
سدرہ بتول
وہ مجھے اپنے ساتھ قید کر کے لے جائے
خدا کرے کوئی ایسا قصود ہو مجھ سے
صدیقہ انقسلک
یہ مجھے چین کیوں نہیں پڑتا
ایک ہی شخص تھا جہاں میں کیا



شاعری کی پختہ ہوتی ہے

سعدیہ ریاض

شاعری خوبصورت احاسیات و جذبات کو الفاظ میں بیان کرنے کا نام ہے۔ کبھی کسی نظم، غزل یا شعر کو بڑھ کر ایسا لگتا ہے جیسے شاعر نے ہمارے دل کے حال کو زبان دے دی ہو۔ ہماری کیفیت کو بیان کر دیا ہو تو شاعری غمگسار کی کیفیت دھار دیتی ہے۔

اب اپنا تعارف کروادوں۔ میرا نام سعدیہ ریاض ہے۔ شاعری سے میرا گہرا تعلق ہے۔ میرا تعلق کراچی سے ہے۔ جس کو پہلے روشتیوں کا شہر کہا جاتا تھا۔ جس کے لیے فیض احمد فیض نے کہا ہے:

رفتہ رفتہ شوگر رہی ہے پھٹی زرد دوپہر دیواروں کو جاٹ رہا ہے تنہائی کا زہر دودا فنی تک گھٹی بڑھتی اٹھی گرتی ہستی ہے لہری صورت میں ہے رونق دردوں کی گدلی لہر بست ہے اس گہر کے پیچھے روشتیوں کا شہر اسے روشتیوں کے شہر...

ابن انشا کی شاعری کا انداز مجھے سب سے مختلف، منفرد اور اچھا لگتا ہے۔ ان کی ایک دل کے تالوں کو چھو جانے والی نظم جسے بار بار پڑھنے کو دل چاہتا ہے۔

سب مایا ہے سب ڈھلے پھرتی چھایا ہے اس عشق میں ہم نے جو کھویا جو پایا ہے جو تم نے کہا ہے، فیض نے جو فرمایا ہے سب مایا ہے

ہاں گائے گائے دید کی دولت ہاتھ آئی یا ایک وہ لذت نام ہے جس کا روائی بس اس کے سوا تو جو بھی ثواب کمایا ہے سب مایا ہے

اک نام تو باقی رہتا ہے، گر جان نہیں جب دیکھ لیا اس سوئے میں نقصان نہیں تب شمع پہ دینے جان پتنگا آیا ہے سب مایا ہے

معلوم ہمیں سب تیس میاں کا قصہ بھی سب ایک سے ہیں، یہ داغ بھی یہ انشا بھی فرماؤ بھی جو اک تہر سی کھود کے لایا ہے سب مایا ہے

کیوں درد کے نامے لکھتے لکھتے رات کرو جس مات سمندر پار کی تاریک مات کرو اس نارسے کوئی ایک نے دھوکا کھایا ہے سب مایا ہے

جس گوری پر ہم ایک غزل ہر شام لکھیں تم جلتے ہو ہم کیونکر اس کا نام لکھیں دل اس کی بھی جو کھٹ بجوم کے داپس آیا ہے سب مایا ہے

وہ لڑکی بھی جو چاند نگر کی مانی تھی وہ جس کی الٹرا ٹیکوں میں حیدرانی تھی آج اس نے بھی پیغام یہی بھجوا یا ہے سب مایا ہے

جو لوگ ابھی تک تام و صفا کالیتے ہیں وہ جان کے دھوکے کھاتے، دھوکے دیتے ہیں ہاں شوگر بجا کر ہم نے حکم لگایا ہے سب مایا ہے

جب دیکھ لیا ہر شخص یہاں ہر جاتی ہے اس شہر سے دودا اک گھیا ہم نے بنائی ہے افواہ اس گھیا کے ماتھے پر کھوایا ہے سب مایا ہے

جون ایلیا میرے پسندیدہ شعراء میں سے ایک ہیں۔ ان کے کلام میں محسوس کیا جانے والا سوز و گداز ہے اور وہ اپنے جذبات کو بڑی خوبصورتی سے بیان کرتے ہیں۔

نہ ہوا نصیب قرار جاں، ہوں قرار بھی اب نہیں تیرا انتظار بہت کیا، تیرا انتظار بھی اب نہیں

تجھے کیا خبر مر و سال نے ہمیں کیسے ختم دیکھاں تری یادگار بھی اک غلط تری یادگار بھی اب نہیں نہ بگلے رہے نہ گماں رہے، نہ گزارشیں ہیں نہ گفتگو وہ نشاط و عہ وصل کیا، ہمیں اعتبار بھی اب نہیں

کسے نذر دین دل و جاں ہم کہ نہیں وہ کاکل خم بہ خم کیسے ہر نفس کا حساب دین کہ تقسیم یا رہی اب نہیں وہ بیجوم دل زدگان کو تھا، تجھے خرد ہو کہ بکھر گیا تیرے استلے کی خیر ہو، سر بردہ خنجر بھی اب نہیں

وہ جو اپنی جاں سے گزر گئے انہیں کیا خبر ہے کہ نہیں کسی جانث را کا ذکر کیا کوئی سوگوار بھی اب نہیں نہیں اب تو بال جنوں میں بھی وہ جو شوق شہر میں عام تھا وہ جو رنگ تھا کبھی کو کبھو، سر کوٹے یا رہی اب نہیں

السان جن سے محبت کرتا ہے، اُس پر اپنا حق اور مان بھگتا ہے۔ لیکن اگر کبھی یہ مان ٹوٹ جلتے تو اُس کی جیساں دل کو زخمی کرتی رہتی ہیں۔

اعجاز اسلام احمد کی یہ نظم بھی اسی طرح کے جذبات کی عکاسی کرتی ہے۔ ساتھ ٹوٹ جلتے ہیں، ہمیشہ میں ذمہ لے کی ہاتھ چھوٹ جلتے ہیں

دوست دار اچوں میں ملوثیں سی پڑتی ہیں اک ذرا سی رنجش سے، شک کی زرد دھنسی پر

پھول بدگمانی کے اس طرح سے کھلتے ہیں زندگی سے پیارے بھی، اجنبی سے لگتے ہیں، عزیز بن جلتے ہیں عمر بھر کی چاہت کو آسرا نہیں ملتا، دشت بے یقینی میں راستہ نہیں ملتا خاموشی کے دھنوں میں بات ٹوٹ جاتی ہے اور سیرا نہیں ملتا

معذرت کے غظوں کو روشنی ہمیں ملتی لذت پذیرائی پھر کبھی نہیں ملتی پھول رنگ و عددوں کی مندریں سرزدتی ہیں، راہ مرنے لگتی ہے

بے رحمی کے گارے سے، بے دلی کی مٹی سے فاصلہ کی اینٹوں سے اینٹ جڑنے لگتی ہے خاک اُڑنے لگتی ہے

خواب ٹوٹ جاتے ہیں، داپھوں کے سائے سے عمر بھر کی محنت کو، پل میں ٹوٹ جاتے ہیں اک ذرا سی رنجش سے، ساتھ چھوٹ جاتے ہیں ہمیشہ میں ذمہ لے کی، ہاتھ چھوٹ جاتے ہیں ساتھ ٹوٹ جاتے ہیں



ادارہ خواتین ڈائجسٹ کی طرف سے بہنوں کے لیے خوبصورت ناول



قیمت 300/- روپے

منگوانے کا پتہ:

مکتبہ عمران ڈائجسٹ فون نمبر: 32735021 37، اردو بازار، کراچی

Art With You

Paint with Water Color & Oil Colour

First Time in Pakistan
a Complete Set of 5 Painting
Books in English



Art With You

کی پانچوں کتابوں پر حیرت انگیز رعایت

Water Colour I & II
Oil Colour
Pastel Colour
Pencil Colour

فی کتاب - 150/- روپے

نیا ایڈیشن بذریعہ ڈاک منگوانے پر ڈاک خرچ

200/- روپے



بذریعہ ڈاک منگوانے کے لئے

مکتبہ عمران ڈائجسٹ

37 اردو بازار کراچی فون: 32216361

بھڑاس بھی نکال لیتی ہوں اور بہت کچھ سنا بھی دیتی ہوں۔ لیکن حیرت کی بات تو یہ ہے سامنے والا چاہے جو بھی ہو، اسے میری بات ذرا بڑی نہیں لگتی۔ پسندیدہ خرمیں کوئی ایک ہو تو مصحف، مرگ، برگ، جو چلے تو جاں سے گزر گئے، آئینوں کا شہر، پیر کامل، ایمان امید اور محبت، رقص جنوں، سفال گر، مرگ و فدا اور بھی کئی ہیں، لکھنے بیٹھوں تو صفحے کم پڑ جائیں۔ پسندیدہ مصنفات میں عمیرہ احمد، فرحت اشتیاق، نمرہ احمد بہت پسند ہیں اور نئی لکھنے والیوں میں نایاب جیلانی اور سائرہ رضا اول نمبر پر۔ سائرہ رضا کا انداز تحریر بہت پسند ہے۔ باریک سے باریک موضوع کو بھی اتنی عمدگی سے لکھتی ہیں کہ پڑھنے والا کئی ہفتے حیرت سے نکل ہی نہیں پاتا۔ اس کے علاوہ امیرا حمید، شازیہ جمل، سدرہ سحر عمران، عنیقہ محمد بیگ بھی خوب ہیں۔

4 - خوبیاں تو دوسرے ہی بتائیں تو بہتر۔ خامیاں نہ پوچھو گی (کوئی یک ہووے تے دساں) ہا ہا ہا۔ انجی لوگوں پر اعتبار کر لیتی ہوں نٹات بھی کھا جاتی ہوں، غصہ بہت ہے، منہ پھٹ ہوں۔ روٹی بہت ہوں۔ بنا سوچے سمجھے فیصلے کرنے کی عادی ہوں۔ ہر وقت خوب سے خوب تر کی تنگ دو دو میں رہتی ہوں۔ بولتی بہت ہوں۔ جھوٹ تو اللہ معافی۔ تعریف آنکھوں کی بہت ہوتی ہے۔ اکثر کالج کی لڑکیاں میری ڈارک براؤن بڑی آنکھوں کی فین ہیں۔

5 - بارش، کیا پوچھ لیا ہائے بارش میں نہاتے نہاتے جھٹکتی نہیں اور لیو پر رقص گیت "ساوان میں موہنی بن کے میں تو چم چم چم ناچوں" بارش کو اکیلے انجوائے کرنے کا اپنا مزہ ہے یا زیادہ سے زیادہ فرینڈز کو ساوان اور بارش کے میسج کر دیے بس کافی نہیں۔

6 - لطیفے ہرے سے پسند نہیں۔ ہاں شعر پسند ہیں۔ کیا کیا ساواں جی۔ بہت سے اشعار پڑھ کر ڈائری میں محفوظ کر لیتی ہوں۔

شعاع کے ساتھ

آداب

اقصی مریم سلغانی... کوئٹہ

1 - رواں سال کے کیلنڈر کو چار سال پیچھے کی جانب لے کر جاؤں تو چار سال بنتے ہیں۔ جی ہاں شعاع سے تعلق کو چار سال کا عرصہ بیت چکا ہے۔ تب میں نائنٹھ کلاس کی طالبہ تھی اور اب ٹیچر ڈائری میں ہوں۔ شعاع کی سب سے اچھی بات جو مجھے لگتی ہے یہ وہ رسالہ ہے جو نہ صرف شہروں تک رسائی رکھتا ہے بلکہ اس کی پہنچ کچی بکی بستیوں، دیہاتوں تک بھی ہے اور یہی اس کی شہرت کی اصل وجہ بھی ہے۔ دیہات کی کم پڑھی لکھی لڑکیاں بھی جب شعاع پڑھنے بیٹھتی ہیں تو اسے اپنی اولین درس گاہ سمجھتی ہیں۔ اس لیے کہ شعاع زندگی کے اوجھے نیچے نیلوں سے گزرنے کا ہنر سکھاتا ہے۔

2 - صبح کا آغاز تو جناب امی صاحبہ کی ڈانٹ سے ہی ہوتا ہے۔ دن چڑھ گیا، سورج نکل آیا اور ابھی تک گھوڑے بیچ کے سو رہی ہو۔ تو جناب جب ہماری امی کا پارہ تھوڑا زیادہ اوپر کو چڑھنے لگتا ہے تو رضائی پھینک کر منہ پر ہاتھ رکھے جمائیاں روکنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ناشتا عموماً امی ہی تیار کرتی ہیں اور میں پکانے ڈکارنے کا ہنر خوب جانتی ہوں۔ ہا ہا ہا۔ ساتھ ساتھ چھوٹے بھائی، بہنوں کے ہمراہ ہنسی مذاق ہلا گلا تو چلتا ہی ہے۔

پھر ناشتے کے برتن میں ہی دھوئی ہوں۔ فراغت کے بعد فٹ سے یونیفارم پہنا، جوتے پہنے، بیک لٹکائے صحن میں آکر ٹہلنے لگے اور دین والے کے بارن کا انتظار کرنے لگے جیسے ہی پول، پول ہوئی میں بھاگتی امی کی دعائیں لیتی دین میں سوار ہو جاتی ہوں۔

پھر کیا ہوتا ہے۔ مہینہ کا آغاز ہو تو پیاری سی کرن آسیہ قادر شعاع نکال کے بیٹھ جاتی ہے۔ اور دین میں ہی ٹائٹل، نئے سلسلوں اور کہانیوں پر سہمہ شروع۔ کالج پہنچ کر بھی جیسے ہی کوئی فری پیریڈ ملا تو شعاع سے لطف اندوز ہونے لگے۔ میری عموماً ساری کلاس فیلوز شعاع کی بات فینز ہیں۔

کالج سے واپسی پہ کھانا کھایا اور پھر سے میٹھی نیند اوڑھ کے سو گئے۔ جیسے ہی شام ہوئی تو مہمانی جان جو قریب ہی رہتی ہیں آجاتی ہیں۔ کیونکہ انہیں میرے ہاتھ کی چائے بہت پسند ہے۔ چائے کے ساتھ پکوانوں یا سموں سے بھی پیٹ کی خاطر تواضع کی جاتی ہے۔ پھر آہستہ آہستہ شام کے سامنے ڈھلنے لگتے ہیں تو مغرب کے فوراً بعد ہی روٹی پکاتی ہوں۔ اپا عشاء کی نماز پڑھنے کے بعد آتے ہیں تو امی کے ساتھ اوہرا اوہر کی باتوں میں مشغول اور میں اس دوران میں نو بجے سے پہلے پہلے ڈرامہ دیکھ لیتی ہوں۔ جوں ہی گھڑی نے نو بجائے لی وی لاؤنج میں دسترخوان لگتا ہے اور اپا خبریں سنتے ہیں ساتھ ہی ہم سب بھی۔

کھانے کے فوراً بعد میں کافی یا چائے لازمی پیتی ہوں۔ جھٹ پٹ چائے پانی، منگو اٹھانی اور اپنے کمرے میں۔ پھر شعاع ہوتا ہے، میں ہوتی ہوں اور کہانیوں کے ساتھ ہنسا کھیلتا رونا دھونتا۔ چلتا رہتا ہے۔ تال مزے کی بات۔

3 - جی ہاں۔ بہت سے کرداروں میں اپنی جھلک نظر آئی۔ عمیرہ احمد کے ناول "ایمان" امید اور محبت کی ایمان مجھ سے بہت ملتی ہے۔ بہت ہی حساس لڑکی ہوں، منہ پھٹ ہوں، مذاق مذاق میں اپنے دل کی



بندھن

صبا فیصل ہمارے فیصلہ

شہناز رشید

صبا فیصل کانام لیتے ہی ایک خوب صورت چہرہ نظروں کے سامنے آجاتا ہے۔ جو ماں بڑی بہن اور بھابھی کے رول بڑی مہارت سے ادا کرتی ہیں۔ صبا فیصل کافی وی سے رشتہ بہت پرانا ہے۔ نوجوانی کے دور سے وہ ٹی وی سے وابستہ ہیں۔ پہلے بحیثیت نیوز کاسٹر کے پھر بحیثیت اداکارہ کے۔

بندھن کے سلسلے میں اس بار ہمارا انتخاب یہی خوب صورت فنکارہ ہیں۔

”جی صبا فیصل! آپس میں؟ آج کل اسکرین پہ کچھ کم نظر آ رہی ہیں۔ وجہ؟“

”نہیں! ایسا تو نہیں ہے۔ مراۃ العروس کو ہی دیکھ لیں۔ ختم ہونے کے دو تین ماہ بعد ہی دوبارہ دکھایا جا رہا ہے اور کچھ اور سیریز بھی آن ایر ہیں۔ کبھی کبھی ایسا

ہوتا ہے کہ سارے تیار شدہ سیریز ایک ساتھ چلنا شروع ہو جاتے ہیں تو ایسا لگتا ہے کہ جیسے ہم ہی ہم ہیں اور جب گپ آجاتا ہے تو لگتا ہے کہ جیسے ہمارے پاس کام ہی نہیں ہے۔“

”آج کل کہاں قیام ہے آپ کا؟ کراچی میں یا لاہور میں؟“

”یہ تو چلتا ہی رہتا ہے۔ کبھی کراچی تو کبھی لاہور۔ ویسے جب کوئی خاص موقع یا تہوار ہوتا ہے تو پھر لاہور میں ہی ہوتی ہوں۔ کیونکہ لاہور میں میری فیملی ہے۔“

”آپ کو یقیناً ”اسکول کالج“ کے زمانے سے غیر نصابی سرگرمیوں میں حصہ لینے کا شوق ہو گا۔ تب ہی آپ اس فیلڈ میں آئیں؟“

”جی بالکل! آپ نے ٹھیک جج کیا اور زمانہ طالب علمی سے ہی میری خواہش تھی کہ میں کوئی ایسا کام کروں کہ میرا نام ہو اور میں عام لوگوں میں پہچانی جاؤں تو بس مجھے ٹی وی ہی ایک ایسا ذریعہ لگتا تھا کہ جہاں میں اپنی صلاحیتیں دکھا سکتی تھی۔ چنانچہ میں نے سب سے پہلے اناؤنسر کے لیے آڈیشن دیا اور کامیاب ہو گئی پھر دل چاہا کہ کچھ اور بھی کرنا چاہیے۔ نیوز ریڈر کے لیے آڈیشن دیا تو اس میں بھی کامیاب ہو گئی۔ تب میں نے اناؤنسر کی جاب چھوڑی اور نیوز کاسٹر بن گئی۔ پھر نیوز رپورٹر تک کا شوق آیا تو نیوز رپورٹر بن گئی اور اب اداکارہ ہوں۔“

”لگتا ہے شادی سے پہلے اس فیلڈ میں آئیں یا بعد میں؟“

”شادی سے بہت پہلے یوں سمجھیں کہ جب میٹرک میں تھی تو ٹی وی جوائن کر لیا تھا اور ساتھ ہی ساتھ پڑھائی بھی کرتی تھی۔ ٹی وی میں کام کرتے کرتے ہی گریجویشن کیا میں نے۔“

”اور شادی کب ہوئی؟ اور آپ کی پسند کو کتنا عمل دخل ہے؟“

”ماشاء اللہ تقریباً ”انتیس سال ہو گئے ہیں اور میرے تین بچے ہیں۔ ایک بیٹی اور دو بیٹے۔ میرے میاں جن کا نام فیصل سلیم ہے۔ وہ چونکہ میرے ماموں کے بیٹے ہیں تو ہم ایک دوسرے کو جانتے تھے ایک دوسرے کے لیے پسندیدگی بھی تھی۔ شاید والدین نے اس بات کو محسوس کیا یا پھر ہمارا جوڑنا ہوا تھا آسمانوں پر کہ دونوں گھروں کی رضا مندی سے ہمارا رشتہ ہو گیا۔“

”آج کل کا ماحول کافی آزاد ہے۔ آج کل تو خواہ رشتے داروں میں ہو شادی یا برادری سے باہر۔ لڑکے لڑکی کا ملنا اور پسند کرنا رواج بن گیا ہے۔ کیا آپ اس کے حق میں ہیں؟“

”میں اربن میچ اور والدین کے فیصلوں کو کبھی غلط نہیں کہوں گی۔ کیونکہ کچھ بھی ہو، ان کے فیصلے

ہمارے لیے ہر حال میں بہتر ہوتے ہیں۔ لیکن اب زمانہ پہلے جیسا نہیں رہا۔ اب ماحول بدل گیا ہے۔ سوچ بدل گئی ہے۔ اس لیے بہتر ہے کہ لڑکائی ضرور پہلے ایک دوسرے سے ملیں اور ایک دوسرے کے مزاج کو سمجھیں۔ آج کے دور میں یہ بہت ضروری ہے۔“

”پہلے زمانے میں جوائنٹ فیملی سسٹم ہوتا تھا تو سب کچھ ٹھیک رہتا تھا۔ مگر اب جوائنٹ فیملی کا رواج بہت کم ہو گیا ہے۔“

”یہ تو ہے۔ میں جب بیاہ کر آئی تھی تو جوائنٹ فیملی میں ہی آئی تھی اور تقریباً ”گیارہ سال جوائنٹ فیملی میں رہی اور بہت پیار محبت کے ساتھ ہمارا وقت گزرا۔ فیملی بھی زیادہ بڑی نہیں تھی۔ والدین ایک بھائی اور دو مندریں تھیں۔ اب تو واقعی جوائنٹ فیملی کا رواج کم ہوتا جا رہا ہے۔“

”شادی سے پہلے آپ اپنے کزن فیصل کو کتنا جانتی تھیں؟“

”شادی سے پہلے بھی فیصل کے ساتھ بہت دوستی اور بے تکلفی تھی۔ مگر بے تکلفی حدود میں رہ کر تھی۔ جس طرح کزنز میں دوستی ہوتی ہے اور شادی کے بعد تو ہم دوستوں کی طرح ہی رہے اور رہ رہے ہیں۔ ہم دونوں میں بہت اچھی انڈر اسٹینڈنگ ہے۔“

”آپ کے میاں صاحب آپ کے کام میں کبھی رکاوٹ بنے؟“

”بالکل نہیں۔ کبھی نہیں۔ بلکہ میں تو کہوں گی کہ شادی سے پہلے اپنے والدین کی رضامندی سے اس فیلڈ میں آئی اور شادی کے بعد اپنے شوہر کی رضامندی سے۔ شادی سے پہلے تو بہت کم وقت اس فیلڈ میں گزارا۔ زیادہ وقت تو میں نے شادی کے بعد گزارا ہے اور گزار رہی ہوں۔ حقیقت تو یہ ہے کہ اگر میرے میاں اجازت نہ دیتے تو میں نے کب کام کرنا تھا کیونکہ میں سمجھتی ہوں کہ اگر بیوی کو اپنے شوہر کی حمایت حاصل نہ ہو تو وہ کبھی کبھی کچھ نہیں کر سکتی۔“

”شوہر نے تو اجازت دی۔ مگر جوائنٹ فیملی میں رہ کر تو پھر سب کو دیکھنا پڑتا ہے سب کا خیال رکھنا پڑتا ہے؟“

”جی بالکل! ایسا ہے۔ مگر میری خوش قسمتی یہ تھی کہ مجھے بیاہ کر اپنے ماموں کے گھر ہی آنا تھا اور ہم سب میں آپس میں بہت سی بات چیت ہوتی تھی۔ لیکن یہ ایک میکے سے نکل کر دوسرے میکے میں آگئی تھی تو مجھے کوئی پریشانی نہیں ہوئی اور میرے سرال والے بہت ہی اچھے ہیں۔ انہوں نے مجھے روکا تو انہیں۔ تب ہی تو گاڑی اچھی چل رہی ہے۔“

”شادی دھوم سے ہوئی تھی؟ آپ نے خود انجوائے کیا تھا؟“

”جی بالکل۔ بہت دھوم دھام سے ہوئی تھی اور خود میں نے بھی بہت انجوائے کیا تھا۔ چونکہ ہم پنجابی ہیں تو آپ کو پتا ہی ہے کہ پنجابیوں میں کتنے مزے مزے کی رسمیں ہوتی ہیں تو میں نے بھی ساری مزے سے انجوائے کیں۔ کیونکہ میں کسی پرانے گھر تو جا نہیں رہی تھی۔ اپنے ماموں کے گھر ہی جاری تھی اس لیے کوئی ڈر خوف نہیں تھا۔“

”بے شک آپ اپنے ماموں کے گھر جاری تھیں۔ لیکن آج کے زمانے کی شادی اور گزرے وقت کی شادیوں میں بہت فرق ہوتا تھا۔ آج لڑکی خود ناچ رہی ہوتی ہے۔ جبکہ پہلے ایسا نہیں تھا؟“

”پہلے بہت شرم و حیا ہوتی تھی۔ اب ایسا نہیں ہے۔ بے شک میں نے رسمیں انجوائے کی تھیں۔ مگر ایسا نہیں تھا کہ میں اتنی گمن ہو گئی تھی کہ پتا ہی نہیں چل رہا تھا کہ دکن کون سی ہے۔ میں نے ساری رسمیں بیٹھ کر دیکھیں۔ مگر ناچ گانا نہیں کیا تھا۔“

”آپ نے کہا کہ ماموں کے گھر جاری تھی۔ اس لیے خوف ڈر نہیں تھا۔ مگر پھر بھی میکہ چھوڑتے وقت کیا احساسات تھے آپ کے؟“

”بھئی! آپ یقین کر کہ میرے تو آنسو ہی نہیں ہٹ رہے تھے۔ بہت زیادہ روئی تھی۔ کیونکہ میں گھر میں اپنے والدین اور بھائیوں کے بہت قریب تھی۔

میرے لیے رخصتی کا وقت بہت مشکل وقت تھا۔ لفظوں میں بیان نہیں کر سکتی۔“

”صبا! آپ اب بھی بہت چارنگ ہیں تو تو جوانی میں تو بہت ہی خوب صورت ہوں گی۔ دکن بن کر کیسی لگ رہی تھیں؟“

”اپنے منہ سے تعریف ہو جائے گی۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ میں بہت خوب صورت لگ رہی تھی۔ میرا میک اپ بھی بہت خوب صورت کیا گیا تھا اور میرا ڈریس بھی بہت خوب صورت تھا۔ سچ! میں بہت حسین لگ رہی تھی۔“

”سسرال کتنا بھی اچھا ہو، لڑکیوں کو اپنے میکے کا بڑا مان ہوتا ہے۔ کچھ رعب ڈالا اپنے میکے کا اور کبھی ناراض ہو کر میکے گئیں؟“

”ہاں! سسرال میں میکے کا مان تو ہوتا ہے لڑکی کو۔ سوچ لیتا تھا جیسے کہ وہ جس گھر میں بیاہ کر جا رہی ہے۔ اب وہ ہی اس کا اصلی گھر ہے اور اسے اپنے گھر سے اپنے اخلاق سے سسرال والوں کو اپنا بنانا ہے۔ میکے میں تو ہم سہماں ہوتی ہیں۔ جہاں ہم نے اٹھارہ یا بیس سال گزارے ہوتے ہیں۔ مگر مجھے لڑکیوں کی یہ بات بری لگتی ہے کہ وہ چھوٹی چھوٹی بات پر روٹھ کر میکے چلی جاتی ہیں۔“

”شادی کو کامیاب بنانے کے کیا گام ہیں؟“

”کھپڑ وائر، انڈر اسٹینڈنگ، بہت ضروری ہے۔ لڑائیاں تو ہر گھر میں ہوتی ہیں تو کیا ہم گھر چھوڑ کر چلے جاتے ہیں؟ سسرال بھی ہمارا گھر ہے۔ اگر اونچ نیچ ہوئی ہے تو ہمیں وہاں رہ کر ہی سارے حالات کو بہتر کرنا چاہیے۔ کہ بات بات پر روٹھ کر میکے جانا چاہیے۔“

”اچھا تو لڑائی تو آپ کی بھی ہوتی ہوگی۔ پتلی لڑائی یاد ہے؟“

”بے ساختہ بنتے ہوئے۔“

”تبی رانی بات آپ نے پوچھ لی۔ یہ پوچھیں کہ آخری لڑائی کب اور کس بات پر ہوئی تھی۔ جب بھی ہم دونوں میں لڑائی ہوتی ہے صدمہ میں پہل میں ہی کرتی ہوں۔“

”غصے کے تیز ہیں فیصل کیا؟ اچھی اور بری عادتیں

پتائیں؟“

”جی! فیصل غصے کے تیز ہیں۔ جبکہ میرا غصہ بہت کم ہے۔ بلکہ نہ ہونے کے برابر ہے۔ بری عادت تو غصے والی ہے اور اچھی عادت یہ ہے کہ بہت خیال رکھتے ہیں۔ بہت رومانٹک ہیں۔ بہت سی خوبیاں ہیں فیصل میں۔“

”آپ نے بتایا کہ آپ فیصل کو بہت حسین لگتی ہیں۔ گویا دل کھول کر تعریف کرتے ہیں؟“

”جی! دل کھول کر تعریف کرتے ہیں۔ لیکن مزے کی بات یہ کہ میں انہیں میک اپ میں حسین نہیں لگتی بلکہ ان کا دل چاہتا ہے کہ میں سادہ رہوں۔ بقول ان کے کہ میں انہیں گھر میں ایک گھریلو عورت کے طے میں زیادہ اچھی لگتی ہوں۔ ان کا کہنا تو یہ بھی ہے کہ سچے بننے کے لیے وی کافی ہے۔“

”اچھا یہ بتائیں کہ منہ دکھائی میں کیا ملا تھا؟“

”منہ دکھائی میں اللہ کے نام کالا کٹ تھا۔ سونے کی موٹی سی پچن میں اللہ لکھا تھا اور قرآن پڑھا ہوا تھا۔ بہت خوب صورت گفت تھا۔“

”بہنی مون کہاں منایا؟“

”کہیں نہیں۔ کراچی کی سڑکوں پر موٹر بائیک پہ گھومتے تھے اور وہی ہمارا اپنی مون تھا۔“

”آپ نے بتایا کہ آپ انہیں گھر کے چلے میں اچھی لگتی ہیں تو آپ کتنی گھریلو ہیں؟“

”بہت زیادہ گھریلو ہوں۔ اگر آپ کے کہنے کا مقصد ہے کہ مجھے گھرداری کتنی آتی ہے تو اللہ کا بڑا شکر ہے کہ ماہر ہوں گھرداری میں۔ سب کچھ پکا لیتی ہوں اور بہت اچھا پکا لیتی ہوں۔ سلائی کڑھائی میں ماہر ہوں۔ جب سب کچھ پھونٹتے تھے تو ان کے کپڑے بھی خود ہی سلائی کرتی تھی۔ اور اپنے کپڑے بھی خود ہی سلائی کرتی تھی۔“

”مہنگی شاپنگ کرتی ہیں یا بار گھنٹنگ کرتی ہیں؟“

”بار گھنٹنگ کرتی ہوں۔ مگر میں کچھ سی نہیں دکھا سکتی۔ کیونکہ میں اس فیلڈ میں ہوں اور مجھے ہر

وقت چیزوں کی ضرورت رہتی ہے۔ ایک گھریلو عورت تو چند چیزوں اور جوتیوں میں گزارہ کر سکتی ہے۔ مگر ایک شو بیز کی عورت ایسا نہیں کر سکتی اس لیے میں اگر خرچ کرتی ہوں تو بچت بھی ضرور کرتی ہوں۔“

”مطلب آپ فیلڈ میں ہیں تو ڈیر انٹو چیزوں کو اہمیت دیتی ہیں؟“

”نہیں! ایسا کچھ نہیں ہے کہ مجھے ڈیر انٹو چیزیں ہی چاہئیں۔ ڈیر انٹو چیزیں بہت مہنگی ہوتی ہیں۔ مجھے اچھی چیز چاہیے ہوتی ہے۔ خواہ وہ چار سو کی ہو یا اس سے زیادہ۔ اور اگر کوئی میری چیز دیکھ کے کہتا ہے کہ یہ ڈریس اچھا لگ رہا ہے یا یہ جو نا اچھا لگ رہا ہے تو میں اس کی صحیح قیمت بتا دیتی ہوں۔ یہ نہیں کہتی کہ یہ بہت مہنگا ہے۔“

”شادی کے بعد کبھی مشکل وقت دیکھا؟“

”مشکل وقت دیکھا۔ مگر ایسا نہیں کہ خدا نخواستہ اس کی وجہ سے کوئی لڑائی جھگڑے ہوئے ہوں۔ جب شادی ہوئی تو فیصل جاب کرتے تھے۔ ان کی جدوجہد کا پیڑ پڑھا وہ اپنی تنخواہ مجھے لاکر دیتے تھے اور میں بہت سنبھال کر ان کو رخصتی تھی اور بہت خیال سے خرچ کرتی تھی۔ پھر جب دوسری تنخواہ پر پہلی تنخواہ کی بچت دیکھتی تھی تو اچھی خاصی ہوتی ہوئی تھی۔ اگر عورت سلیقہ مند ہوتی ہے تو ہر حال میں گزارہ کر لیتی ہے۔ جب پیسہ کم تھا تو اسی حساب سے خرچ کرتی تھی اور اب پیسہ زیادہ ہے تو اسے اسی حساب سے خرچ کرتی ہوں۔ مگر بچت ہر حال میں کرتی ہوں۔“

”تخفے کے معاملے میں سر پرانے دیتے ہیں یا خود شاپنگ کراتے ہیں اور پہلے سے بتا دیتے ہیں؟“

”فیصل نے جب مجھے کچھ دینا ہوتا ہے تو تحفہ خرید کر نہیں دیتے۔ بلکہ مجھے کیش دے دیتے ہیں کہ اپنی پسند سے خرید لوں۔ اور جب ہم ایک ساتھ شاپنگ پہ جاتے ہیں تو پھر سارا خرچ یہ خود ہی کرتے ہیں۔“



تصنیف: شاکر

کیمیائیں

پہلی نظر

پہلی نظر کی محبت پر بہت کم لوگ یقین رکھتے ہیں۔ اکثر لوگوں کے خیال میں پہلی نظر میں صرف پسندیدگی ہی ہوتی ہے۔ پھر محبت تو آہستہ آہستہ چند ملاقاتوں کے بعد ہی جنم لیتی ہے۔ مگر حجاب آپچھ لوگ ایسے بھی ہیں کہ جن کے نزدیک پہلی نظر پر ہی سب کچھ ہوتی ہے۔ وہ کسی پر پہلی نظر پڑتے ہی اسے زندگی بھر کا ساتھی بنانے کا فیصلہ کر بیٹھتے ہیں۔

معروف اہنکو پرسن اور ماڈل کرن خان اپنی ایک دوست کے ساتھ ریٹورنٹ میں لہجہ کرتے نظر آئے۔ انہیں وہاں بیٹھے تھوڑی دیر ہی ہوئی تھی کہ انہیں محسوس ہوا، کوئی انہیں گھور رہا ہے۔ انہوں نے اوھر

اوپر دیکھا تو کچھ فاصلے پر بیٹھے ہوئے ایک شخص کو مسلسل اپنی طرف متوجہ پایا۔ کرن کو برا لگا۔ کرن کی دوست کو ان صاحب کی نظریں کچھ میٹھی میٹھی سی محسوس ہوئیں۔ انہوں نے کرن کی توجہ اس طرف دلائی تو کرن نے انہیں جھاڑ دیا اور انہیں وہاں سے اٹھنے کو کہا۔ لہجہ کے بعد دونوں کا شاپنگ کار وگرام تھا۔ لہذا دونوں اٹھ کر ایک قریبی شاپنگ سینٹر چلی گئیں۔ انہوں نے دیکھا کہ وہ صاحب بھی اٹھ کر ان کے پیچھے آگئے ہیں۔ کرن نے شاپنگ سینٹر پہنچ کر پارکنگ ایریا میں گاڑی پارک کی اور خود دوست کے ساتھ اندر چلی گئیں۔

تقریباً دو گھنٹے کے بعد وہ شاپنگ کر کے لوٹیں تو

انہوں نے ان صاحب کو کرن کی گاڑی سے نیک لگائے کھڑا پایا۔ انہیں دیکھ کر کرن تو تھوڑی دیر پر ہی ٹھہر گئیں۔ تاہم ان کی دوست نے ان صاحب سے پوچھا کہ ”کیا بات ہے؟“

ان صاحب نے بتایا کہ ”مجھے آپ کی دوست پسند آئی ہیں۔ مجھے ان سے شادی کرنی ہے۔“

پھر انہوں نے کرن کی دوست کو اپنا رابطہ کارڈ دیا کہ وہ اس پر انہیں کرن کا جواب بتادیں۔ کرن کی دوست نے کارڈ لے لیا اور بعد میں کرن کے ”نہ نہ“ کرنے

کے باوجود علی تاہر کو فون کر کے کرن کی تفصیلات اور رابطہ نمبر دے دیا۔ علی صاحب نے کرن کو فون کرنے شروع کر دیے۔ مگر کرن پھر بھی نہ مائیں۔ علی صاحب نے اپنی والدہ کو کرن کا پروگرام دکھایا اور کہا کہ ”میں اسے آپ کی ہو بنانا چاہتا ہوں۔ مگر یہ نہیں مانتی۔ اب اسے منانا آپ کا کام ہے۔“

پھر جب علی صاحب کی والدہ نے کرن سے بات کی تو دونوں کی فورا کی دوستی ہو گئی۔ کرن نے سوچا کہ یہ صاحب باقاعدہ فیملی والے ہیں۔ اس لیے ان سے رشتہ کیا جاسکتا ہے۔ یوں علی صاحب کی والدہ کی وجہ سے کرن نے ہاں کر دی۔ علی صاحب کو کرن کی ”ہاں“ پر اعتبار نہیں تھا یا شاید کچھ زیادہ ہی جلدی تھی کہ انہوں نے جھٹ نکاح بھی کر ڈالا۔ کرن کو اتنی مہلت بھی نہ دی کہ وہ نکاح کے لیے کوئی جوڑا خرید سکیں یا اپنی دوستوں ہی کو مدعو کر سکیں۔

(کرن جی! آپ کو ڈھیروں مبارک باد اور زندگی کا سفر خوش گوار رہنے کی دعائیں۔ قابل تعریف بات یہ ہے کہ آپ نے شوہر سے وابستہ ہونے کے باوجود فیصلہ کرتے وقت فیملی اور رشتوں کو اہمیت دی۔ ورنہ اب تو ہمارے معاشرے میں بد قسمتی سے فیملی اور رشتوں کو دیوار سے لگا دینے کا چلن عام ہو گیا ہے۔)

کچھ اوھر اوھر سے

مشرف صاحب کے وکیل اور معتقد خاص احمد رضا

قصوری نے دلیل دی ہے کہ جنرل صاحب نے خود تو کسی کو قتل نہیں کیا۔ احمد رضا قصوری صاحب کو یہ دلیل اس وقت یاد نہ آئی۔ جب انہوں نے اپنے والد صاحب کے قتل کی ایف آئی آر میں وزیراعظم ذوالفقار علی بھٹو کو نامزد کر کے انہیں پھانسی کی سزا دلوائی۔ اس وقت عدالت میں یہ کیوں نہیں کہا کہ بھٹو نے اپنے ہاتھ سے گولی نہیں چلائی۔

(اظہر بالشمی۔ بین السطور)

☆ دکھ کی بات ہے کہ جن بہادر پولیس افسران نے کراچی آپریشن میں حصہ لیا تھا۔ انہیں پرویز مشرف کے دور میں چن چن کر قتل کیا گیا اور ریاست چپ چاپ ان کے قتل ہونے پر خوشیاں مناتی رہی۔ اس کے بعد کون ریاست کے ساتھ کھڑا ہو کر شہریوں کو بچانے کی کوشش کرنا۔

(روٹ کلاس۔ راز و نیاز)

☆ کراچی میں 19 ہزار اسلحہ سے بھرے کنٹینر غائب ہونے کا مسئلہ کئی سال پرانا ہے۔ اسلحہ کے کنٹینر سابق وزیر پورٹ اینڈ شپنگ کے دور میں آئے۔ اب یہی اسلحہ کراچی میں استعمال ہو رہا ہے اور شہر جل رہا ہے۔

(ڈی جی رینجرسندھ جنرل رضوان کاندھلوی میں بیان) ☆ میڈیا کے سارے ارسطو اور سقراط یک زبان ہو کر کہے جا رہے ہیں کہ اگر شاہ رخ کو پھانسی ہو جاتی تو قاتلوں کے لیے عبرت کا سامان ہو جاتا۔ عبرت...؟ کس کے لیے عبرت...؟ ان کے لیے جو چیف جسٹس اور آرمی چیف کے ہوتے ہوئے شہر کے پتیلوں بچ لائیں گرا رہے ہوتے ہیں۔ ان کے لیے عبرت جو تمام گواہوں اور ثبوتوں کی موجودگی میں رہا ہو جاتے ہیں؟

(محمد رفور عالم۔ حرف آزاد)

قلعہ فتح دولت

حضرت زینب بنت علی رضی اللہ عنہا

تاریخ میں جب بھی شہدائے کریم کا تذکرہ آتا ہے تو زینب بنت علی رضی اللہ عنہا کے حالات و واقعات بھی سامنے آجاتے ہیں۔ زینب بنت علی رضی اللہ عنہا آنحضور کی نواسی، شہر خدا علی المرتضیٰ اور خاتون جنت فاطمہ الزہراء کی نور نظر اور شہید کریم امام حسین بن علی رضی اللہ عنہما کی بہادر اور جرات مند بہن تھیں۔ یہی نہیں بلکہ وہ عون اور محمد کی والدہ بھی ہیں جو اپنے عظیم ماموں حسین بن علی رضی اللہ عنہما کے ساتھ میدانِ کریم میں خلعت شہادت سے سرفراز ہوئے۔

حضرت زینب کی ولادت 4 ہجری میں ہوئی۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی رحلت کے وقت ان کی عمر 6 سال سے کچھ زائد تھی۔

حضرت زینب کی ولادت کے وقت آپ صلی اللہ علیہ وسلم حجاز کے لیے مدینہ سے باہر تشریف لے گئے تھے جب مدینہ منورہ پہنچے تو آپ نے اپنی نومولود نواسی کو گود میں اٹھالیا۔ لعاب مبارک اس کے منہ میں ڈالا اور مجبور چبا کر کھلائی۔ پھر فرمایا۔

”یہ مجھے بہت پیاری لگ رہی ہے۔ یہ اپنی نانی خدیجہ سے بہت مشابہت رکھتی ہے۔“

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی بڑی بیٹی کے نام پر اپنی اس نواسی کا نام بھی زینب رکھا۔ 6 سال کی عمر میں حضرت زینب نے اپنے والدین کے علاوہ اپنے نانا جان سے اس قدر تربیت حاصل کر لی تھی کہ اپنی بے مثال ذہانت و وفائت کی وجہ سے وہ اسلام کے بنیادی عقائد و

ان سب کے بعد جس سے آنکھیں ٹھنڈی ہوتی تھیں اور جو میرے دل کا قرار تھا، اب وہ بھی مجھ سے چھین جائے گا۔ اے کاش میں اس کے بدلے میں اپنی جان قربان کر دیتی اور اسے زندہ نہ پہنچتا۔“

ان جذبات میں کوئی نقص ہے، نہ کسی قسم کی غیر فطری بات۔ یہ فطرت انسانی کے عین مطابق ہیں اور ان میں کوئی مبالغہ بھی نہیں۔

استقامت کے کوہ گراں

اس موقع پر حضرت امام حسینؑ نے عریمت کا پہاڑ بن کر اپنی بہن کو نہایت بلخ انداز اور پر عزم الفاظ میں صبر کی تلقین فرمائی۔ انہوں نے فرمایا۔

”اے میری بہن! صبر کو اپنی ڈھال بناؤ۔ اللہ سے لو لگاؤ۔ اللہ کے ذکر سے تسکین حاصل ہوتی ہے۔ اللہ کو بچا ہے باقی ساری کائنات کا مقدر فنا ہے۔ ساری کائنات سے اعلا و ارفع اور مقدس ہستی ہمارے نانا جان کی تھی۔ (وہ بھی دنیا میں ہمیشہ نہیں رہے) ہمیں ان ہی کے اسوہ حسنہ کی پیروی کرنا ہے۔ اے میری پیاری بہن! میری بات سنو۔ میں تمہیں اللہ کا واسطہ دیتا ہوں کہ میں راہ حق میں شہادت چاؤں تو گریبان نہ پھاؤں، نہ بین کرنا نہ چہرے اور بالوں کو نوچنا۔“

میدانِ کریم کا معرکہ گرم ہوا تو سب سے پہلے حضرت زینبؑ کے نو عمر بیٹے عون اور محمد بن عبد اللہ بزمیدی فوجوں کے مقابلے پر نکلے۔ وہ بڑی بہادری سے لڑے اور جام شہادت نوش کیا۔ ان کے دادا جعفر اور والد عبد اللہ بن جعفر بھی شیر دل تھے اور وہ خود تو شیر خدا کے نواسے تھے۔

واقعات کریمہ کا دل و ذوق واقعہ جس طرح رونما ہوا۔ وہ ایک المناک تاریخ ہے۔ شہادت اہل بیت اور امام حسین رضی اللہ عنہ کے بعد صرف خواتین اور بچے ہی بچے تھے۔ ان کے خاندان اور قافلے کی خواتین کو قیدی بنایا گیا۔ پورے قافلے میں سے صرف آپ کے ایک نو عمر بیٹے علی بن حسین المعروف زین العابدین جو

شدید بیمار تھے، بچ پائے۔ کچھ بد بختوں نے زین العابدین پر ہتھیار اٹھانا چاہے، مگر حضرت زینب ان کے سامنے کھڑی ہو گئیں اور فرمایا۔

”خدا کی قسم جب تک میں زندہ ہوں، میرے پیارے بچے کو کوئی قتل نہیں کر سکتا۔“

حضرت زینبؑ نے غمِ عالم کے اس موقع پر اپنے نانا محبوب خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی روح کو خطاب کیا اور میدانِ جنگ کا دردناک نقشہ کھینچا، جہاں اہل بیت کے لاشے بکھرے پڑے تھے اور جہاں آپ کے محبوب نواسے کا بے سرجسم پڑا تھا۔ بس پھر کیا تھا دشمن اپنی دشمنی کے باوجود بے ساختہ رونے لگے۔

شیر خدا کی شیر دل بیٹی

یہ سارے مناظر دل و فگار تھے۔ مگر اگلی منزل میں مشکل تر تھیں۔ قافلہ اہل بیت کو بزمید کے دربار میں لے جانے کے لیے کریم سے دمشق کی جانب سفر شروع ہوا تو بزمیدی فوجوں کے حصار میں اسیران اہل بیت کو پہلے کوفے کے ظالم گورنر عبید اللہ بن زیاد کے دربار میں پیش کیا گیا۔ قافلے کا گزر کوفہ کے بازاروں میں سے ہوا تو بے وفا کوفی ہزاروں کی تعداد میں اس منظر کو دیکھنے کے لیے گھروں سے نکل آئے۔ اس موقع پر حضرت زینبؑ سے کوفیوں کی عمد شکنی اور غدار پر خاموش نہ رہا گیا۔ انہوں نے ان کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا۔

”اے دھوکے باز! بد عمدی کرنے والو! اللہ تمہیں کبھی سکون عطا نہ کرے۔ تم نے میرے بھائی کے ساتھ جو غدار کی کی اس نے ثابت کر دیا کہ تمہارے خمیر میں خیر نہیں۔ تم خوشامدی اور بزدل ہو۔ نواسہ رسول کے قتل میں تم بالواسطہ شریک ہو۔ تم نے بیعت کر کے توڑ دی اور حمایت کا اعلان کر کے پیٹھ پھیر گئے۔ یاد رکھو تم اللہ کے قہر سے نہ بچ سکو گے۔“

دمشق پہنچنے سے پہلے کوفہ کے گورنر عبید اللہ بن زیاد نے کوفہ میں دربار منعقد کیا اور اسیران کریم اس

کے سامنے پیش کیے گئے۔

بد بخت عبید اللہ بن زیاد نے اس مصیبت زدہ اور غم سے چور خانوادہ رسول کے قافلے کو اذیت پہنچانے کے لیے بہت بے ہودگی اور بیاہ گوئی کا مظاہرہ کیا۔ اس نے جو الفاظ کہے وہ الفاظ تاریخ کے صفحات میں خود تاریخ کے لیے اذیت کا باعث ہیں۔

شیر خدا کی بیٹی اس دہشت گردی کے عالم میں بھی بے خوف کلمہ حق بلند کرتے ہوئے بولیں۔

”تعریف اور حمد و شکر ہے اس ہستی کے لیے جس نے اپنے محبوب رسول کے ذریعے ہمیں عزت بخشی۔ ان شاء اللہ فاسق رسوا اور ذلیل ہوں گے اور ان کے نظریات لعنت زدہ قرار پائیں گے۔“ یہ گفتگو بڑی طویل تھی۔ عبید اللہ بن زیاد جب زچ ہو گیا تو اس نے علی بن حسین (امام زین العابدین) کی طرف اشارہ کر کے کہا۔ ”اس لڑکے کو کیوں قتل نہیں کیا گیا؟ اسے میرے سامنے قتل کر دیا جائے۔“

حضرت زینبؓ اپنے جیتے سے لپٹ گئیں اور فرمایا۔ ”پہلے مجھے قتل کرو پھر اسے قتل کرنا۔“

کوفہ سے شام روانگی

آخر ابن زیاد نے اپنا فیصلہ بدل لیا اور یہ قافلہ کوفہ سے شام کی طرف سرکاری دستوں کے محاصرے میں روانہ کر دیا گیا۔ کئی دنوں کی مسافت کے بعد یہ مظلوم یزید کے دربار میں پیش کیے گئے۔ نواسہ رسول کا مبارک سر جسے آنحضور ہمارے بوسہ دیا کرتے تھے۔ نیزے کی آلی پر رویا ہوا تھا۔ یزید کے دربار میں ان مظلوموں کو پیش کیا گیا تو اس نے امام کا سر دیکھ کر کہا کہ میں نے اسے نیزے پر پروئے کا حکم نہیں دیا تھا۔

یہاں بھی یزید کے ساتھ جو مکالمہ ہوا، اس میں حضرت زینبؓ نے کمال حکمت و دانش اور جرات و بہادری کے ساتھ اس کے تمام اعتراضات و خرافات کا بھرپور جواب دیا۔ یزید کے دربار میں حضرت زینبؓ نے ایک مؤثر اور دردناک خطاب فرمایا۔ اس میں

انہوں نے یزید کو باور کرایا کہ اپنے زعم میں وہ سمجھ رہا ہے کہ اسے کامیابی مل گی اور اہل بیت سرنگوں ہو گئے، مگر حقیقت میں اہل بیت کا کوئی نقصان نہیں ہوا، بلکہ یزید اور اس کے پورے ٹولے نے اپنے آپ کو تباہ و برباد کر لیا ہے۔

قل حسین اصل میں مرگ یزید ہے اسلام زندہ ہوتا ہے ہر کرہا کے بعد

سفر جانب مدینہ

کچھ دن یزید نے ان لوگوں کو دمشق میں ٹھہرائے رکھا، پھر اس نے حکم دیا کہ ان خواتین کو سوار یوں پر سوار کیا جائے اور مدینہ تک بحفاظت پہنچایا جائے۔ یزید نے صحابی رسول حضرت نعمان بن بشیر انصاری کو جو دمشق میں مقیم تھے، ذمہ داری سونپی کہ وہ اپنی نگرانی میں قافلے کو مدینہ تک پہنچائیں۔ اونٹوں پر حمل رکھے گئے تھے۔ حضرت زینبؓ نے فرمایا کہ ”محملوں پر سیاہ چادریں ڈال دی جائیں“ اس لیے کہ محملوں میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بیٹیاں سوار تھیں اور سفر کیا تھا۔ ان کو یہ سفر بروے میں کرنا تھا کہ ان پر کسی کی نظر نہ پڑے۔ یہ خاتون جنت کی بیٹیاں

تھیں جنہوں نے فرمایا تھا کہ ان کے جنازے کے وقت چشم فلک بھی ان کے نقین کو نہ دیکھ سکے۔ واقعات کر بلا کی جبریتہ منورہ پہنچ چکی تھی۔

جب یہ قافلہ مدینہ کے قریب پہنچا تو مدینہ میں موجود صحابہ و تابعین اور اہل مدینہ بڑی تعداد میں ان کے استقبال کے لیے شہر سے باہر نکلے مشہور صحابی حضرت جابر بن عبد اللہ انصاری سب سے آگے آگے تھے اور ان کی آنکھوں سے آنسو رواں تھے۔ وہ فرما رہے تھے کہ

”یہ قوم اپنے نبی کو روز قیامت کی مانند دکھاے گی۔“ اپنے غم خوار رشتے داروں اور نانا حضور کے جانثار صحابہ کو دیکھ کر۔ حضرت زینبؓ بھی رونے لگیں۔

حضرت جابر کو خطاب کر کے کہا۔

”اے میرے نانا کے صحابی! آپ نے جس بچے کو اپنے ہاتھوں سے اپنے آقا کے مبارک کندھوں پر چڑھی بار بٹھایا تھا اس کا جسد اطہر گودوں کے سبوں سے پچلا گیا اس کا سر نیزے کی نوک کی زینت بن گیا۔“

اور اس کے ساتھ ہی حضرت زینبؓ ربے ہوشی طاری ہو گئی اور وہ گر گئیں۔ یہ پہلا موقع تھا کہ جب حضرت زینبؓ قرط غم سے غش کھا گئیں۔ انہیں اٹھا کر ان کے گھر لایا گیا۔ پورے مدینہ پر غم کی چادر تن گئی اور ہر گھر میں بڑے چھوٹے مرد و خواتین سب ہی زار و قطار روئے۔ اگلے دن حضرت زینبؓ صبح نہویں میں تشریف لے گئیں۔ آنحضور کے روضہ مبارک پر حاضر ہوئیں اور صلوٰۃ و سلام عرض کرنے کے بعد اس پورے منظر کو بیان کیا۔ جس سے آل رسول دوچار ہوئی تھی۔ اس موقع پر بھی سب لوگ رونے لگے، مگر حضرت زینبؓ نے آج اسی انداز میں لوگوں کو صبر کی تلقین کی جس انداز میں شب کر بلا میں ان کے محبوب بھائی نے انہیں تلقین فرمائی تھی۔

عظمت ہی عظمت

بنات لعل بیت کا ایک واقعہ بعض مورخین نے حضرت زینبؓ کی سیرت میں بیان کیا ہے۔ جو اہل بیت کی عظمتوں کو مزید واضح کرتا ہے۔ حضرت زینبؓ اور ان کی دوسری بہنوں نے صحابی رسول حضرت نعمان بن بشیر کو بلایا۔ ان کے حسن سلوک اور غم خواری کا شکریہ ادا کیا اور دوران سفر ان کی خدمت کے اعتراف کے طور پر اپنی چوڑیاں اتار کر پیش کر دیں۔ ساتھ ہی یہ بھی کہا کہ ”اس وقت ہمارے پاس کچھ اور ہوتا تو وہ بھی آپ کی خدمت میں پیش کر دیا جاتا۔“ حضرت نعمان بن بشیر یہ بات سن کر زار و قطار روئے اور کہا۔

”اے بنات رسول صلی اللہ علیہ وسلم! اللہ کی قسم میں تو آپ کی خدمت کو اپنے لیے توشہ آخرت سمجھتا ہوں۔ اگر میں نے دنیا کے لالچ میں یہ کام کیا ہو تو مجھے

قیامت کو کیا اجر ملے گا۔ اللہ آپ کے غموں کا مداوا فرمائے۔ آپ اپنی چوڑیاں اپنے پاس رکھیں۔“

قافلہ کر بلا اور حضرت زینبؓ کی یہ داستان خونچکاں طویل ہے۔ واقعات اتنے اندونماک ہیں کہ انسان کو ہلا کر رکھ دیتے ہیں۔ امت مسلمہ کا الیہ دیکھیے کہ خانوادہ رسول کے ساتھ یہ ظلم ڈھلانے والے آسی رسول کا کلمہ پڑھتے تھے۔

(بہ شکریہ معارف اسلامی لاہور)

ادارہ خواتین ڈائجسٹ کی طرف سے بہنوں کے لیے خوبصورت ناول

کتاب کا نام	مصنفہ	قیمت
بہادول	آمنہ دیش	500/-
دور دوم	راحت جبین	750/-
زنگی اک روشتی	رخسانہ کارعدنان	500/-
خوشبو کا کوئی گھر نہیں	رخسانہ کارعدنان	200/-
شہر دل کے دروازے	شازیہ چوہدری	500/-
تیرے نام کی شہرت	شازیہ چوہدری	250/-
دل ایک شہر چوڑا	آمینہ مرزا	450/-
آنکھوں کا شہر	قائزہ افتخار	500/-
بھول بھلیاں تیری بھلیاں	قائزہ افتخار	600/-
پھلاں دے رنگ کا لے	قائزہ افتخار	250/-
یہ بھلاں یہ چھپا رہے	قائزہ افتخار	300/-
صحن سے عورت	فرال عزیز	200/-
دل اُسے ڈھونڈ لایا	آمینہ رزاقی	350/-
بکھرنا چاہیں خواب	آمینہ رزاقی	200/-

ناول نگاران کے لئے کتاب ڈاک فرم - 30/ 30 روپے
مکتبہ عمران ڈائجسٹ - 37 اردو بازار کراچی۔
فون نمبر 32216361



موم کے پیکوان خالہ جیلانی

فالودہ

اجزا :

دودھ
لال شربت
رنکین سویاں
جیلی
پتے بادام
انناس کے ٹکڑے
چینی
وینا آکس کریم

ایک کلو
آدھا کپ
ایک کپ
آدھا پیکٹ
دو کھانے کے چمچے
ایک کپ
آدھا کپ
حسب ضرورت

ترکیب :

دودھ کو پکا کر تین یا دو کر لیں، پھر چینی ڈال کر ٹھنڈا کر لیں اور لال شربت کس کر کے فریزر میں رکھ دیں۔ سویاں ابل لیں۔ بادام پتے کتر لیں۔ جیلی جھا کر چھوٹے چھوٹے چوکور ٹکڑے کر لیں۔ گلاسوں میں پہلے سویاں اور — انناس کے ٹکڑے ڈالیں پھر ٹھنڈا دودھ، تین بڑے چمچے آکس کریم کے ڈالیں۔ آخر میں سب سے اوپر بادام پتے چھڑک کر ٹھنڈا ٹھنڈا پیش کریں۔

نوڈلز کباب

اجزا :

چاول
لسن اور ک پیسٹ
چینی
کس خشک میوے
پھول گو بھی
پھلیاں
گاجر
آلو

ایک کلو
دو کھانے کے چمچے
دھانی کپ
چار کھانے کے چمچے
ایک کپ
ایک عدد
ایک عدد
دو عدد

نورتن پلاؤ

ترکیب :

گوشت میں لسن اور ک پیسٹ، ہلدی، مرچ اور نمک ڈال کر گلائیں۔ الگ کڑائی میں تیل گرم کر کے گوشت اور ایلے ہوئے آلو ڈال کر فرانی کر لیں ٹھنڈا کر کے میٹھ کر لیں (پینٹا نہیں ہے) اب اس میں سویا ساس، چلی ساس، اچینو موتو، لیموں کارس، پیسی کالی مرچ اور نوڈلز ڈال کر مکس کریں اور کسی بھی شیب میں کباب بنالیں۔ اینڈول میں ڈبو کر ڈیل روٹی کا چورا لگائیں اور تھوڑی دیر فرنی میں رکھنے کے بعد گھرے تیل میں تلیں اور کچھپ کے ساتھ پیش کریں۔

اجزا :

ایلے ہوئے نوڈلز
گوشت
اینڈول
آلو
لیموں کارس
سویا ساس
ڈیل روٹی کا چورا
لسن اور ک پیسٹ
ہلدی / سرخ مرچ
نمک
تیل
ترکیب :

ایک پیکٹ
آدھا کلو
دو عدد
ایک عدد
دو کھانے کے چمچے
ایک کھانے کا چمچ
دو کپ
دو کھانے کے چمچے
آدھا آدھ چائے کا چمچ
حسب ذائقہ
حسب ضرورت

بے لی کارن
فوڈلر
چھوٹی الائچی
تیز پات
نمک
تیل

آدھا کپ
ایک ایک چمکی
چار عدد
ایک بڑا پتا
حسب ذائقہ
حسب ضرورت

تیل گرم کر کے لونگ، الائچی، تیز پات، زیرہ اور لسن اور ک پیسٹ ڈال کر بھوئیں، پھر چوکور کئی گاجر، اہلی ہوئی پھلیاں، پھول گو بھی، آلو اور بے لی کارن مکس کریں۔ اس کے بعد چینی اور نمک ڈال کر ایلے دیں جاول ڈال کر درمیانی آج پر پکائیں۔ پانی خشک ہو جائے تو ہلکے ہاتھ سے مکس کر کے فوڈلر (سرخ، سبز، زرد) الگ الگ چھڑک دیں۔ میوہ ڈالیں اور دم پر رکھ دیں۔ سلاؤ اور رانتھے کے ساتھ گرم گرم پیش کریں۔

کومبر پیف رول

قیمہ
تھیرے
لسن پیسٹ
پانڈ
نماؤ کچھپ
کئی سرخ مرچ
پراٹھے
کریم
نمک
تیل

ایک پاد
دو عدد
ایک چائے کا چمچ
ایک عدد
آدھا کپ
ایک چائے کا چمچ
چار عدد
حسب ضرورت
حسب ذائقہ
حسب ذائقہ

قیمہ پانڈ چوب کر کے سنہری کریں پھر لسن پیسٹ اور قیمتہ ڈال کر مکس کریں۔ گل جائے تو نمک، نماؤ کچھپ اور کئی مرچ ڈال کر بھون لیں۔ پراٹھے پر قیمتہ، کریم اور ایک کس کیا ہوا کھیرا رکھ کر رول کریں اور ٹوٹھ پک (تیلی) لگا کر کنارے بند کر لیں۔ دوسرے کھیرے کے چھلکے سمیت لمبائی میں کٹے سلاؤں اور چلی گارلک ساس کے ساتھ پیش کریں۔

دار چینی ملائیں۔ اسے چہرے پر لگائیں۔ تقریباً بیس منٹ کے بعد سادہ پانی سے منہ دھولیں۔ یہ چہرے کے لیے بہترین ماسک ہے۔

☆ کچے کیلے کو ملل کے صاف کپڑے پر رکھ کے کچل لیں۔ پھر اس کی پوٹلی سی بنا کر اسے چہرے پر اچھی طرح ملیں۔ دس منٹ بعد سادہ پانی سے منہ دھولیں۔ یہ عمل چہرے کے لیے کلیننگ کا کام کرے گا۔ باقاعدگی سے کرنے پر اس سے چہرے کے داغ و بھبھے بھی دور ہو جاتے ہیں۔

☆ پکے ہوئے کیلے کا گودا چہرے پر ملیں۔ تیس منٹ بعد سادہ پانی سے منہ دھولیں۔ اس ماسک کو بھی باقاعدگی سے لگانے سے چہرے کے داغ و بھبھے دور ہوتے ہیں اور رنگت نکھ جاتی ہے۔

☆ اگر آپ کے سر میں خشکی ہے تو سرسوں کے تیل میں کیلے کے تنے کا عرق کافی مقدار میں ایک اینڈ اور تھوڑی دبی پھینٹ کر شامل کر لیں۔ اسے سر پر لگائیں۔ پھر کوئی کپڑا اس کا رقبہ لے کر اسے سر پر باندھ لیں۔ ایک گھنٹے بعد عام طریقے سے سر دھولیں۔ کچھ ہی عرصے میں بالوں کی خشکی سے نجات مل جائے گی۔

☆ اگر بال گرتے ہوں تو آدھا پاؤ دبی، ایک پاؤ دودھ اور آدھا لیٹر کیلے کے تنے کا عرق لے کر انہیں اچھی طرح ملا لیں۔ پہلے اس سے سر دھو میں اور آدھے گھنٹے بعد سادہ پانی سے سر دھولیں۔ یہ عمل ایک مہینے تک روزانہ کرنے سے بال گرتا بند ہو جاتے ہیں۔

☆ بالوں کو لمبا اور گھنا کرنے کے لیے کیلے کی جڑوں کا عرق ایک لیٹر، چند رکھنڈ کا عرق ایک لیٹر، خشک آملہ ایک پاؤ، ہندی کے تے آدھا پاؤ ملیں۔ انہیں ایک برتن میں ڈالیں اور چونے پر چڑھا دیں۔ آنچ دھیمی رکھیں۔ جب عرق آدھا رہ جائے تو اس میں چار چھٹانک تلوں کا تیل بھی شامل کر دیں۔ جب پک پک کر سارا عرق جل جائے اور صرف تیل ہی باقی بچے تو اسے چھان کر کسی بوتل میں رکھ لیں۔ یہ تیل باقاعدگی سے استعمال کرنے سے بال لمبے اور گھنے ہو جاتے ہیں۔



لکڑی



قدرت نے پھلوں اور سبز یوں میں کچھ ایسے قدرتی خواص رکھے ہیں جو بالوں اور چہرے کی خوبصورتی اور دلکشی برہانے میں بے حد معاون ہیں۔ کیلا صرف کھانے ہی میں خوش ذائقہ نہیں بلکہ حسن و دلکشی حاصل کرنے کا قدرتی ذریعہ بھی ہے۔ اس میں ایسے اجزاء شامل ہیں جو جلد کو نمی فراہم کرتے اور داغ و بھبھے دور کرتے ہیں۔ نیز یہ بالوں کے لیے بھی بے حد فائدہ مند ہے۔

☆ چہرے کی رنگت نکھانے کے لیے کیلے کے سبز پتوں کا عرق دس قطرے، لیموں کے رس کے دس قطرے اور عرق گلاب کے پانچ قطرے لے کر انہیں ملا لیں۔ اس مخلوط کو رات سونے سے پہلے چہرے پر لگائیں۔ صبح کسی اچھے صابن سے منہ دھولیں۔

☆ کیلے کے پتوں کا عرق اور گرپ فروٹ کا رس برابر مقدار میں لے کر اس میں تھوڑی سی پسلی ہوئی